(کُلیاتِ غزل)

(جلد پنجم)

کُلیات میں شامل 6 مجموعہ ہائے غزل

تادیب تنصیب

توسیع تفریق

ترمیم تجویز

ظفر اقبال

1966 میں جناب ظفر اقبال کا مجموعہ گلافتاب
شائع ہوا تھا، اب 2016ء ہے۔ نصف صدی گزر گئی
انھیں سخن کی راہ گزر پر بنا رکے چلتے ہوئے۔ پھر بھی ان
کے لہجے میں تھکن کے آثار ہیں، نہ کلام پر فرسودگی کی گرد۔
انھیں اظہار پر ایسی غیر معمولی قدرت حاصل ہے جس
میں تسلسل ہے، شگفتگی ہے، انفرادیت ہے اور خود کو دہرانے
کا عمل شامل نہیں۔ کہیں سے بھی مجموعے کو پڑھ لیجیے، اچھے
اشعار سامنے آ جائیں گے:

کہیں چھوڑ آیا ہوں یادوں کی پرانی گٹھری
میرا کیا لیتی اگر اس کو وہیں رکھ سکتا
زندگی میں کوئی ترتیب تو رہتی باقی
جو اٹھایا تھا جہاں سے بھی، وہیں رکھ سکتا

غزل وہ صنفِ سخن ہے جس میں اساتذہ نے اپنا
خزانہ چھوڑا ہے کہ نئے لکھنے والے ان کی چمک دمک سے
مسحور ہو جاتے ہیں اور اکثر اس کی نقل بنانا شروع
کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ظفر اقبال نے پہلے ہی مجموعے
میں اپنی غزلوں کے خالص اور کھرے ہونے پر زور دیا۔
انھیں اس کی پروا نہیں تھی کہ جو نگینے وہ غزل کے سانچے میں
جڑ رہے ہیں، ان کی قدر و قیمت کیا لگائی جائے گی۔
غزل جیسی روایتی صنفِ سخن میں انھوں نے اپنی شناخت
اس منفرد انداز کو برقرار رکھتے ہوئے بنائی جو تکنیک میں
تو روایتی ہے مگر زبان و بیان میں غیر روایتی بھی ہے

اب تک

(کُلّیاتِ غزل)

(جلد پنجم)

ظفر اقبال

رنگ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعر
0345-2610434

کتاب : اب تک
(کلیاتِ غزل)
(جلد پنجم)

کلام : ظفر اقبال
0333-4374597
zafariqbal@dunya.com.pk

اشاعت : 2016ء

کمپوزنگ : شیرازی شاعر
0300-2054154

ناشر : رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی
0336-2085325
021-32761100
rangeadab@yahoo.com
www.facebook.com/rangeadab

تعداد : 1000

صفحات : 928

قیمت : 1500/= روپے

ابرار احمد کے نام

کیا زبردست آدمی ہو ظفرؔ
عیب کو بھی ہنر بنا دیا ہے

اب تک

(جلد پنجم)

میں شامل 6 مجموعہ ہائے غزل

سلیقہ

تادیب

تنصیب

توسیع

- دیکھ سکتا ہوں جسے تابِ تماشا کے بغیر 3556
- لفظ رہ جاتے ہیں سارے ہی معانی کے بغیر 3557
- آشیانہ نہیں لگ رہا 3558
- پاس آتا نہیں لگ رہا 3559
- بوجھ اُتارا نہیں لگ رہا 3560
- میں جو مرتا نہیں لگ رہا 3561
- آنی جانی نہیں لگ رہا 3562
- عیب عالی نہیں لگ رہا 3563
- کوئی چارہ نہیں لگ رہا 3564
- یہ جو قابو نہیں لگ رہا 3565
- میری باتوں کو نیا رنگ لگانے والے 3566
- حرفِ دل جوئی کے طومار لگانے والے 3567
- ہیں کوئی اور ہی تدبیر لگانے والے 3568
- اب جو اَوروں کو ہیں اَلقاب لگانے والے 3569
- ستم کی تیز تُنگ دھار سے نہیں مرتا 3570
- اپنا ہی فلک، اپنی زمیں چاہیے مجھ کو 3571
- کیا جانیے کیوں بار دگر چاہیے مجھ کو 3572
- میرے جو آس پاس تھی دُنیا کہیں سے لاؤ 3573
- موجیں وہ مارتا ہُوا پانی کہیں سے لاؤ 3574
- موجود ہے وہ اُس کو سراسر کہیں سے لاؤ 3575
- تدبیر کچھ کرو، کسی عنواں کہیں سے لاؤ 3576
- تصویرِ تیرگی میں اُجالا کہیں سے لاؤ 3577
- ہوتے نہیں جو چاند ستارے کہیں سے لاؤ 3578
- مزہ کچھ تو ملے گا موج کو منجدھار کرنے میں 3579
- ہیں نقصانات یوں تو اور بھی تعجیل کرنے میں 3580

تفریق

ترمیم

تجویز

◆◆◆

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ مِلا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تُو نہ مِلا

عرضِ ناشر

مارکسی نظریہ کے مطابق مقدار سے معیار پیدا ہوتا ہے۔ ظفؔر اقبال کے کلیات ''اب تک'' کی 5 جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہر جلد میں 6 مجموعۂ کلام، ہر مجموعے میں 121 غزلیں، ہر غزل میں 9 شعروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یعنی 30 مجموعہ ہائے غزل، 3630 غزلیں، 32670 اشعار کہنے والا شاعر مقدار اور معیار ہر دو لحاظ سے اُردو شعر و سخن کی دنیا میں ایک ایسے بلند و بالا پہاڑ کی حیثیت رکھتا ہے جسے اُس کی غیر معمولی اُونچائی کے سبب سر نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کا غیر مطبوعہ اور پنجابی کلام اِس اعداد و شمار کے علاوہ ہے۔

ظفؔر اقبال کے ہنر پر تنقید اور اُن کے فن پر تنقیص لکھنے والے (فرض کرتے ہوئے) اگر ظفؔر اقبال کی اُردو شاعری سے وہ کلام منہا بھی کر دیں جس پر معترضین کو اعتراض ہے تو اچھے اور قابلِ ذکر معیار کی بڑی مقدار ظفؔر اقبال کے پاس رہ جاتی ہے جو پھر بھی اُنھیں عہدِ حاضر کا اہم، معتبر اور نمایندہ شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ جس پر ناقدینِ فن و ہنر نے جم کر تحسین و تقریظ لکھی اور مشاہیرانِ ادب نے اُن کی تجرباتی اور نئی شاعری پر دل کھول کر داد دی ہے۔

پاکستان کیا ہمیں اُردو دنیا میں کہیں بھی اُن کے شاعرانہ قد کے برابر کوئی ایسا ہم پلّہ دوسرا شاعر نظر نہیں آتا، جس نے اُردو شاعری کو اِس قدر نت نئے تجربات سے گزارا ہو، اور اُردو غزل کو ایک نئی منزل سے روشناس کرایا ہو۔ اُردو شاعری کو ایسی معراج پر غالبؔ کے سو سال بعد ظفؔر اقبال نے پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے اہم اور قد آور شاعر کی تمام اُردو شعری کلیات کو ''رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی'' نے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ناشر: شاعر علی شاعؔر

رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

◆◆◆

ظفر اقبال

عجب نہیں کہ ترا چاند ہو ستارہ مجھے

شمیم حنفی (انڈیا)

ہمارے ہم عصر غزل گویوں میں صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کی غزل ہر طرح کے کلیشز سے آزاد ہے۔ ان کے شعروں کا آہنگ، ان کا لہجہ، ان کی لفظیات، ان کے تجربے، ان کا طرزِ احساس، کچھ بھی متعین اور سکہ بند نہیں ہے۔ فکری اور تخلیقی آزادی کا جیسا گھنا اور دیرپا تاثر ظفر اقبال اور احمد مشتاق کی غزل قائم کرتی ہے، اس کی مثال کہیں اور نظر نہیں آتی۔

کچھ عرصہ پہلے، اب تک کے عنوان سے ظفر اقبال کے چھ مجموعوں کا مجموعہ سامنے آیا ہے۔ ظفر اقبال نے اسے کلیات نہیں کہا ہے۔ چناں چہ اسے ہمارے زمانے کے سب سے مشاق اور پرگو غزل کہنے والے کے بے تحاشا تخلیقی وفور کا پہلا پڑاؤ سمجھنا چاہیے۔ ظفر اقبال کے کلام میں اچھے برے، نئے اور پرانے غزل گویوں کے تمام محاسن یک جا ہو گئے ہیں۔ سنجیدگی اور پھکڑ پن، معنی آفرینی اور قافیہ پیمائی، اظہار کی بے لگامی اور تخلیقی ضبط، تخیل کی بے حد و حساب پرواز اور بے لوث ارضیت، کہیں زبان کا بے دریغ استعمال اور کہیں غیر معمولی احتیاط کے ساتھ وضع کیے جانے والے لسانی سانچے...... ظفر اقبال کے یہاں شاعرانہ قادر الکلامی، مہارت اور استغنا کے ساتھ ساتھ بیان میں ایک عجیب و غریب لاپروائی کے علاوہ ایک سوچے سمجھے لسانی تشدد کی کیفیت بھی جا بہ جا دکھائی دیتی ہے۔ ظفر اقبال کی غزل کا سلسلہ غزل کی روایت کے مشاہیر میر، مصحفی، سودا، درد، قائم، آتش، غالب، مومن، داغ، حسرت، فانی، یگانہ، شاد، اقبال، فراق، فیض...... کسی سے نہیں ملتا۔ ان کی متانت کی طرح ان کا کھلنڈرا پن بھی ان کا اپنا ہے۔ چناں چہ ظفر اقبال کے ہر رنگ پر انفرادیت کی ایک مہر ثبت ہے۔

اس عہد کے ادبی معاشرے کو جو بیماریاں لاحق ہیں، ان میں ایک مہلک بیماری یہ ہے کہ شہرت اور کامرانی کے معیار دھندلے ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے باکمال اور ہنر مند شعر کہنے والے اپنے اِن معاصرین سے پیچھے جا پڑے ہیں جو ہمیشہ نظر میں رہنے کا گر جانتے ہیں اور اپنی کتابوں کی تقریباتِ رونمائی، اپنے بارے میں مسلسل اور متواتر لکھے جانے والے فرمائشی مضامین، اپنے عام تعلقات اور مراسم کے بل پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر عزیز حامد مدنی، مشفق خواجہ، اطہر نفیس، عدیم ہاشمی، جمال احسانی نے غزل میں اپنے بیش تر معروف و مشہور ہم عصروں کی بہ نسبت بہتر شعر کہے، مگر ان کا تذکرہ عام نہ ہوا۔ اس صورتِ حال کے علاوہ غزل کی صنف کے سلسلے میں ایک عام اور مانوس سچائی بھی ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ غزل کا اچھا شعر کبھی کبھار دوسرے درجے کے شاعروں کے یہاں بھی مل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کی مخصوص ہیئت اور اس کی عمومی روایت میں یہ عجیب و غریب صلاحیت بھی پائی جاتی ہے کہ کسی جانے پہچانے تجربے، طرزِ احساس، قافیے، لسانی ترکیب کی مدد سے اچانک ایک اچھا شعر بغیر کسی بڑی تخلیقی کاوش کے خود بہ خود ظہور میں آجائے، اسی لیے غزل کی روایت کو ترقی دینے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے والوں میں دوسرے درجے کے شعرا کی کارکردگی ہمیشہ موثر رہی ہے۔ اعلا درجے یا پہلی صف کا شاعر عموماً ایک گہری اور مستقل تخلیقی تنہائی کی زندگی گزارتا ہے۔ میر، آتش، غالب، فانی، فراق، یگانہ، ناصر کاظمی کسی گروہ یا جماعت کے شاعر، اگر چاہتے بھی تو ہو نہیں سکتے تھے۔ یہ ایک ایسی دُنیا کے باسی بھی تھے جو انھی کی اپنی بنائی ہوئی بھی تھی۔ صرف جماعتی مزاج اور عام مذاق رکھنے والوں کی دنیا کے لیے یہ اجنبی تھے، بیگانے تھے، مختلف تھے۔ یہ بس ایک حد تک اپنے اپنے عہد کے میلانات کی ترجمانی کر سکتے تھے۔ اسی لیے دوسرے درجے کے شعرا کا رول ماڈل بننے کی صلاحیت اِن میں کم تھی۔ ایک طرف یہ لوگ تھے، دوسری طرف مثال کے طور پر ناسخ اور ذوق اور داغ اور نوح ناروی جیسے شعرا، جن سے عمومی صلاحیت رکھنے والے غزل گویوں کی لمبی قطاریں اور سلسلے منسوب ہیں۔ بہ قول رشید احمد صدیقی، اس نوع کے شاعروں کا کلام عیوب سے پاک ہے، مگر اس میں کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔ اس پس منظر کی طرف ذہن یوں جاتا ہے کہ ظفر اقبال ایک ساتھ بہت سے رنگوں پر قادر ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کے اعتبار سے بہت مستحکم حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ کسی ایک گروہ، ایک مذاقِ سخن، ایک میلان، زبان و بیان کے ایک طور کے

شاعر نہیں ہیں۔ اُردو غزل کے مشاہیر میں انھوں نے کسی کو بھی اپنا آدرش نہیں بنایا۔ کسی ایک انداز کی پیروی نہیں کی۔ زبان و بیان، تجربے اور طرزِ احساس کے کسی ایک دائرے میں محصور نہیں ہوئے۔ ان کا آہنگ، ان کی لفظیات، ان کے لسانی داؤں پیچ، ان کی ترکیبیں، کچھ بھی متعین نہیں۔ انھوں نے روایتی غزل کے کم و بیش ہر دستور کی نفی کی ہے، ہر قدر سے انحراف کیا ہے۔ انھوں نے غزل کی زبان، لہجے، مضمون، علائم اور استعارات کی کوئی حد قبول نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی پُر گوئی، قادر الکلامی، شہرت کے باوجود ظفر اقبال مقبول شاعر نہیں ہیں۔ مقبولیت کا راستہ عام مذاق رکھنے والوں سے مفاہمت کے بغیر نہیں نکلتا۔ بالعموم معاشرے کی عام ذہنی، جمالیاتی، جذباتی سطح سے سمجھوتہ کیے بغیر مقبولیت ہاتھ نہیں آتی۔ قبولیتِ عام کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اپنے اپنے دور میں ذوق، غالب سے آگے تھے، نوح ناروی اور جوش ملسیانی، یگانہ اور فراق سے آگے تھے۔ احمد فراز، ظفر اقبال اور احمد مشتاق سے آگے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مقبولیت اپنے آپ میں کوئی بُری چیز ہے، تاہم اتنا طے ہے کہ صرف مقبولیت کسی شاعر کے اعتبار اور اس کی شاعری کے معیار کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اچھی اور بڑی شاعری نامقبولیت کے راستوں پر جانے سے گھبراتی نہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو غالب اور اقبال کو اپنے بہت سے نکتہ چیں نہ ملے ہوتے۔

ظفر اقبال کا معاملہ بھی یہ ہے کہ ہمارے شاعروں اور شاعری کے قارئین کا ایک حلقہ انھیں اچھا شاعر تسلیم کرنے اور ان کے کمال کا اعتراف کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ ان کے پورے تخلیقی عمل کو غیر سنجیدہ سمجھنے والے بھی مل جائیں گے۔ بہت سے لوگ انھیں پھکڑ باز اور غزل کے روایتی محاسن کا منکر قرار دیتے ہیں۔ 'آبِ رواں' (اشاعت ۱۹۶۲ء) کے بعد ظفر اقبال نے جو غیر معمولی تخلیقی چھلانگ لگائی تھی اور جس کا اظہار ان کے دوسرے مجموعے 'گلافتاب' (اشاعت ۱۹۶۶ء) سے ہوا ہے اسے شعر فہمی اور شعر کی تحسین کے معاملے میں ضعفِ معدہ کا شکار قاری اگر آسانی سے قبول کرنے پر تیار نہیں تو اس میں حیرانی کی بات بھی نہیں ہے۔ 'گلافتاب' اُردو غزل کی روایت میں ایک عظیم الشان تجربے، ایک ان ہونی، ایک تخلیقی معجزے سے کم نہیں۔ اپنی اس جسارت (بے جا!) کی وضاحت کرتے ہوئے ظفر اقبال نے لکھا تھا:

> "یہ کتاب اُردو مستقبل کا خواب نامہ ہے، دھندلا اور ادھورا۔
> مروّج اُردو کے ساتھ اپنی کچھ بن نہیں آئی، چناں چہ شعری تجربے کی

حدت میں پگھل کر اس نے یہ صورت اختیار کی ہے، جن چشموں سے اس زبان نے ابتدا میں توانائی حاصل کی اور جو ایک مدت سے اس پر روک دیے گئے تھے، میں نے انھیں پھر سے رواں کر دیا ہے، کچھ کلیوں کا احیا کیا ہے، کچھ وضع کیے ہیں۔ ایسا کرنے میں کچھ اور پردے بھی ہٹے ہیں۔"

مگر اس معاملے میں ظفر اقبال کی وضاحت کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے سے پہلے بہتر یہ ہو گا کہ 'آبِ رواں' اور 'گلافتاب' کے شعری مزاج کی ترجمانی کرنے والے کچھ اشعار پر نظر ڈال لی جائے۔ 'آبِ رواں' کے کچھ شعر حسبِ ذیل ہیں:

کتنے دیے جلا گئی شام کی تند رو ہوا
پھول گرا کتاب سے، چاند جھڑا نقاب سے

☆

وہ معرکے مری آنکھوں میں گرم ہیں کہ ظفر
میں سوچتا ہوں مجھے دل کی واردات سے کیا

☆

کتنے ہنگاموں سے برپا کر رہا ہوں جشنِ مرگ
کوئی کیوں جانے کہ مجھ کو زندگی کا غم بھی ہے

☆

مقصد ہے آب و دانہ، تہِ دام ہی سہی
ایسی فضاؤں میں ہوسِ بال و پر کسے

☆

دل میں خوشبوئے گنہ بھی ہے رواں چاروں طرف
اس زمیں کا چپہ چپہ دامنِ مریم بھی ہے

☆

مرے وجود سے آگے بھی میں ہوں جلوہ نما
یقیں نہ ہو تو کبھی دیکھ لے بھلا کے مجھے

☆

جس دل کو آج کنجِ اماں کہہ رہے ہیں لوگ
آسیبِ آرزو اسی اُجڑے مکاں میں تھا

اب ذرا 'گلافتاب' کے کچھ شعروں کو بھی دیکھ لیا جائے:

آنکھوں میں سانولا ہے زمیں رنگ زرق برق
سر میں ہے سبز موجِ فلک فام ہر طرف

☆

عجیب تھا اس ہرے بھرے کھیت سے گزرنے کا تجربہ بھی
مگر یہ ہر عضو کی زباں پر جو ذائقہ زرد گھاس کا ہے

☆

بتی بجھا کے دیکھ لے، سب کچھ یہیں پہ ہے
بنیان میرے نیچے ہے، شلوار اُس طرف

☆

پیڑ کے پتے ہوس حیرت ہوا میں حیلہ جو
گھاس کے گھنگھور میں رس کی بھری انجیر تھی

☆

شیر آ کے چیر پھاڑ گیا مجھ کو خواب میں
دم بھر کو میری آنکھ لگی تھی مچان پر

☆

سوکھا ہے اپنا خون سمندر بھی دیر سے
اور ڈوبنے کو شہر میں دریا کوئی نہیں

☆

جسم کے راستوں پہ ہے گردِ گناہ کی چمک
سنگ سزا کی جستجو راحتِ رائیگاں تو ہے

ایک طرف 'آبِ رواں' کے شعروں کا مانوس جادو اور ان اشعار کا سنبھلا ہوا انداز ہے، دوسری طرف 'گلافتاب' کے شعروں میں ظفر اقبال کے تخلیقی تخیل کی آوارہ گردی، مبہم پسندی اور ان کے لسانی شعور کی بے خوفی ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک ہی شاعر کی دو کتابیں نہیں ہیں، تخلیقیت اور طرزِ احساس کے دو الگ الگ منطقے ہیں۔ 'آبِ رواں' کے شعروں سے صاف پتا چلتا ہے کہ انفرادیت کے بعض نمایاں عناصر کے باوجود ظفر اقبال غزل کی روایت کے موسم میں سانس لے رہے ہیں اور ان کا شعور ایسے تمام اوصاف سے مزین ہے جو صنفِ غزل کے عہد بہ عہد ارتقا کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ قاری کو ایک نئے پن کا احساس تو 'آبِ رواں' کے کچھ شعروں میں ہوتا ہے، مگر ظفر اقبال کے اظہار و احساس کی کوئی بھی شکل اس کے احساسات کا بوجھ نہیں بنتی۔ ظفر اقبال کے بیان، زبان اور مضامین کی ندرت، ان کے تخیل کی تازہ کاری پڑھنے والے کے شعور میں کسی طرح کے زور زبردستی کے بغیر نہایت خاموشی کے ساتھ جگہ بنا لیتی ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف انداز رکھنے والے غزل گویوں کی وساطت سے غزل کے جو اسالیب ہم تک پہنچے ہیں، ان کی گونج جا بہ جا محسوس کی جا سکتی ہے۔ اُردو شاعری کی کوئی بھی صنف اتنے تنوع اور ایسی رنگارنگی کی متحمل شاید نہیں ہو سکتی جس سے ہم صنفِ غزل کے ذریعے روشناس ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تغزل کے ایک مبہم تصور اور شعری زبان کے ایک بندھے ٹکے تصور نے ہم سے غزل کے مختلف اسالیبِ اظہار اور احساس کی داد دینے کا ملکہ چھین لیا ہے۔ چناں چہ ہر زمانے کی غزل میں ہم کم و بیش ایک جیسی خوبیوں کو تلاش کرتے ہیں۔ 'آبِ رواں' کے شعروں میں اور مختلف غزلوں میں ہمیں ایک مختلف جمالیاتی تجربے کا ادراک ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تجربہ بے قابو نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس 'گلافتاب' کی بہت سی غزلیں اور اشعار ہمارے دل و دماغ کے لیے ایک چیلنج بن جاتے ہیں۔ ان میں ظفر اقبال نے ہر قدم پر طرح طرح کے خطرے مول لیے ہیں۔ دوسرے درجے کا شاعر شاعری کے مسلمہ ضابطوں اور اصولوں کے ساتھ کسی طرح کی دراز دستی نہیں کرتا اور اپنی روایات کے مانوس گھیرے میں خود کو مامون و محفوظ سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظفر اقبال اس قبیل کے شاعر نہ تو ہیں نہ ہونا چاہتے ہیں، ان کی تخلیقی طینت میں گستاخی اور خودسری کا ایک مستقل عنصر موجود ہے جو انھیں کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ یہ ایک قسم کی 'شورانگیزی' ہے جو ظفر اقبال کے مزاج سے خلقی مناسبت رکھتی ہے۔

بہت زمانہ ہوا، غالباً بیس ویں صدی کی سات ویں دہائی کے اوائل میں فراقؔ صاحب نے 'گڑبڑ غزل' کے نام سے ایک طویل تجربہ کیا تھا۔ شاید اسی تجربے کے پیشِ نظر سجاد ظہیر نے اپنے ہفتہ وار اخبار میں یہ رائے ظاہر کی کہ فراقؔ کے یہاں بلند و پست کا ایک عجیب وغریب آمیزہ نظر آتا ہے۔ ہیرے جواہر کے ساتھ ساتھ کنکر پتھر یا خزف ریزے بھی نکل آتے ہیں۔ اس رائے پر فراقؔ صاحب نے اپنے ردِ عمل کا اظہار سجاد ظہیر کے نام ایک خط میں کیا (جس کی اشاعت بھی ہوئی) اور کہا کہ ان کی غزل کو منتہاؤں کا ایک سلسلہ (A series of climaxes) سمجھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ تمام اشعار ایک سی بلندی کے حامل نہیں ہوتے۔ کوئی کم اونچا ہوتا ہے، کوئی زیادہ اونچا، مگر کوئی بھی شعر پست نہیں ہوتا! خیر، یہ تو ایک بے دلیل دعویٰ تھا، مگر ظفرؔ اقبال نے 'گلافتاب' کے ساتھ غزل کی شعریات کا جو ایک نیا نظام وضع کرنے کی جستجو کی تھی، اس کے نتیجے میں ظفرؔ اقبال کی غزل بہ تدریج 'ظرف تنگنائے غزل' کی قید سے نکل کر ایک وسیع تر فضا کی متلاشی نظر آتی ہے۔ ظفرؔ اقبال اپنی قوتِ ایجاد، اپنی معنی آفرینی، اپنے تخیل کی بے حسابی اور جانے پہچانے لفظوں کو نئے مفہوم کے ساتھ برتنے یا ان میں ایک انوکھا تعلق قائم کرنے کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔ اس سطح پر ان کی غزل اس صنف کی تاریخ میں اقبال کی غزل کے بعد سب سے بڑا اور انقلابی اقدام کہی جاسکتی ہے اور انھی اسباب کی بنا پر ظفرؔ اقبال کی غزل اظہار و بیان کے تنوع اور معنی کی تکثیر کا ایک نیا منظر سامنے لاتی ہے۔ ظفرؔ اقبال کے یہاں ایک ساتھ ان کی تمام حسیں سرگرم دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ساتھ لفظوں کے کئی امکانات روشن ہوتے ہیں، ایک ساتھ ذہنی اور جذباتی ردِ عمل کی بہت سی صورتیں اُبھرتی ہیں اور ایک ساتھ زبان و بیان کی کئی حدیں آپس میں گھُل جاتی ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے یہاں ظفرؔ اقبال کے کلیات کی پہلی جلد (اب تک) سے نموتاً کچھ شعر نقل کرتا ہوں:

مرگِ طبعی سے مرے، دیر کے بیمار تھے لفظ
اور پکڑا گیا میں صرف دوا دینے میں

مفت کی معتبری ہے، ترا نقصان ہے کیا
جو ترے پاس نہیں اس کو لٹا دینے میں

☆

مرے حدود میں ہے میرے آس پاس کی دھند
رہا یہ شہر تو اس کا نہیں اجارہ مجھے

☆

وہ دسترس سے دور سہی، اس کے باوجود
ہے یہ دماغ، اس میں خلل ہونا چاہیے

☆

کچھ دل کو ٹٹولیں گے تو ہوگا کہیں معلوم
تیرے میں زیادہ ہے کہ میرے میں اندھیرا

☆

کچھ بھی ہو سکتا ہے ان سہمے ہوئے لوگوں کے ساتھ
شہر پر چھایا ہوا بادل اگر کھلتا نہیں

☆

فلک پر پارہ پارہ ہے زمیں سی
زمیں پر آسماں سا ٹوٹتا ہے

☆

تھک کر نڈھال ہونا ہی تھا اس لیے کہ میں
گرمِ سفر رہا ہوں ٹھہرنے کے درمیاں

☆

اچھے لگتے ہیں مجھے اپنے غروب اور طلوع
چھپنے والا ہوں کہ ہونا ہے عیاں ازسرِ نو

ان شعروں میں تاثریت، ماورائے حقیقت، تجرید و تجسیم کے ایک محیر العقول خلاقانہ عمل کی تابع بہت سی تصویریں یک جا ہوگئی ہیں۔ ظفر اقبال جس سہولت کے ساتھ رسمی اور روایتی تجربوں کا بیان کرتے ہیں، اسی آزادی اور آسانی کے ساتھ خیال کے بعید ترین اور اجنبی امکانات کی شہادتیں ڈھونڈ لاتے ہیں۔ وہ آسان بھی ہیں اور مشکل بھی، روایتی بھی ہیں اور جدید بھی۔ پرانے

بھی اور نئے بھی۔ ظفر اقبال کی غزل پر کوئی حکم لگانا مشکل ہے۔ انھیں کوئی ایک نام نہیں دیا جا سکتا، سوائے اس کے کہ ان کے اشعار کے گرد ایک ایسی مہیب اور رفیع انفرادیت کی دھند پھیلی ہوئی ہے جس میں غزل کی صنف کے ہزار رنگ سمٹ آئے ہیں۔ ایک چوڑے پاٹ کا پُر جلال اور بہ ظاہر خاموش دریا ہے، جس کی تہ میں تخلیقی جذبے، احساس، تجربے اور شعور کی ایک بھری پُری دنیا آباد ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ظفر اقبال کا تخلیقی وفور اور جوش کہیں تھمتا نظر نہیں آتا۔ وہ بے تحاشا شعر کہتے ہیں اور ان کی طول طویل غزلیں بھی حسی اور فکری تجربوں کی ایک مسلسل بڑھتی پھیلتی ہوئی زنجیر بناتی چلی جاتی ہیں۔ وہ ٹھہرے ہوئے، مرکوز اور متعین تجربوں سے زیادہ حرکت پذیر، سیال اور بے قرار کیفیتوں کے بیان سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اسی لیے، ظفر اقبال کی غزل میں حرکی علائم، تمثالوں اور پیکروں کا ایک ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو غزل کی تاریخ میں غالب کے بعد اپنی صلاحیت اختراع و ایجاد کے لحاظ سے ظفر اقبال ہمارے نمایاں ترین شاعر ہیں۔ ان کے ممتاز ہم عصروں میں غیر متوقع اور انوکھی حسی اور جذباتی واردات کی نشان دہی کرنے والے شعری پیکروں تک رسائی کی سطح پر باقی، عرفان صدیقی، زیب غوری، احمد مشتاق، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، شہریار نے اپنی اپنی انفرادیت اور استعداد کے نقش و نشان تو ثبت کیے، لیکن ان میں سے کسی کے یہاں ظفر اقبال کی جیسی آمد، وفور اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ ظفر اقبال سنجیدہ سے سنجیدہ شعر بھی اس طرح کہتے ہیں جیسے اپنے خیال اور جذبوں کے ساتھ کھیل رہے ہوں۔ اپنے آپ میں مگن اور اپنے ہزار شیوہ عمل کے تماشوں میں کھوئے ہوئے ہوں، ان کے یہاں تکرار، تھکن اور تنگی کا شائبہ تک نہیں۔

ادھر پچھلے کچھ برسوں سے ظفر اقبال کے اشعار میں بولی (بول چال کے لہجے) اور سہلِ ممتنع کا رنگ پہلے سے زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ اُردو غزل میں بے تکلف شعر کہنے کی روایت پرانی ہے۔ ولی، سودا، میر، قائم، آتش سے لے کر تقریباً تمام ادوار کے غیر معمولی اور معمولی شاعروں کے یہاں خیال اور تجربے سے لے کر زبان اور اسلوب کی بے تکلفی تک، سہلِ ممتنع کا ایک رنگا رنگ عالم آباد دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے عہد تک آتے آتے کلیشے اور ادراک و اظہار کے طے شدہ سانچوں سے شغف کے نتیجے میں، غزل کی صنف یکسانیت کا شکار ہو چلی تھی۔ بہت سے نئے شاعر، چاہے برا شعر نہ کہتے ہوں، جب بھی اپنی پہچان بنانے سے قاصر جو رہ جاتے ہیں تو اسی لیے کہ ان کے

یہاں لفظیات، علائم، احساسات، جذبوں اور تجربوں کی تکرار بہت ہے، کبھی نجی اور شخصی واردات کے حوالے سے، کبھی اپنے عہد اور عام انسانی صورتِ حال کے حوالے سے۔ ظفر اقبال کی غزل اس خرابی سے یک سر پاک ہے اور اپنی تازہ کاری کے لحاظ سے ہمارے زمانے کے غزل گویوں میں ان کے ساتھ صرف احمد مشتاق کو نمایاں اور ممتاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کی غزل میں نئی غزل کے تمام روپ اور رنگ سمٹ آئے ہیں۔

ظفر اقبال کی غزل سے میرے تعارف پر چالیس برس سے زیادہ کی مدت گزر چلی ہے۔ وہ جتنے انوکھے اور تازہ کار مجھے اس وقت دکھائی دیے تھے، آج بھی ویسے ہی طباع، اختراع و ایجاد کی صلاحیت سے مالا مال اور دل چسپ نظر آتے ہیں۔ ادھر شاعری کے رموز پر ان کی کچھ تحریریں جو سامنے آئیں اور ان سے ملاقاتوں میں غیر رسمی بات چیت جو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ صنفِ غزل کی روایت اور شاعری کے مجموعی عمل کی بابت جتنا گہرا اور سنجیدہ رویہ رکھتے ہیں، وہ خاصا پُر فریب اور ان کی اپنی غزل کے عام تاثر سے بہت آگے کی چیز ہے، خاصا بلند اور مختلف۔ اب سے کوئی سینتیس برس پہلے ظفر اقبال کی غزل کا ایک شعر سامنے آیا تھا:

جیسے گلِ سیاہ بکھرتا ہو عرش پر
گرتی رہیں زمیں پہ اندھیرے کی پتیاں

میں نے یہ شعر احتشام صاحب (پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم) کو سنایا تو ان کا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ "اگر نئی غزل ایسے شعروں سے عبارت ہے تو اس کی داد نہ دینا بے توفیقی ہوگی۔" یہاں مصرعے کی پُر اسرار فضا نے پورے شعر کو ایک اچانک اور غیر متوقع اور عام ذہن کی گرفت میں نہ آنے والی حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔ ظفر اقبال کی غزل کا یہ امتیاز غیر معمولی ہے کہ اس نے مختلف ادوار، روایت کے مختلف آداب اور مذاق و مزاج کے بدلتے ہوئے مطالبات کی کوئی حد کبھی قبول نہ کی۔ اپنی قوتِ ایجاد کے معاملے میں وہ غالبؔ کے بعد ہمارے سب سے زیادہ جاذبِ نظر غزل گو ہیں۔ صرف معمولات اور تجربے یا اظہار کے متوقع منطقوں پر قناعت کے نتیجے میں اچھے شعر خواہ کہہ لیے جائیں، مگر انھیں 'غیر معمولی' اور ہماری حیرتوں کو جگانے والی شاعری کے دائرے میں جگہ شاید کبھی نہیں مل سکے گی۔ اس سطح پر ظفر اقبال اپنے تمام معاصرین سے آگے ہیں۔

◆◆◆

اور پھر ایک طرف اُس نے کیے چاروں طرف

ابرار احمد (لاہور)

25 اپریل 2016ء

ظفر اقبال پر بات کرنا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس قدر مشکل ہوتا چلا جائے گا مجھے اِس کا اندازہ نہیں تھا۔ مجھ سمیت یار لوگ ایک زمانے میں اُن کو دو طرح کی شاعری سے ہی پرکھا کرتے تھے۔ یہ تقسیم شاید آج بھی بے بنیاد ہرگز نہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے اس قدر وقیع اور ضخیم کام کر دکھایا ہے کہ اُس کی تفہیم و تنقید تو رہی ایک طرف، یہ دعویٰ کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ ہم نے اُنھیں پورا پڑھ بھی رکھا ہے یا نہیں۔ اور یہ جو اِدھر اُدھر ہر طرح کے لوگوں کی جانب سے اُنھیں جملوں میں اُڑانے کا رواج سا چل پڑا ہے تو اگر وہ اُن کے کلیات ''اب تک'' کی صرف پہلی جلد ہی ذرا جم کر اور غیر متعصبانہ انداز سے پڑھ سکیں تو ایسی جرأت کرنا شاید اُن کے لیے ممکن نہ رہے اور اگر پھر بھی اُن کی تسلی نہ ہو، تو کسی کو بھی شوق پورا کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ شوق بغض ہی کے زمرے میں شمار کیا جائے گا اور خود اُن کے لیے ہر ایک دن شرمندگی کا سبب ہوگا۔ ظفر اقبال نے جو لکھا ہے اُس کی بنیاد میں تنازعہ موجود ہے اور اُن کی غزل نے چند بنیادی سوالات اُٹھائے ہیں جن پر ہم غور کریں، نہ کریں اُردو غزل کی روایت اور تاریخ اُن سے لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک غیر معمولی شاعر ہیں اور تاریخ ادب کا ایک مستقل حوالہ اور نام، جس کی حقیقت سے انکار کرنا، ناممکن ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی شاعر کو پرکھنے کے لیے اُس کے اچھے کام سے ہی معاملہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس ''اچھے کام'' کا تعین کون کرے گا؟ اچھا کام اگر آٹے میں نمک کے برابر ہو تو ہم اُسے سرزد ہونا کہتے ہیں۔ نیز میرے نزدیک جو کام اچھا ہے، ضروری نہیں کہ کسی اور کی نظر میں بھی وہ

اچھا ہی قرار پائے۔ پھر بھی اگر اچھا کام ظفر اقبال کے حوالے سے تلاش کیا جائے تو تعداد میں اُن کے اتنے مجموعے غیر معمولی نوعیت کے ہیں، جتنی تعداد میں کئی شعراء کے پورے کلام سے اشعار برآمد نہیں ہوتے۔

میں زمانۂ طالب علمی سے ہی اُن کی شاعری کا قتیل ہوں۔ ہم لوگوں نے نوجوانی کے دنوں میں جب ''گلافتاب'' پڑھی تو دنگ رہ گئے۔ ٹرانس میں آ گئے۔ کچے پکے انداز میں، اُن کے رنگ میں شعر کہنے لگ گئے لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ہمارے سامنے یہ سوال آ گیا کہ یا خدا! کیا غزل یوں بھی کہی جاسکتی ہے۔؟ ہمارے سامنے اور ذہن میں اِس وقت غزل کی نصابی تعریف موجود تھی اور اُس کی تائید کرتی ہوئی دستیاب غزل۔ لیکن ''گلافتاب'' کی شاعری نے تو اِن تمام تصورات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب میں نے شمس الرحمان فاروقی کا یہ بیان پڑھا کہ:

> ''دیوانِ غالب کی اوّل اشاعت (1841ء) کے بعد اُردو غزل کی تاریخ میں دوسرا انقلابی قدم ''گلافتاب'' (1966ء) کی اشاعت تھی۔ بیچ میں کچھ نہ تھا۔''

لیکن آج ظفر اقبال کئی قدم مزید آگے بڑھ چکے ہیں، ضخامت، تنوع، رنگارنگی اور زبان کے خلاقانہ استعمال کے حوالے سے۔ اگر ہم اُن کے قریبی معاصرین کے پورے کام پر نگاہ ڈالیں۔ تو شاید ہی کسی ایک شاعر کا عمر بھر کا کام۔ کلیات کے سلسلے ''اب تک'' کی پہلی جلد سے زیادہ ضخیم ہو، اور یہ تحریر اُن کے کلیات کی جلد نمبر 5 کے لیے لکھی جا رہی ہے۔ محض ضخامت یہ تعین نہیں کیا کرتی کہ کون کس درجے کا شاعر ہے، لیکن یہ کام ظفر اقبال کا ہے، اِسی لیے ہم مقدار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اُن کے کلام کی بابت، میری رائے واضح ہوا کرتی تھی۔ ایک نوع کا کلام مجھے بے حد پسند تھا اور دوسری قسم کا، میرے لیے اُلجھن کا باعث۔ لیکن اب خیال آتا ہے کہ آخر میں اُن کا ایک قاری ہی ہوں اور ہر قاری کا اپنا مزاج، اپنی تربیت، اپنی توقعات اور اپنی ترجیحات ہوا کرتی ہیں۔ یہ عنصر جہاں اُسے اوروں سے ممتاز کرتا ہے تو وہیں ایک نوع کی محدودیت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر میری جتنی ہی سمجھ بوجھ رکھنے والے دو قاری ظفر اقبال کا انتخاب کریں تو مجھے یقین ہے کہ دونوں انتخاب،

ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں گے۔ یہ وصف ایک نقاد میں ہوا کرتا ہے یا ہونا چاہیے کہ وہ خالص معروضی پیمانوں سے کسی فن پارے پر حکم لگا سکے لیکن تنقید میرا میدان نہیں اور نہ میں اپنے چھوٹے چھوٹے تعصبات سے آزاد ہو جانے کا دعویٰ ہی کر سکتا ہوں اس لیے ہر چند میری کوشش ہے کہ کسی حد تک غیر ذاتی انداز میں بات کر سکوں پھر بھی یہ ایک قاری ہی کی تحریر رہے گی۔ جس سے اختلاف کی گنجائش ہی ہے، اور ایسا ہونا یقینی بھی۔

لیکن آگے پڑھنے سے پہلے میں یہاں چند ناقدین فن کی آرا درج کرنا چاہوں گا۔ جن کی تنقیدی بصیرت پر سوال اُٹھانا مشکل ہے:

"فیض اور ناصر کاظمی کے عہد میں غزل میں شاید ہی کسی شاعر کو اتنی انفرادیت اور اتنی شہرت حاصل ہوئی ہے جتنی ظفر اقبال کو۔ دوسرے لفظوں میں اب وہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا غزل گو ہے۔"

قمر جمیل

"(ظفر اقبال) کے کلام کی ایک لہر بول چال کے اُسلوب کو ادبی زبان کا حصہ بنا کر اور پرانے ادبی سانچوں کا کچومر نکال کر نئی زبان کی تخلیق کا عمل ہے۔ یہی اس کے کلام کا بنیادی وصف (Contribution) ہے۔"

وحید قریشی

انتظار حسین لکھتے ہیں:

"اب میں دوسروں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ بھائی اُسے ایسے مت پڑھیے جیسے اور شاعروں کو پڑھتے ہو۔ ظفر اقبال کی غزلیں ایسے پڑھو جیسے آم کھا رہے ہو۔ ٹیبل پر بیٹھ کر چھری کے ساتھ قلمی آم نہیں بلکہ جیسے کھٹے بیٹھے دیسی آموں سے بھری تھال آپ کے سامنے رکھی ہے اور آپ آستینیں چڑھا کر اطمینان سے بیٹھے آم چوس رہے ہیں۔"

میرے نزدیک ظفر اقبال کو کیسے پڑھا جائے، اس حوالے سے اتنی خوب صورت اور کار آمد بات صرف انتظار حسین ہی لکھ سکتے تھے۔

فاروقی مزید لکھتے ہیں:

"لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ اپنی تمام تر تازگی اور جدید کاری کے باوجود (بلکہ اس کی وجہ سے) ظفر اقبال کا کلام پنجاب سے باہر کے رسالوں میں بالکل نہ چھپا۔ کراچی کے حلقوں میں ظفر اقبال کو عام طور پر شک، خوف اور عدم اعتمادی کے ساتھ دیکھا گیا۔"

برسوں پہلے اُن کی کہی گئی یہ بات آج بھی درست ہے اور شاید اس کی ممکنہ وجوہات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ "اہلِ زبان" اُردو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن اُردو شعر و ادب کے ارتقا پر نگاہ ڈالی جائے تو کلیدی حوالہ زبان کی ترقی ہی قرار پائے گا۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ تخلیقی عمل میں شریک لوگوں کی غالب اکثریت کا تعلق اس متوسط طبقے سے ہے، جس کی مادری زبان، اُردو نہیں ہے۔ اسی لیے اُن کی تخلیقات میں اُن کی اپنی مادری زبانوں کے اثرات کا در آنا فطری تو ہے ہی، میرے نزدیک اُردو کو بہ طور زبان وسعت آشنا کرنے کے لیے ایک لازمی حیلہ بھی اور ظفر اقبال اس حوالے سے اُردو غزل کی نمایاں ترین مثال ہیں۔ اُردو زبان میں اُنھوں نے مقامی زبانوں اور خاص طور پر پنجابی کے لاتعداد الفاظ کو ایسے سلیقے سے برتا ہے کہ اب وہ کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں رہے۔ اُن کا یہ کارنامہ، بہ ذاتِ خود بے مثال ہے۔

اب ذرا ہم بعد میں آنے والوں کے حوالے سے ظفر اقبال کو دیکھیں تو وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے اگلی دو نسلوں کو کسی نہ کسی حوالے سے متاثر کیا ہے۔ ہم لوگوں نے اُنھیں حیرت اور محبت سے پڑھا۔ کہیں کہیں ہمارے ساتھ کے شعراء کے کلام میں اُن کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہم نے اُن سے اختلاف بھی کیا، بحث مباحثے بھی چلتے رہے جن میں احترام اور محبت کا رشتہ ہر دو طرف سے ہمیشہ قائم و دائم رہا۔

لیکن ہمارے بعد کی نسل کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ہمارے اُن نوجوانوں کی اکثریت نے ظفر اقبال کو جم کر پڑھا ہی نہیں اور دستیاب کلام میں، جس پر اعتراضات وارد ہوتے رہے نئی نسل نے زیادہ تر انھی اثرات کو شدت سے قبول کیا ہے اور یہ قابلِ فہم بات بھی ہے کہ نئے لکھنے والوں کے سامنے غزل کی روایت کی آب و تاب تو موجود تھی ہی۔ لیکن ظفر اقبال کی شاعری کی چکاچوند، مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ نئے امکانات کے در بھی وا کرتی نظر آ رہی تھی۔ میں تو یہاں تک

کہوں گا کہ نئی نسل کی غزل گوئی تعداد میں اسی سبب سے زیادہ ہے، اور وہ جو ہم "تنگنائے غزل" کے خوف ناک احساس اور اِس کی جکڑ بندیوں سے گھبرا کر نظم کی جانب آتے چلے گئے تو اِس کی جزوی تلافی بھی ظفؔر اقبال کی غزل ہی نے کر دکھائی۔ نظم ہی دراصل مستقبل گیر صنفِ سخن ہے لیکن یہ بات بھی ضرور ہے کہ ان دو اصناف کا درمیانی فاصلہ اگر کم ہو گیا ہے تو یہ کریڈٹ ظفؔر اقبال ہی کو دینا پڑے گا۔

ظفؔر اقبال کی ساری شاعری کو پسند کرنے پر میں خود کو نہ مجبور سمجھتا ہوں نہ حقیقت میں ہی ایسا ممکن ہے کہ بہر حال کسی بھی فن پارے سے لطف اُٹھانے، بصیرت کشید کرنے وغیرہ کا تعلق ہمارے اپنے ذوق اور تربیت سے ہی ہے اور میں آج بھی اس حوالے سے کہیں نہ کہیں بدمزہ ضرور ہو جاتا ہوں۔ لیکن میرے اِس طرزِ عمل کی کچھ بنیاد بھی موجود ہے۔

میں بڑی یا اعلیٰ شاعری میں اس روحانی، جذباتی یا ذہنی واردات کو تلاش کرنے پر مجبور ہوں جو مجھے اپنی جگہ پر نہ رہنے دے۔ وہ فضا جو میرے نزدیک شاعری کو عظمت عطا کرتی ہے۔ یوں بھی نہیں کہ ایسے مقامات اُن کے مطالعے کے دوران کم آتے ہیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ تسلسل سے اُن کے ہاں موجود نہیں ہے۔ اب "عظمت" کو فی الحال ایک طرف رکھ کر بات کروں تو یہ حقیقت ہے کہ مجھے اُن کے کلام میں اس مسلسل رو اور باطنی مسلکے کی غیر موجودگی پریشان کرتی ہے۔ لیکن یہ غیر موجودگی ہے نہیں۔ کسی ایک بڑے مسلکے سے وابستہ رہنے والی شاعری یا ادب اپنے اندر زیادہ بڑا امکان رکھتا ہے لیکن ظفؔر اقبال کے ہاں تو پوری زندگی اپنی تمام تر رنگا رنگی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ میں نے ایک مرتبہ خود اُن سے کہا تھا کہ ظفؔر صاحب...... آپ نے جگہ جگہ لاتعداد چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود دیے ہیں، کوئی کنواں نہیں بنایا۔ تو موضوعات کے حوالے سے یہ بات شاید زیادہ درست ہے کہ اُنھوں نے کسی بھی موضوع یا مضمون کو چھوڑا ہی نہیں، جسے اپنے شعر میں بیان نہ کر دکھایا ہو۔ یہ موضوعاتی تنوع ہی اُن کا اِس حوالے سے سب سے بڑا امتیاز ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ بہ طور مداح اور جونیئر یہ میری خوش بختی رہی ہے کہ میرا ذاتی تعلق جن بے پناہ شاعروں سے رہا ہے۔ ان میں منیؔر نیازی اور ظفؔر اقبال سرِ فہرست ہیں۔ منیؔر نیازی تو خیر ہمارے لاڈلے تھے۔ زیادہ لبرٹی لینے ہی نہیں دیتے تھے لیکن ظفؔر اقبال کی شخصیت میں ایسا کمال ہے کہ کوئی بھی، اُنھیں اپنا دوست بنا سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، بحث مباحثہ کر سکتا ہے، اختلاف کی جرأت دکھا

سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مانتے کسی کی نہیں حتیٰ کہ کالم کے حوالے سے چھوٹی موٹی فرمائش کو بھی خاطر میں نہیں لاتے لیکن اُن کی محفل میں عمروں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اُن کی جانب سے، میری گستاخیوں کے باوجود، ہمیشہ درگزر اور بے پناہ محبت ملی ہے اور یہ میری خوش بختی بھی ہے اور میرے لیے قیمتی ترین اثاثہ بھی۔ یہاں اِن خوبیوں کے بیان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اُن کی غزل بھی اُنھی کی طرح سے بے تکلف ہے، فطری ہے، گفتگو کے قریب ہے اور سخت جان بھی!

ہم جب کسی بڑے شاعر پر بات کرتے ہیں تو اپنی ترنگ میں بھول جاتے ہیں کہ خود ہم کیا ہیں اور جس پر ہم ایسی فراخ دلی سے تبرا بھیج رہے ہیں، وہ کس مقام و مرتبے کا شاعر ہے۔ آج کے بہت سے شاعر، جن کے ''مقام'' کی بہ قول منیر نیازی۔ ابھی ''م'' بھی نہیں بنی۔ وہ جب ظفر اقبال پر حملہ آور ہوتے ہیں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے بھائی۔ ذرا دھیرج۔ کیا آپ جانتے بھی ہیں کہ کس پر آوازے کس رہے ہیں آپ؟ اور کیا کبھی یوں کسی ایسے شاعر کا کچھ بگاڑا جا سکتا ہے، جس کا کام، نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہو؟ اور جس کے شعر میں کسی کو بھی مکمل طور پر بے دست و پا اور بے ٹھکانہ کر دینے کی صلاحیت ہمیشہ سے موجود رہی ہو؟

کچھ عرصہ قبل ظفر اقبال کے مضامین/کالموں کی کتاب ''لاتنقید'' بھی سامنے آئی اور مجھے اُس کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملا۔ اِن مضامین میں جہاں اُنھوں نے دیگر موضوعات اور شخصیات پر لکھا ہے، وہیں ایسی تحریریں بھی موجود ہیں جن سے ہمیں اُن کے ''نظریۂ شعر'' کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مجھے اُن کی اِس کتاب نے اُن کے فن کو سمجھنے کے لیے خاصی راہ نمائی فراہم کی۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ''میرا یہ سارا سفر دراصل شاعری کی تلاش کے سلسلے میں ہے۔ میں غزل کے لیے کسی نئی اور ایسی مابعد الطبعیات کے کسی امکان کی جستجو میں ہوں جس سے یہ مرتی ہوئی صنفِ سخن کچھ دیر مزید نکال سکے۔ میں نے اگر زیادہ لکھا ہے تو یہ اسی جستجو کا شاخسانہ ہے۔''

گویا اُن کے نزدیک غزل ایک مرتی ہوئی صنفِ سخن ہے۔ یہ بات درست بھی ہے کہ عصری معاملات میں کچھ ایسی جوہری اور بنیادی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں کہ لگتا ہے غزل، تن تنہا، اُن کا ساتھ نہیں دے پائے گی۔ لیکن یہاں اُن کا مطلب غالباً یہ ہے کہ غزل کی موت اُن گنے بندھے

اصولوں اور ڈھلی ڈھلائی (یا دھنی دھنائی) زبان کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور ظفر اقبال کی جدوجہد، اسی صنف کو اسی یبوست سے نکالنے کا دوسرا نام ہے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ظفر اقبال اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہیں اور جس نئے امکان کو انھوں نے پیدا کر دکھایا ہے وہ اصل میں ایک لسانی امکان ہے۔

میں اوپر بیان کر چکا کہ لسانی حوالے سے اُنھوں نے ایک تو مقامی زبانوں سے کام لیا تو دوسری طرف زبان کو نہایت بے رحمی سے توڑا اور پھر اُسے ازسرِنو جوڑنے اور مرتب کرنے کا کام تسلسل سے کرتے چلے گئے۔ گویا وہ جس ''مابعد الطبیعات'' کی کھوج میں رہے، اِسے اُنھوں نے زبان کے اندر ہی دریافت کیا۔ گویا، ظفر اقبال ایسے شاعر کا نام ہے جو زبان کی پیداوار ہے اور اسی حوالے سے اُنھیں اور اُن کے کام کو سمجھنا سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

''لاتنقید'' میں ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر آپ مضمون و موضوع کو سر پر سوار کر کے اس کام (یعنی تخلیق) کا آغاز کریں گے تو اُس کا انجام آپ کو پہلے ہی سے معلوم ہونا چاہیے۔ چناں چہ ان آلائشوں کو ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھنا ہوگا؟''

یہ ذہن کو سخت جھٹکا دینے والی بات ہے کہ وہ مضمون کو آلائشیں قرار دے رہے ہیں لیکن یہ خود اُن کے اپنے کلام کے حوالے سے کلیدی بات ہے۔ ہم تخلیقی عمل کی بابت یہی سمجھتے آئے ہیں کہ اس کی بنیاد قلبی واردات ہوا کرتی ہے یعنی یہی مضمون، موضوع یا کیفیت، تو کیا ظفر اقبال کے ساتھ ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی جسے ہم ''آمد'' کا نام دے سکیں۔؟ اُن کا شعر اس بات کی نفی کرتا ہے اور شدت سے کرتا ہے شاید وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مضمون، واردات، خیال، موضوع، کیفیت، اپنی جگہ لیکن اُن کا حق ادا کرنے کے بعد بھی شاعر کو جاری رہنا چاہیے اور کسی اگلے ''ارفع لمحے'' کے انتظار کے بجائے، تخلیقی عمل کو طوالت دینی چاہیے اور یوں مضمون کو سر پر سوار کرنے کی بجائے، اُس سے محض آغاز کا کام لیا جائے۔

یہ کام نظم میں ممکن نہیں اور اگر کوئی اس فارمولے پر عمل کرے گا تو کام سے گیا۔ لیکن غزل میں یہ ردیف اور قافیے کا نظام ہے اگر اُسے ڈھنگ سے استعمال کیا جا سکے تو کئی مرتبہ ایسے مضامین نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں جن کا آپ کی باطنی واردات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ تو گویا

ظفر اقبال، زبان کے ساتھ ساتھ کرافٹ کے شاعر بھی ہیں۔ ایک ایسا کرافٹ، جو کم کم ہی کسی کو نصیب ہوا کرتا ہے۔

ظفر اقبال مزید لکھتے ہیں:

''ادیب کی ذات کو اس کے فن سے منہا کر کے دیکھا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اُس کے فن کا صحیح محاکمہ ہو سکتا ہے۔''

بہ ظاہر یہ بات اُن کے مذکورہ بالا نقطۂ نظر کی نفی کرتی دکھائی دیتی ہے اور ہماری مابعد جدید تنقید کو شاید یہ پسند ہی نہیں آئے لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی شاعری سے اُن کی شخصیت کا گہرا تعلق موجود بھی ہے اور جگہ جگہ جھلکتا بھی ہے۔ گویا ہر چند وہ مضمون و موضوع کو آلائشیں قرار دیتے ہیں لیکن اپنے لکھے کو خود سے پوری طرح وابستہ بھی گردانتے ہیں گویا ہمیں اگر اُن کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنا، سمجھانا ہے تو ہر دو کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس شاعر کے کلام سے کس طرح کی ذات یا شخصیت برآمد ہوتی ہے۔ تو میرے نزدیک یہ روحِ عصر سے ہم آہنگ، فنی دسترس اور قدرتِ کلام سے مالا مال ایک ایسی فعال شخصیت ہے جو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اُردو غزل کے مزاج کو تبدیل کرنے کا مصمم ارادہ کر کے میدان میں آئی۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ اپنے سماج اور اپنے زمانے سے اس قدر بامعنی انداز سے جڑی ہوئی ہے کہ اپنے عہد کے انسان کے تمام مسائل سے بھی معاملہ کرتی چلی آئی ہے۔ اور دیکھا جائے تو وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی قرار دی جا سکتی ہے۔

ظفر اقبال کے تنقیدی خیالات کے تناظر میں اُن کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کے دوران، ٹی ایس ایلیٹ بھی یاد آیا جس نے لکھا تھا کہ شاعری، جذبات و احساسات اور شخصیت کے اظہار کا نہیں۔ ان سب سے فرار کا نام ہے اور میری یہ بات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے واقعی کوئی جذبات یا کوئی شخصیت ہو۔ معلوم نہیں کہ زیرِ نظر شاعری کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ شاید ہاں، شاید نہیں۔

ظفر اقبال اور اُن کے معاصرین کی بابت ہماری نئی تنقید کم و بیش خاموش ہے اور یہ خاموشی غزل کے حوالے سے زیادہ گہری ہے۔ ہماری نسل تو رہی ایک طرف ہم سے پہلی نسل کا نظم پر بھی اگر ڈھنگ سے کوئی کام دکھائی دیتا ہے تو وہ بھی صرف راشد اور مجید امجد تک محدود ہے۔ اس تعلق

کی وجوہات کا تعین کرنا، نہ میرا کام ہے، نہ شاید میرے لیے ممکن لیکن بہ ظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے پوسٹ ماڈرن نقاد، اخلاقی تنقید کی جانب آنے سے بوجوہ گریزاں ہیں۔

ذرا پیچھے جائیں تو شمس الرحمان فاروقی نے ظفؔر اقبال کو غالبؔ کا ہم پلہ قرار نہ بھی دیا ہو کم از کم یہ سوال ضرور اُٹھادیا کہ غالبؔ کے بعد اُردو غزل میں کسی بڑے شاعر کا ظہور ممکن ہے۔ اس سے ذرا ہلکا سوال بھی اُنھوں نے ہی اُٹھایا کہ احمد مشتاقؔ، فراقؔ سے بڑے غزل گو ہیں۔ ان دعوؤں سے قطع نظر، یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ غزل کی شاعری پر کوئی تنقیدی مکالمہ تو کیا گیا، کوئی بات تو چلائی گئی۔ لیکن اس کے بعد کی لمبی چپ ٹوٹنے میں نہیں آرہی۔ آنے والے برسوں میں یہ کام تو ہوکر رہے گا لیکن ظفؔر اقبال کی شہرت بھی خود اُن کی اپنی کوششوں کا جزوی نتیجہ دکھائی دیتی ہے حالاں کہ اُن جیسے اہم غزل گو پر ہماری تنقید کو جم کر بات کرنی چاہیے تھی۔

اُن کا تنقیدی مطالعہ اِس لیے بھی اہم ہے کہ اب اُردو میں دو طرح کی ہی غزل قابلِ شناخت ہے، ایک وہ جسے اُردو غزل کی تاب ناک روایت کے تسلسل میں دیکھا جاسکتا ہے اور دوسری وہ جسے ہم ظفؔر اقبال کے بعد کی غزل کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ ظفؔر اقبال اِسی روایت کے عظیم دھارے کا ایک لازمی حصہ بن چکے ہیں جس کو قطع کرنے کی وہ بات کرتے رہے ہیں اور اُن کی کام یابی اور شان دار کام یابی سے انکار ممکن نہیں۔

چند برس پہلے ایک انگریزی کالم میں، راقم نے اُن کی بابت ایک جملہ تحریر کیا تھا۔ اپنی معروضات کا اختتام اِس جملے پر کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا:

" Zafar Iqbal is an UNPRECEDENTED Phenomenon in the history of urdu ghazal. "

◆◆◆

تادیب

سیدہ سیفو کے لیے دوبارہ

بھلا دیا اُسے جس کو بھلا نہ سکتے تھے
گھر آ گئے جو کبھی واپس نہ آ سکتے تھے

ظفر اقبال غزل کا "لیجنڈ"

جاذب قریشی

گزشتہ تیس برسوں میں غزل لکھنے والوں کے جو اہم نام ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں ظفر اقبال کا نام پہلی صف میں شامل ہے، ظفر اقبال کو ان کے ہم عمروں میں اس اعتبار سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی غزل کے حوالے سے زندگی کے مختلف معروضی اور موضوعی تجربوں کو کئی اسالیب میں پیش کیا ہے کہ وہ سب سے زیادہ چونکانے والے اور سب سے زیادہ تجربے کرنے والے شاعر ہیں۔ "آبِ رواں"، "گلافتاب"، "رطب ویابس" اور "عہدِ زیاں" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کالم لکھے ہیں، تنقیدی فلیپ لکھے ہیں اور پنجابی شاعری بھی کی ہے۔ ظفر اقبال اردو غزل کا وہ نام ہے جس سے ہزار اختلافات کیے جاسکتے ہیں اسے غزل کی اہم تاریخ نظر انداز نہیں کرسکتی۔

"آبِ رواں" ظفر اقبال کی وہ پہلی شعری کتاب ہے جس نے انھیں نہ صرف اردو ادب کے پڑھنے والوں سے روشناس کرایا تھا بلکہ ان کی اہمیت کا احساس بھی پیدا کیا تھا۔ اس کتاب میں وہ ایک خالص شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے تھے۔ اس کتاب نے ایک طرف اپنے گزشتنی کی بازیافت کی تھی تو دوسری طرف اپنے مستقبل کا اشاریہ بن کر ظاہر ہوئی تھی کہ جو موضوعات اور جو اسالیب ظفر اقبال نے آگے چل کر پیش کیے ہیں ان سب کی جھلکیاں "آبِ رواں" میں موجود تھیں۔ وہ جدید عہد کے ایک سرکش، سچے توانا اور بے چین روح رکھنے والے شاعر ہیں۔

"آبِ رواں" کی شاعری میں ظفر اقبال کے جو اہم موضوعات اظہار پاتے ہیں ان میں تصوف، انسان، معاشرتی جبر اور جمالیات کو نئی تازگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ موضوعات ان

کے پڑھنے والوں کے درمیان دو صورتوں میں اعتبار پیدا کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھیں اپنی کلاسیکی شعری روایات کی آگہی ہے اور دوسری صورت میں وہ جمالیات کے پرانے دائروں سے نکل کر جدید امیجری کی طرف بڑھتے ہیں۔ پہلے چند شعر تصوف اور انسان کے حوالے سے دیکھیے:

خاک در خاک چھپی ہے مری آنکھوں کی چمک
جس خرابے میں تری انجمن آرائی ہے

☆

کڑکتی دھوپ میں صحراؤں سے گزرنے کا
مجھی کو حکم ہوا ہے، برہنہ پا بھی میں
حضور کو نظر آیا ہے کون سا پہلو
کہ بجھتی راکھ بھی میں اور کیمیا بھی میں

☆

تو منقش ہے مری روح کی دیواروں پر
مجھ سے چہرہ نہ چھپا، میں تو ترا پردہ ہوں
لہر آتی ہے مرا عکس مٹا جاتا ہے
ڈوب ہی جاؤں کہ مدت سے لب دریا ہوں
کسی کے ساتھ اگر دو قدم بھی چلتا ہوں
تو خود نمائی کے صحرا میں جا نکلتا ہوں

☆

پہنا تھا پیڑ پیڑ نے پتھر کا پیرہن
یہ امرِ واقعہ نہ سہی، داستاں تو ہے
گاڑی کے گرد بھاگتے ہیں دور کے درخت
یوں ہو، نہ ہو مگر مجھے ایسا گماں تو ہے

☆

تھرتھراتی پاؤں میں تاریک مٹی ہی نہ تھی
روشنی کا بوجھ میرے کانپتے سر پر بھی تھا

☆

ریل کے زور شور سے سارا مکاں لرز گیا
اوس الگ نہ ہو سکی کھلتے ہوئے گلاب سے

☆

باہر گلی میں چلتے ہوئے لوگ تھم گئے
تنہائیوں کا شور تھا خالی مکان میں

☆

سر سلامت ہے ابھی حسن کی دیوار نہ توڑ
کیا کرے گا جو ادھر بھی یہی صحرا نکلا

☆

رات کے دشت میں ٹوٹی تھی ہوا کی زنجیر
صبح محسوس ہوئی ریت کی جھنکار مجھے

ظفر اقبال کے ان تمام شعروں میں ایک گہری پر اسراریت اور ایک گھنی ماورائیت محسوس ہوتی ہے۔اس شاعری کا پس منظر اور پیش منظر انسان اور کائنات کے درمیان ہی موجود ہے اس کی نوعیت غیر انسانی نہیں بلکہ باطنی اور تخلیقی ہے۔''آبِ رواں'' کی شاعری میں ظفر اقبال مشاہداتی تجربوں سے بھی گزرے ہیں۔ان کے یہاں معاشرتی جبر کو اور غیر انسانی رویوں کو محسوس کرنے کی شدید کیفیت ملتی ہے۔انھوں نے خود کہیں لکھا ہے کہ:

''میری الجھن روحانی بھی ہے اور سیاسی بھی''

ان کی سیاسی الجھنوں میں وہ الجھنیں بھی شریک ہیں جو انسان پر ناانصافی اور جبر کے دروازے کھولتی ہیں۔''آبِ رواں'' میں اس سلسلے کی ایک طویل شعری فہرست موجود ہے جسے ہم دیکھ سکتے ہیں:

چمک رہا ہے مری زندگی کا ہر لمحہ
میں کیا کروں کہ مری آنکھ میں ضیا ہی نہیں

☆

نہ کوئی زخم لگا ہے نہ کوئی داغ پڑا ہے
یہ گھر بہار کی راتوں میں بے چراغ پڑا ہے

☆

جو غم ملا جبیں کی شکن میں چھپالیا
دل سی گداز چیز کو پتھر بنالیا

☆

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کر چلی حیات
نکلی برونِ شہر تو بارش نے آلیا

☆

خوشی ملی تو یہ عالم تھا بد حواسی کا
کہ دھیان ہی نہ رہا غم کی بے لباسی کا

☆

سائے بھی جل کے راکھ ہوئے اتنی دھوپ ہے
اس دوپہر میں ڈھونڈتے ہو بام پر کسے

☆

خود راستہ بدل۔کے نکل جایئے کہ اب
ان پتھروں میں اپنی نوا کارگر نہیں

ظفر اقبال نے ہمیشہ اپنی آواز کو اہمیت دی ہے۔ان کا ایک مصرعہ ہے:

تیرہ درخت پر پڑی آبِ رواں کی روشنی

آبِ رواں کی روشنی دراصل خود ان کی آواز ہی ہے جو جنگلوں میں اور چٹانوں میں کبھی سورج بن کر، کبھی گلاب بن کر اپنا اظہار کرتی ہے، مگر لاحاصلی ان کے تعاقب میں ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

رائگاں ہر شاخ پر میں پھول کی صورت کھلا
اس بھرے جنگل میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا

پتھروں میں اور پرچھائیوں میں ظفر اقبال نے اپنے وجود کی اہمیت اور اپنی آواز کی اثر پذیری کی خواہش کو کبھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انھیں جسم وجان کی خوبصورتیوں کی ضرورت بھی رہی ہے مگر وہ رومانی غزل نگاروں کی طرح حسن کی سمت رقت آمیزی، خوشامد پسندی، خودرحمی یا ترحم کی خواہش کے ساتھ کبھی نہیں بڑھے، بلکہ وہ جدید شعور کے ساتھ زینہ زینہ صداقتوں کو قبول کرتے گئے ہیں۔ وہ نئے زمانے کے نئے جسم وجان کی نئی جمالیاتی ہم آہنگیوں کو بچی خواہشوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ان کے لیے دائرۂ ہجراں میں کوئی روایتی تہذیبی قدر یا کوئی مصنوعی لذت نہیں ہے۔ وہ وصال کے شہر میں بے باک قربتوں ہی کو جسم وجاں کی پکار سمجھتے ہیں:

جو ٹھن گئی ہے تو اب ہے سوال عزت کا
وگرنہ اس سے گلے ملنے کی ہوس کیا ہے
تری نگاہ میں ہے آب وتاب وروغن ورنگ
تجھے خبر ہی نہیں زندگی کا مس کیا ہے

☆

بدن سے پیرہن خاک اتار کر اک بار
تری بجی ہوئی آنکھوں میں آئینہ دیکھوں
وہ شب بھی ہو تجھے بانہوں میں لے کے ساری رات
میں تجھ کو یاد کروں تیرا راستہ دیکھوں۔

☆

یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

☆

میں ترے پاس تو ہوں تجھ سے جدا ہو کر بھی
یہی سمجھاتی ہے شب بھر تری تصویر مجھے

☆

بس ایک بار کسی نے گلے لگایا تھا
پھر اس کے بعد نہ میں تھا نہ میرا سایا تھا
برے وجود سے گل زار ہو کے نکلی ہے
وہ آگ جس نے ترا پیرہن جلایا تھا

☆

پاس بٹھا کے پیار سے روح میں زہر بھر دیا
خاک سیاہ کر دیا شعلۂ اعتبار سے

☆

لو دے اٹھیں پھسلتی ہوئی انگلیاں ظفرؔ
وہ آگ تھی کھلے ہوئے ریشم کے تھان میں

☆

رات پھر آئے گی پھر ذہن کے دروازے پر
کوئی مہندی میں رنگے ہاتھ سے دستک دے گا
وہ تو خوشبو ہے اسے چوم سکو گے کیسے
مر بھی جاؤ تو یہ ارماں نہ کبھی نکلے گا
آہٹ آتے ہی نگاہوں کو جھکا لو کہ اسے
دیکھ لو گے تو لپٹنے کو بھی جی چاہے گا

''آب رواں'' کے ختم ہوتے ہوتے ظفر اقبال نے بدنی حسن کے تجربوں سے سیر ہو کر اس طرح نگاہوں کو بدلا ہے کہ ''گلافتاب'' میں وہ کہیں جسمانی لذتوں کے مقابل نظر نہیں آتے۔ ''گلافتاب'' کو ظفر اقبال نے اردو مستقبل کا ''خواب نامہ'' کہا ہے۔ اس کے خواب نامہ ہونے پر تو آگے چل کر بات ہوگی، یہاں پہلے خود ان کی اس تحریر کو دیکھ لیتے ہیں جس کے بعد ''گلافتاب'' کو سمجھنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ ظفر اقبال نے لکھا ہے کہ:

''مروج اردو کے ساتھ اپنی کچھ بنی نہیں چنانچہ شعری تجربے کی حدت میں پگھل کر اس نے یہ صورت اختیار کی ہے۔ جن چشموں سے اس زبان نے ابتداء میں توانائی حاصل کی اور جو ایک مدت سے روک دیے گئے تھے میں نے انھیں پھر سے رواں کر دیا ہے۔ کچھ کلیوں کا احیا کیا ہے، کچھ وضع کیے ہیں۔ ایسا کرنے میں کچھ اور پردے بھی ہٹے ہیں۔ اصولاً یہ پنجابی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ اور اردو کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ پنجابی پیوند میں نے خاص طور پر جا بجا لگائے ہیں۔ یہ تازہ خون اردو زبان کی موجودہ تھکن اور پژمردگی دور کرنے کے لیے ضروری تھا۔ میں نے اضافت سے حتیٰ الامکان گریز کیا ہے۔ گرامر کی گھٹن بھی ویسی نہیں رہی کہ اب میں سانس لے سکتا ہوں۔''

ظفر اقبال کی یہ تحریر ہمیں آگے چل کر اس لسانی قضیے کی طرف لے جاتی ہے جو ''گلافتاب'' کی چند غزلوں کے بعد ''رطب و یابس'' میں اپنے غیر تکمیلی اختتام کو پہنچتا ہوا نظر آتا ہے۔

دراصل لسانی تشکیلات کا خبط افتخار جالب اور انیس ناگی وغیرہ کی خوش خیالی نے پیدا کیا تھا جس کی بنیاد ان کی اس انفرادی پسند یا ناپسند پر تھی کہ اردو زبان کی حرکی، نامیاتی اور زندہ قوتیں برف بن چکی ہیں۔ اس لیے کوئی متبادل زبان ایجاد کی جائے جو زندگی کو شعر و ادب کی صورتوں میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس طرح انھوں نے اس تاریخی صداقت کو اپنے جوشِ جنوں میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی کہ زبانیں صدیوں میں بنتی ہیں اور ان کی تعمیر و تشکیل میں کوئی ایک فرد نہیں، کوئی ایک گروہ نہیں، بلکہ کئی نسلیں اور کئی عہد شریک ہوتے رہتے ہیں۔ زبانوں کے تجربے ان کے ارتقاء کو اظہار میں لاتے ہیں۔ کنایہ، استعارہ، علامت، لفظ ان کی خارجی اور باطنی معنویت اور شکلیں ضرور بدلتی ہیں لیکن کوئی فردِ واحد یا چند لوگوں کا گروہ کسی زبان کو نہ تو مسترد کر سکتا ہے اور نہ ہی نئی زبان کو ایجاد کرنے کی سکت کسی میں ہو سکتی ہے۔

ظفر اقبال جدید شاعری کا ایک بہت اہم نام ہے۔ اس کے اندر جو سکت، جو ذہانت اور جو تخلیقی قوت موجود ہے وہ ہمارے عہد کے زندہ، تازہ، توانا اور بڑے امکان کی بہترین شاعری کی علامت ہے۔

''آبِ رواں'' اور ''گلافتاب'' دونوں ایک ہی سال ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی ہیں، مگر ان دونوں کے تجربوں میں اور اظہار و اسلوب میں حیرت انگیز فرق نظر آتا ہے۔ ''گلافتاب'' کی غزلوں کا سفر گزشتہ عمر کی بازیافت بھی کرتا ہے، موجودہ لمحے کا احتساب بھی آئندگاں کی خبر بھی دیتا ہے۔ ''گلافتاب'' میں داخلی تجربوں کا ارتکاز صعودی ہے۔ ظفر اقبال یہاں معاشرے کے جبر کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اقدار کی شکست کو نئی توجیہات کے ساتھ دیکھتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کو وہ تازہ تر امیجری اور منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں۔ مختلف موضوعات کی چند مثالیں دیکھیے:

ٹوٹے ہوئے مکاں کی اُداد یکھتا کوئی
سر سبز تھی منڈیر کبوتر سیاہ تھا
وہ خواب تھا کہ واہمہ بس اتنا یاد ہے
باہر سفید و سرخ تھا اندر سیاہ تھا

☆

بدرنگ ہے زمیں ابھی کالا ہے آسماں
آنکھیں پگھل سکیں تو اجالا ہے آسماں

☆

یہ ہے صحرا مرا گواہ کہ میں
اور کچھ بھی نہیں صدا کے سوا

☆

شہر سارا سو رہا ہے نیند کی گرمی میں گم
بند دروازے ہوا کے کھولتا پھرتا ہوں میں
خبر نہیں سفرِ خاک میں کہاں ہوں میں
کہیں اندھیرے اجالے کے درمیاں ہوں میں

☆

جیسے گلِ سیاہ بکھرتا ہو عرش پر
گرتی رہیں زمیں پہ اندھیرے کی پتیاں

☆

یہ لازمی ہے کہ تجھ کو وہی خوش آئے گا
جو تیرے ساتھ تری سطح پر اتر کے رہے
ہمارے سر میں بھی سکھ منزلوں کی خاک اڑی
ہمارے پاؤں میں بھی سلسلے سفر کے رہے

☆

ہے عکسِ بے درخت وہی شام ہر طرف
ٹوٹا ہوا پڑا تھا مرا نام ہر طرف
لٹکے ہوئے ہوا میں شفق دھند آئینے
بھٹکے ہوئے صدا میں سیہ بام ہر طرف

''گلافتاب'' کی شاعری میں معلوم سے نامعلوم تک، روشنی سے اندھیرے تک اور گمانوں سے امکان تک کا سفر نظر آتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے تجربوں سے اور شاعری کی روایت سے جو کچھ بھی سیکھا تھا اس میں اپنی تخلیقی اور محسوساتی صلاحیتوں کے ساتھ جدت، بے باکی اور اثر پذیری کو شریک کر کے ہمیں لوٹا دیا ہے۔

ظفر اقبال نظری اور عملی دونوں طرح کی سیاست میں موجود رہے ہیں۔ ان کی کتاب ''عہدِ زیاں'' سیاسی نظریات اور ایک بہتر معاشرے کی خواہش کو سامنے لاتی ہے۔ ظفر اقبال اپنی ابتدائی شاعری سے موجودہ زندگی تک کچھ نہ کچھ سیاسی اور سماجی الجھنوں کو براہ راست اپنا مسئلہ بنائے ہوئے ہیں جس کا اظہار یوں تو ان کی پوری شاعری میں ملتا ہے لیکن ''عہدِ زیاں'' میں اس الجھن کو انھوں نے ایک ادبی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ''عہدِ زیاں'' کی غزلوں میں ایک طرف تو معاشرے کی خارجی اور باطنی ناہمواریوں کو طنز کے لہجے میں لکھا ہے تو دوسری طرف انھوں نے حکومت کی ناانصافیوں کو اور غیر انسانی رویوں کو ادبی اسلوب میں ظاہر کرنا چاہا ہے۔ ظفر اقبال کی یہ شاعری فیضؔ اور حبیب جالبؔ دونوں سے مختلف ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں سیاسی و

انقلابی آواز کو سنجیدہ اور نرم لہجے میں پیش کیا گیا ہے کہ:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

جب کہ حبیب جالبؔ کی آواز براہ راست خطیبانہ اور غیر شاعرانہ ہے کہ:

لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو

ظفر اقبال ان دونوں سے الگ نظر آتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے اسلوب میں معاشرے کے جبر کو، غیر استوار معاملات کو، جمہوری زندگی کی خواہش کو اور تمام لوگوں کے خوف کو پیش کرتے ہیں۔ پہلے کچھ مثالی معاشرتی ناہمواریوں کو دیکھتے ہیں:

جس نے چوری کی تھی سو پچاس پر چھوڑا اسے
جو سڑک پر جا رہا تھا، اس کو اندر کر دیا

☆

ہم آپ کے اپنے ہیں وہ کہتا رہا مجھ سے
آخر صف اغیار میں شامل بھی وہی تھا

☆

یہ میری اپنی ہمت ہے جو میں دنیا میں رہتا ہوں
مگر مچھ سے نہیں بنتی، مگر دریا میں رہتا ہوں

☆

ہیں میری گھات میں کب سے کرائے کے قاتل
سراغ رکھتا ہے کچھ تو وہ بے خبر میرا
میں اصل چہرہ دکھاتا ہوں اس کا دنیا کو
قصور کوئی اگر ہے تو اس قدر میرا

☆

شور ہے زیر زمیں چشمہ ابلتا کیوں نہیں
بول اے خاک وطن پانی نکلتا کیوں نہیں

کس نے پہنایا دلوں کو سرد لوہے کا لباس
خوں پگھلتا کیوں نہیں، موسم بدلتا کیوں نہیں

ظفر اقبال جمے ہوئے خون کو پگھلا کر حرارتوں کے موسم میں بدلنا چاہتے ہیں، لیکن لوہے کے لباس کو شکستہ نہیں کر پاتے۔ ان کی یہ تمام تر جرائتیں اور ان کی مکمل توانائیاں اپنی آواز کو پراثر بنانے میں مصروف رہتی ہیں۔ وہ اپنے آپ سے کیے ہوئے وعدوں کو اور اپنے لوگوں کے بہتر ہونے کی خواہش کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے، اگرچہ اس راستے میں کالے جنگل بھی آتے ہیں اور گہرے دلدل بھی، مگر وہ اپنے جان وتن کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اس سلسلے کے چند شعر اور دیکھیے:

یہ شہر ہے جائیداد اس کی
ہر شخص ہے اب غلام اس کا
تھوڑے ہیں ظفرؔ جناب کے دن
مشہور ہے انتقام اس کا

☆

رگوں میں قید ہے اک عمر سے جو موجۂ خوں
رہا ہو کر وہ سڑکوں پر بکھرنا چاہتا ہے
بہت بیزار ہے دیوار بھی اس کے علاوہ
پرانا پوسٹر خود بھی اترنا چاہتا ہے
ظفرؔ اقبال کچھ سود و زیاں بھی دیکھ اپنا
بھلے مانس یہ تو کس موت مرنا چاہتا ہے

☆

روٹی کپڑا بھی دے مکان بھی دے
اور مجھے جان کی امان بھی دے
زہر کیسا ہے میں بتا بھی سکوں
ذائقہ تو دیا زبان بھی دے

☆

وہ کانچ کانچ بدن چور چور کس کا تھا
سزا سنائیں گے کس کو قصور کس کا تھا

وہ ہاتھ جس نے دوپٹے سروں سے نوچ لیے
جو ہو سکے تو بتانا ضرور کس کا تھا

ہماری خاک پہ عکسِ انا تھا کس کا ظفر
ہمارے خوں سے یہ غسلِ غرور کس کا تھا

اور اس انتخاب کا آخری شعر بھی سن لیجیے:

دامانِ شہ سے دستِ گدا کتنی دور ہے
اے قصرِ شیشہ سنگِ سزا کتنی دور ہے

قصرِ شیشہ سے سنگِ سزا کے فاصلے ازل اور ابد کے فاصلے ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک بے کنار دشت ہے جسے کوئی خضر و سکندر عبور نہیں کر سکا ہے۔ ظفر اقبال نے بھی اپنے سفر کی داستان لکھ دی ہے اور آنے والوں کے لیے اندھیرے راستے پر کچھ چراغ جلا دیے ہیں۔ ''آبِ رواں'' سے ''عہدِ زیاں'' تک اور پھر موجودہ غزلوں تک ان کی کلاسیکیت ہو، جدید حسیت ہو کہ سیاسی و معاشرتی منظر ناموں پر طنز، سب ہی اپنے خصوصی اسلوب میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اسالیب و معنویت کی یہ رنگارنگی اور تخلیقی و شعری سطحوں پر ان کا اظہار ظفر اقبال کی فنی و فکری گرفت کا احساس دلاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہوا ہے کہ قاری کو ان کی کوئی ایک مستحکم جہت یا زندگی کے کسی وسیع تر کینوس کی کوئی یافت نہیں ہو سکی ہے جب کہ ہر اہم شاعر پڑھنے والوں کے لیے اپنا ایک رخ، اپنی ایک سمت اور اپنے ایک منفرد اسلوب کا پتا ضرور دیتا ہے کہ اس طرح خود اس کی پہچان اور اس کے عہد کی شناخت کا دروبست بنتا ہے۔ ''گلافتاب'' کی شاعری میں ظفر اقبال نے نہ صرف خود کو اور اپنے عہد کو دریافت کر لیا ہے، بلکہ ہمیں آئندہ روشنیوں کے ساحل بھی دکھائے ہیں اور شاید یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اگر وہ صرف ''گلافتاب'' ہی لکھ جاتے تو انھیں عہدِ جدید کی شعری روایت سے کاٹ کر کوئی الگ نہیں کر سکتا تھا گلافتاب کے کچھ اور شعر بھی پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ اپنی بات مکمل کر سکوں:

یہ جوروراں ہیں چار سو اتنے دھوئیں کے آدمی
کس لیے چوب شہر کو آگ سے آشنا کروں
شاخ ہلی تو ڈر گیا، دھوپ کھلی تو مر گیا
کاش کبھی تو جیتے جی صبح کا سامنا کروں
سفید سانپ کہ لیٹا ہوا تھا جنگل میں
چمک گیا مری آنکھوں میں راستا ہو کر
سفر سزا تھی، چمک موسموں کی مجبوری
سیاہ گھاس پہ چلنا برہنہ پا ہو کر

☆

آئینۂ آواز میں چمکا کوئی منظر
تصویر سا اک شور مرے کان میں آیا
بے کار ہی جلتا ہوں ظفرؔ ورنہ مجھے کیا
خورشید اگر اس کے گریبان میں آیا

☆

دشت کی آنکھ میں یہ پیاس چمکتی ہی رہی
کہ اڑے سبز کبوتر بھی کبھی باز کے ساتھ
موسموں سے بہت آگے نکل آیا ہوں ظفرؔ
کھل کے مرجھاؤں گا میں اب نئے انداز کے ساتھ

☆

بدلے ہیں آب و خاک نے کتنے ہی پیرہن
یہ عکسِ آسماں ہے کہ ویسا ہی زرد ہے
آنکھوں میں شور و شر ہے بدن کی بسنت کا
میں وہ ہوں جس نے حسن کو دیکھا ہی زرد ہے

☆

وہ دفینہ ہوں کہ مستور ہوں کب سے اب تک
توڑتا ہی نہیں آ کر کوئی دیوار مری
میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

دشت میں کسی آواز کا جھنکار بن جانا پیاسی زمین پر اجلی بارشوں کی بشارت جیسا ہے ظفر اقبال اور گلافتاب دونوں جدید غزل کے نمایندہ ترین استعارے بن گئے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں کے درمیان ظفر اقبال نے تنقید لکھی ہے کالم لکھ رہے ہیں اور بہت سی اچھی شاعری کے کئی کلیات شائع کر چکے ہیں اور چھ نئی کتابوں سے ترتیب دیا ہوا تازہ کلیات ''اب تک'' کے نام سے میرے اور آپ کے سامنے ہے۔

ظفر اقبال نے جدید غزل کا وہ طویل سفر مکمل کر لیا ہے جس کے کینوس پر صرف تین نام لکھے ہوئے ہیں ان میں پہلا نام ظفر اقبال کا ہے۔ ''گلافتاب'' کے بعد ظفر اقبال پھر مختلف ہوئے ہیں لیکن ان کی تبدیلی کسی تھکن یا دہرانے کے عمل کی نہیں ہے۔ ان کی رفتار میں دھیما پن آیا ہے مگر زندگی کے تضادات کے درمیان اقدار کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے وہ پیڑوں کی خنک چھاؤں میں بیٹھے تو ہیں لیکن ان کے خوابوں اور ان کے تجرباتی ارادوں کا سفر رکا نہیں ہے وہ پر چھاؤں کے حصار سے باہر ہیں کہ ظفر اقبال اجلے عکس کو خوش رنگ خوابوں کو تازہ خوشبوؤں کی خواہش کے درمیان رکھے ہوئے ہیں لہجہ واسلوب میں شائستگی کا ریشم بڑھا ہے اور خوش گوار باتوں کا دلچسپ اظہار ان کی غزل کے ذریعے پڑھنے والوں کے ذہن واحساس پر اپنے پورے اثرات کے ساتھ اترتا ہے نئی غزلوں کی چند مثالیں دیکھیے:

ٹکڑے ٹکڑے جو یہ بادل سا بنایا ہوا ہے
یوں کہیں دھوپ ہوئی ہے کہیں سایا ہوا ہے

☆

روشنی رہتی ہے تیری شب بھر
جلتا رہتا ہے بجھایا ہوا تو

☆

خوابوں اور خواہشوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے
آج کل گھر بھی ہے بازار سے ملتا جلتا

☆

خرچ کر سکتے ہو جتنا بھی مجھے کر ڈالو
پھر کسی کام نہ آؤں گا بچایا ہوا میں

☆

میری فطرت ہے کہ روپوش نہیں رہ سکتا
کبھی ہو جاؤں گا ظاہر بھی چھپایا ہوا میں

ظفر اقبال چھپ جانے یا گم ہو جانے والا شاعر نہیں ہے کہ وہ روپوش ہو کر بھی اپنے ظاہر ہونے کی بشارت دیتا رہا ہے اس نے ٹھہر کر بھی چلنے کا ہنر پیدا کیا ہے غزل کی تاریخ میں کوئی دوسرا شاعر نہیں جس نے بار بار نئے اور زندہ تجربوں کی آگ پہنی ہو اور جس نے پتھروں پر چلتے ہوئے تخلیقی فن اور زندگی کی اقدار کو ہم آہنگ کرنے کا منفرد ہنر اختیار کیا ہو شاعری کے زمانے بتاتے ہیں کہ ایسے تجربوں کے درمیان کئی شاعر مسمار ہوئے اور ریت بن کر بگولوں میں تبدیل ہو گئے۔ ظفر اقبال نے صرف لسانی کلیشے کو ہی نہیں توڑا بلکہ اس نے خیال اور تجربے کی یکسانیت کو بدل کر ایک ایسا حرکی اور طلسمی شہر آباد کیا ہے جو نئے چہروں چمکیلی آنکھوں اور تازہ خوابوں کا شہر ہے ظفر اقبال نے اپنی بے پناہ منفرد تجرباتی اور تخلیقی قوت اور بے مثال جمالیاتی شعور کے ساتھ اڑان بھری ہے وہ اڑ کر دیوارِ گریہ تک گئے پھر واپس شہرِ سبا میں اترے مگر ظفر اقبال نے خود رحمی یا خود ترسی کو کبھی نہیں پہنا ظفر اقبال اپنے پورے عہد کے منظر نامے پر اتنی وضاحتوں اور اتنی اہمیتوں کے ساتھ ظاہر ہو چکے ہیں کہ بہت دور تک اور بہت دیر تک اس نوعیت کے کسی شاعر کے آنے کا امکان موجود نہیں رہا ہے۔ ظفر اقبال کی تمام تخلیقی اور تجرباتی انفرادیت کے ساتھ میں انھیں عہدِ جدید کی غزل کا لیجنڈ (Legend) بنتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

◆◆◆

ظفر اقبال کی شاعری میں
الفاظ، لسانی اساطیر نہیں، تخلیقی تجربہ ہیں

گوہر نوشاہی

ظفر اقبال کی غزلیں مختلف رسالوں میں چھپتی رہیں، آپ نے انھیں سنجیدگی سے پڑھا، یا تفنّنِ طبع سمجھ کر، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، لیکن اس قدر وثوق ضرور ہے کہ آپ میں سے اکثر نے اُن کو پڑھا، میں نے اُن کے بارے میں اپنے بزرگوں سے طرح طرح کے جملے سنے، دوستوں میں سے اکثر کو اُن پر ہنستے دیکھا، اور وضع داروں میں سے بیشتر کو انھیں بے معنی قرار دیتے ہوئے پایا۔ یہ سب لوگ ایک ایسی ذہنیت کے نمایندہ ہیں جن کے ادبی اور لسانی معیارات نئی اقدار کی بساط پر پٹے ہوئے مہروں کے برابر ہیں۔

لسانی معیارات کا ذکر آیا ہے تو اس جگہ میں اپنی پوزیشن پہلے ہی واضح کر دوں کہ مجھے لفظوں کے نفسیاتی عمل اور انسانی ذہن پر اُن کے منطقی اور مافوق الفطرت اثرات سے کچھ زیادہ آگاہی نہیں، میں تو لفظ کو اندرونی تجربہ سمجھتا ہوں۔ سماجی تعلقات کے لیے بھی ذہنی تجربے داخلی اور جذباتی تجربوں کے بعد ہی نمو پاتے ہیں۔ میں لفظ کو آسمان سے نازل ہونے والا عقیدہ نہیں سمجھتا، اور نہ ہی دوسرے ملک سے درآمد ہونے والا فیشن جانتا ہوں۔ لفظ تو اِن جذباتی رشتوں اور جسمانی قربتوں کی تخلیق ہے جو ہمارے جسم کو لاموجود سے موجود کی طرف راغب کرتی ہے، اور موجود کی تعریف میرے نزدیک بہت سیدھی سی یہ ہے کہ جس میں قربت ہے، براہِ راست تعلق ہے وہ وجود ہے، اور جو بُعد ہے، تجرید ہے یا عقیدہ ہے وہ موجود نہیں ہے اور میرے نزدیک لفظ کا سب سے

اہم وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہمیں موجود کا علم دیتا ہے، موجود کا علم وجود کی معرفت ہے اور وجود کی معرفت میں عقیدوں اور علم الغیب کو ذہنی اور جغرافیائی عوامل سے اوّلیت دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

اب ہم اِس جگہ پر آ گئے ہیں جہاں ہمارے ساتھ تین حقیقتیں گفتگو کر رہی ہیں۔ پہلی لفظ، دوسری وجود اور تیسری زمین۔ یہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح منسلک اور لازم وملزوم ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ عقیدے کا مسئلہ الگ ہے کہ آپ پاکستان میں بیٹھے ہوئے راوی اور چناب کا پانی پیتے ہوئے، سیمرغ اور ترکِ شیرازی سے عشق کریں اور آپ کا کیا ہے۔ آپ نے تو زبان کی صفائی کے معیارات کارپوریشن کے کاغذات میں پڑھے ہیں، اُنھیں کے تحت شاعری کی تربیت حاصل کی ہے اور اب اُن سے سرِمو انحراف آپ کے نزدیک کلمۂ کفر کے برابر ہے۔

تو میں زبان کے بارے میں لفظ، وجود اور زمین کے باہمی تعلقات پر گفتگو کر رہا تھا۔ میرے نزدیک ان تینوں کی ہم آہنگی ہی لفظ کو شعری تجربے میں کوئی اہم مقام دے سکتی ہے۔ وہ الفاظ جن میں وجود اور زمین کی قربت نہیں ہے، بیگار میں آئے ہوئے کارندے ہیں، کل کے گھوڑے ہیں، زندگی تو جذباتی لگاؤ کا نام ہے۔ بیگار میں آئے ہوئے کارندوں کو جذباتی لگاؤ سے کیا مناسبت، اور بے رُوح اور غیر جذباتی کارکنوں کا ادب میں کیا مقام؟

ظفؔر اقبال کی شاعری میں مجھے بے شمار خصوصیت کی بنا پر پسند ہے، ان سب پر گفتگو کسی دوسرے موقع پر کروں گا۔ اس وقت مجھے صرف اس اتحادِ ثلاثہ کا تذکرہ کرنا ہے جو اِس شاعری کو پہلے کی شاعری سے الگ کرتا ہے اور جس کی بنا پر افتخار جالبؔ کا ہم زبانؔ ہو کر میں ظفؔر اقبال کو صاحبِ عہد شاعر کہتا ہوں۔ اتحادِ ثلاثہ...... لفظ...... وجود...... زمین۔

ظفؔر اقبال کی شاعری میں الفاظ، لسانی اساطیر نہیں، تخلیقی تجربہ ہیں۔ یہ کس نے کہا کہ تخلیقی تجربہ معلوم اور مانوس چیزوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ یا یہ بات کس کے منہ سے نکلی کہ تجربہ معلوم روزمرہ کولھو کے بیل والی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم اکثر چیزوں کو بھول چکے ہوتے ہیں اور وہ ہمیں دوبارہ یاد آ جاتی ہیں تو اس میں ہمارے حافظے کا قصور ہے۔ اس حافظے کے نقص کو تخلیقی عمل کہنا کہاں کا انصاف ہے؟ اسی طرح معلوم چیزوں کے راستے تبدیل کرنا

تخلیقی فن کار کا کام نہیں، سرکس کے مداری کا وظیفہ ہے۔ تخلیقی تجربہ فنکار کی ذات کا اظہار ہے جو موجودہ ''اب'' (Present Now) کی تربیت زمین پر جغرافیائی تفسیرات کے تحت ہوئی، وہ ذات جو اپنی وراثت میں جسم اور زمین کو منہا نہیں کرتی، زمینی اور جغرافیائی اثرات، جسمانی مزاج کو پھر جسمانی مزاج یا لذتیں سانس کی در و بست کو اور سانس کی در و بست لفظ کو جنم دیتی ہے، پھر لفظوں کو عقیدے کا مسئلہ سمجھنا، ہوا میں تیر چھوڑنے کے برابر نہیں تو اور کیا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری میں استعمال ہونے والا لفظ اس زمین کے ساتھ وابستہ ہے جس نے ظفر اقبال کو جنم دیا ہے۔ پنجاب کی مٹی کا یہ المیہ رہا ہے کہ اسے پانو کا آشوب نصیب نہیں ہوا۔ خواہ وہ پانو کا آشوب حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پیدا ہو یا عقیدوں میں بسنے والے مصنوعی اور ہوا میں اُڑنے والے بے وزن جسموں کے منفی ردِعمل سے۔ پنجاب کی مٹی اپنا حق مانگتی ہے اور اپنے لفظ کو اپنے سے پیدا ہونے والے جسم کو بہ طور روایت سپرد کرنا چاہتی ہے۔

ظفر اقبال کے ہاں لسانی تشکیلات کا عمل ہماری کلاسیکی تنقید کی اصطلاح میں ''ندرتِ بیان'' سے بہتر طور پر واضح کیا جا سکتا ہے۔ ندرتِ بیان سے غالباً ان کی مراد یہ تھی کہ شعر میں الفاظ کا تخلیقی عمل، معانی اور تجربے کی نئی نئی راہیں دریافت کرتا ہوا نظر آئے۔ ظفر اقبال کے ہاں قدرتِ کلام کے نمونے دیکھیے:

شاخ ہلی تو ڈر گیا، دھوپ کھلی تو مر گیا
کاش کبھی تو جیتے جی صبح کا سامنا کروں

☆

بدن جنگلوں کی صدا سو گئی
رم شعلہ دم قدم بھی گیا

☆

بکھرے گا راز رنگ کھلے آسماں پر
نکھرے گا ناز نقش برابر کی دھوپ میں

☆

تن طغیانی تہ بہ تہ نیند نوا چپ چانگی
لہر اتہر کناروں میں در دیوار الانگی
سانپ سُرخ سلواریا ریتگ ریٹ رنگ روغنی
اُڑ انکار الف ادا ریت، ردا نم نانگی
لکھ لُٹ لاٹ لُٹا کس چکھ چٹ چاٹ چٹا کسی
سٹ سنجوگ سہاولا نٹ کھٹ رٹ جٹ جانگی
تھک تھڑتھئی تھر تھر تھرک تھال تھپک تھن تھوتھنا
تھوڑ تھڑی تھم تھامنی تھپ تھیلی تھک تھانگی

آپ کو اِن اشعار کی لسانی اور صوتی دروبست سے شدید اختلاف ہوگا۔ آپ سچ کہتے ہیں، اس لیے کہ آپ کے کانوں کو زُود فہم لسانی استعارے کی تربیت حاصل ہے۔ لیکن کیا زُود فہم لسانی، استعارے جو ہماری روزمرہ میکانکی زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں، شاعری ہیں۔ آپ کو ظفر اقبال کے مصرعوں میں چ اور تھ کی اجنبی زنجیروں سے گھبراہٹ محسوس ہوگی، لیکن اپنے کلاسیکی شاعروں کے ایسے اشعار پر کہ:

وہاں دیکھے کئی طفل پری زاد
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

آپ کو کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ آپ ان سب باتوں کو چھوڑیں، اچھا شاعر لفظ کے استعمال میں اس بات کا پابند نہیں ہے کہ کون کس طرح بندش پسند کرتا ہے۔ میں آپ سے ایک سوال بڑے ادب سے کرتا ہوں اور وہ یہ کہ کلاسیکی موسیقی میں طبلے کی تالیں اور راگوں کے جو سرگم موجود ہیں، اُن کے الفاظ کیا بے معنی ہیں؟ اگر وہ الفاظ بے معنی ہیں تو آپ کا سارا ذوق بے معنی ہے۔ روپک تال کے بول اس وقت مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

پہلا رُوپ: دھن دھک دھن دھک

دوسرا رُوپ: دھن تک دھین نا۔ دھین دھین نا۔ تین تک تین نا دھین دھین تا۔

تیسرا رُوپ: دھی دھا تیرک۔ دھی دھی دھا ترک۔

موسیقی میں جس کیفیت کا نام رس ہے، وہ انھیں لفظوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ میر درد کی غزلوں یا منزلِ شب کی شاعری کے ساتھ نہیں۔ موسیقی کے وہ بول جو آپ کو سمجھ آ جاتے ہیں، فنکار کا تجربہ ان میں ہاتھ پاؤں توڑ کر اور اپنی شکل و صورت مسخ کر کے داخل ہوتا ہے۔ صاحبِ عہد موسیقاروں اور صاحبِ عہد شاعروں میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے کہ وہ اظہار کے پیمانوں میں زندگی کے روایتی رشتوں سے آزاد ہوتے ہیں اور قدرتِ کلام اس چیز کا نام ہے کہ فن کار اپنے اندرونی تجربے کو بیرونِ ذات حقیقت بناتے ہوئے اس کی صورت مسخ نہ ہونے دے۔

اور اب ندرتِ بیان کے چند نمونے پیشِ خدمت ہیں:

غزل دکھ شور ہے اندر پرانا
بہت گونجے گا یہ پیکر پرانا
وہی ہے حسرتِ منزل دلودل
وہی سہے راہ رک پتھر پرانا
کبھی امید سے آزاد ہوں گے
کبھی بدلاں گے یہ پیکر پرانا

☆

خالی خولی غبار نکلیا
اس خاک سے جو سوار نکلیا
آیا جب دوسرا کنارا
دریا دریا کے پار نکلیا

☆

اُڑتا ہویا عکس دیکھتے ہی
پھیلیا ہویا دام ہو گیا میں

☆

دلدّر درمیاں دلدارنے کا
تلغ تنہا الف انکارنے کا
امشکل پیروی انجان ایجاد
تگن میتھنڈ عجب اشعارنے کا

آپ کو ان اشعار پر سب سے پہلا اعتراض تو یہ ہوگا کہ دلدول، راہ رُک، بدلاں گے، نکلیا، دلدارنا جیسے الفاظ کیوں استعمال ہوئے ہیں، جن کا اُردو کی روایتی شاعری میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ تو اِس کا جواب دینے کے بجائے میں خود آپ ہی سے ایک سوال کیوں نہ پوچھ لوں کہ لکھنؤ والے جگہ کو جاگہ کیوں کہتے ہیں۔ دلی والے لفظوں کو درباری پن سے کیوں ادا کرتے ہیں۔ ولی کی شاعری میں کہنا کے بجائے بولنا، پاس کے بجائے کنے، رومال کے بجائے پنکا، کولھو کے بجائے گھان، بہت کے بجائے بوت، کی طرح کے بجائے غن کا استعمال کیوں ہوا ہے۔ اگر دلی، دکن اور لکھنؤ کے ادب میں، مقامی روزمرہ کے استعمال اور اِس روزمرہ کے درمیان شدید اختلاف کے باوجود شاعری شاعری ہی رہتی ہے۔ تو ظفر اقبال کے ہاں 'بدلیں گے'، کے بجائے 'بدلاں گے'، یا 'راہ روکنے والے'، کے بجائے 'راہ رُک' استعمال ہوگا، تو اِس سے اُردو زبان کس طرح ضعیف ہوگئی۔ بہرحال یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر آپ کو خود ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے۔ میں تو صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ظفر اقبال اِن لفظوں کو استعمال کرنے کے باوجود اُردو ہی لکھ رہا ہے اور دلی اور لکھنؤ کے محاورے کی نقل اُتارنے کے بجائے پنجاب کے روزمرہ کو استعمال کر کے زیادہ ادبی دیانت داری کا ثبوت دے رہا ہے اور ابھی تو ظفر اقبال روایت کی گرفت سے بہت کم آزاد ہوسکا ہے:

غزل میں تھے بہت آزادہ رو ظفر لیکن
تلازمات کی زنجیر سے رہا نہ ہوئے

تلازمات کا طوق گلے میں پہننے سے ظفر کو کیا فائدہ ہوا؟ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اچھا ہوتا اگر وہ اس قید سے بھی آزاد ہو جاتا۔ یاروں نے اب اتنے نہیں بخشا تو پھر اس سے زیادہ کیا کر لیتے۔

ظفر کے اشعار پر ایک اعتراض یہ کیا جائے گا، کہ صاحب! یہ شاعر، اضافتوں، حروف اضافت اور بعض دوسرے مواقع پر "الف" کو استعمال کیوں کرتا ہے؟ مثال کے طور پر:

میں بھی شریکِ مرگ ہوں مر میرے سامنے
میرے سدا اُپھول بکھر میرے سامنے
کہتے نہیں ہیں اس اکھن میرے آس پاس
دیتے نہیں ہیں اس اکبر میرے سامنے

☆

پتھر کے پانو دھو رہیا تھا
پانی ابہام ہو گیا میں

تو یہ ایک انفرادی تجربہ ہے، جو صرف ظفر اقبال کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے۔ اگر آپ نے اس ایک آدمی کے تجربے کو چیلنج کر دیا تو وہ آپ کی ساری شاعری کو چیلنج کر دے گا۔ بہتر یہ ہے کہ جہاں آپ نے پہلے اس قدر لسانی تجربات کی مصیبتیں گلے ڈال رکھی ہیں، اور ان سے اُردو زبان میں کوئی غلاظت پیدا نہیں ہوئی تو ایک اور سہی۔ ممکن ہے یہ بھی اپنی حیثیت منوالے۔ یونہی چیں بچیں ہونے سے نہ آپ نئے تجربے کو روک سکتے ہیں اور نہ وہ رک سکتا ہے اور آخر میں آپ کو صرف دو مشورے دے کر اجازت چاہتا ہوں۔

1- اگر کلاسیکی لسانی اساطیر آپ کے عقیدے کا حصہ ہیں تو یہ شاعری آپ کے لیے نہیں، کیوں کہ یہ آپ کو گزشتہ تمام شعری تربیت پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کرے گی۔

2- اگر آپ کو اس بات پر یقین ہے کہ نیا تجربہ آپ کی ذہنی اور ادبی عمر میں اضافہ کرے گا تو "گلافتاب" کو بھی پڑھ لیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسے پڑھنے کے بعد بھی آپ مسلمان ہی رہیں گے اور آپ کی وضع داری میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔

◆◆◆

محتاج بہت اپنی طبیعت بھی نہیں تھی
کچھ اُس کو محبت کی ضرورت بھی نہیں تھی

جو ہو نہ سکا اور جو ہوتا رہا، جس پر
حیرت بھی نہیں تھی مجھے حسرت بھی نہیں تھی

پیڑوں کی خنک چھاؤں میں ہی بیٹھ رہا میں
درپیش مجھے اتنی مسافت بھی نہیں تھی

اُس کا بھی حساب آج مجھے دینا پڑا ہے
جس کام میں کچھ میری شراکت بھی نہیں تھی

جتنا یہاں کہرام مچا رکھا ہے دل نے
اُس شوخ سے کچھ اتنی شکایت بھی نہیں تھی

مصروف ہوں میں کچھ بھی نہ کرنے میں شب و روز
بے کار بھی تھا اور مجھے فرصت بھی نہیں تھی

کچھ میں بھی رہا گرمیٔ بازار سے ہٹ کر
جو اُس نے ادا کی مری قیمت بھی نہیں تھی

چھایا ہوا سا، اور، دھڑکتی ہوئی دل میں
موسم بھی نہیں تھا، وہ محبت بھی نہیں تھی

وہ وقت بھی تھا خوب، ظفرؔ جب مرے دل سے
غائب تھا ہر اک رنج تو راحت بھی نہیں تھی

دل کی تختی سے مٹایا ہُوا تُو
یاد آتا ہے بھلایا ہُوا تُو

روشنی رہتی ہے تیری شب بھر
جلتا رہتا ہے بجھایا ہُوا تُو

میں کہیں اور تجھے ڈھونڈتا ہوں
ہے کہیں اور چھپایا ہُوا تُو

میرے دل سے نہ برآمد ہو جائے
اتنی محنت سے چُرایا ہُوا تُو

خرچ کرتا ہوں کفایت سے تجھے
کام آئے گا بچایا ہُوا تُو

تُو جو پہلے بھی نہیں تھا اپنا
اب ہوا کیا جو پرایا ہُوا تُو

پھر وہی سامنے آ جاتا ہے
میرے رستے سے مٹایا ہُوا تُو

رنگ ہے کوئی ہمیشہ کے لیے
میرے چہرے سے اُڑایا ہُوا تُو

چاہتا کچھ بھی نہیں تجھ سے ظفرؔ
کس تکبّر میں ہے آیا ہُوا تُو

جو اِس طرح سے نہ کرتا تو اور کیا کرتا
وہ میرے ساتھ بھلا کس لیے وفا کرتا

اُٹھا رکھا ہے محبت کا بوجھ اکیلے ہی
خیال تھا کہ ذرا تُو بھی آسرا کرتا

جہاں سے تیرے گزرنے کا شک بھی ہوا ے کاش
غبار بن کے میں اُس راہ سے اُٹھا کرتا

کبھی تو یہ بھی عبادت نصیب میں ہوتی
میں تیرے ساتھ لپٹ کر خُدا خُدا کرتا

یہ رنج و غم بھی گزر جائیں گے کبھی نہ کبھی
اِسی خیال سے دن رات خوش رہا کرتا

خطر نہ تھا مجھے آفاتِ آسمانی سے
کہیں میں شہر کے لوگوں سے ہی بچا کرتا

مجھے کچھ اور بھی مہلت اگر ملی ہوتی
میں ناروا کو بھی سو طرح سے روا کرتا

میں کوئی خواب کسی خاک میں ملاتے ہوئے
میں کوئی خواب کسی خاک سے جُدا کرتا

بہت غلط ہی سہی کام یہ، ظفرؔ، لیکن
اِسے جو ایک نہ کرتا تو دوسرا کرتا

اجنبی پن ہے سروکار سے مِلتا جُلتا
کوئی انکار تھا اقرار سے مِلتا جُلتا

محض بے سود ہے دریائے محبت کا عبور
کہ ہے اُس پار بھی اِس پار سے مِلتا جُلتا

ہیبتِ حُسن میں یکتا و یگانہ ہی سہی
ہو بھی سکتا ہے وہ دو چار سے مِلتا جُلتا

اُس کے ہونے کی عجب سی جو یہ سرشاری ہے
لُطف ہے یہ بھی کچھ آزار سے مِلتا جُلتا

خود ہی کشتی کو جو لے جاتا ہے ساحل کی طرف
موجۂ خواب ہے پتوار سے مِلتا جُلتا

خوابوں اور خواہشوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے
آج کل گھر بھی ہے بازار سے مِلتا جُلتا

کہیں پرچھائیں نہ پتّے، نہ پرندے تھے، مگر
کوئی منظر تھا وہ اشجار سے مِلتا جُلتا

جس خرابے میں مجھے کب سے لیے پھرتے ہو
یہ تو ہے میرے ہی آثار سے مِلتا جُلتا

خامشی بھی تو، ظفرؔ، اپنی زباں رکھتی ہے
ہے ہُنر یہ بھی کچھ اظہار سے مِلتا جُلتا

ٹکڑے ٹکڑے جو یہ بادل سا بنایا ہُوا ہے
یوں کہیں دھوپ ہوئی ہے، کہیں سایا ہُوا ہے

دل کے اندر دھڑک اُٹھتا ہے کہیں رہ رہ کر
اپنی جانب سے جسے ہم نے بھُلایا ہُوا ہے

اپنی یہ شانِ بغاوت کوئی دیکھے آ کر
منہ سے انکار بھی ہے، سر بھی جھکایا ہُوا ہے

اِس ملاقات کا ہے کوئی مزہ ہی کچھ اور
ہم بھی موجود ہیں، وہ یاد بھی آیا ہُوا ہے

کسی کونے میں الگ بیٹھ کے رو لیتے ہیں
تُو نہیں بھی ہے تو کیا، کام چلایا ہُوا ہے

اب کہیں بھی تو یہ دل باز کہاں آئے گا
اسے اِس راہ پہ خود ہی تو لگایا ہُوا ہے

بات کیا ہے کہ بھرے جاتے ہیں قسطیں اب تک
ہم نے یہ قرض اگر کب کا چکایا ہُوا ہے

کیا تماشا ہے کہ یوں ایک بھلے مانس کو
آپ نے مفت میں دیوانہ بنایا ہُوا ہے

ہے توکّل بھی کوئی چیز محبت میں، ظفرؔ
خرچ کر ڈالیے وہ بھی جو بچایا ہُوا ہے

آسماں سے اُتارتا ہوں تجھے
اور، خود سے گزارتا ہوں تجھے

کیا محبت ہے، کیا مصیبت ہے
یہ جو ہر دم سہارتا ہوں تجھے

کھیل کیسا ہے یہ کہ میں ہر روز
جیتنے میں بھی ہارتا ہوں تجھے

خاک ہے دشتِ دل میں چاروں طرف
خاک ہی سے نکھارتا ہوں تجھے

سینکڑوں میل دور رہ کر بھی
کیا بناتا، سنوارتا ہوں تجھے

کوئی دیوار چاہیے مجھ کو
اندر اندر اُسارتا ہوں تجھے

تیرے ہی پانیوں میں شام و سحر
ڈوب کر خود اُبھارتا ہوں تجھے

تُو بھی آواز سُن نہ پائے مری
اس طرح سے پکارتا ہوں تجھے

وہی کرتا ہے آ کے زندہ، ظفرؔ
میں تو ہر روز مارتا ہوں تجھے

چھوڑنے کے لیے گھر بار بہت کام آیا
اور، یہ مرحلہ ہر بار بہت کام آیا

خود کو ترتیب دیا آخرکار از سرِ نو
زندگی میں ترا انکار بہت کام آیا

زندگی یوں بھی اندھیروں میں گزر ہی جاتی
وہ چراغِ لب و رُخسار بہت کام آیا

دل نے بہلائے رکھا قصہ طرازی سے ہمیں
یوں تمھارا یہ طرف دار بہت کام آیا

مستقل ایک تغافل ہی رکھا اُس نے شعار
اور، اُس کے یہ لگاتار بہت کام آیا

راستہ ہے، ترے گھر ہی کی طرف جاتا ہے
یہ بہانہ سرِ بازار بہت کام آیا

دیکھا دیکھی سب اِسی راستے پر چل نکلے
زاہدوں کے یہ گنہگار بہت کام آیا

پھر ہُوا یوں کہ کہیں اُڑ گئی خوشبو ساری
کوئی دن یہ گلِ گفتار بہت کام آیا

آپ بھی آ کے ظفرؔ سے جو پکڑتے عبرت
اپنے جیسوں کے یہ بے کار بہت کام آیا

میرے اندر سے گزارا ہُوا تُو
ایک ہی بار دوبارہ ہُوا تُو

چاند سورج ہیں جدا ہی تیرے
کس فلک سے ہے اُتارا ہُوا تُو

فاصلے قدر بڑھا دیتے ہیں
دُور سے اور بھی پیارا ہُوا تُو

کوئی سمجھا نہیں جس کو اب تک
ایک مبہم سا اشارہ ہُوا تُو

راستہ بھولا ہوا ہوں ب سے
میرا جس رات ستارہ ہُوا تُو

عجز کے زور پہ جیتا ہُوا میں
اور، پندار کا مارا ہُوا تُو

دیکھ سکتے نہیں تجھ کو اب تو
نہ ہی سنتا ہے پکارا ہُوا تُو

دوستی بھی ہوئی حد سے بڑھ کر
اور دشمن بھی ہمارا ہُوا تُو

تیرا دریا تھا کہیں اور، ظفرؔ
جا کہیں اور کنارہ ہُوا تُو

نہ اندھیرا، نہ اُجالا ہُوا تُو
میرے اندر سے نکالا ہُوا تُو

کہیں گم ہو گیا آخر مجھ سے
ایک مدّت کا سنبھالا ہُوا تُو

سبھی لگتے تھے پرانے یکسر
جب نیا اور نرالا ہُوا تُو

دُور ہوتا گیا اِن آنکھوں سے
جب ذرا دیکھنے والا ہُوا تُو

کوئی پتھر سا ڈبویا ہُوا میں
موج سا کوئی اُچھالا ہُوا تُو

نقش سب کو ہوئے ازبر تیرے
کہیں دیکھا ہے نہ بھالا ہُوا تُو

کھو گئی ہو کہیں چابی جس کی
بند اِس طرح کا تالا ہُوا تُو

کن فضاؤں سے اُتارا ہُوا ہے
کن ہواؤں کا ہے پالا ہُوا تُو

خاص نسبت تھی ظفرؔ سے تجھ کو
کیوں نہ پھر اُس کا حوالہ ہُوا تُو

یہ جو کھویا ہوا لگتا ہوں نہ پایا ہُوا میں
ہوں کسی چیز میں کچھ اور ملایا ہُوا میں

کیا کروں گا جو مرے پاؤں زمیں میں گڑ جائیں
کہاں جاؤں گا ترے سامنے آیا ہُوا میں

سوچتا ہوں تری محفل میں پہنچ کر کہ یہاں
آپ آیا ہُوا ہوں یا کہ بلایا ہُوا میں

اتنے خوش خوش نہ پھرو، وقت بدل سکتا ہے
یاد آؤں گا کسی روز بھلایا ہُوا میں

رات بھر دیکھتا ہوں راہ کسی کی بے کار
اور، پڑا رہتا ہوں بستر سا بچھایا ہُوا میں

خرچ کر سکتے ہو جتنا بھی مجھے کر ڈالو
پھر کسی کام نہ آؤں گا بچایا ہُوا میں

یہ دُھواں سا جو مرے سر سے ابھی اُٹھتا ہے
دیکھنا جل نہ اُٹھوں پھر سے، بجھایا ہُوا میں

کیا کیا جانے کہ پھر سامنے آجاتا ہے
دوست احباب کا رستے سے ہٹایا ہُوا میں

مری فطرت ہے کہ روپوش نہیں رہ سکتا
کبھی ہو جاؤں گا ظاہر بھی چھپایا ہُوا میں

ماندگی میں ترے پتھر پہ جبیں رکھ سکتا
یا یہ سامانِ سفر اور کہیں رکھ سکتا

میں جو بے دخل ہُوا باغ بدن سے تیرے
کچھ علاقہ تو کہیں زیرِ نگیں رکھ سکتا

عجز اپنا ترے پندار سے کرتا دوچار
آسمانوں پہ ترے اپنی زمیں رکھ سکتا

کہیں چھوڑ آیا ہوں یادوں کی پرانی گٹھڑی
میرا کیا لیتی اگر اُس کو یہیں رکھ سکتا

روشنی کچھ مرے اندر بھی سفر کر جاتی
شمعِ رُخسار اگر اور قریں رکھ سکتا

خود کو خالی جو کیا تھا کسی مجبوری سے
سر میں سودا ہی کوئی اپنے تئیں رکھ سکتا

زندگی میں کوئی ترتیب تو رہتی باقی
جو اُٹھایا تھا جہاں سے بھی، وہیں رکھ سکتا

اُس کے لوگوں سے کوئی رابطہ رہتا ہی ضرور
میں اگر شہر کے ہونے کا یقیں رکھ سکتا

میں نے اب تک تو بچایا ہے محبت کو، ظفرؔ
اور اب میں اِسے محفوظ نہیں رکھ سکتا

دل کے تری تحریر مٹا دیتا ہوں اکثر
قصہ یہ زبانی ہی سنا دیتا ہوں اکثر

حصے سے بھی کم تر مجھے ملتی ہے محبت
اُس میں سے بھی تھوڑی سی بچا دیتا ہوں اکثر

جو بات بتانی ہے، کسی سے نہیں کہتا
جو سب سے چھپانی ہے بتا دیتا ہوں اکثر

بے کار پڑے رہنا ہی رہتا ہے مجھے یاد
جو کام بتاتے ہیں، بھلا دیتا ہوں اکثر

اِس طرح کہ دونوں کی سمجھ کچھ بھی نہ آئے
تصویر پہ تصویر بنا دیتا ہوں اکثر

دریا کو اگر پار نہ کر پاؤں کسی طور
میں دونوں کناروں کو ملا دیتا ہوں اکثر

اک رنج سے رکھتا ہوں شبِ تار کو روشن
اور، سارے چراغوں کو بجھا دیتا ہوں اکثر

اک عمر ہوئی ہے جہاں کوئی نہیں رہتا
ایک ایسی گلی میں بھی صدا دیتا ہوں اکثر

آگے نہیں بڑھتا ہوں، ظفرؔ، آپ ہی، ورنہ
دیوار تو رستے سے ہٹا دیتا ہوں اکثر

کبھی سوارِ سمندِ سفر تو آ کسی دن
ترس گئی ہیں یہ آنکھیں، نظر تو آ کسی دن

کہ ہو سکے تجھے اندر کا حال بھی معلوم
کہیں دریچۂ دل سے گزر تو آ کسی دن

وہ ایک بار کا آنا بھی کوئی آنا نہیں
کسی حساب سے بارِ دگر تو آ کسی دن

ابھی تو ہم نے تجھے ہر طرف سے دیکھنا ہے
گھڑی ہی بھر کو سہی، سر بہ سر تو آ کسی دن

یہ شہرِ خواب ترا منتظر ہے مدّت سے
ہوا کی طرح یہاں در بہ در تو آ کسی دن

جو اتنا نفع کمایا ہے اہلِ دنیا سے
ہماری سمت اُٹھا کر ضرر تو آ کسی دن

یہ ہونے والا ہے لوگوں کے ساتھ کیا کیا کچھ
جو چاہیے کوئی تازہ خبر تو آ کسی دن

ہم اپنے آپ سے رہتے ہیں ڈوبہ ڈو کیا کیا
یہ دیکھنا ہے تماشا اگر تو آ کسی دن

تلاش اُس کی بھی لازم سہی، ظفرؔ، لیکن
زمانے ہوگئے ہیں، یار، گھر تو آ کسی دن

●

اپنا نہیں کچھ بھی تو پرایا ہی بہت ہے
آنکھیں ہی بہت ہیں، یہ تماشا ہی بہت ہے

پھر کیا ہے جو وہ شوخ ہمارا نہیں ہوتا
ہم ہو گئے ہیں اُس کے تو اتنا ہی بہت ہے

یہ عمر زیادہ طلبی کی بھی نہیں اب
ہوتا ہے گزارہ تو گزارہ ہی بہت ہے

پانی نہ سہی، شور تو دیتا ہے سنائی
چڑھتا ہُوا یہ دُور کا دریا ہی بہت ہے

ہم ہیں کہ سرِراہ اِسی کام میں لگ جائیں
کیا کیجیے، رونا ہمیں آتا ہی بہت ہے

ہوتی ہے محبت میں قناعت بھی کوئی چیز
ویسا نہیں موجود تو ایسا ہی بہت ہے

کچھ ہم بھی خریداروں میں شامل تو ہیں، لیکن
سودا یہ ترے حسن کا مہنگا ہی بہت ہے

کچھ ڈوب کے مرنے کو سمندر نہیں درکار
ہو پختہ ارادہ تو کنارا ہی بہت ہے

کچھ سمت ہی سُوجھے، ظفؔر، اِس تیرہ شبی میں
سورج نہیں ملتا تو ستارہ ہی بہت ہے

حدِ سفر مری کیا ہے، تجھے بتا سکتا
یہ بارِ دوش اگر اور بھی اُٹھا سکتا

سخن جو تُو نے کیے رات رات بھر مجھ سے
کبھی کبھار تجھے یاد تو دِلا سکتا

وہ ہاتھ چُومنا تو خیر تھا ہی ناممکن
میں ایک بار اُنھیں آنکھوں سے ہی لگا سکتا

تری فضا میں اندھیرا سا جگمگاتے ہوئے
تری ہوا میں ذرا اور سرسرا سکتا

جو ناؤ خود ہی رواں ہو گئی بھنور کی طرف
میں ڈوبنے سے اُسے کس طرح بچا سکتا

سبق پڑھائے ہوئے تیرے بھول سکتا میں
لکھا ہُوا ہے جو دیوار پر، مٹا سکتا

یہ حالی تو مرا ہونا ہی تھا محبت میں
جو خرچ کرتا ہوں اتنا تو میں کما سکتا

بنی ہے جو مری لاحاصلی کے ریشم سے
کسی دن آ کے وہ چادر تجھے اُڑھا سکتا

یہ گھر بھی جیسے مرے انتظار میں ہے ظفرؔ
جہاں میں جا نہیں سکتا وہاں سے آ سکتا

بے مقصد و بے فائدہ زحمت ہی کیے جائیں
لازم تو نہیں ہے کہ محبت ہی کیے جائیں

اللہ کا گھر گرچہ ذرا دُور تھا، لیکن
آئے ہیں تو اُس بُت کی شکایت ہی کیے جائیں

یہ شوقِ ملاقات بھی خطروں سے ہے دوچار
کافی ہے اگر اِس کی حفاظت ہی کیے جائیں

ٹھہریں تو ذرا جلسہ گہِ خواب سے باہر
ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ شرکت ہی کیے جائیں

آتے ہیں کئی اِس کے علاوہ بھی ہمیں کام
یہ کیا ہے کہ ہم آپ کی عزت ہی کیے جائیں

یہ مقبرہ ہے میری محبت کا اِدھر سے
گزریں جو کبھی اس کی زیارت ہی کیے جائیں

وعدوں پہ بھی جی سکتا ہوں، جھوٹے ہوں کہ سچے
بے شک وہ مرے ساتھ سیاست ہی کیے جائیں

کل تک جو رہا اپنے لیے، باعثِ توقیر
اُس کام پہ اظہارِ ندامت ہی کیے جائیں

جاتے ہیں سفر پر تو، ظفرؔ، دل سے کسی طور
اک مفت کے مہمان کو رخصت ہی کیے جائیں

ہوتا رہتا ہے گزارہ کہ یہی کافی ہے
یعنی اشیائے ضرورت میں کمی کافی ہے

دل کو رہتی ہے جو اکثر یہ پریشانی سی
کبھی کم پڑتی ہے یکسر تو کبھی کافی ہے

سوچتے رہتے ہیں اُس کو، یہ محبت ہے اگر
اپنے حصے کی یہی تھی تو یہی کافی ہے

دھند ایسی ہے کہ آگے نہیں بڑھنے دیتی
سو، یہ دیوار سی رستے میں کھڑی کافی ہے

یاد آتی ہے محبت وہ پُرانی بھی بہت
حق تو یہ ہے کہ مصیبت یہ نئی کافی ہے

تیری قربت سے بھی کیا ہے ابھی لینا دینا
کہ سرِدست یہ بے گانہ روی کافی ہے

کچھ بتاتے ہی نہیں شرم کے مارے، ورنہ
چوٹ اِس بار لگی ہے تو لگی کافی ہے

اپنے ہی ساتھ ہُوا بیٹھنا اُٹھنا اپنا
اور، صحبت یہ بُری ہو کہ بھلی، کافی ہے

دل کو خوراک تو کچھ ملتی ہی رہتی ہے ظفرؔ
بے رُخی اتنی زیادہ نہ سہی، کافی ہے

آئینے پہ اتنا جو غبار آیا ہُوا ہے
کیسا یہ طبیعت میں نکھار آیا ہُوا ہے

سر پر سے جھٹک دی ہے کسی رنج کی گٹھڑی
آساں ہے سفر، اور قرار آیا ہُوا ہے

مہکے ہوئے سے ہیں جو فراغت کے یہ گل پھول
ہر سمت عجب رنگِ بہار آیا ہُوا ہے

اِس درجہ سہولت سے رواں ہے جو مسافر
ہر مرحلۂ سخت گزار آیا ہُوا ہے

پانی بھی ہے خاموش، کنارے بھی سلامت
دریائے محبت میں اُتار آیا ہُوا ہے

روکی ہُوئی ہے خود کوئی چلتی ہُوئی تصویر
منظر کوئی بے نقش و نگار آیا ہُوا ہے

ہر طرح کے خواب اور خیالات سے خالی
کیا سلسلۂ لیل و نہار آیا ہُوا ہے

کچھ رہ گیا ہے دُور حماقت کا زمانہ
کچھ عقل کے اندر بھی سدھار آیا ہُوا ہے

بُھولا ہوا ہے شہر کا نقشہ ہی ظفرؔ کو
حالاں کہ یہاں وہ کئی بار آیا ہُوا ہے

اک عمر ہوئی جس میں خسارے سے لگا ہُوں
پکڑا ہے وہی کام، دوبارے سے لگا ہُوں

رُکنا تو مرے بس میں ہے، جس جگہ بھی رُک جاؤں
آگے میں اگر تیرے اشارے سے لگا ہُوں

آواز تو آتی ہے، دِکھائی نہیں دیتا
وہ کون ہے میں جس کے پکارے سے لگا ہُوں

حاصل بھی ہو کچھ اِس سے نہیں کوئی سروکار
تھوڑے پہ تسلی نہیں، سارے سے لگا ہُوں

بھٹکا ہوا ہے خود ہی، کہاں سمت سُجھائے
ایسا کسی گمراہ ستارے سے لگا ہُوں

اپنا بھی کیے رکھتا ہوں کچھ اِس کے علاوہ
ظاہر میں تو میں کام تمھارے سے لگا ہُوں

پیچیدہ ہے اتنا، کہ سمجھ کچھ نہیں آتی
بس دیکھتا جاتا ہوں، نظارے سے گیا ہُوں

اپنی اِسے ہمت ہی سمجھتا ہوں، وگرنہ
اُترا ہے یہ پانی تو کنارے سے لگا ہُوں

میں دوشِ ہوا پر کوئی خس تھا، ظفرؔ، آخر
اُڑا ہوا آ کر جو شرارے سے لگا ہُوں

ہر ایک بات سے انکار ہونے والا تھا
جو ہے یہاں وہی اُس پار ہونے والا تھا

کبھی کبھار جو ہوتا تھا وہ بھی مشکل سے
یہاں وہ کام کئی بار ہونے والا تھا

بُھلا ہُوا کہ مری واردات ہو نہ سکی
یہ شہر یُوں بھی خبردار ہونے والا تھا

نجانے کیوں اُسے دشمن سمجھ کے مار دیا
ابھی جو میرا مددگار ہونے والا تھا

یہیں کہیں کوئی دروازہ سا کُھلا آخر
جب اُس کے آگے میں دیوار ہونے والا تھا

کسی نے کھینچ دیئے تھے چہار سُو پردے
میں ہر طرف سے نمودار ہونے والا تھا

یہ دل، یہ قلعہ بنایا تھا جس سے مِل جُل کر
اُسی کے ہاتھ سے مسمار ہونے والا تھا

نہ جانے کس لیے دریا میں خاک اُڑتی تھی
یہ دشت کیوں گل و گلزار ہونے والا تھا

بچی کھچی یہ محبت بچھڑ رہی تھی، ظفرؔ
کیا دھرا سبھی بے کار ہونے والا تھا

یہیں کہیں پہ نہیں، جا بہ جا سے آگے ہے
ہوا اک اور بھی جیسے ہوا سے آگے ہے

کھلا ہے دل میں کوئی پھول دیر سے، لیکن
مہک بہار کی سیلِ صبا سے آگے ہے

کئی دنوں سے مجھے کھینچتا ہے اپنی طرف
وہ اک نشاں جو ترے نقشِ پا سے آگے ہے

مسافروں کے لیے ہے بھی کوئی جائے اماں
تو وہ کہیں تری مہماں سرا سے آگے ہے

وہ رنگ ابھی نہیں اُترے ہیں میری آنکھوں پر
وہ رات ابھی مرے خوابِ خطا سے آگے ہے

کچھ اپنے خاص محبت کے ضابطے ہیں کہ یہ
معاملہ ہی جزا و سزا سے آگے ہے

کوئی بتائے کہ اب اِس کو کیا کہا جائے
کہ راہ گیر جو ہے رہ نما سے آگے ہے

اب اہلِ باغ خبردار ہوں نہ ہوں، ورنہ
یہ جانتے نہیں بجلی گھٹا سے آگے ہے

ہم اُن کی بزم کا احوال کیا بتائیں، ظفرؔ
جو اجنبی ہے وہی آشنا سے آگے ہے

جو خود اپنی بھی سمجھ میں نہیں آئی ہُوئی ہے
ہم نے دنیا کو وہی بات بتائی ہُوئی ہے

ایک ہی بات ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں
یہ رَسائی ہُوئی ہے یا کہ جدائی ہُوئی ہے

ہم گداگر نہیں، بس یوں ہی تمھارے آگے
ہاتھ پھیلایا ہُوا، آنکھ جھکائی ہُوئی ہے

پھر بھی اک ربط سا رہتا ہے کوئی جس دن سے
درمیاں میں کوئی دیوار اُٹھائی ہُوئی ہے

نظر آنے لگی ہے رنگ بہ رنگی دُنیا
سامنے سے کوئی تصویر ہٹائی ہُوئی ہے

دشتِ دل دیکھ کے اکثر یہ خیال آتا ہے
کوئی دن ہم نے بھی یہ خاک اُڑائی ہُوئی ہے

یار لوگ اِس سے گزرتے ہیں تو خوش ہوتا ہوں
یہ جو اک راہ گزر میری بنائی ہُوئی ہے

ہم تو شاعر ہیں سو یہ شور ہے اپنا، لیکن
آپ نے اور ہی اک دھوم مچائی ہُوئی ہے

گرچہ بے سود ہے، مصروف تو رکھتی ہے، ظفرؔ
یہ محبت جو ابھی، اُس سے چھپائی ہُوئی ہے

آرزو آگے بڑھی، اقرار پیچھے رہ گیا
ایسی پسپائی ہوئی، اصرار پیچھے رہ گیا

عشق میں اِس بار باہر کی ہوا ایسی لگی
دیکھتے ہی دیکھتے گھر بار پیچھے رہ گیا

کچھ پتا چلتا نہیں، واماندگی کی راہ پر
یار پیچھے رہ گیا یا پیار پیچھے رہ گیا

یہ تو ہونا ہی تھا رخشِ خواب پر ہو کر سوار
سو رہا منزل پہ ہے، بیدار پیچھے رہ گیا

ہر دفعہ اِس دوڑ میں آگے نکلنا تھا مجھے
اور، میں وہ ہوں کہ جو ہر بار پیچھے رہ گیا

تیز رفتاری کے صدقے اب مرے چاروں طرف
دھوپ ہے اور سایۂ دیوار پیچھے رہ گیا

آ دبوچا سر بہ سر گہرے اندھیروں نے ہمیں
اور، کہیں وہ مطلعِ انوار پیچھے رہ گیا

گھومتے رہتے تھے ہم جو ایک ہی نقطے کے گرد
گردشِ گفتار میں کردار پیچھے رہ گیا

بِک گیا ہوں مفت میں، وہ بھی سرِ رہ ہے ظفرؔ
مول کیا لگتا، مرا بازار پیچھے رہ گیا

جدائی میں بھی خوش رہنا قناعت اور کیا ہے
رضا تیری پہ ہیں راضی، محبت اور کیا ہے

ضرورت ہے نہ فرصت ہے مگر شام و سحر ہم
کسی کی یاد میں رہتے ہیں، عادت اور کیا ہے

ہمیں یہ مرتبہ ہونا ہی تھا حاصل کبھی تو
تمھارے عشق میں رُسوا ہیں، عزت اور کیا ہے

محبت اپنے حصے کی طلب کرتے ہیں تم سے
زیادہ کے نہیں خوگر، شرافت اور کیا ہے

فغاں اندر فغاں ہے اور شکایت در شکایت
یہی کچھ ہے تمھارے پیشِ خدمت، اور کیا ہے

ہمیں نعمت میسر ہی سہی ہر ایک، لیکن
کسی نے یہ نہیں پوچھا ضرورت اور کیا ہے

سلوک اِس طرح کا اور وہ بھی ہم سادہ دلوں سے
سو، کہتے کچھ ہو، کرتے کچھ، سیاست اور کیا ہے

ذرا سا سوچ کا رُخ موڑنے کا ہے تماشا
وگرنہ رنج کیا ہے اور راحت اور کیا ہے

ظفر، ہم عشق بھی کرتے ہیں سب سے چھپ چھپا کر
مگر، پکڑے بھی جاتے ہیں، مہارت اور کیا ہے

کئی دن سے ترے ہونے کی سرشاری میں رہتا ہوں
میں کیا بتلاؤں آسانی کہ دشواری میں رہتا ہوں

ہمیں اک دوسرے سے کام تو کوئی نہیں، لیکن
یہ کیا کم ہے کہ میں تیری عمل داری میں رہتا ہوں

کسی کے ناز اُٹھانے میں بھلا کیا عذر ہو مجھ کو
ہوں مزدورِ محبت، بار برداری میں رہتا ہوں

ترا گھر دُور ہے اور دُور تر بھی ہوتا جاتا ہے
بھلے میں جس قدر بھی تیز رفتاری میں رہتا ہوں

بہت کچھ کر گزرنے کی ابھی ہمت بھی ہے مجھ میں
کسی کے سامنے جتنی تھی لاچاری میں رہتا ہوں

سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے کیوں ہوتا نہیں مجھ سے
وگرنہ کچھ نہ کچھ کرنے کی تیاری میں رہتا ہوں

یہ عزت میں نے آخر کس طریقے سے کمائی ہے
معزز ہو کے بھی جو اِس قدر خواری میں رہتا ہوں

دُکانوں سے یہاں کچھ لینا دینا بھی نہیں مجھ کو
مگر، دیکھو تو کیسی گرم بازاری میں رہتا ہوں

ظفرؔ، ویسے تو میں بے زار ہی پھرتا ہوں سڑکوں پر
مگر، پھر بھی کسی شے کی طلب گاری میں رہتا ہوں

ہے حُسنِ نظر اُن کا جیسا نظر آتا ہوں
اُتنا بھی نہیں میں تو جتنا نظر آتا ہوں

پُورا نہیں اُترا ہوں دُنیا کی توقع پر
دریا نظر آنا تھا، صحرا نظر آتا ہوں

کچھ کاٹ کے لے گئے ہیں احباب مرا حصّہ
میں اِس لیے بھی سب کو آدھا نظر آتا ہوں

اک جُھوٹ کا پردہ سا تانا ہُوا ہے، ورنہ
میں آخری تھا سب سے، پہلا نظر آتا ہوں

ہونا بھی نہ ہونا تھا دربارِ محبت میں
صد شکر کہ اب میں بھی بیٹھا نظر آتا ہوں

اُس بزم کی اب مجھ پر قدغن تو نہیں کوئی
جاتا نظر آتا ہوں، آتا نظر آتا ہوں

یہ دیکھنے والے خود بھینگے ہی نہ ہوں، جن کو
ٹیڑھا نظر آتا ہوں، ترچھا نظر آتا ہوں

کچھ فیصلہ اِس کا ہم خود تو نہیں کر سکتے
تُو کیا نظر آتا ہے، میں کیا نظر آتا ہوں

اِس کا بھی حساب آخر ہونا ہے، ظفرؔ، اک دن
مستور ہوں میں کتنا، کتنا نظر آتا ہوں

روز اِس دل کی سفارش نہیں کی جا سکتی
آپ سے اور گزارش نہیں کی جا سکتی

آپ کے خواب تو ہم دیکھتے رہتے ہیں بہت
اک ذرا آپ کی خواہش نہیں کی جا سکتی

آپ کو گھیر کے لانا تو نہیں ناممکن
مگر اِس ابر سے بارش نہیں کی جا سکتی

آتے جاتے تو ہیں اِس دل کے مکاں میں اتنا
کہیے، کیا اِس میں رہائش نہیں کی جا سکتی

ساتھ بھی کوئی ملانا ہی پڑے گا آخر
تنِ تنہا تو یہ کاوش نہیں کی جا سکتی

کہتے ہیں کام تو اچھا ہے تمھارا، لیکن
جانے کیوں اِس کی ستائش نہیں کی جا سکتی

یہ جو کوشش ہے رہِ راست پہ لانے کی مجھے
اِس سے بڑھ کر کوئی سازش نہیں کی جا سکتی

یہ ادب گاہِ محبت ہے سو ہم جانتے ہیں
آپ کے سامنے جنبش نہیں کی جا سکتی

ہونے والا ہی نہیں کام پڑا ہے جو، ظفرؔ
یہ نہیں ہے کوئی کوشش نہیں کی جا سکتی

ذرا سی موج تھی جس کو بھنور ہونے دیا میں نے
بہت کچھ یوں ہی دورانِ سفر ہونے دیا میں نے

بہت افسردہ پھرتا تھا یہاں میں جس کے ہونے پر
وہی پھر کس لیے بار دگر ہونے دیا میں نے

عجب یہ داستانِ شوق تھی اُس شوخ کے آگے
جو کہہ پایا نہ اِس کو مختصر ہونے دیا میں نے

کوئی آوارگی لکھی ہوئی تھی میری قسمت میں
سو، کوئی گھاٹ تھا میرا، نہ گھر ہونے دیا میں نے

جسے سُن کر بھی کوئی گھر کے اندر سے نہیں نکلا
وہ کیا دستک تھی جس کو در بہ در ہونے دیا میں نے

اُسی رفتار سے سارا اثر زائل بھی ہونا تھا
جو اِس پر اتنی تیزی سے اثر ہونے دیا میں نے

وہ جس کی جستجو میں ایک دُنیا چھان ماری تھی
نظر آیا تو پھر صرفِ نظر ہونے دیا میں نے

یہ پگڈنڈی بنائی تھی جو اپنے ہی لیے میں نے
پھر اپنے آپ اِس کو رہ گزر ہونے دیا میں نے

محبت سربہ سر نقصان تھا میرا، ظفرؔ، اب کے
میں اِس سے بچ بھی سکتا تھا، مگر ہونے دیا میں نے

وہ ہے بھی یا کہ نہیں ہے، پتا ہی کر لیتے
گئے تھے اُس کی گلی میں، صدا ہی کر لیتے

یہاں ہے کون جسے عاقبت کی فکر نہیں
کچھ آپ خدمتِ خلقِ خدا ہی کر لیتے

قریب و دُور بھٹکنے سے تو یہ بہتر تھا
کہ اختیار کوئی راستہ ہی کر لیتے

اک انتہا پہ اگر لا کے ہم کو چھوڑنا تھا
تو پھر کہیں سے کوئی ابتدا ہی کر لیتے

شریف آدمی تھے، اپنی بات پر اصرار
اگر زیادہ نہیں تو ذرا ہی کر لیتے

اِدھر اُدھر جو یہ دل مارا مارا پھرتا ہے
اِسے کہیں نہ کہیں مبتلا ہی کر لیتے

دوبارہ اُس سے وہ کہنی ہے یا نہیں جا کر
اُس ایک بات کا ہم فیصلہ ہی کر لیتے

خود اپنے آپ یہ موسم بدلنے والا تھا
کچھ انتظار تو کچھ حوصلہ ہی کر لیتے

مِلا جُلا ہی رہا ہے ہمیں پسند، ظفرؔ
وگرنہ جھوٹ کو سچ سے جُدا ہی کر لیتے

ہماری نیند کا دھارا ہی اور ہونا تھا
یہ خواب سارے کا سارا ہی اور ہونا تھا

سفر پہ ہم جو نکلتے تو پھر ہمارے لیے
سفینے اور ستارہ ہی اور ہونا تھا

ہماری بات اگر ایک بار سُن لیتے
تو فائدہ یہ تمھارا ہی اور ہونا تھا

دُکان بند نہ کرتے تو اور کیا کرتے
کہ جانتے تھے خسارہ ہی اور ہونا تھا

ہمارے کام نہ آئیں وہاں یہ آنکھیں بھی
خبر نہ تھی کہ نظارا ہی اور ہونا تھا

پہنچ گئے تھے سبھی سنگسار ہونے کو
بس انتظار ہمارا ہی اور ہونا تھا

چلا گیا ہے وہ کچھ اور دُور تو پھر کیا
وہ بے وفا ہمیں پیارا ہی اور ہونا تھا

ہماری شام کے پانی ہی اور ہونا تھے
ہماری شب کا کنارہ ہی اور ہونا تھا

ہمیں بھی تھی نہیں اُمید پہلی بار، ظفرؔ
سلوک اُس کا دوبارہ ہی اور ہونا تھا

یہ کاروبار تھا، ایسا ہی اور ہونا تھا
زیاں کچھ اِس میں ہمارا ہی اور ہونا تھا

ہماری پیاس ہی اس بار تھی غلط، ورنہ
ہمارے سامنے دریا ہی اور ہونا تھا

یہ کام اور طرح سے اگر کیا جاتا
تو دوست، اِس کا نتیجہ ہی اور ہونا تھا

تم آتے جاتے اگر اور بھی یہاں رہتے
ہمارے شہر کا نقشہ ہی اور ہونا تھا

ہمارے ساتھ ہی آنا تھے یہ سبھی منظر
اور اس کے بعد تماشا ہی اور ہونا تھا

تم اور طرح کے ہو دوسروں سے اتنے اگر
تمھارا چاہنے والا ہی اور ہونا تھا

یہ دار و گیر اِسی طرح سے اگر رہتی
یہ کُشت و خوں ابھی اتنا ہی اور ہونا تھا

اِس اجتماع کی جتنی بھی سعی کی جاتی
یہ انتشار زیادہ ہی اور ہونا تھا

علاج اور ہی کرتے رہے مرض کا، ظفرؔ
اگرچہ اس کا مداوا ہی اور ہونا تھا

یہیں پہ ڈھونڈیئے ہم کو، یہیں پڑے ہُوئے ہیں
علاقے آپ کے زیرِ نگیں پڑے ہُوئے ہیں

ہمارے ساتھ ہی ڈوبے ہوئے سفینے بھی
صحیح و سالم ابھی تہ نشیں پڑے ہُوئے ہیں

ہمیں کسی نے اُٹھایا نہیں کہ آپ ہمیں
جہاں پہ ڈال گئے تھے وہیں پڑے ہُوئے ہیں

ہمارا راستہ روکا ہُوا ہے آپ نے ہی
یہ ہم تو آپ کے پیچھے نہیں پڑے ہُوئے ہیں

ہُوئی ہماری تواضع کئی طریقوں سے
کہیں نکالے گئے ہیں، کہیں پڑے ہُوئے ہیں

مذاق اُڑاؤ نہ دل کا کبھی کہ اس کے لیے
خدا کے فضل سے دُنیا و دیں پڑے ہُوئے ہیں

کہیں مکان ترستے ہوئے مکینوں کو
کہیں مکانوں سے باہر مکیں پڑے ہُوئے ہیں

وہ ذوقِ سجدہ تو باقی نہیں رہا، لیکن
اُسی طرح سے یہ داغِ جبیں پڑے ہُوئے ہیں

کبھی نہ لائے جو خاطر میں آسماں کو، ظفرؔ
بڑے رسان سے زیرِ زمیں پڑے ہُوئے ہیں

کچھ دنوں سے ایسا ہی روزگار اپنا ہے
رہ گزر کسی کی ہے، انتظار اپنا ہے

جا رہے کہیں بھی وہ، ہو رہے کسی کا بھی
تھا جو ایک بار اپنا بار بار اپنا ہے

اُس کو اور ہمیں جب سے پوچھتا نہیں کوئی
ہم بھی یار اُس کے، وہ بھی یار اپنا ہے

رفتہ رفتہ شاید ہم ہو گئے ہیں ویسے ہی
جس طرح کے لوگوں میں اب شمار اپنا ہے

کر سکے ہیں اب تک ہم جتنی آپ کی خدمت
آپ پر بھی اتنا ہی اختیار اپنا ہے

خاک یہ ہماری ہے، کیوں نہ اِس کو پہچانیں
کارواں ہو جس کا بھی یہ غبار اپنا ہے

خود تو ہو چکے فارغ کاروبارِ ہستی سے
دوسروں پہ ہی اب تو انحصار اپنا ہے

کاٹ کر اسے بے شک اور بھی کوئی لے جائے
یہ بچا ہُوا باقی بے شمار اپنا ہے

اے ظفرؔ یہاں جس کے دم سے جانے جاتے ہیں
اب تو اُسی کا ہونا ہی اشتہار اپنا ہے

جدائی نہ خوابِ جوانی ہے یہ
کوئی اور ہی سرگرانی ہے یہ

کبھی پوچھ لیتے ہو میرا بھی حال
محبت نہیں، مہربانی ہے یہ

عجب سی کوئی شے ہے دریائے دل
کہ پانی سے باہر روانی ہے یہ

نکل آئے ہیں دل سے اُس کے جو ہم
سو، درپیش اب لامکانی ہے یہ

جسے طول دیتا رہوں گا بہت
بڑی مختصر سی کہانی ہے یہ

کبھی اُس کی باتوں میں آنا نہیں
کہ دل ہے بڑا داستانی ہے یہ

کھڑی ہے اُسی طرح دیوارِ دل
ابھی راستے سے ہٹانی ہے یہ

محبت کا ماتم کریں بیٹھ کر
کہیں پر دری سی بچھانی ہے یہ

ظفر، فرق اتنا تو ہونا ہی تھا
کہا جو بھی کچھ ہو، زبانی ہے یہ

فلک پر جو تنہا ستارہ ہے یہ
ہمارا نہیں ہے، تمھارا ہے یہ

نہ جانے کہاں کا نظارا ہے یہ
جو پہلے نہیں تھا، دوبارہ ہے یہ

بہت منتظر ہے جُدائی کی رات
بڑے شوق سے دن گزارا ہے یہ

یہ طرزِ تغافل بھی ہے خاص چیز
سمجھتا نہیں ہوں، اشارہ ہے یہ

نہ دیوارِ بے گانگی یوں گراؤ
کہ اب آخری ہی سہارا ہے یہ

بہت خوش نہ ہونا اِسے دیکھ کر
منافع نہیں ہے، خسارا ہے یہ

میں نیچے لُڑھک جاؤں گا ایک دن
کہ میری زمیں کا کنارہ ہے یہ

زمینی نہیں ہے مرا آفتاب
کسی آسماں سے اُتارا ہے یہ

ظفرؔ کو بھلا اور بانٹو گے کیا
کہ پہلے ہی سارے کا سارا ہے یہ

کسی طور سے جو اُتاری ہے یہ
کہ گٹھڑی محبت کی بھاری ہے یہ

محبت بہت بے وقوفی سہی
اکٹھی ہماری تمھاری ہے یہ

ابھی اور کرتب دِکھائے گا دل
تمھیں، اچھا خاصا مداری ہے یہ

مجھے سب سے اچھی لگی تھی جو راہ
تمھاری طرف سے گزاری ہے یہ

ہمارے تو جھڑنے لگے بال و پر
تمھاری ہی پہلی اُڈاری ہے یہ

محبت میں پڑتا ہی رہتا ہے کام
سو پہلی گزارش ہماری ہے یہ

وہ رہتے ہیں سر پر مرے ہی سوار
کہ ستی جو سب سے سواری ہے یہ

نیا تو نہیں مکتبِ گُمرہی
ہمیشہ سے ہی فیض جاری ہے یہ

تعلق جو توڑا تھا خود ہی، ظفرؔ
تو پھر کس لیے بے قراری ہے یہ

نہ باہر سے کہیں وہ اور نہ اندر سے نکل آیا
جو مجھ میں تھا نہیں، میرے برابر سے نکل آیا

محبت چل رہی تھی دائرہ در دائرہ مجھ میں
مگر کچھ سوچ کر میں اِس کے چکّر سے نکل آیا

مری اوقات کتنی ہے، اُسے معلوم تھا شاید
میں نیچے منتظر تھا اور وہ اوپر سے نکل آیا

مجھے معلوم ہے یہ راستہ اُس کا نہیں، لیکن
اگر وہ اِس طرف میرے مقدر سے نکل آیا

کہیں اک نیند جیسے اور ہی تھی منتظر میری
یکا یک جاگ اُٹھا میں اور بستر سے نکل آیا

کہیں کا بھی نہیں رکھا اِس آوارہ خرامی نے
جو میں سعیٔ سخن میں اپنے محور سے نکل آیا

یہ پانی ہے جو اپنا راستہ خود ہی بناتا ہے
کہیں دیوار نے روکا تو یہ در سے نکل آیا

ارادے باندھتا رہتا تھا یہ دل جانیے کب سے
خدا کا نام لے کر آج میں گھر سے نکل آیا

ظفرؔ ہر حال میں اِس نے تو گرنا تھا مرے اندر
یہ آنسو کس خوشی میں دیدۂ تر سے نکل آیا

اپنی کھینچی ہوئی سرحد سے گزرنے لگا ہوں
دوسری بار کسی شوخ پہ مرنے لگا ہوں

جس کے آگے سے میں ہر روز گزر جاتا تھا
اُسی دروازے پہ کیوں رُکنے، ٹھہرنے لگا ہوں

دُور ہو گی ابھی انکار کی مُنہ زور ہوا
اور میں وقت سے پہلے ہی بکھرنے لگا ہوں

سرد سی لہر تھی ایسی ہی کسی کی اب کے
کہ کڑی دھوپ میں بھی جیسے ٹھٹھرنے لگا ہوں

آنے والی ہے کوئی مجھ میں بڑی تبدیلی
نہیں معلوم بگڑنے کہ سنورنے لگا ہوں

جو کیا تھا وہ کسی اور کو بھرنا پڑا ہے
جو کبھی میں نے کیا ہی نہیں، بھرنے لگا ہوں

لگ رہی ہے کوئی رونق مرے اندر کیا کیا
خود سے خالی تھا، کسی خواب سے بھرنے لگا ہوں

اصل قد و کاٹھ کا اندازہ لگانے کے لیے
اپنی شہرت کی بلندی سے اُترنے لگا ہوں

ابھی ناتا نہیں توڑا ہے سمندر سے، ظفرؔ
ابھی میں پاؤں کسی خاک پہ دھرنے لگا ہوں

اُسی طرح سے ہی اور در بہ در بہت خوش ہے
مسافرت ہے وہی اور سفر بہت خوش ہے

رُکا ہوا تھا جو گردش کو چھوڑ کر اپنی
وہ چاند اب بھی ترے بام پر بہت خوش ہے

جسے، جہاں ترے قدموں نے ارجمند کیا
وہی مقام، وہی رہ گزر بہت خوش ہے

چہک رہے ہیں پرندے بھی اور پتّے بھی
لگی ہُوئی ہے جو رونق، شجر بہت خوش ہے

تفکرات کے مارے ہوئے ہیں اہلِ خبر
یہ ایک اپنا دلِ بے خبر بہت خوش ہے

چَھٹے گا شہر سے آخر غبارِ غم کسی دن
ہجومِ خلق یہی سوچ کر بہت خوش ہے

خوشی کے جب سے معانی بدل دیئے گئے ہیں
یہ خاکسار یہاں خاص کر بہت خوش ہے

لطیفہ یہ بھی رہا اک مرے نہ ہونے سے
دو ایک لوگ تو کیا، گھر کا گھر بہت خوش ہے

تمھیں تو رنج نہیں ہونا چاہیے تھا، ظفرؔ
وہ بے وفا نئے گھر میں اگر بہت خوش ہے

معمول کے خلاف محبت زیادہ ہے
یا آج کل جناب کو فرصت زیادہ ہے

یہ بات وہ ہے جس کے معانی ہیں کم سے کم
یہ کام وہ ہے جس میں فراغت زیادہ ہے

ہر چیز اپنے پاس فراواں ہے اِن دنوں
حیرت زیادہ ہے کبھی حسرت زیادہ ہے

محتاط کچھ زیادہ ہی رہنے لگے ہیں آپ
دولت زیادہ ہے کہ حفاظت زیادہ ہے

ہے اِس تپاک میں بھی تغافل کا ایک رنگ
اِس رکھ رکھاؤ میں بھی مروّت زیادہ ہے

دل کا معاملہ ہے کچھ ایسا کہ اِن دنوں
دُنیا ہے تھوڑی اور قیامت زیادہ ہے

چیزوں کی اصلیت نظر آنے لگی ہے صاف
جب سے اِس آئنے میں کدورت زیادہ ہے

واقف نہیں یہاں پہ کوئی آپ سے ابھی
اِس شہر میں جو آپ کی عزت زیادہ ہے

جیسی بھی ہے یہ شاعری اچھی بُری، ظفرؔ
سچ پوچھیے تو آپ کی شہرت زیادہ ہے

قریب و دُور برابر دِکھائی دینے لگا
جو تھا نہیں وہی منظر دِکھائی دینے لگا

لگا کھڑا تھا میں دیوار سے مگر یک دم
مجھے مکان کے اندر دِکھائی دینے لگا

چھپا رہا کسی آندھی میں شہر بھر، اور پھر
غبار بیٹھنے اور گھر دِکھائی دینے لگا

وہ روشنی تھی کہ چندھیا گئیں مری آنکھیں
مجھے وہ دُور سے بہتر دِکھائی دینے لگا

وہ ایک عمر جو پوشیدہ ہی رہا مجھ سے
دیا دِکھائی تو اکثر دِکھائی دینے لگا

کیا تھا دل میں جسے قید میں نے اپنے تئیں
کسی کے ساتھ سراسر دِکھائی دینے لگا

ٹھہر ٹھہر کے بصارت مری بحال ہُوئی
نہیں یہ بات کہ یک سر دِکھائی دینے لگا

غزل کے آئنہ خانے کی سیر کرتے ہُوئے
پھر اپنے ہاتھ میں پتھر دِکھائی دینے لگا

پھر ایک مرتبہ اندر پڑے پڑے ہی، ظفرؔ
میں اپنے آپ سے باہر دِکھائی دینے لگا

یہ مرے ہاتھ میں شاید ہنر نہیں میرا
کہ آج کل مرے شانوں پہ سر نہیں میرا

وہ رکھنا چاہتا ہے اپنی ملکیت میں بھی کچھ
چناں چہ ہے بھی مگر اس قدر نہیں میرا

یہاں مکیں تھے کئی اور لوگ بھی اُن کو
کہیں سے لاؤ وگرنہ یہ گھر نہیں میرا

کسی نے پاؤں میں چکّر سا باندھ رکھا ہے
میں کر رہا ہوں کہیں جو سفر نہیں میرا

سو، ہے یہ دعوتِ شیراز دوسروں کے لیے
کہ پیڑ اپنا ہے لیکن ثمر نہیں میرا

اُٹھا رہا ہُوں کسی خوابِ خامشی کے مزے
وگرنہ شور شرابہ کدھر نہیں میرا

میں ڈال سکتا کسی اور پر اثر کیوں کر
کہ خود پہ بھی کہیں کوئی اثر نہیں میرا

بدن سے جھاڑتا رہتا ہوں، رات ہے ایسی
وہ راستہ ہُوں جہاں سے گزر نہیں میرا

میں کھا رہا ہوں کسی اور کا جو رزق، ظفؔر
دیا ہی کیوں تھا مجھے یہ اگر نہیں میرا

جو ہونا چاہیے تھا وہ اکثر نہیں ہُوا
اندر جو ہو رہا ہے وہ باہر نہیں ہُوا

تم نے ہنسی ہنسی میں کیا ہے جو میرے ساتھ
مجھ کو کبھی گمان بھی تم پر نہیں ہُوا

تم پر ہی اختیار نہیں ورنہ آج تک
وہ کون سا ہے معرکہ جو سر نہیں ہُوا

جو کچھ نہیں ہُوا وہ بتاتا رہا ہُوں سب
میں یہ تو جانتا نہیں کیوں کر نہیں ہُوا

ناممکنات کا تو کوئی ذکر ہی نہیں
کام ایک وہ بھی ہے کہ جو ہو کر نہیں ہُوا

باہر تو ہو رہی تھی کہیں خوب اُس کی مشق
ہنگامہ جو بھی شہر کے اندر نہیں ہُوا

ٹکرا کے سر بھی دیکھ لیا سب نے بار بار
دیوار تو کھڑی رہی اور در نہیں ہُوا

آگے تو دوسروں سے نکلنا تھا کیا، مگر
میں اپنے آپ کے بھی برابر نہیں ہُوا

میں پھول ہی سمجھتا رہوں گا اُسے، ظفرؔ
جو اُس کے ہاتھ میں ابھی پتھر نہیں ہُوا

مٹا ہوا بھی زیادہ دِکھائی دینے لگا
دیا دِکھائی تو کتنا دِکھائی دینے لگا

ابھی غروب ہوا تھا جو چاند سا پسِ در
طلوع ہو کے دوبارہ دِکھائی دینے لگا

فضا میں اور ہی تصویر بن رہی تھی کوئی
مجھے اک اور تماشا دِکھائی دینے لگا

تمھیں بھی رہنے لگی تھی مری خبر جب سے
مجھے بھی خواب تمھارا دِکھائی دینے لگا

رُکا ہوا تھا کہ دیوار تھی مرے آگے
چلا تو آپ ہی رستہ دِکھائی دینے لگا

ہجوم تھا کوئی اُس کے لہو میں اپنا ہی
وہ میرے ساتھ بھی تنہا دِکھائی دینے لگا

کسی کے ساتھ جو بے گانگی ہوئی آغاز
تو سارا شہر ہی اپنا دِکھائی دینے لگا

نیا ہی ذائقہ چکھا کبھی پُرانے میں
کبھی نیا بھی پُرانا دِکھائی دینے لگا

سوال یہ ہے کہ سیدھا کھڑے کھڑے ہی ظفؔر
درخت کیوں مجھے اُلٹا دِکھائی دینے لگا

ڈھوئیں کی ڈھول چھٹی، آسماں دِکھائی دیا
بہت دنوں میں مجھے یہ سماں دِکھائی دیا

وہیں پہ بکھرا ہُوا زرد رنگ ہے اب تک
جہاں کبھی مجھے خوابِ خزاں دِکھائی دیا

مجھے سنائی دیا کوئی گم شدہ منظر
اور ایک سلسلۂ داستاں دِکھائی دیا

تلاش میں نے بھی چھوڑی نہ اور آخرِ کار
جہاں پہ تھا ہی نہیں وہ، وہاں دِکھائی دیا

وہاں پہ اور بھی تھا اپنے دیکھنے کو بہت
ہجوم میں وہ اچانک جہاں دِکھائی دیا

یہ دیکھنا بھی کوئی دیکھنا ہے آخرِ کار
دکھائی تو دیا لیکن کہاں دِکھائی دیا

ہماری اپنی روانی بھی اس میں شامل تھی
رُکا ہُوا بھی ہمیں جب رواں دِکھائی دیا

زباں دراز تھا اپنی طرح کا ایک ہی وہ
جو پہلے پہلے ہمیں بے زباں دکھائی دیا

دِکھائی دینے پہ آیا تو ایک دم وہ، ظفرؔ
اِدھر اُدھر کی جگہ درمیاں دِکھائی دیا

اپنا کبھی ہُوا نہ تمھارا ہُوا ہوں میں
یہ کیسے راستوں سے گزارا ہُوا ہوں میں

کس آسمان کا مجھے دھوکا دیا گیا
یہ کون سی زمیں پہ اُتارا ہُوا ہوں میں

پھرتا تھا موج موج بڑی دُور دُور تک
پانی نہیں رہا تو کنارہ ہُوا ہوں میں

بے دخل ہو چکا ترے دل کے مکان سے
یوں بھی نہیں کہ سارے کا سارا ہُوا ہوں میں

چمکا گئی ہیں مجھ کو محبت کی آندھیاں
گردِ گناہ سے ہی سنوارا ہُوا ہوں میں

بھٹکے بہت ہیں رات کے راہی مرے طفیل
اِس طرح کا فلک پہ ستارا ہُوا ہوں میں

سمجھے نہ دوسروں کو ہی سمجھا سکے کوئی
دُنیا کی خاطر ایسا اشارہ ہُوا ہوں میں

خود ہی نکال دوں گا ہوا اِس کی ایک دن
شہرت سے پھُول کر جو غبارہ ہُوا ہوں میں

ہے منتظر اک اور زمانہ مرا، ظفرؔ
ایک اور ہی طرف کا پکارا ہُوا ہوں میں

صرفہ کیا تقریر نہ تحریر سے ہم نے
رکھی بھی عداوت کوئی تاثیر سے ہم نے

ڈھالا نہیں مستقبل و موجود میں خود کو
پیچھا ہی چھڑایا نہ اساطیر سے ہم نے

سرزد ہُوئے کچھ وقت سے پہلے ہی کم و بیش
کچھ کام کیے ہیں ذرا تاخیر سے ہم نے

قابو میں ہی آتا نہیں تھا یہ دلِ وحشی
جکڑا اسے آخر تری زنجیر سے ہم نے

کچھ نیند میں بھی جاگتے رہتے تھے کم و بیش
کچھ دُور رکھا خواب کو تعبیر سے ہم نے

اکثر تو اکارت ہی گئی خاکِ تماشا
سونا بھی بنایا اِسی اکسیر سے ہم نے

کچھ کی صفِ احباب پہ دھوکے سے چڑھائی
کچھ کام لیا نعرۂ تکبیر سے ہم نے

اپنی ہی کرامات دِکھاتے رہے سب کو
سرقہ نہ کیا معجزۂ میر سے ہم نے

پایا تھا، ظفر، کوششِ بسیار سے جس کو
کھویا بھی ہے اُس کو بڑی تدبیر سے ہم نے

سمجھ رہے ہیں کہ جیسے ہنسی خوشی کی تھی
جو تیرے شوقِ ملاقات میں کمی کی تھی

ترا خیال نہیں تھا تو کیا تھا وہ اُس رات
کہ جس سے ہم نے اندھیرے میں روشنی کی تھی

بہت کیے ہیں غلط کام بھی، مگر ہم نے
جو تجھ سے کی ہے محبت تو ٹھیک ہی کی تھی

بدل گیا ہے تو کیا سوچ کر بھلا ہم نے
خیال و خواب کے موسم سے دوستی کی تھی

کسی پہ ٹوٹ کے مرتے تھے کوئی دن ہم بھی
یہ لگ رہا ہے کہ ہم نے بھی زندگی کی تھی

سوال ہے مرا پیچھے ہٹانے والوں سے
کہ میں نے کس کی یہاں پر برابری کی تھی

نہ جانے فیصلہ کیوں کر ہُوا ہمارے خلاف
کہ اپنے حق میں وہاں رائے تو سبھی کی تھی

قرار پائی ہے وہ دوسروں سے بھی بدتر
جو ہم نے اپنی طرف سے سخن وری کی تھی

گلے ہی پڑ گئی وہ مستقل ہمارے، ظفرؔ
جو دل کی بات یہاں ہم نے سرسری کی تھی

بھلا بیٹھا ہُوں کیا جانے کہاں رکھا ہُوا ہے
کہیں اک خواب زیرِ آسماں رکھا ہُوا ہے

یہ اتنا فاصلہ ہی وہ تعلق ہے جو تو نے
ہمارے اور اپنے درمیاں رکھا ہُوا ہے

مرا کردار جو بھی تھا محبت کے سفر میں
اُسی کو ماورائے داستاں رکھا ہُوا ہے

کسی اچھے کرائے دار کا ہُوں منتظر میں
اِسی مقصد سے خالی یہ مکاں رکھا ہُوا ہے

یہ دل اپنی حفاظت کا ہے ذمے دار خود ہی
علاقہ یہ بھی ہم نے بے اماں رکھا ہُوا ہے

اِسی خاطر جہاں میں بے نشاں ہی رہ گئے ہم
جو اپنی بے نشانی کو نشاں رکھا ہُوا ہے

یہی شاخِ تمنّا کاٹ دیں گے ایک دن خود
کہ جس پر مدّتوں سے آشیاں رکھا ہُوا ہے

رگوں میں رُکتی جاتی ہی سہی گردش لہو کی
طبیعت کو مگر ہم نے رواں رکھا ہُوا ہے

ظفرؔ اقبال یہ کیا بدمعاشی ہے کہ تُو نے
بڑھاپے میں بھی جذبوں کو جواں رکھا ہُوا ہے

چمک اُٹھی ہے شبِ تار تیرے ہونے سے
یہ روشنی ہے لگاتار تیرے ہونے سے

ہٹا ہُوا تھا مرا دھیان راستوں سے بہت
بھٹک گیا بھی کئی بار تیرے ہونے سے

بگڑ بھی سکتی ہے اہلِ نظر کی صورتِ حال
بدل بھی سکتا ہے معیار تیرے ہونے سے

ابھی نہیں تو کسی دن دمک اُٹھیں گے کہیں
مٹے ہُوئے مرے آثار تیرے ہونے سے

پہنچ نہ پائے گا تو دوسرے کنارے پر
یہ ہو سکے گا مرے پار تیرے ہونے سے

ہوا کی طرح تُو اِن سے گزر کے دیکھ کبھی
جُڑے ہوئے ہیں یہ اشجار تیرے ہونے سے

بتا بھی دوں گا میں تعداد بھی صحیح اپنی
اگر ہُوا کبھی دو چار تیرے ہونے سے

تھی یہ بھی اصل میں اقرار کی کوئی صورت
میں کر رہا تھا جو انکار تیرے ہونے سے

ظفرؔ کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں، نہ سہی
غرض اُسے ہے بس اے یار تیرے ہونے سے

نہیں یہ دل ہی پریشان تیرے ہونے سے
ہوا ہے اور بھی نقصان تیرے ہونے سے

نزول شہر پہ تھا اک بلا کا ہونا ہی
نہیں ہے کوئی بھی حیران تیرے ہونے سے

رہے نہیں وہ مضامینِ عشق ہی یکسر
بدل گئے سبھی عنوان تیرے ہونے سے

تُو اہلِ خواب کی خدمت کی خاطر آیا تھا
سمجھ رہے ہیں یہ نادان تیرے ہونے سے

سڑک پہ رات گزاری ہے میں نے جانِ عزیز
جگہ نہ تھی کہیں مہمان تیرے ہونے سے

ابھی یہ کُفر کے نزدیک تو نہیں، لیکن
خلل پذیر ہے ایمان تیرے ہونے سے

کہاں سے آئے ہیں یہ گلستان و موجِ بہار
کدھر گئے ہیں بیابان تیرے ہونے سے

نہیں ہُوا کہیں پورا تو مدعا اپنا
ہوئے ہیں کام کچھ آسان تیرے ہونے سے

تجھے بھی لے کے، ظفرؔ، بیٹھ جائے گا اک دن
اُٹھا ہُوا ہے جو طوفان تیرے ہونے سے

یہ راستے ہوئے کیوں تنگ تیرے ہونے سے
کہاں گئے ہیں سبھی رنگ تیرے ہونے سے

کسی کا سحر سلامت نہ رہ سکا کوئی
ہوا ہُوئے سبھی نیرنگ تیرے ہونے سے

دلوں کا امن تو اب خواب ہے اور اُس کی جگہ
لگی ہُوئی ہے کوئی جنگ تیرے ہونے سے

کسی کو تیرا یقیں ہی نہ آرہا تھا، سو اب
پڑے ہیں ایک طرف دنگ تیرے ہونے سے

ترے بیاں کے لیے چاہئیں نئے الفاظ
بدل رہی ہے جو فرہنگ تیرے ہونے سے

کوئی سمجھ ہی نہیں آرہی کہ ہو گئی ہے
یہ زندگی عجب آہنگ تیرے ہونے سے

یہ آئنہ جو بہت صاف تھا کبھی، اِس کو
لگا ہُوا ہے کوئی زنگ تیرے ہونے سے

کوئی تو آ کے بتائے گا ایک دن مجھ کو
کہ ایسا لگتا ہے اب جھنگ تیرے ہونے سے

کسی کو اِس کی توقع نہیں تھی، جانِ ظفر
جو سب کے رنگ میں ہے بھنگ تیرے ہونے سے

ہے شہر کے لیے انعام تیرے ہونے سے
یہ روشنی سی لبِ بام تیرے ہونے سے

ترا پتا تو چلے دوست ہے کہ ہے دیوار
رُکے ہُوئے ہیں سبھی کام تیرے ہونے سے

کسی نے کر لیا آغاز اُمید میں تیری
کسی کا ہوگیا انجام تیرے ہونے سے

تری نظر میں بچا ہی نہ کوئی دانۂ دل
بچھے ہوئے تھے کئی دام تیرے ہونے سے

زباں پہ مُہرِ خموشی کا ہے سبب یہ بھی
جو میرے دل میں ہے کہرام تیرے ہونے سے

جُڑا ہُوا ہے کوئی شور تیرے خواب کے ساتھ
بندھی ہُوئی کوئی شام تیرے ہونے سے

ہماری عقل تھی حیراں ترے نہ ہونے پر
ہمارا عشق ہے ناکام تیرے ہونے سے

علاج تو تیری موجودگی ہی تھی سب کا
کسی کو بھی نہیں آرام تیرے ہونے سے

یہاں پہ اس سے تو گم نام ہی بھلی تھی ظفرؔ
جو شاعری ہُوئی بدنام تیرے ہونے سے

ہُوئی ہے عام جو بیداد تیرے ہونے سے
زمانہ قید ہے آزاد تیرے ہونے سے

مجھے خوشی ہے یہاں پر ترے علاوہ بھی
بہت سے لوگ ہیں دل شاد تیرے ہونے سے

سو، رفتہ رفتہ زمانہ بھی اُن کو چھوڑ گیا
کئی جو ہو گئے برباد تیرے ہونے سے

کسی سے چھن گیا جو کچھ بھی پاس تھا جس کے
کسی کی ہو گئی امداد تیرے ہونے سے

یقین ایک زمانے کو اپنے ہونے کا
ہُوا ہے میرے بہت بعد تیرے ہونے سے

دعائیں دیتے ہیں تجھ کو یہاں وہاں، جن کی
ہُوئی ہے عرض بھی ارشاد تیرے ہونے سے

یہ طرفگی کبھی یوں رائگاں نہ جائے گی
کہیں پڑے گی یہ اُفتاد تیرے ہونے سے

کوئی عجب نہیں ویران ہے اگر ملتان
بلادِ جھنگ ہے آباد تیرے ہونے سے

جو ہر طرف کسی انکار کا ہے شور، ظفؔر
یہ رونقیں ہیں سب اُستاد، تیرے ہونے سے

آسماں کی خاک پر جیسے ستارہ شور ہے
دل کے اندر پھر کئی دن سے تمھارا شور ہے

اِس زمیں کے ساتھ جس کی کوئی نسبت ہی نہیں
جانے یہ کن آسمانوں سے اُتارا شور ہے

آج کل پانی کے اندر عاجزی ہے اِس قدر
اِس دفعہ خاموش ہے دریا، کنارہ شور ہے

اب تو میرا بھی نہیں چلتا ہے اِس پر اختیار
جس طرف سے بند کرتا ہوں، دوبارہ شور ہے

میرے باہر اور اندر کی تلاشی ہو اگر
اور یہ کچھ بھی نہیں، سارے کا سارا شور ہے

بات مطلب سے نکل جائے گی پھر آگے کہیں
اِس دفعہ بھی خامشی کا استعارہ شور ہے

دیکھتا جاتا ہوں سب کچھ اور میرے سامنے
ٹکڑے ٹکڑے شام ہے اور پارہ پارہ شور ہے

چل نہیں سکتا ہوں اور اُس تک پہنچنا ہے ضرور
سُن نہیں سکتا ہوں اور اُس کا اشارہ شور ہے

یہ جو ہنگامہ بپا ہے اپنے اندر، اے ظفرؔ
کچھ ہماری شاعری ہے، کچھ ہمارا شور ہے

کسی بستی کہ بیاباں سے پکارو مجھ کو
آ ملوں گا، کسی عنواں سے پکارو مجھ کو

یا کسی نیند کی نرمی سے مجھے دو آواز
یا کسی خوابِ پریشاں سے پکارو مجھ کو

جس میں اک ہمہمۂ لمسِ بدن بھی ہو کوئی
پھر کسی سلسلۂ جاں سے پکارو مجھ کو

ذائقے جس میں ہوں دونوں کی طرح کے موجود
کسی آبادیٔ ویراں سے پکارو مجھ کو

منتظر بیٹھا ہوں اِس عالمِ دُشواری میں
کب کسی جادۂ آسانی سے پکارو مجھ کو

کسی یاد آئی ہُوئی بات کا دامن تھامے
کسی بھُولے ہُوئے پیماں سے پکارو مجھ کو

وہ صدا ہو جو کوئی اور بھی سُن لے بے شک
ایسی ترکیبِ نمایاں سے پکارو مجھ کو

عافیت کوش بہت میں بھی نہیں رہ گیا ہوں
اب کسی مرکزِ طوفاں سے پکارو مجھ کو

آج بھی کان لگائے ہُوئے بیٹھا ہوں، ظفرؔ
کہیں سازوسروساماں سے پکارو مجھ کو

دو گھڑی کے لیے خوش ہو گئے، دل شاد کیا
آج ہم نے کسی بھولے ہوئے کو یاد کیا

دیکھنے کے لیے اُس کو کبھی نکلے ہی نہیں
ہم نے جو شہر خود اپنے لیے آباد کیا

ایک اپنی ہی بلا آئی ہوئی تھی سر پر
جانے کیا سوچ کے اُس نے مجھے ہم زاد کیا

تیری دنیا سے تو ویسے ہی نکل آئے ہم
کچھ بھی تعمیر کیا ہے نہ ہی برباد کیا

پڑ گیا ہوں کسی اِس سے بھی بڑی قید میں اب
کیسی نیت سے یہ تو نے مجھے آزاد کیا

اِس کا اظہار بھی شاید نہیں ہو پایا ہے
اپنی دانست میں ہم نے جو کچھ ایجاد کیا

درمیاں ہی میں کہیں ہو گیا ہو تو، ورنہ
کبھی پہلے کیا ہے اور نہ کبھی بعد کیا

غلطی یہ ہوئی لفظوں کو مِلا بیٹھے ہم
شور بھی عرض کیا، شعر بھی ارشاد کیا

کچھ جو سیکھا ہے تو بَن بَن کے بگڑنا آخر
کس گھڑی ہم نے ظفرؔ، آپ کو اُستاد کیا

اُس گلی جاتے ہیں اور آتے ہیں ہم
ایک ہی اُلجھن کو سلجھاتے ہیں ہم

جو یہاں نایاب و ناموجود ہے
پھر اُسی کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں ہم

جی نہیں سکتے ہیں اپنے آپ ہم
اپنی مرضی سے تو مر جاتے ہیں ہم

بُھول جانا ہے محبت کا سبق
چاہے اِس کو روز دہراتے ہیں ہم

دے رکھا ہے خود زمانے کو فریب
اب کبھی دھوکا نہیں کھاتے ہیں ہم

پختگی سی آ گئی ہے طبع میں
شرم آتی ہے نہ شرماتے ہیں ہم

ختم ہونے کو ہے یہ عہدِ ستم
کیسے کیسے دل کو بہلاتے ہیں ہم

لفظ کو سیدھا ہی رکھتے ہیں، اِسے
وقت پڑنے پر ہی اُلٹاتے ہیں ہم

بے وفا سے جان تو چُھوٹی، ظفرؔ
آج کل روتے نہیں گاتے ہیں ہم

موج در موج زیادہ ہوں کہ تھوڑا ہُوا میں
رُخ کسی اور ہی جانب کو ہوں موڑا ہُوا میں

دھوپ سے اور نہ سردی سے بچا سکتا ہوں
اور بے کار چلا جاتا ہوں اوڑھا ہُوا میں

اصلیت مری کُھلی سارے جہاں پر آخر
کوئی بھانڈا ہوں کسی چوک میں پھوڑا ہُوا میں

پیش کرتے ہیں تیرے سامنے لا کر جو کبھی
کہیں ٹوٹا ہُوا ہوں اور کہیں موڑا ہُوا میں

راستے مَیرے لیے سارے کُھلے ہیں، لیکن
کہیں جا بھی نہیں سکتا ترا چھوڑا ہُوا میں

ایک ٹھوکر سے بدل جائے گی تقدیر مری
اِس توقع پہ تری راہ کا روڑا ہُوا میں

کچھ ہُوا ہے تو بس اتنا ہی قیامت کا اثر
جاگ کر سو گیا ہوں پھر سے جھنجھوڑا ہُوا میں

ہے کوئی داد نہ فریاد اب اُس کی دیکھو
ظلم ہوں اپنے ہی اوپر کوئی توڑا ہُوا میں

کہیں، باقی نہیں وہ میل محبت کا، ظفرؔ
اتنا دُھویا ہوں اور نچوڑا ہُوا میں

آ رہا ہوں جو تری سمت جھجکتا ہُوا میں
کبھی اپنے بھی قریب آؤں سرکتا ہُوا میں

پھر کسی سیدھ، کسی سمت کا متلاشی سا
ایک ڈھلوان ہے اور اُس سے لڑھکتا ہُوا میں

دُور رہنے ہی کی اک یہ بھی صفت ہے شاید
لگ رہا ہوں جو تری سمت لپکتا ہُوا میں

کہنے آیا ہوں تجھے آج بھی پھر سے کوئی بات
وہی رُکتا ہُوا، ویسا ہی اٹکتا ہُوا میں

اجنبی ہوں مگر اِس بار تو آ نکلوں گا
بس ترے شہر کی گلیوں میں بھٹکتا ہُوا میں

پھیلتے جاتے ہیں سارے مرے اندر باہر
بجھ نہ جاؤں اِن اندھیروں میں چمکتا ہُوا میں

چھوڑ بیٹھا ہوں وہ گھر لیکن ابھی تک شاید
در و دیوار سے رہتا ہوں جھلکتا ہُوا میں

مطمئن رہیے، چکاچوند یہ بس عارضی ہے
بجھنے والا ہوں کوئی دم میں بھڑکتا ہُوا میں

پھول ہی اور طرح کا ہوں، ظفرؔ کیا کیجے
چشمِ احباب میں کانٹا سا کھٹکتا ہُوا میں

کسی اُمید، کسی انتظار میں ہونا
ہمیشہ اپنے ہی گرد و غبار میں ہونا

ابھی ہے دونوں طرف کی خبر مجھے درکار
یونہی نہیں یہ مرا آر پار میں ہونا

جو چاہتا تو یقیناً نہیں تھا ناممکن
کہیں تمھارے شمار و قطار میں ہونا

جہاں تہاں مرے ٹکڑے بکھرتے جاتے ہیں
بُرا نہیں یہ مرا انتشار میں ہونا

یہی طواف ملاقات کے برابر ہے
مجھے بہت ہے تمھارے مدار میں ہونا

ہزار طرح کی آزادیوں سے بڑھ کر ہے
تمھاری قید، تمھارے حصار میں ہونا

کوئی کہے مرے کس کام کی ہے یکتائی
اگر نہیں مرا ہونا ہزار میں ہونا

بھلے کہیں بھی نہ پہنچوں کہ جانے کیوں مجھ کو
ابھی پسند ہے اس رہ گزار میں ہونا

بھٹک رہا ہے جو بے کار، چاہتا ہے ظفرؔ
تمھارے ساتھ کسی کاروبار میں ہونا

بکھرے تھے مرے خواب، قطار اُس نے کیا ہے
یوں اپنے ہی لوگوں میں شمار اُس نے کیا ہے

ہمسایۂ دل میں ہیں کچھ ایسے بھی علاقے
بھولے سے جنھیں، باغ و بہار اُس نے کیا ہے

آگے نہیں کچھ بھی، وہ بُجھاتا رہا مجھ کو
دریائے تماشا سے جو پار اُس نے کیا ہے

کس کو نہیں معلوم کہ میں ہی وہ فلک تھا
جس پر سے کئی بار اُتار اُس نے کیا ہے

جب جانتا تھا اُس کی ادائی نہیں ممکن
کیوں پھر بھی مرے ساتھ اُدھار اُس نے کیا ہے

دُشوار بھی کافی تھا مگر جانیے پھر کیوں
اِس راہ سے اپنا یہ گزار اُس نے کیا ہے

اُس کی جو پرانوں پہ توجہ نہیں اتنی
لگتا ہے کوئی تازہ شکار اُس نے کیا ہے

یوں تھک سا گیا ہے وہ مہم آرائی سے شاید
اب ایک جگہ پر جو قرار اُس نے کیا ہے

اپنے ہی ظفرؔ چاروں طرف پھیلا ہُوا ہوں
میں خاک تھا اور مجھ کو غبار اُس نے کیا ہے

سارا تہ و بالا جو نظام اُس نے کیا ہے
دورانِ تعارف یہی کام اُس نے کیا ہے

تھا کوئی سبق مجھ کو سکھانے کا اشارہ
اور میں یہی سمجھا کہ سلام اُس نے کیا ہے

مرنے کی بھی اے کاش نکالے کوئی تدبیر
ورنہ مرا جینا تو حرام اُس نے کیا ہے

پرہیز ہو مجھ سے کہ ہو اوروں سے ملاقات
جو کام کیا ہے سرِ عام اُس نے کیا ہے

فرمائشیں اپنی بھی مناسب نہیں لگتیں
اِس پختگی میں بھی مجھے خام اُس نے کیا ہے

میرا تو فقط نام ہی بدنام ہے، ورنہ
جو کچھ بھی ہُوا ہے وہ تمام اُس نے کیا ہے

بیگارِ محبت کبھی لیتا بھی وہ مجھ سے
کہنے کو تو خاص اپنا غلام اُس نے کیا ہے

دریا ہے کہ آئینے بہے جاتے ہیں دیکھو
یہ کون سی لہروں پہ خرام اُس نے کیا ہے

ہے شہر سے اتنا ہی تعلق ظفرؔ اپنا
جب ہم نے کیا کوچ، قیام اُس نے کیا ہے

آخر مرا جینا تو محال اُس نے کیا ہے
کافی ہے جو اتنا بھی خیال اُس نے کیا ہے

روتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑتا ہوں خود پر
اِس عمر میں جیسا مرا حال اُس نے کیا ہے

آیا ہے اچانک تو اُڑایا ہے مرا رنگ
اور شرم سے مُنہ اپنا بھی لال اُس نے کیا ہے

میں سوچتا رہتا ہوں جواب اِس کا شب و روز
پیدا کوئی مشکل ہی سوال اُس نے کیا ہے

میں نیست و نابود تھا اِس خاک پہ یک سر
مجھ کو مرے ہونے کی مثال اُس نے کیا ہے

تھک جاتا ہوں میں سوچتا ہی سوچتا اُس کو
اِس طرح سے بھی مجھ کو نڈھال اُس نے کیا ہے

جس کا کوئی مطلب ہے نہ مقصد ہے کوئی خاص
اِس عشق پہ تھوڑا سا ملال اُس نے کیا ہے

میرے لیے ممکن تھا کہاں رابطہ کرنا
سچ پوچھیے تو یہ بھی کمال اُس نے کیا ہے

مشکل بھی نہیں تھا یہ ظفرؔ کے لیے اتنا
جس وصل کی حسرت میں وصال اُس نے کیا ہے

کبھی اقرار سے دیکھا، کبھی انکار سے دیکھا
مجھے اُس شوخ نے اِس بار پھر سے پیار سے دیکھا

حقیقت میں تو اس کا شہر میں ہونا ہی کافی تھا
نہ جانے کیوں اُسے ہم نے بڑے اصرار سے دیکھا

ہمارے صحن میں بھی کاش لگ سکتی یہی رونق
جو نظارہ ابھی ہم نے تری دیوار سے دیکھا

سروکار اِس سے کچھ تھا ہی نہیں یعنی اُسے ہم نے
کبھی گفتار سے پرکھا، کبھی کردار سے دیکھا

محبت میں تمھارا اس قدر نایاب ہو جانا
یہاں ہم نے تمھاری گرمیِ بازار سے دیکھا

نظر آتا ہمیں دریا میں پانی کی جگہ کچھ تو
کبھی اِس پار سے دیکھا، کبھی اُس پار سے دیکھا

یہ دنیا اجنبی ہے اب بھی حالاں کہ اِسے ہم نے
کبھی آسان سے جانا، کبھی دُشوار سے دیکھا

سفر بھی ہے وہی اور فاصلہ بھی ہے وہی اب تک
محبت میں تجھے ہم نے تری رفتار سے دیکھا

ظفرؔ ممکن نہیں تھی رونمائی شعر کی لیکن
یہ چہرہ ہم نے آخر قلتِ اظہار سے دیکھا

جھوٹ موٹ اُس کی جو دل میں دشمنی پالی گئی
اِس دفعہ تو اپنی یہ تدبیر بھی خالی گئی

جانتے تھے کیا ہے یک طرفہ محبت کا وبال
اور کہاں تک اِس اکیلے ہاتھ کی تالی گئی

ہوتے ہوتے دل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
صبح کا جلوہ گیا اور شام کی لالی گئی

رہ گئی ہیں ہر طرف نادیدنی شکلیں یہاں
ایک ہی تھی وہ بھی صورت دیکھنے والی گئی

کام ہی اُس نے کبھی کر کے نہیں اپنا دیا
اور اُس کی بات بھی ہم سے نہیں ٹالی گئی

عمر بھر پھرتے رہے اُس بے خبر سے دُور دُور
یوں محبت کی طرح کوئی نئی ڈالی گئی

کس کے آنے اور ٹھہرنے کی تھی وہ افواہ جب
شام سے پہلے ہی گھر میں رات کروالی گئی

لوگ میرے سامنے خوش حال بھی ہوتے گئے
عشق تھا جیسا بھی پھر اُس کی نہ بدحالی گئی

وہ تو اپنی ہی کسی دنیا میں رہتا ہے، ظفرؔ
بات بس اتنی ہی تھی جو دل کو سمجھا لی گئی

روشنی سے رنگ ہم آہنگ ہونا ہے ابھی
دیکھ کر وہ چہرہ سب کو دنگ ہونا ہے ابھی

آئے گا آخر محبت میں کھلا موسم بھی ایک
کافی عرصے کے لیے دل تنگ ہونا ہے ابھی

شاید اُس کو راہ پر لانا بہت آساں نہ ہو
اُس کی خاطر کوئی پیدا ڈھنگ ہونا ہے ابھی

جانتے ہیں بند سارے راستے کھل جائیں گے
ایک دن ظاہر کوئی نیرنگ ہونا ہے ابھی

عرضِ مطلب سن کے اُس کے طور ہی کچھ اور تھے
موم جیسا تھا تو اُس کو سنگ ہونا ہے ابھی

ہونے ہی والا ہے اپنے جھوٹ کا پردہ بھی چاک
اُس کی جانب سے بھی عُذرِ لنگ ہونا ہے ابھی

پوچھتے پھرنا ہے اُس نے سب ہمارا حسب و نسب
راہ کی دیوار نام و ننگ ہونا ہے ابھی

بے تکلف اُس کو بھی ہونا پڑے گا ایک دن
اور اس دل نے بھی شوخ و شنگ ہونا ہے ابھی

امن بھی ہوتا رہے گا بعد میں قائم، ظفرؔ
اس سے پہلے میری اُس کی جنگ ہونا ہے ابھی

آپ کے ہاتھوں مرا نقصان ہونا ہے ابھی
کام یہ کچھ اور بھی آسان ہونا ہے ابھی

آپ نے کچھ عدل تو کر ہی دیا ہے میرے ساتھ
تھوڑا تھوڑا اب کوئی احسان ہونا ہے ابھی

رات دن رونق لگی رہتی ہے دل کے درمیاں
یعنی دل کے درد کو دالان ہونا ہے ابھی

پھر ہی آئیں گے پریشانی کے سارے مرحلے
پہلے اُس کو دیکھ کر حیران ہونا ہے ابھی

کچھ بہم پہنچائے گا تازہ ہوا اور روشنی
میں نے آبادی کا روشن دان ہونا ہے ابھی

رُخ کہیں کر جائیں گے ایک ایک کر کے جانور
اَور یہ جنگل اور بھی سنسان ہونا ہے ابھی

گھاس کو پامال ہو جانا ہے آخر ایک دن
اَور میرے باغ کو ویران ہونا ہے ابھی

ہم جسے اپنے تئیں سمجھے تھے بس ہونے کو ہے
اصل میں اُس کام کا امکان ہونا ہے ابھی

کام آنی ہے محبت کی توانائی، ظفرؔ
جس کی خاطر جسم کو بے جان ہونا ہے ابھی

اُس سے ملنا ہے ابھی، ناشاد ہونا ہے ابھی
وہ بھی کتنے مرحلوں کے بعد ہونا ہے ابھی

کون ہے وہ جس کے کاکل کی اسیری کے لیے
دل کو خالی طبع کو آزاد ہونا ہے ابھی

سچ تو یہ ہے اُس سے اظہارِ محبت کے لیے
لفظ کوئی اور ہی ایجاد ہونا ہے ابھی

لکھ تو رکھے ہیں کہیں پر اُس کی آنکھیں اُس کے ہونٹ
ہم کو وہ چہرہ زبانی یاد ہونا ہے ابھی

کر چکے ہم تو یہاں ساری ہی اپنی عرضِ شوق
آپ کی جانب سے کچھ ارشاد ہونا ہے ابھی

دوسروں کی بات پر کرنا ہے اُس نے اعتبار
اور دعویٰ اپنا بے بنیاد ہونا ہے ابھی

حاشیہ بردار ہم بھی ہیں مگر اپنا یہاں
نام اُس فہرست میں ایزاد ہونا ہے ابھی

فکر مت کیجے کہ اتنے دشمنوں کے درمیاں
آپ کا ہمدرد بھی ایک آدھ ہونا ہے ابھی

شہر کو سارے مکینوں کی ظفرؔ ہجرت کے بعد
پہلے غیر آباد، پھر برباد ہونا ہے ابھی

ہُوا نہیں ہے تو امکان ہو بھی سکتا ہے
وہ معجزہ جو کسی آن ہو بھی سکتا ہے

ہمارے پاس وسائل ہی کچھ نہیں، ورنہ
یہ انتظام، یہ سامان ہو بھی سکتا ہے

درشت خُو تو نہیں، تھوڑا لالچی ہے یہ دل
جو تیرے تابع فرمان ہو بھی سکتا ہے

تمھاری طبع سخاوت پسند اگرچہ نہیں
کسی غریب پہ احسان ہو بھی سکتا ہے

وہ مرحلہ جسے مشکل سمجھ رہا تھا بہت
جو آپ چاہیں تو آسان ہو بھی سکتا ہے

بہت بچائے بھی رکھتا ہوں شیشۂ دل کو
مگر کبھی تو یہ نقصان ہو بھی سکتا ہے

وہ ہو چکا ہے جو کافرِ تری پرستش سے
کبھی دوبارہ مسلمان ہو بھی سکتا ہے

جو اُس کو اور بھی مہمل بنا کے رکھ دیتا
وہ داستان کا عنوان ہو بھی سکتا ہے

میں ڈرتا رہتا ہوں موسم کی مار سے کہ ظفرؔ
یہ باغ ہے تو بیابان ہو بھی سکتا ہے

چھپا ہُوا ہے نمودار ہو بھی سکتا ہے
یہ شہر خواب سے بیدار ہو بھی سکتا ہے

دلِ خراب کے پلّے تو کچھ نہیں، لیکن
یہ اُس پری کا خریدار ہو بھی سکتا ہے

جو تم سے رہتا ہے ظاہر میں بے نیاز بہت
وہی تمھارا طلب گار ہو بھی سکتا ہے

محبت اپنی جگہ، احترام اپنی جگہ
سو، فکر مند ہوں، انکار ہو بھی سکتا ہے

پلٹ بھی سکتی ہے بازی ہماری جیتی ہُوئی
یہ در دوبارہ سے دیوار ہو بھی سکتا ہے

ہزار میں نظر آتا ہوں اتنا صحت مند
مگر مجھے کوئی آزار ہو بھی سکتا ہے

ہوائے شوق ابھی تک تو کاروبار نہیں
یہ راستہ ہے تو بازار ہو بھی سکتا ہے

جو ہم نے شعر میں طے کر دیا تھا اپنے لیے
زمانے بھر کا وہ معیار ہو بھی سکتا ہے

ظفؔر جو کارِ محبت میں ہے بہت مصروف
کسی سبب سے یہ بے کار ہو بھی سکتا ہے

منکر ہے آج کل جو سلام و پیام سے
منسوب کر رہا ہوں کتاب اُس کے نام سے

دن ڈوبنے کا یہ جو مجھے انتظار ہے
کچھ کام ہے تمھارے علاوہ بھی شام سے

کچھ سُوجھتا نہیں کہ اندھیرا ہے اِس قدر
ایسے میں کوئی چاند ہی چمکاؤ بام سے

دل پھڑپھڑانے لگتا ہے کیوں جانے ایک دم
ویسے تو پھر رہا ہوں بہت دُور دام سے

میری ضروریات بھی کچھ اور ہو گئیں
کچھ مطمئن نہیں ہوں ترے انتظام سے

ہم نے رکھا تھا یاد شرارت سے بیش و کم
اُس نے بُھلا دیا ہے بڑے احترام سے

مصروفِ کار تو وہاں رہتے ہو رات دن
آ جاؤ اِس طرف بھی کسی روز کام سے

اک خاص بات ہے جو کسی اور میں نہیں
ویسے تو آدمی نظر آتے ہو عام سے

اونچی نکل گئی تھی عمارت بہت، ظفرؔ
میں بچ نہیں سکا ہوں تبھی انہدام سے

ہمارے ہو گئے ہیں اور تمھارے ہو گئے ہیں
یہاں جو کام تھے سارے کے سارے ہو گئے ہیں

کبھی یک بارگی بھی ہو نہیں پائے تھے جو کام
وہی ہونے پہ آئے تو وہ بارے ہو گئے ہیں

فقط اک ریت کی تصویر باقی رہ گئی ہے
یہاں دریاؤں کے پانی کنارے ہو گئے ہیں

بچی ہے اہلِ ساحل کے لیے جھلمل ذرا سی
اگر اپنے سفینے بھی ستارے ہو گئے ہیں

تمھاری دست گیری کا اثر ایسا ہُوا ہے
کہ پہلے سے زیادہ ہی بچارے ہو گئے ہیں

لرزتا ہے مرے اندر خسِ خوابِ محبت
کہ میری شام کے ٹکڑے شرارے ہو گئے ہیں

سہولت سے تمھارا وقت جیسا کٹ گیا ہے
اُسی صورت ہمارے بھی گزارے ہو گئے ہیں

بُھلا بیٹھے ہیں پہلے والا برتاؤ تمھارا
سو، ہم اک بار شاید پھر تمھارے ہو گئے ہیں

ظفؔر خود پر بھلا کرتے یہاں کب تک بھروسا
کہ ہمت ہار دی ہے، بے سہارے ہو گئے ہیں

مدّت سے کوئی بات، کوئی گھات ہی نہیں
کیا عشق ہے کہ شوقِ ملاقات ہی نہیں

اب کے مِلا جُلا تھا محبت کا ماجرا
کچھ شُکر بھی ہے ساتھ، شکایات ہی نہیں

کس وقت سوئیں اور اُسے یاد کب کریں
ہوتے ہیں اب جہاں وہاں دن رات ہی نہیں

اُس نے بھُلا دیا تو ہم اب اُس پہ کیا کہیں
کہنے کو اپنے پاس کوئی بات ہی نہیں

وہ خواب ہے کہ رہ گیا تعبیر کے بغیر
ہیں وہ سوال جن کے جوابات ہی نہیں

یہ شہر میں فساد جو برپا ہے چار سُو
کیسے کہوں کہ اِس میں ترا ہاتھ ہی نہیں

تُو نے تو اِن کے واسطے کیا کچھ نہیں کیا
یہ لوگ اصل میں جو ترے ساتھ ہی نہیں

دوزخ کو جا رہے ہیں کئی دوسرے بھی لوگ
اِس قافلے میں اہلِ خرابات ہی نہیں

گھیرا ہُوا ہے اس کی حدوں نے اِسے ظفرؔ
یہ شہر وہ ہے جس کے مضافات ہی نہیں

چار دن بات کا بَن بَن کے بگڑ جانا تھا
میرا اور آپ کا اتنا ہی تو افسانہ تھا

آپ جس دن مجھے ملنے کے لیے آئے تو
دھوپ بھی تیز تھی، موسم بھی جداگانہ تھا

ایک بے نام سے رشتے میں پرویا ہُوا ہوں
میں جو اِس کھیل میں اپنا تھا نہ بے گانہ تھا

رہیں اُس باغِ بدن سے مری آنکھیں روشن
صرف تھوڑا سا علاقہ ابھی اَن جانا تھا

جہاں کِھلتے ہیں تری بھُولی ہُوئی یاد کے پھول
دل کے انواح میں پھیلا ہُوا ویرانہ تھا

اتنے لوگوں میں اُسے بھی نہ لگی میری نظر
میں نے بھی اُس کو ذرا دیر سے پہچانا تھا

جانے کیوں ساتھ پریشان رکھا اُس کو بھی
میں نے جس شاخ پہ کِھلنا تھا نہ مُرجھانا تھا

دل کے مہمان تھے اتنے، تجھے اب کیا کہیے
کوئی کرنا تھا روانہ، کوئی ٹھہرانا تھا

ڈیرے ڈالے ہُوئے ہیں اب جہاں جنات، ظفرؔ
اُنھی اطراف میں اپنا بھی پری خانہ تھا

باتوں باتوں میں زمانہ جو گزارا کوئی تھا
ایسا لگتا ہے کہ اُس خواب میں سارا کوئی تھا

آپ مالک ہیں اگر صاف مُکرنا چاہیں
ہم تو یہ بھی نہیں کہتے کہ ہمارا کوئی تھا

نامکمل سی ملاقات ہی تھی وہ جس نے
ایک مٹتا ہُوا سا نقش اُبھارا کوئی تھا

ہم بھی سمجھے نہیں اور آپ بھی خاطر میں نہ لائے
در بہ در ہوتی ہَوا میں جو اشارہ کوئی تھا

آپ دیتا رہا آ کر درِ دل پر دستک
ایک ہی بار نہیں تھا وہ دوبارہ کوئی تھا

کشتیاں اپنی ہی غرقاب ہوئیں جس کے سبب
ایک اندر سے اُچھلتا ہُوا دھارا کوئی تھا

دُور تک دشت میں دیوار نہ تھی کوئی مگر
پھر بھی محسوس یہ ہوتا ہے سہارا کوئی تھا

منتظر ایک زمانہ رہا پانی کے لیے
ورنہ دریا تھا کہیں اور کنارا کوئی تھا

خوش رہے وہ بھی کہ بھٹکا گیا رستے سے، ظفرؔ
اِن اندھیروں میں جو ساتھ اپنے ستارہ کوئی تھا

خاکِ دل ہے یہ کسی کی بھی نہیں، میری ہے
جس جگہ آپ کھڑے ہیں وہ زمیں میری ہے

بندگی سے مجھے انکار بھی ہے اور دن رات
سنگِ در آپ کا ہے اور جبیں میری ہے

اس محبت پہ اجارہ بھی نہیں ہے میرا
جو کہیں اور کسی کی ہے، کہیں میری ہے

اُلجھے اُلجھے سے خیالات، بکھرتے ہوئے خواب
ہے جہاں آپ کی جاگیر، وہیں میری ہے

آپ آسان بنا سکتے تھے اب بھی جس کو
زندگی شہر میں دُشوار تریں میری ہے

خود ہی دوزخ میں لگایا ہوا ہے جی، ورنہ
جانتا بھی ہوں کہ وہ خُلدِ بریں میری ہے

اب جسے خانہ بدر کرنے لگا ہوں آخر
ہے وہ خواہش جو زمانوں سے مکیں میری ہے

کچھ رعایت مجھے دے رکھی ہے دُنیا نے یہاں
اور، کچھ وہ بھی ہے جو اپنے تئیں میری ہے

شامِ تنہائی ہو یا صبحِ جدائی ہو، ظفرؔ
یہاں جو چیز ہے میری وہ یہیں میری ہے

اور بھی وہ تو گرفتارِ مصیبت ہُوا تھا
اتنا خوش خوش جو ترے ہاتھ پہ بیعت ہُوا تھا

تُو نے پہلے ہی کئی جال بچھائے ہُوئے تھے
میں تو مشکل سے ہی آمادۂ اُلفت ہُوا تھا

راہ بُھولے ہیں ترے دل کے مسافر کیا کیا
ایک دن تُو جو نئے شہر کی زینت ہُوا تھا

رفتہ رفتہ کوئی چپ جیسی بھی لگتی گئی ہے
جس زمانے سے ترا راز امانت ہُوا تھا

اُن دنوں بھی نہیں تھا ہم کو جزا کا لالچ
کبھی اپنے لیے جب عشق عبادت ہُوا تھا

انتظار اب بھی اُسی کا ہے شب و روز تو کیوں
پھر نہ آنے کے لیے کوئی جو رخصت ہُوا تھا

اب وہی تمغۂ رُسوائی بنا آخرِ کار
کام جو اپنے لیے باعثِ عزت ہُوا تھا

عشق پر اب تو ہمیں خود بھی ہنسی آتی ہے
کہ یہ کیا کام تھا جو ہم کو ودیعت ہُوا تھا

بچ گیا عزتِ سادات کے صدقے میں ظفرؔ
غلطی سے جو گنہ گارِ محبت ہُوا تھا

جب سے مولا علی کے گاؤں میں ہوں
چادرِ فاطمہ کی چھاؤں میں ہوں

جتنی اونچی بھی ہو مری پرواز
یہ سمجھ لے کہ تیرے پاؤں میں ہوں

جن پہ لکھا گیا ہے نامنظور
میں کچھ ایسی ہی التجاؤں میں ہوں

بجلیوں میں مرا بسیرا ہے
میں اُڑتی ہوئی گھٹاؤں میں ہوں

سانس لینا بھی ہو گیا مشکل
جانے کس طرح کی ہواؤں میں ہوں

چھوڑ بیٹھا ہوں میں زمین اپنی
اور، اِن اجنبی فضاؤں میں ہوں

کون سی آفتوں کا سامنا ہے
اور محصور کن بلاؤں میں ہوں

یاد ہیں اپنے اَن کہے الفاظ
اپنی ہی اَن سنی صداؤں میں ہوں

خواہشوں نے کیا خراب ظفرؔ
کب سے اِن طُرفہ بیسواؤں میں ہوں

اگر اتنی بھی رعایت نہیں کی جا سکتی
صاف کہہ دو کہ محبت نہیں کی جا سکتی

آج کے بعد سے رکھیں گے کرایہ کا حساب
آپ سے اور مروّت نہیں کی جا سکتی

خود سے باہر نکل آئے تو ہے یہ بات الگ
اور، صدا تو کسی صورت نہیں کی جا سکتی

یوں تو معلوم ہے اُس کو بھی مرے گھر کا پتا
یہ الگ بات ہے زحمت نہیں کی جا سکتی

آپ کی سناکھ ہی کچھ اور طرح کی ہے جناب
آپ کے ساتھ شراکت نہیں کی جا سکتی

باغ ایسا ہے کہ گل گشت نہیں ہے ممکن
دشت ایسا ہے کہ وحشت نہیں کی جا سکتی

زندگی موت سے بدتر ہُوئی جاتی ہے یہاں
پھر بھی اس شہر سے ہجرت نہیں کی جا سکتی

کام جیسا بھی ہو کر سکتے ہیں آتے جاتے
مسئلہ یہ ہے کہ محنت نہیں کی جا سکتی

عشق یہ بھی تو کوئی دن کا ہے مہمان ظفرؔ
کیوں بھلا ترک یہ عادت نہیں کی جا سکتی

اِس کا انکار بھی حق میں تھا سراسر میرے
یہ جو حالات ہوئے جاتے ہیں بہتر میرے

ڈوبتا بھی نہیں ساحل پہ، اُترتا بھی نہیں
ناز کرتا ہے سفینے پہ سمندر میرے

کون تھا وہ جو رہا اپنے شب و روز میں گُم
مر گئے جس کی منڈیروں پہ کبوتر میرے

اک صدا سی کہیں رُکتی ہے مرے پاس آ کر
اک ہوا سی کوئی چلتی ہے برابر میرے

پھیلتا جاتا ہے جب دن کا اُجالا ہر سُو
بجھنے لگتے ہیں چمکتے ہوئے منظر میرے

میں اکیلا تھا سو اِس معرکے میں کام آیا
اور پیچھے ہی کہیں رہ گئے لشکر میرے

وہ کوئی چاند کا ٹکڑا بھی نہیں تھا لیکن
چاندنی اُس کی بُجھی رہتی ہے اندر میرے

سوکھ جاتا ہے یہ بہتا ہُوا پانی اکثر
اور ہر بار نکل آتے ہیں پتھر میرے

دھیان رکھتا ہوں ظفرؔ زخم تماشا کا بہت
پھر بھی ٹانکے کئی کُھل جاتے ہیں اکثر میرے

بات کرنے کی اجازت بھی نہیں چاہتے ہم
تھی جو حاصل وہ سہولت بھی نہیں چاہتے ہم

بارشِ لطف و کرم تو ہے بہت دُور کی بات
اب تو کچھ حسبِ ضرورت بھی نہیں چاہتے ہم

تھا کوئی چیز ترے عشق میں رُسوا ہونا
جانے کیوں اب تو یہ عزت بھی نہیں چاہتے ہم

چاہتے بھی ہیں تو پھر چاہتے کیا ہیں تجھ سے
خود سے کچھ اس کی وضاحت بھی نہیں چاہتے ہم

اپنی آواز کا بھی پھول کھِلا دے کسی دن
تجھ سے اتنی سی مروّت بھی نہیں چاہتے ہم

اپنے بھی مفت میں ہاتھ آئی تھی یہ دولتِ دل
اِس لیے اِس کی حفاظت بھی نہیں چاہتے ہم

یہ شب و روز کسی اور کے ہیں، اور تجھ سے
اِس امانت میں خیانت بھی نہیں چاہتے ہم

کفر سے اپنا سروکار بھی اتنا نہیں کچھ
اور، ایمان سلامت بھی نہیں چاہتے ہم

ایک اُلجھن میں پڑے رہتے ہیں دن رات ظفرؔ
اور اس کام سے رُخصت بھی نہیں چاہتے ہم

جتنا بھی سروکار تھا، چھوڑا نہیں میں نے
کم زور سا یہ تار بھی توڑا نہیں میں نے

جیسا تھا اِسی طرح سے بتلا دیا دل کو
تیرا وہ بیاں توڑا مروڑا نہیں میں نے

کپڑے بھی کبھی پھاڑ کے نکلا نہیں گھر سے
سر بھی کسی دیوار سے پھوڑا نہیں میں نے

یہ جُوئے قناعت کہ رواں ہے اُسی صورت
رُخ اِس کا کسی سمت بھی موڑا نہیں میں نے

پھر سوکھ ہی جانا تھا محبت کا یہ پودا
اِس پر جو لہو دل کا نچوڑا نہیں میں نے

جاگی تو کبھی آپ ہی جاگے گی بہرحال
سوئی ہُوئی قسمت کو جھنجھوڑا نہیں میں نے

ٹھوکر تری اعزاز تھا میرے لیے خود کو
ٹوٹا ہوں کچھ اِس طرح کہ جوڑا نہیں میں نے

شاید کہیں پڑ جائے کبھی اس کی ضرورت
خاشاکِ بدن کو ابھی اوڑھا نہیں میں نے

فریاد سی دل سے جو نکل آتی ہے آخر
دیکھو تو کیا ضبط بھی تھوڑا نہیں میں نے

ساری باتیں میں سرِعام بھی کر سکتا تھا
اِس طرح آپ کو بدنام بھی کر سکتا تھا

کوئی یلغار بھی ایسی تھی کہ میں ہار گیا
ورنہ حملے کو میں ناکام بھی کر سکتا تھا

بیچ میں رہنے دیا خوابِ محبت، ورنہ
میں اِس آغاز کو انجام بھی کر سکتا تھا

یہ محبت کی جو تُہمت سی اُٹھا رکھی ہے
اِس کے بدلے میں کوئی کام بھی کر سکتا تھا

یاد بھی ایک مشقت کی طرح تھی اور میں
اِسی دوران کچھ آرام بھی کر سکتا تھا

تھا فقط میرا غبار اپنے بدن پر اور میں
اِسی ملبوس کو احرام بھی کر سکتا تھا

اپنے دشمن کے لیے میرے لبوں پر اِس بار
وہ دُعا ہے جسے دُشنام بھی کر سکتا تھا

بھر دیا جس میں یہی شور گلی کوچوں کا
میں اِس آواز کو الہام بھی کر سکتا تھا

میرے اندر ہی اندھیرے ہیں کچھ اتنے کہ ظفرؔ
یہ جو دن ہے میں اِسے شام بھی کر سکتا تھا

سخن کرو نہ کرو، میں نے کچھ کہا تو نہیں
سو، خوش رہو کہ محبت مطالبہ تو نہیں

جُڑے ہُوئے نہ جدا ہیں جو آسمان و زمیں
کہیں ہمارا تمھارا یہ سلسلہ تو نہیں

خبر لگی ہو تمھیں جس طرح سے بھی اِس کی
ہماری آگ سے لیکن دُھواں اُٹھا تو نہیں

کسی خیال نے قائم رکھا ہُوا ہے مجھے
کہ زندگی کا ذریعہ فقط ہُوا تو نہیں

کہیں ہمارا پہنچنا اِسی سے ظاہر ہے
کہ چل رہے ہیں جو اِس پر یہ راستہ تو نہیں

بگولہ سا وہ ابھی دُور ہی سہی اُس کا
ہماری خاک سے کچھ اتنا فاصلہ تو نہیں

یہ مشکلات ہماری نہیں سبھی کی ہیں
کہ ہم بھی ساتھ ہیں سب کے، کہیں جُدا تو نہیں

یہ میل جُول جو دُنیا کے ساتھ ہے اتنا
کہیں تمھارا ہمارا معاملہ تو نہیں

ظفرؔ، ہماری ملاقات اپنے آپ سے ہے
کسی سے ملنے مِلانے کا سلسلہ تو نہیں

دشت میں موجِ صبا مانگتا ہوں
جانتا ہی نہیں کیا مانگتا ہوں

کچھ توجہ کی ضرورت ہے الگ
تھوڑی شنوائی جدا مانگتا ہوں

دو گھڑی کوئی اُڑانی ہے پتنگ
کسی جانب کی ہوا مانگتا ہوں

شرم کی بات ہے کیا اب اِس میں
کہ گداگر ہوں، کھڑا مانگتا ہوں

صرف تھوڑی سی جگہ چاہیے ہے
میں کوئی ارض و سما مانگتا ہوں

مہربانی کی ضرورت ہے مجھے
نہ محبت کا صلہ مانگتا ہوں

جو کہیں سے نہیں مِلتا مجھ کو
اپنی دہلیز پہ آ مانگتا ہوں

جُرم جو میں نے کیا ہی نہیں ہے
میں تو اُس کی بھی سزا مانگتا ہوں

گُم شدہ کوئی خدا ہے کہ ظفرؔ
خلق سے جس کا پتا مانگتا ہوں

کسی ہونے کا اشارہ ہُوا تو
ایک ہی بار دوبارہ ہُوا تو

راستہ بھول چکا ہوں گھر کا
اِس طرح میرا ستارہ ہُوا تو

یوں ہی پابند رہا اپنی جگہ
جانے کِس کِس کا پکارا ہُوا تو

خواب سا پھیلا ہُوا ہے ہر سمت
میرے اندر سے گزارا ہُوا تو

خس و خاشاک پڑا ہوں یوں ہی
کِس طرح کا یہ شرارہ ہُوا تو

کاروبار اُس نے کیا ہی نہیں تھا
اِس قدر جس کا خسارا ہُوا تو

آر ہی تھا نہ ترا پار کہیں
پانی آیا تو کنارہ ہُوا تو

تو کسی کا نہ ہُوا، اور یہاں
سب سمجھتے تھے ہمارا ہُوا تو

کیسی بستی میں گِرا آ کے ظفؔر
کِس بلندی سے اُتارا ہُوا تو

شعر کہنے کا بہانہ ہُوا تُو
میری جانب جو روانہ ہُوا تُو

دُھول اور دُھوپ کے اِس موسم میں
دل پہ تنبو سا یہ تانا ہُوا تُو

مہربانی ہُوئی تیری مجھ پر
ورنہ بے مہر تھا مانا ہُوا تُو

میں نے چُھو کر نہیں دیکھا تجھ کو
میرے اندر ہی پُرانا ہُوا تُو

ہوئیں ناکامیاں میری آغاز
جب مرے شانہ بہ شانہ ہُوا تُو

اجنبی بن گیا پہلے کی طرح
دیکھا بھالا ہُوا، جانا ہُوا تُو

کہیں گُم ہو گئی آواز تری
یوں حقیقت سے فسانہ ہُوا تُو

رو سکا ہوں نہ تجھے گا ہی سکا
کوئی نوحہ نہ ترانہ ہُوا تُو

نہیں موجود ظفؔر اپنی جگہ
ہے کہیں اور زمانہ ہُوا تُو

کنارِ خوابِ گراں بار پر رُکا ہُوا ہوں
کسی رُکی ہُوئی رفتار پر رُکا ہُوا ہوں

مرے خلاف جو سازش تھی، بے خبر اُس سے
میں اہلِ شہر کے اصرار پر رُکا ہُوا ہوں

کٹے گا کیا سفر اتنے بڑے خرابے کا
ابھی تو اپنے ہی آثار پر رُکا ہُوا ہوں

میں جا رہا تھا کہیں اور چھوڑ کر آنکھیں
کسی کے وعدۂ دیدار پر رُکا ہُوا ہوں

پہنچ گئے ہیں کہاں سے کہاں تک اہلِ رضا
میں آج بھی ترے انکار پر رُکا ہُوا ہوں

دُکان دار دُکانیں بڑھا گئے اور میں
اُمیدِ گرمیٔ بازار پر رُکا ہُوا ہوں

کسی کی چھاؤں ہوں، چھایا ہُوا ہوں دشت بہ دشت
کسی کی دُھوپ ہوں دیوار پر رُکا ہُوا ہوں

کہ احترام سے واپس کروں یہ خلعتِ خاص
اِسی لیے ترے دربار پر رُکا ہُوا ہوں

سُبک سری کا ہے ایک اعتراف یہ بھی ظفرؔ
جو ابر سا کسی کہسار پر رُکا ہُوا ہوں

عمر موجود بھی تھی، اور گزاری بھی نہیں
دل سے مٹتی ہوئی تحریر اُبھاری بھی نہیں

کھیل جب ختم پہ آیا تو یہ بازی تھی کہ جو
ہم نے جیتی بھی نہیں، آپ نے ہاری بھی نہیں

کیا سے کیا ہوگئے ہو آپ بھی اب تک شاید
اور اگلی سی کوئی بات ہماری بھی نہیں

کوئی گٹھڑی سی اُٹھائے ہوئے پھرتا رہا میں
کہ جو بھاری بھی تھی اور سر سے اُتاری بھی نہیں

ذائقہ اور ہی کچھ اب کے محبت کا رہا
پانی میٹھا بھی نہ تھا اور یہ کھاری بھی نہیں

اِس سے رفتار کا اندازہ تو ہو سکتا ہے
کارواں جاتا ہے اور گرد و غباری بھی نہیں

جس کے کہنے سے میں یوں رُکنے لگا ہوں ہر بار
بات تھوڑی سی ہے یہ، ساری کی ساری بھی نہیں

وہ تو آدابِ محبت کا خیال آگیا تھا
ورنہ اِس طرح کا میں عقل سے عاری بھی نہیں

تم تو منظورِ نظر تھے ظفؔر اُس کے اتنے
بات پھر کیا ہے کہ سنتا وہ تمھاری بھی نہیں

رابطہ جتنا بھی اپنے اور بیگانے میں ہے
کچھ پتا چلتا نہیں جانے کہ اَن جانے میں ہے

ہے بہت اپنے لیے انکار کی خیرات بھی
لطف سارا اُس کے آگے ہاتھ پھیلانے میں ہے

مل کے بیٹھیں گے تو یہ گتھی بھی سلجھے گی کہیں
فرق ہی سارا سمجھنے اور سمجھانے میں ہے

خود ہی کافی ہے بہت اپنی تباہی کے لیے
ایک پتھر جو ہمارے آئنہ خانے میں ہے

کچھ مری مقدار بھی رہتی ہے اکثر بیش و کم
فرق بھی کچھ آپ کے بوسیدہ پیمانے میں ہے

صاف سیدھا راستہ منزل کو جاتا ہی نہیں
بات ساری، بات کو تھوڑا سا اُلجھانے میں ہے

وہ کسی کے پاس رُکنے اور ٹھہرنے میں کہاں
جو مزہ نزدیک سے ہو کر گزر جانے میں ہے

سوچتے ہیں فائدہ لوگوں کو پیغامِ سخن
راستے میں روک لینے میں کہ پہنچانے میں ہے

جھوٹ سارا بھر دیا عرضِ حقیقت میں ظفرؔ
اور سچی بات جتنی بھی تھی افسانے میں ہے

چھوڑیئے اِس کو، بُرائی میں کہ اچھائی میں ہے
فائدہ اپنا مگر ہنگامہ آرائی میں ہے

پیش رفت اپنی ابھی اتنی ہی ممکن تھی وہاں
اور اب دانائی بھی تھوڑی سی پسپائی میں ہے

اجنبی تھے اور دونوں خوش رہا کرتے تھے ہم
آج کی ساری خرابی اِس شناسائی میں ہے

اعتنائے خاص بھی کیوں کر نہ سمجھوں اِس کو آج
خود بھی وہ شامل اگر میری پذیرائی میں ہے

دُور تر اپنی رسائی سے ہوئی ہر شے یہاں
اک سی صورت محبت اور مہنگائی میں ہے

پہلے پہلے گُم سا ہو جانا یہ دونوں کا کہیں
اک فضا تنہائی کی بھی اپنی یک جائی میں ہے

اپنی اپنی مشکلیں کیا کیجیے دونوں کی ہیں
فرق تھوڑا سا ہی شہرت اور رُسوائی میں ہے

بے مزہ، بے کیف ہی رہ جانے والی ہے اگر
آپ کی ساری کی ساری بات سچائی میں ہے

صاحبِ سازِ سخن میں ہی نہیں تنہا ظفر
کافی اوروں کا بھی حصہ میری یکتائی میں ہے

ٹوٹ پھوٹ ایسی ہے اور ساری لگاتاری میں ہے
انتظار اتنا یہاں کس کی نمو داری میں ہے

کچھ ترا انکار دُنیا سے چھپایا بھی نہیں
کیا بتائیں اپنی عزت بھی اِسی خواری میں ہے

چھوڑنے والا نہیں میں بھی یہاں اپنی قطار
دیر ساری عمر کی ورنہ مری باری میں ہے

دل کسی بیگار پر ہی رکھ لیا ہوتا کہ یہ
کام کرنا چاہتا ہے اور بے کاری میں ہے

ایک دن اُس کی محبت سے مکر جانا ہے صاف
اختیار ایسا بھی کوئی اپنی لاچاری میں ہے

آخرش مایوس ہو کر چھوڑ دی میں نے دوا
اس لیے شاید ذرا سا فرق بیماری میں ہے

کچھ دکاں بھی شہر میں سب سے پرانی ہے یہاں
کچھ ملاوٹ بھی ہماری گرم بازاری میں ہے

کیا کروں دل کے فسوں سے یوں ہوں تنگ آیا ہُوا
جتنی بے چینی میں تھا اُتنی ہی بے زاری میں ہے

کام کوئی بھی ظفرؔ سے ہو نہیں پایا، مگر
جب بھی دیکھو کچھ نہ کچھ کرنے کی تیاری میں ہے

شاعر ہونا چاہتا ہوں
ظاہر ہونا چاہتا ہوں

میں بھی اگر اجازت ہو
حاضر ہونا چاہتا ہوں

تیرے عجائب خانے کا
زائر ہونا چاہتا ہوں

کہیں نہیں تھا، اب تیری
خاطر ہونا چاہتا ہوں

پہلے بھی ناکام ہُوا
اب پھر ہونا چاہتا ہوں

اُڑ کر واپس جانا ہے
طائر ہونا چاہتا ہوں

مان چکا ہوں اب تیرا
منکر ہونا چاہتا ہوں

تنگ پڑا ہوں نہ ہونے سے
آخر ہونا چاہتا ہوں

صابر ہو نہیں سکا ظفرؔ
شاکر ہونا چاہتا ہوں

وہ شعلہ بجھ گیا ہے کہ فرصت نہیں رہی
یوں بھی نہیں کہ دل میں محبت نہیں رہی

آدھی بھی کہہ سکیں تو غنیمت ہے آج کل
کھل کر وہ بات کرنے کی عادت نہیں رہی

گپ شپ ہے اپنے ساتھ ہی، اب رات ہو کہ دن
ہو کوئی ہم سخن بھی، یہ حاجت نہیں رہی

رہتے تھے کچھ نہ ہونے پہ حیران کس قدر
اب ہو بھی جائے کچھ تو وہ حیرت نہیں رہی

اچھا ہے، خود ہی کرلیا کرتے ہیں سارا کام
جب سے ہمیں کسی کی اجازت نہیں رہی

تنہائیوں نے مار دیا ہے اُسے یہاں
جس کی بھی اپنے آپ سے صحبت نہیں رہی

یوں ہو چکا ہے صاف حساب و کتابِ دل
اک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں رہی

پکڑے گئے تھے جس پہ کئی بار یار لوگ
اُس کام میں بھی کوئی قباحت نہیں رہی

مصروف کر رکھا ہے، ظفر زندگی نے یوں
مرجائیں، اس قدر بھی فراغت نہیں رہی

شورِ دریائے تماشا ہے، گزر جائے گا
اور پھر اپنے بیاباں میں اُتر جائے گا

رات خالی ہی رہے گی مرے چاروں جانب
اور یہ کمرہ ترے خواب سے بھر جائے گا

آج پیوستہ ہیں کچھ اور طرح سے دونوں
شاخ کے ساتھ ہی اِس بار شجر جائے گا

میں اِسی پر گزر اوقات کروں گا اپنی
کوئی لمحہ جو مرے پاس ٹھہر جائے گا

آن کی آن میں ہو جائیں گی شکلیں تبدیل
کوئی بھی اپنی طرف دیکھ کے ڈر جائے گا

ایک آواز بلائے گی کہیں سے سب کو
کوئی اندازہ نہیں کوئی کدھر جائے گا

واپسی کی بہت اُمید نہ رکھنا کوئی
تنگ آئے گا ہی باہر سے تو گھر جائے گا

سرد مہری کا ظفرؔ ہو گا کچھ ایسا عالم
دل کے اندر کا ستارہ بھی ٹھٹھر جائے گا

مار دیں گے تجھے اُس بزم میں بولا تو ظفرؔ
یہ بھی طے ہے کہ نہ بولے گا تو مر جائے گا

شادماں رہنا نہیں، ناشادماں رہنا نہیں
میں یہاں سے جا چکا ہوں اور وہاں رہنا نہیں

رات دن باتیں بنانے سے بھلا کیا فائدہ
کوچ کر سکتا ہے جس جس کو یہاں رہنا نہیں

مفت میں مارے گئے سارے، کسے معلوم تھا
چند روزہ ہے زمیں، اور آسماں رہنا نہیں

دیکھ لو جی بھر کے اِس بام و در و دیوار کو
بس مکیں رہ جائیں گے، باقی مکاں رہنا نہیں

داستاں ساری کی ساری گھومتی ہے جن کے گرد
ایک دن کو بھی زیبِ داستاں رہنا نہیں

میں تو بے نام و نشاں ہوں خود ہی اس دنیا میں آج
کیا بتا سکتا ہوں کس کس کا نشاں رہنا نہیں

رنگ ہے، پھیکا پڑے گا اور پھر اُڑ جائے گا
آج اگر رہ جائے بھی تو بعد ازاں رہنا نہیں

ایک دن میں نے بھی اپنی بات کرنی ہے یہاں
مستقل تو یہ مرا عجزِ بیاں رہنا نہیں

چاروں جانب سے اُنھی نے گھیر رکھا ہے ظفرؔ
ہم کہا کرتے تھے جن کے درمیاں رہنا نہیں

خیال میں نظر آنا کہ خواب میں ہونا
اِسی طرح کے حساب و کتاب میں ہونا

بہت زیادہ ضروری ہے مچھلیوں کی طرح
یہ رات دن مری آنکھوں کا آب میں ہونا

ہم اِس زمانے پہ ظاہر جو ہو نہیں سکتے
غلط نہیں یہ ہمارا حجاب میں ہونا

بہت دنوں میں ہمارے لیے ہُوا ممکن
ہوا کی طرح کسی پیچ و تاب میں ہونا

مرے علاوہ بھی لوگوں کو باور آیا ہے
یہ رنگ بن کے تمھارا گلاب میں ہونا

زمانے بھر سے وہی غیر حاضری اپنی
وہی ہمارا تمھاری جناب میں ہونا

رَلے مِلے ہُوئے رہنا اِنھی اندھیروں میں
کبھی نئی ہی کسی آب و تاب میں ہونا

گزارنی ہے بہت لاتعلقی میں یہ عمر
نہیں اب اور گناہ و ثواب میں ہونا

بہت رہا بھی ہوں لیکن یہ چاہتا ہوں ظفرؔ
ابھی کچھ اور سوال و جواب میں ہونا

یقیں مجھے ترے انکار سے نہیں آیا
یہ مرحلہ جو لگاتار سے نہیں آیا

اُسے بھی تیرے ہی کھاتے میں ڈال رکھا ہے
وہ زخم جو تری تلوار سے نہیں آیا

اِسی لیے تو کوئی اُس کو پوچھتا ہی نہیں
یہ مال وہ ہے کہ بازار سے نہیں آیا

میں تھک گیا ہوں شب و روز دستکیں دے کر
جواب کوئی بھی دیوار سے نہیں آیا

گزارہ کرنا پڑا ہے یہیں کے لوگوں سے
یہاں کبھی کوئی اُس پار سے نہیں آیا

ہر ایک مجھ کو خبردار کر رہا تھا یہاں
پیام یہ کوئی دو چار سے نہیں آیا

تو یاد کیوں ہیں مجھے اتنی ساری تفصیلات
اگر میں اپنے ہی آثار سے نہیں آیا

مآلِ کار اُسے لائی ہے میری خاموشی
جو میری گرمیٔ گفتار سے نہیں آیا

سجا ہُوا ہوں دُکانوں میں جانے کب سے، ظفرؔ
اشارہ کوئی خریدار سے نہیں آیا

سُخن کا سارا کرشمہ صدا کے نیچے ہے
ہَوا اک اور بھی میری ہَوا کے نیچے ہے

کبھی وہ ابرِ تماشا خدا کے اوپر تھا
اور اب یہ شور شرابہ خدا کے نیچے ہے

یہ ہو تو سکتا ہے کچھ قابلِ پذیرائی
مرا مطالبہ اب مدّعا کے نیچے ہے

کیا ہُوا ہے اُسی نے اِسے بہت روشن
یہ خاکِ دل جو ترے نقشِ پا کے نیچے ہے

میں اُس کی ذات سے مایوس ہو نہیں سکتا
قبولیت مرے دستِ دعا کے نیچے ہے

چڑھا تو اُس کی چمک پھیل جائے گی ہر سُو
وہ چاند ابھی مری ظلمت سرا کے نیچے ہے

پڑی ہُوئی ہے کہیں پر کسی سبب کے بغیر
اُمید جو اسی بیم و رجا کے نیچے ہے

ہمارے وہم و گماں سے ہے دُور تر ورنہ
زمانہ اور بھی صبح و مسا کے نیچے ہے

رکاوٹوں میں بھی کیا کیا جھلک رہا تھا، ظفرؔ
وہ رنگ سا جو کسی کی قبا کے نیچے ہے

کوئی نظارہ کُھلتے بند ہوتے باب سے دیکھا
نظر سے خواب دیکھا اور نظر کو خواب سے دیکھا

اُسی لمحے میں ہم کو زندگی کے پڑ گئے لالے
کبھی ہم نے جو اپنے آپ کو احباب میں دیکھا

کوئی دم میں ہوس آنکھوں سے باہر کو چھلکتی تھی
کہ پہلے تو بہت اُس کو ادب آداب سے دیکھا

کہیں پانی نہیں تھا، بس روانی ہی روانی تھی
اِنھی آنکھوں سے پھر غرقاب کو پایاب میں دیکھا

ہماری ہی طرح کے اور کچھ مینڈک تھے باہر بھی
نظر بھر کر جو ہم نے ایک دن تالاب میں دیکھا

زیادہ فرق دونوں میں کوئی تھا ہی نہیں یک سر
تمھاری چاندنی کو رات بھر مہتاب میں دیکھا

بہت کچھ اور بھی پردے ہٹے بے خواب آنکھوں سے
ترے ہونے کو ہم نے جس گھڑی نایاب میں دیکھا

جو پوشیدہ رہا اپنی نظر سے ایک عرصے تک
وہ کیا کچھ تھا جو اَب کے عالمِ اسباب میں دیکھا

ظفؔر جو کچھ دِکھایا تھا کسی کی تازہ کاری نے
وہی اپنے تھکے ٹوٹے ہوئے اعصاب سے دیکھا

بات ہے ایسی محبت، بعد میں تولی گئی
اور اِس کے ساتھ پہلے ہی کہیں بولی گئی

چادرِ غربت نکل آئی ہے کیا شفاف و صاف
داغ لگتے ہی جو سب کے سامنے دھولی گئی

وہ سیاہی بھی نہیں تھی، وہ اُجالا بھی نہ تھا
روشنی سی ایک اندھیری رات میں گھولی گئی

اور کیا کرتے کہ دن بھر کے تھکے ہارے تھے ہم
خواب سا دیکھا گیا اور نیند سی سولی گئی

راستوں کے پیچ وخم میں ہیں کبھی مارے گئے
ورنہ ہم سے آگے آگے بھی کوئی ٹولی گئی

اور تو کچھ ساز و رخت اپنے تئیں تھا ہی نہیں
آرزو تھی ایک وہ بھی بیٹھ کر رو لی گئی

زندگی کی فصل ابھی تک لہلہاتی تھی، مگر
کھیت جو خالی تھا اُس میں موت ہی بولی گئی

لاد کر بھجوائی ہے ہر شے نئے گھر کی طرف
جو بچی اپنے سروں پر آپ ہی ڈھو لی گئی

بند ہی رہنا تھا اِس بھیدوں بھرے دل کو، ظفرؔ
یہ گرہ جو آج تک ہم سے نہیں کھولی گئی

ایک ہی منظر ہے اور اِس کو بدلنا ہے ابھی
گھر میں رہنے کے لیے گھر سے نکلنا ہے ابھی

چاند، سورج اور ستاروں پر ہے میری دسترس
چار دن ایسے کھلونوں سے بہلنا ہے ابھی

خاکِ دل بنجر ہے اور آب و ہوا ناسازگار
اِس میں لگتا ہے کوئی پودا سا پلنا ہے ابھی

یہ جو لگتے ہیں مرے دریا و صحرا پُرسکوں
ریت نے اُڑنا ہے، پانی نے اُچھلنا ہے ابھی

ہیں سبھی میری نظر میں راستے کے پیچ و خم
آخر اپنے خواب نے آگے بھی چلنا ہے ابھی

ڈھل گئے تھے خود تو شاید اور ہی سانچے میں آپ
اور، ہم نے آپ کے سانچے میں ڈھلنا ہے ابھی

آ کے اپنے وقت پر ہی وہ سنبھالے گا، مگر
تھوڑے عرصے کے لیے خود ہی سنبھلنا ہے ابھی

میں نے خود کو ہے بہت اوقات میں رکھا ہُوا
جانتا ہوں دوپہر ہوں، میں نے ڈھلنا ہے ابھی

بس ذرا دھمکا رہا ہوں شہر والوں کو، ظفرؔ
اصل میں جن کے سروں سے میں نے ٹلنا ہے ابھی

بات کرنی ہے ابھی، اصرار ہونا ہے ابھی
اُس کی جانب سے کُھلا انکار ہونا ہے ابھی

کچھ توجہ کارِ دُنیا پر بھی دینی ہے ضرور
ہم نے اُس کے خواب سے بیدار ہونا ہے ابھی

راستے سب رفتہ رفتہ بند ہوتے جائیں گے
ہے یہ دروازہ اِسے دیوار ہونا ہے ابھی

ہو چکے فی الحال تو آرام سے، نادم ذرا
کچھ نہ کرنے کے لیے تیار ہونا ہے ابھی

خلق نے ہی اِس قدر مصروف رکھا ہے ہمیں
اور، اپنے آپ سے دوچار ہونا ہے ابھی

جانتا ہوں دل اگر آہستہ رَو ہے کیا ہُوا
اک دن اِس موج کو منجدھار ہونا ہے ابھی

یہ جو تھوڑی سی توجہ ہے اِسی پر بس نہیں
اُس نے اپنے درپئے آزار ہونا ہے ابھی

درمیاں دریا کے ہیں ٹھہرے ہُوئے ہم، کیا بتائیں
آر ہونا ہے کہیں یا پار ہونا ہے ابھی

لوگ ہیں جن سے ابھی ملنا ہے لوگوں سے الگ
لفظ ہیں جن کا ظفرؔ اظہار ہونا ہے ابھی

اِس نئے آغاز کا انجام ہونا ہے ابھی
ہُوئی ہیں باتیں ہی باتیں، کام ہونا ہے ابھی

آپ کے بھیجے ہوئے نسخے کا استعمال ہم
کر رہے ہیں روز اور، آرام ہونا ہے ابھی

اُس کے آگے کر ہی دیتی ہے کبھی عرضِ نیاز
یعنی اپنی پختگی نے خام ہونا ہے ابھی

ہے بہت فی الحال اپنی دال دلیہ پر نظر
کوئی دن میں اُس کے زیرِ دام ہونا ہے ابھی

رفتہ رفتہ مچنے والا ہے یہاں چڑیوں کا شور
ہوتے ہوتے اِس شجر نے شام ہونا ہے ابھی

اپنی اپنی سوچ ہے اور اپنا اپنا سلسلہ
یہ سزا میرے لیے انعام ہونا ہے ابھی

یہ ابھی آوارہ پھرتی ہے تو پھرنے دو اِسے
اِس محبت پر کسی کا نام ہونا ہے ابھی

کیا وہ دن ہوگا جو کروائیں گے ہم کو سنگسار
یہ تو خالی موردِ الزام ہونا ہے ابھی

نسلِ نو کو اور بھی گُم راہ کرنا ہے ظفرؔ
اور یہ طرزِ تکلّم عام ہونا ہے ابھی

اِس شہر کے ہجوم سے باہر بنایا ہے
ہم نے ہوائے تازہ میں اک گھر بنایا ہے

دیوار اِس کی روز رکاوٹ بنی رہی
آخر خیال و خواب میں اک در بنایا ہے

لگتی ہے محنت اپنی ٹھکانے اِسی طرح
تھوڑا ہے صبح کو جسے شب بھر بنایا ہے

اکثر ہی لوگ نقل مکانی کریں گے اب
اک شہر آسمان کے اوپر بنایا ہے

کچھ تجربہ بھی کام میں لایا ہوں بیش و کم
اب کے بہانہ پہلے سے بہتر بنایا ہے

باقی بھی جو ہے کام کبھی ہو ہی جائے گا
فی الحال اُس کے واسطے بستر بنایا ہے

ہم نے اِسی میں باغ لگانا ہے ایک دن
قدرت نے جس زمین کو بنجر بنایا ہے

باہر کے لوگ دیکھ نہیں پائیں گے اسے
جو کچھ بنا دیا ہے وہ اندر بنایا ہے

اس پر بکھیر دی ہے کوئی دُھند بھی ظفرؔ
تصویر میں عجیب جو منظر بنایا ہے

بکھرا ہُوا زمین پہ سارا ہی رنگ ہے
اُس نے تو آسماں سے اُتارا ہی رنگ ہے

وہ سبز ہے کہ سُرخ، ابھی کچھ پتا نہیں
میرے لیے تو اُس کا اشارہ ہی رنگ ہے

مجھ کو تو کوئی اِس سے زیادہ نہیں پتا
میں نے تو رنگ میں سے گزارا ہی رنگ ہے

دیتا ہے یا نہیں کوئی تقدیر کی خبر
بے رنگ آسماں پہ ستارہ ہی رنگ ہے

سختی سے اِس کو روک دیا ہوتا ایک بار
اب کے جو آرپار دوبارہ ہی رنگ ہے

جو کچھ دِکھائی دیتا ہے اِس پر نہ جائیے
آئے نہ جو نظر وہ نظارا ہی رنگ ہے

رنگینیٔ فضا کوئی بے وجہ تو نہیں
یہ سادگی میں سارا تمھارا ہی رنگ ہے

ہم نے تو احتیاط ہی رکھی ہے شہر میں
پھر بھی یہاں تمھارا ہمارا ہی رنگ ہے

پانی کے رنگ ریت ہُوئے اب تو اے ظفرؔ
دریا کے ساتھ ساتھ کنارہ ہی رنگ ہے

اِن دنوں آ ہی نکلتا ہے کوئی دیدار دن
ہو چلی آساں محبت کٹ گئے دُشوار دن

رات بھر چلنے کی تیاری میں رہتا ہوں، مگر
چل پڑوں تو سامنے آجائے گا دیوار دن

گھر کے برتن بیچ کر ہی کچھ خریداری کریں
رات کا پردہ گرا اور کُھل گیا بازار دن

چلتے چلتے رُک گیا ہے اور گزرتا ہی نہیں
کیا مصیبت بن گیا ہے آر ہو یا پار دن

اونچی نیچی گھاٹیوں میں پھنس گئے ہیں راہ رو
سوچتے رہتے ہیں آئیں گے کبھی ہموار دن

لوٹ آیا ہے یہ موسم رائگانی کا کوئی
ہیں وہی بے سُود راتیں، اور وہی بے کار دن

شام تک میرے کھنڈر میں چوکڑی بھرنے کے بعد
اپنے پیچھے چھوڑ جائے گا مرے آثار دن

پھر سے اپنی بار برداری رہے گی شام تک
میرے کاندھوں پر پڑا ہے پھر وہی انبار دن

اپنے اپنے کام میں لگ جائیں گے آخر، ظفرؔ
کاٹ کر یہ لوگ میرے سوگ میں دو چار دن

چھپا ہُوا جو نمودار سے نکل آیا
یہ فرق بھی ترے انکار سے نکل آیا

پلٹ پڑا جو میں سر پھوڑ کر محبت میں
تو راستہ اِسی دیوار سے نکل آیا

مجھے خریدنا کچھ بھی نہ تھا، اِسی خاطر
میں خود کو بیچ کے بازار سے نکل آیا

سرے سے جو کہیں موجود ہی نہ تھا، آخر
وہ نقص بھی مرے کردار سے نکل آیا

بہت سے اور طلسمات منتظر ہیں مرے
اگر کبھی ترے اسرار سے نکل آیا

مجھے بھی دے رہے تھے خلعتِ وفا لیکن
نظر بچا کے میں دربار سے نکل آیا

نئی ہوا نئے آفاق ہیں اسی کے لیے
جو آج اُڑتی ہُوئی ڈار سے نکل آیا

ابھی تو اپنے کھنڈر ہی کی سیر تھی باقی
یہ تُو کہاں مرے آثار سے نکل آیا

اُسی کو ایک غنیمت قرار دوں گا، ظفرؔ
جو ایک شعر بھی طومار سے نکل آیا

مت سمجھو وہ چہرہ بھول گیا ہوں
آدھا یاد ہے، آدھا بھول گیا ہوں

یاد ہے کہاں سے لایا تھا میں اُس کو
اور کہاں رکھا تھا، بھول گیا ہوں

اور تو سب کچھ نقش ہے میرے دل پر
لیکن اُسے بُھلانا بھول گیا ہوں

حافظہ اتنا ہُوا خراب کے آخر
سب کچھ رفتہ رفتہ بھول گیا ہوں

رٹا ہُوا تھا ایک سبق جو میں نے
وہ بھی اچھا خاصا بھول گیا ہوں

اپنا گھر ہی ڈھونڈ رہا ہوں کب سے
واپس آ کر کیسا بھول گیا ہوں

یادداشت کا خانہ ہُوا ہے خالی
تھا جو اِس میں سارا بھول گیا ہوں

یہ پوچھو کچھ یاد بھی ہے اب مجھ کو
پوچھ رہے ہو کتنا بھول گیا ہوں

لوگوں کو تو یاد، ظفر کیا ہو گا
میں ہی نام تمھارا بھول گیا ہوں

جو بے نیازی تھی اُس کو دوچند کر دیا ہے
تمام سلسلۂ عشق بند کر دیا ہے

تمھارے خواب کو اُلٹا دیا ہے تنگ آ کر
پسند تھا جو اُسے ناپسند کر دیا ہے

جسے ہم اپنے لیے اک زیاں سمجھتے تھے
وہی تمھارے لیے سُود مند کر دیا ہے

جو فائدہ ہمیں امکان تھا پہنچنے کا
خوشی سے ہم نے اُسے بھی گزند کر دیا ہے

خوشی ہمیں جو میسر تھی بددعائی ہوئی
تمھارے غم میں اُسے ارجمند کر دیا ہے

یہی بہت ہے جو دن رات کی پرستش سے
تمھارا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے

تمام تلخیاں پی لی ہیں گھول کر ہم نے
کوئی تبسمِ جاں زہرخند کر دیا ہے

جو بے دلی ہمیں راس آ گئی ہے آخرِ کار
یہ زہر اپنے لیے میں نے پسند کر دیا ہے

یہ لاتعلقی تھی چھت، ظفر بہت اونچی
ارادہ کر کے اِسے بھی کمند کر دیا ہے

کبھی اندر، کبھی باہر نہیں تھے
اور، اپنے بھی برابر نہیں تھے

کس طرح کا تھا یہ ہونا اپنا
یعنی ہم تھے بھی تو اکثر نہیں تھے

دل میں طوفان اُٹھے کیوں، ہم تو
آب جُو ہی تھے، سمندر نہیں تھے

کب سے اوراقِ نظر تھے خالی
اور، کسی سمت بھی منظر نہیں تھے

ہم نے ایمان بھی بیچا ہُوا تھا
اور، اپنے تئیں کافر نہیں تھے

کیوں مخالف ہُوئی دُنیا اپنی
ہم کچھ اوروں سے تو بہتر نہیں تھے

جو بھی تھے، آپ ہمارے تو کبھی
نہیں تھے، اور برابر نہیں تھے

جب تھے نایاب ہمارے لیے آپ
کیا کسی کو بھی میسر نہیں تھے

ہم ہی وہ بند مکاں تھے کہ ظفرؔ
جس میں دیواریں تھیں اور در نہیں تھے

یہ جو سر پر سوار ہوں اتنا
اور پھر بار بار ہوں اتنا

مہربانی اب اور کیا مانگوں
پہلے ہی شرم سار ہوں اتنا

بیٹھتے بیٹھتے ہی بیٹھوں گا
چاروں جانب غبار ہوں اتنا

معتبر شہر میں نہیں مجھ سا
اور بے اعتبار ہوں اتنا

کوئی تو ڈالتا نکیل مجھے
آج کل بے مہار ہوں اتنا

سخت دیوانہ بھی ہوں اور اپنے
کام میں ہوشیار ہوں اتنا

بھول بیٹھا ہوں میں اگر اُس کو
کس لیے بے قرار ہوں اتنا

توڑ بیٹھا ہوں جب کناروں کو
اس لیے بے کنار ہوں اتنا

درمیاں میں پھنسا ہُوا ہوں، ظفرؔ
آر ہوں اور نہ پار ہوں اتنا

بے نیازی ہی زیادہ نہ ضرورت کم ہے
التوا میں ہے ملاقات کہ فرصت کم ہے

دل میں رونق تو لگی رہتی ہے اکثر، لیکن
اُس پری چہرہ کی اِس گھر میں سکونت کم ہے

اِس اُداسی میں ہے کچھ ہاتھ کسی اور کا بھی
کچھ ہمیں آپ بھی خوش رہنے کی عادت کم ہے

روز اُس کارگہِ ناز میں ہوتا ہوں جہاں
کام کافی ہے مگر اُس کی اجازت کم ہے

آئنہ صاف بھی ہو سکتا ہے رفتہ رفتہ
کچھ دنوں سے جو مرے دل میں کدورت کم ہے

کوئی بے فائدہ ڈھونڈے نہ پناہیں کہ یہاں
جان بچتی ہے وہی جس کی حفاظت کم ہے

ہم نے اُس بزم کا دستور نرالا دیکھا
ہے وہی صدر نشیں جس کی حمایت کم ہے

جو کچھ افراط میں ہے وہ تو ہے بے حدّ و حساب
اور، جو کم ہے یہاں پر وہ نہایت کم ہے

یہ حلف نامہ محبت کا ہے ایسا کہ ظفرؔ
جس میں افسانہ زیادہ تھا، حقیقت کم ہے

یوں روشنی لاتا ہوں سویرے سے زیادہ
کرتا ہوں اندھیرے کو اندھیرے سے زیادہ

حق بات ہے اتنی سی کہ خطرے میں یہ مخلوق
ہے سانپ سے کم اور سپیرے سے زیادہ

اک جال ہے، پانی بھی ہے اور جال میں پھنسنا
مچھلی کو ہے منظور مچھیرے سے زیادہ

ناراض ہے دنیا بہت، اور یہ نہیں معلوم
تیرے سے زیادہ ہے کہ میرے سے زیادہ

ایک اور بھی ہے ٹھیک مری جان کا دشمن
رکھتا ہے پریشان جو تیرے سے زیادہ

جا اُس کے دلِ تنگ میں گھس بیٹھا ہوں جب سے
آرام سے ہوں اپنے بسیرے سے زیادہ

اُس نے تو کُھلے چھوڑے ہوئے ہیں مرے رستے
میں خود ہی نکلتا نہیں گھیرے سے زیادہ

زنجیروں میں جکڑے ہُوئے خواب اور خیالات
ہوتے ہیں برآمد مرے ڈیرے سے زیادہ

سودا یہ سخن کا، ظفرؔ، ایسے ہی نہ رہ جائے
مایوس جو ہوں پہلے ہی پھیرے سے زیادہ

دشت ہو کوئی خیابان سے مِلتا جُلتا
ایک امکان، بس امکان سے مِلتا جُلتا

سوچ ہی سکتے ہیں بس، چھو نہیں سکتے اُس کو
جسم ایسا بھی ہے اک جان سے مِلتا جُلتا

رہی اپنی ہی طرف ساری توجہ اُس کی
میزباں تھا ہی وہ مہمان سے مِلتا جُلتا

کاروبار اور نہ کر پائے محبت کے سوا
نفع بھی جس میں ہے نقصان سے مِلتا جُلتا

ساتھ ہی لے گیا وہ ساری اُمیدیں، یادیں
تھا یہی کچھ سر و سامان سے مِلتا جُلتا

دامن اپنا بھی نہیں صاف ہمارا جس پر
کوئی دھبّا ہے کسی دھیان سے مِلتا جُلتا

عاقبت میں یہی کام آئے تو آئے شاید
کُفر اپنا جو ہے ایمان سے مِلتا جُلتا

گھومتے اور ٹہلتے ہیں اِسی میں شب و روز
دل یہ اپنا جو ہے دالان سے مِلتا جُلتا

ہو تو سکتی ہے ظفؔر میں بھی کچھ انسانیت
اچھا خاصا ہے یہ انسان سے مِلتا جُلتا

میں سانس لے نہیں سکتا، ہَوا رکاوٹ ہے
رُکا ہُوا ہوں کہ خود راستہ رکاوٹ ہے

ابھی ہماری ملاقات ہو نہیں سکتی
کہ پہلے خلق تھی اور اب خدا رکاوٹ ہے

میں کس طرح سے بھلا ہو سکوں گا صحت مند
دوا تو تھی ہی، مگر اب دعا رکاوٹ ہے

سوال میں کوئی اُلجھن ہے سدِّراہ الگ
جواب میں کوئی مشکل جدا رکاوٹ ہے

کریں بھی کیا کہ اشارہ ہی اتنا مُبہم تھا
خبر نہیں یہ اجازت ہے یا رکاوٹ ہے

کئی تو بے دھڑک آ جا رہے ہیں چاروں طرف
مگر کسی کے لیے جا بہ جا رکاوٹ ہے

طرح طرح کی رکاوٹ ہے، دیکھتے جاؤ
کہیں روا تو کہیں ناروا رکاوٹ ہے

ہمارا کام ہے اور دوستوں کا لطف و کرم
کہ ایک ہے تو کبھی دوسرا رکاوٹ ہے

عبور کر کے ہی اِس کو جواب دوں گا، ظفرؔ
ابھی بتا نہیں سکتا ہوں کیا رکاوٹ ہے

نمود بھی نہیں کچھ، نام بھی نہیں میرا
مقام خاص تو کیا، عام بھی نہیں میرا

پسِ دریچہ ہے جو بھی، نہیں ہے میرے لیے
وہ آفتابِ لبِ بام بھی نہیں میرا

فضول اُسی سے تعلق جتاتا رہتا ہوں
جو دن کے وقت نہ ہو، شام بھی نہیں میرا

قرار پایا ہے میری تباہیوں کا سبب
یہ تو کہ مُوردِ الزام بھی نہیں میرا

نہیں تھا کام کے آغاز میں بھی میں شامل
بھگت رہا ہوں جو انجام بھی نہیں میرا

اگرچہ مُفت میسر نہیں ہوں دُنیا کو
کہ اصل میں تو کوئی دام بھی نہیں میرا

اُٹھائی ہے جو مشقت نہ جانے کس کی تھی
جو کر رہا ہوں وہ آرام بھی نہیں میرا

یہ شہرت اور کسی کم نصیب کا حق تھی
مِلا ہے مجھ کو جو انعام بھی نہیں میرا

جو کہہ رہا ہوں کسی اور کی ہے بات، ظفرؔ
جو کر رہا ہوں یہاں کام بھی نہیں میرا

یہ جو الزام سے لگے ہوئے ہیں
ایک ہی نام سے لگے ہوئے ہیں

بڑا تکلیف دہ معاملہ ہے
بڑے آرام سے لگے ہوئے ہیں

رات بھی اب گزرنے والی ہے
اور ہم شام سے لگے ہوئے ہیں

ایسا لگتا ہے آسمان میں بھی
کچھ در و بام سے لگے ہوئے ہیں

وہی کانٹے ہیں راہ میں اپنی
اُسی گُل فام سے لگے ہوئے ہیں

پیڑ تو آم کا نہیں، لیکن
شاخ پر آم سے لگے ہوئے ہیں

پختہ کاری کی عمر ہے اور ہم
ہوسِ خام سے لگے ہوئے ہیں

ایک ہی کام ہم کو آتا ہے
اور، اُسی کام سے لگے ہوئے ہیں

چھوڑ بیٹھے ہیں طرزِ خاص، ظفرؔ
روشِ عام سے لگے ہوئے ہیں۔

گُم شُدہ بھی رہی اور ڈھونڈ نکالی بھی ہے
ایک تصویر جو اصلی بھی، خیالی بھی ہے

سوچتا ہوں تو بہت دُور ہے دُنیا تیری
دل میں ہمت بھی نہیں، بے پر و بالی بھی ہے

دل کی دیوار پہ تصویر بھی تیری ہے ابھی
یہ وہ گھر ہے جو ترے خواب سے خالی بھی ہے

اختیار اس کا نہیں گھاس کی پتی پر بھی
دل جو کہنے کو ترے باغ کا مالی بھی ہے

یہ محبت جسے برباد بھی کرنا ہے کبھی
دل کے اندر کسی گوشے میں سنبھالی بھی ہے

آج پھر اُس سے تعارف مرا کروائے کوئی
دیکھی بھالی ہے صورت جو نرالی بھی ہے

اِس کے لوگوں سے سروکار نہیں کچھ میرا
پوچھنا تھا کوئی اس شہر کا والی بھی ہے

بات پر بعد میں قائم جو نہیں رہتا ہوں
اِسی خاطر مرا کردار مثالی بھی ہے

دل جو ٹوٹے گا تو آواز بھی آئے گی، ظفرؔ
کانچ کی چیز ہے اور ٹوٹنے والی بھی ہے

دل کے پتھر میں شرارے نہیں تھے
صرف آنکھیں تھیں، نظارے نہیں تھے

کبھی یہ ساری زمیں تھی خالی
آسماں پر بھی ستارے نہیں تھے

راستے کوہ و بیاباں سے ابھی
یار لوگوں نے گزارے نہیں تھے

ہر طرف پھیلا ہُوا تھا پانی
یعنی دریا تھا، کنارے نہیں تھے

شہر میں لوگ مخالف اب تک
تھے، مگر سارے کے سارے نہیں تھے

خامشی اُس کی رہی نیم رضا
پھر بھی ہم اُس کو پکارے نہیں تھے

خود ہی اندازے لگاتے رہے سب
اُس کی جانب سے اشارے نہیں تھے

اب کسی اور کے ہو جاؤ تو کیا
تم جو پہلے بھی ہمارے نہیں تھے

کھیل کھیلا ہی نہیں تھا، سو ظفرؔ
کبھی جیتے، کبھی ہارے نہیں تھے

ڈاکٹر تحسین فراقی کے نام

میں ایک قطرے کو دریا بنا رہا ہوں ظفرؔ
اور اس کے بعد اُسے میں نے پار کرنا ہے

ظفؔر اقبال کا شعری بیانیہ اور غالبؔ

الیاس بابر اعوان

اُردو شعری منظر نامہ اپنی روایتی، جمالیات اور لسانی جبر تلے ایک مدت سانس لیتا رہا۔ بلاشبہ روایت کا فقیرانہ تتبع محض اسٹیس کو ہی سمجھا جائے گا۔ ممکن ہے آج سے سو دو سو سال بعد کوئی غیر متعصبانہ تجزیہ یہ طے کر پائے کہ اُردو غزل کے منظر نامے پر دو شاعر حاوی رہے۔ ایک غالبؔ دوسرے ظفؔر اقبال۔ غالب سے متعلق، غالبؔ، شمس الرحمٰن فاروقی اور ظفؔر اقبال کی ایک مثلث بنتی ہے۔ اس مثلث میں ایک بات تو طے ہے کہ فاروقی جیسے بڑے نقاد کا تنقیدی اور شعری پینڈولم غالبؔ اور ظفؔر اقبال کے درمیان ہی گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اُردو تنقیدی روایت میں Comparative analysis میں دو تخلیق کاروں کے ہاں تخلیقی انضمام تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت بُودا طریقہ کار ہے۔ سماجی علوم میں کوئی بھی بیانیہ حتمی تصور کیا جانا، اپنے معنوی اعتبار سے انفرادی یا اجتماعی جبر ہے، اور جبر کا اختراعی متن از خود اپنے معنی متعین کرتا ہے یعنی اسی لفظ میں اس کا دوسرا معنی موجود ہے یعنی خوف۔ سماجی اکائیاں کسی بیانیے، کسی شخصیت اور تخلیق کو مہا بیانیے کا درجہ اُس وقت دیتے ہیں جب اُن کے ہاں خوف کا عنصر نمو پذیر ہوتا ہے۔ (یاد رہے اس بحث کا تعلق آفاقی آدرش سے نہ جوڑا جائے، میں من و عن اُسے صدقِ دل سے تسلیم کرتا ہوں) یہی صورتِ حال غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ بھی رہی۔ ان دونوں شعرا کا شعری قد کاٹھ ایک طرح سے Political constructs ہیں۔ اس عمل کی ایک تفہیم یہ بھی ہے کہ اس سے کسی بھی تخلیقی جوہر کی ممکنہ تفہیم اور معنویت کو پابند کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی تخلیقی متن بقول بارتھ (The message of the Author-God نہیں ہوتا۔ بارتھ اپنے مضمون "The death of the Author" میں لکھتا ہے:

"Writing ceaselessly posits meaning, ceaselessly to evaporate it, carrying out a systematic exemption of meaning."

Barthes, The death of Author, p147

ساختیاتی مباحث اور لسانی تشکیلات کی ذیلی روا اپنی جگہ، تاہم معنوی سطح پر متن کا آفاقی آدرش سے انسلاک ایک لحاظ سے غیر تنقیدی رویہ ہے اور ہمارے ہاں بدقسمتی سے کسی ادبی تخلیق پر تنقیدی نظر کرنا تو درکنار اِس سے اختلاف کی گنجائش نکالنا بھی ادبی گستاخی تسلیم کی جاتی ہے۔ ظفؔر اقبال کے شعری قد کاٹھ کا تعلق غالبؔ سے جوڑنا ایک طرح سے ظفؔر اقبال کے اپنے شعری قد کو کم کرنا ہے، حالاں کہ ظفؔر اقبال خود اپنے ایک انٹرویو جو انھوں نے ادبی دنیا بلاگ کو دیا تھا غالبؔ کے بارے میں درج ذیل اظہار فرما چکے ہیں:

''فاروقی میرے لیے سند کی حیثیت نہیں رکھتے، اور اُن کے کہنے سے میں غالبؔ سے بڑا شاعر نہیں بن سکتا۔ میں تو اپنے آپ کو غالبؔ کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا جس کی انگلی پکڑ کر میں نے قدم قدم چلنا شروع کیا۔''

یہاں ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خود کو غالبؔ سے بڑا شاعر نہیں سمجھتے، لیکن ایک بات جو اس بیانیے کے اندر ہی موجود ہے کہ اُس کے مقابلے کے شاعر ضرور ہیں۔ یہ بات وقت اور نقاد نے طے کرنے کی کوشش کرنی ہے نہ کہ تخلیق کار نے خود جیسا کہ انکساری سے ظفؔر اقبال نے خود کو غالبؔ سے بڑا شاعر ہونے سے معذوری ظاہر کی۔ لیکن فاروقی، ظفؔر اور غالبؔ کی تخلیقی اور تنقیدی مثلث میں غالبؔ کے ساتھ ظفؔر اقبال کا نام ہی کیوں؟ ناصؔر کاظمی، عرفاؔن صدیقی، شکیبؔ جلالی، احمد مشتاقؔ یا فاروقی کے پسندیدہ باؔنی کیوں نہیں؟ اِس سوال کا جواب ادبی جدلیات کے معنی کا تعین کرے گا۔ غالبؔ نے لسانی اور معنوی جمالیات کی ترتیب رکھی اور ایک زمانے تک اس کی شعری نوآبادیات قائم رہی۔ تاہم ظفؔر اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو شعری نوآبادیات سے غالبؔ کو دیس نکالا دیا۔ یہ کام کوئی غیر شعوری نہیں تھا، نئی لسانی اور جمالیاتی ترتیب کی بنیاد رکھنے

والے کا اپنا شعری وژن کیا ہے، اس پر ظفر اقبال کا ایک تاثر سامنے آتا ہے، جو انھوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''جون ایلیا کی شاعری'' میں بیان کیا ہے:

۳۔ ''شعر بنیادی طور پر سمجھنے یا مکمل طور پر سمجھنے کی چیز ہی نہیں ہوتی کہ اس سے تو صرف لطف اندوز ہُوا جاسکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی سوچ کی لہروں میں ہلکا سا تموّج پیدا کر دے اور بس۔''

حوالہ: ''بیادِ جون ایلیا'' سوینیر اشاعت بہ اہتمام انجمنِ سادات امروہہ، کراچی سن ۲۰۰۳ء

شعر کی بظاہر یہ سادہ سی تعریف اتنی سادہ بھی نہیں۔ ولیم ورڈز ورتھ نے انیسویں صدی میں Preface to Lyrical Ballads میں شاعری بارے کہا تھا کہ:

> "poetry is the spontaneous overflow of powerful feelings; it takes its origin from emotion recollected in tranquility"

ظفر اقبال کا شعری رویہ اور شعری تفہیم اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اور ورڈز ورتھ کی اس جامع تعریف سے مغائرت برتنا ممکن بھی نہیں دکھائی دیتا۔ اب ہم اس نکتے پر آ پہنچے ہیں جہاں ہمیں ظفر اقبالی رویے اور ان کی شعری تخلیق پر اطلاق کرنے سے الگ کچھ دیکھنا ہوگا۔ غالب بنیادی طور پر مشکل پسند شاعر تھے، اس کی ایک وجہ اُس عہد کا جیو پولیٹکل منظر نامہ بھی ہوسکتا ہے اور لسانی ٹرانسفورمیشن بھی، لیکن ایک بات تو طے ہے کہ غالب کو اپنے شعری اظہار کے خلاف اتنی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جتنا کہ ظفر اقبال کو اپنے اوائلِ شعر ہی سے کرنا پڑا۔ غالب زبان ساز تھے تو ظفر اقبال نے نہ صرف اُردو شعری روایت کو غالب کی زبان سے علاحدہ کیا بلکہ نئی لسانی جمالیات بھی اختراع کی جو، ایک لحاظ سے غالب سے کچھ آگے کی بات بھی کہی جاسکتی ہے۔ آج ہم ظفر اقبال کو جس یک طرفہ رویے کی وجہ سے ناپسند کرتے ہیں اس کی سب سے اعلیٰ مثال یاس یگانہ چنگیزی کی صورت میں اُردو ادب پروارد ہو چکی ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی خود کو اپنے تئیں توپ سمجھتے تھے اور اپنے علاوہ ہندوستان میں کسی کو شاعر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یاد رہے کہ یاس یگانہ چنگیزی کی پیدائش ۱۸۸۴ء اور وفات ۱۹۵۶ء کی ہے۔ ان ۷۲ برس کا شعری منظر نامہ سامنے رکھا

جائے تو یاس کی اپنے تئیں یہ خود ساختہ شعری تشکیل کتنی بودی دکھائی دیتی ہے، اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے، دوسری طرف بی بی سی میں انور سن رائے کو انٹرویو دیتے ہوئے ظفر اقبال نے اپنی شاعری کو منسوخ کرنے کا بھی اعلانیہ اظہار کیا ہوا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کو اپنی بدتہذیبی اور دوسری بدخصلتوں کی بنا پر آخری عمر میں گدھے پر بٹھا کر منہ کالا کر کے پھرایا گیا تھا اور مرزا نے اپنی کتاب بھی چنگیز خان کے نام معنون کی تھی۔''

حوالہ: مرزا یاس یگانہ چنگیزی عرف غالب شکن: از ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

چنگیزی کو اُردو ادبی شعری حوالے سے اتنی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جتنا کہ ظفر اقبال کو، اس کی ایک ہی وجہ سمجھ آتی ہے کہ چنگیزی نے محض اپنی شخصی کمزوری کے تحت غالب کو تسلیم نہیں کیا جب کہ ظفر اقبال نے اپنی شعری تخلیقیت سے غالب کا اثر زائل کیا اور نئے شعری Narrative کو تشکیل کیا۔ ظفر اقبال کے ہاں ناصر کاظمی کی طرح کی محض سہل پسندی نہیں بلکہ ان کے ہاں ایک متن کا معنوی انسلاک انفرادی اور کلی شعری حسیات اور شعوری تجربے سے دکھائی دیتا ہے۔ غالب کے پیچھے بیدل، عرفی، نظیری اور میر کی روایت تھی جس کے مقابل غالب نے اپنی خود ساختہ مشکل نگاری سے اپنا ایک ہیولہ اور تاثر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اُن کے مقابل سہل پسندی ایک مشکل عمل تھا۔ عمومی طور سے کہا جاتا ہے آسان بات کو مشکل پیرائے میں بیان کرنا ایک نفسیاتی عُجب ہوتا ہے جب کہ مشکل ترین بات کو آسان پیرائے میں بیان کرنا ایک کامیابی۔ ظفر اقبال کے ہاں متن اور اس میں در آنے والی علامتیں اپنے جوہر میں کثیر المعنوی ہو جاتی ہیں۔ علامت گرچہ ایک سے زیادہ معنوی تفہیم کی ہی صورت ہوتی ہے۔ تاہم اس سے بیک وقت رومانی اور پولیٹکل بیانیہ کشید کرنا، ناپید ہوتا ہے۔ ظفر کے ہاں صورت اس سے مختلف دکھائی دیتی ہے:

ہزار سایہ، ہوا دار بھی، گھنا بھی ہے\
مگر جو بات تھی دیوار میں شجر میں نہیں

غالب کے ہاں مشکل پسندی ممکن ہے ایک ایجاز ہو، تاہم اُن کے ہاں شعری رعایت اور اس کا اظہار یہ اُسے اپنے عہد سے کچھ اس راسخ طور سے جوڑے رکھے گا جو بعدازاں اپنے منطقی دائرے میں چھنتے چھنتے شاید نصف سے بھی کم رہ جائے۔ غالب کا یہ شعر دیکھیے:

برشگالِ گریۂ عاشق بھی دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

غالبؔ کے ہاں Christopher Marlowe کی طرح کی Mighty Lines تو وارد ہوتی ہیں۔ تاہم Milton کی طرح کا حتمی ارتفاع تواتر کے ساتھ زیادہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہ لیا جائے کہ غالبؔ کے ہاں جو سہل پسندی اور میرؔ سا شعری آہنگ ہے، وہ متروک تصور کیا جائے گا؟ نہیں بلکہ غالبؔ کے ہاں لسانی جمالیات کے ایک غیر حقیقی تصور نے بالآخر تنقید نگاروں کو مجبور کیا کہ غالبؔ کی اگر کوئی مجموعی شعری تصویر بنتی ہے تو وہ ہے اُس کی مشکل پسندی۔ غالبؔ کی وفات ۱۶ر فروری ۱۸۶۹ء میں ہوئی جب کہ ظفرؔ اقبال کی پیدائش ۱۹۳۲ میں ہوئی۔ قیاس کرتے ہیں ظفرؔ اقبال کا شعری منظر نامہ غالبؔ کے سو سال بعد تشکیل پایا۔ اِن سو سالوں میں اپنے عہد کے تنقیدی رویوں اور ادبی ڈسکورس پر بلاواسطہ یا بالواسطہ ہر دو طرح سے غالبؔ کی شعریات غالب رہیں، لیکن یکدم سے ایک اُجھلن، ایک اُڑکن سماجی ادبی بیانیوں میں در آتی ہے۔ اسے ابتدا میں قبول ہی نہیں کیا گیا۔ رفتہ رفتہ ظفرؔ اقبال کے نئے شعری بیانیے نے پچھلے پچاس برس میں قدیم شعری اظہار کے مقابل ایک ایسی شعری روایت قائم کر دی ہے۔ جس نے قدیم شعری روایت کی عمارت میں نہ صرف دراڑیں ڈال دی ہیں بلکہ اپنے شعری بیانیے سے اپنے بعد کی نسلوں کو متاثر کیا۔ ظفرؔ اقبال کا متن اپنے لسانی ڈسکورس کو خود وضع کرتا ہے۔ لازم نہیں کہ اس کے ہاں کوئی تعقل، منطق یا کوئی نمائندگی کی نو آبادیاتی جبلت موجود ہو۔ ظفرؔ اقبالی متن سے متعلق معاصر خرابے کا تعلق دراصل مفہوم کا تعلق ہے۔ سوسیور کے نزدیک ''زبان ایک من مانا اور تفریقی نظام ہے، جس میں اجزا کی کوئی مثبت اور خود مکتفی شناخت نہیں ہوتی۔''

حوالہ: تحریر اساس تنقید، مصنف قاضی افضال حسین

ظفر اقبال کے ہاں زبان کا وہی من مانا نظام موجود ہے، گویا ان پر لسانی تشکیلات اور زبان کے بگاڑ سے متعلق اعتراضات کرنے والے دراصل زبان کے نظام سے آشنا نہیں ہیں اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے لاتنقید میں ظفر اقبال کے حوالے سے لکھ رکھا ہے ''کہ معنی آفرینی نئی زبان کے استعمال کے بغیر ناممکن ہے، اور یہ بھی کہ بڑا شاعر وہ ہے جو زبان کو نیا آہنگ دیتا ہے، نیز یہ کہ زبان آسمان سے نہیں اُتری۔''

حوالہ: لاتنقید، صفحہ ۱۰

ظفر اقبال زبان کو بطور ایک مہابیانیہ تصور نہیں کرتے یعنی اس کے مروّج قواعد و ضوابط اور لسانی معنوی نظام کے در و بست کو شاعر کا استحقاق تصور کرتے ہیں۔ زبان کے حوالے سے ایسا برتاؤ جو کس سطح پر قابلِ قبول ہے، اس کا کوئی معیار متعین کیا جانا، اپنی ذات میں خود ایک جبر ہے جبکہ تخلیق ایک آزاد فکری عمل ہے۔ زبان کو اُس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ زبان کے ساتھ عام معنوں میں یہ ''کھلواڑ'' کرنے والے دیگر تخلیق کار خود ظفر اقبال کیوں نہ بن سکے۔ ظفر خود کہتے ہیں:

زباں کو سر پہ اُٹھائے بھی ہم پھرے ہیں ظفر
سخن کیا ہے زباں پر سوار ہو کر بھی

گویا زبان کے حوالے سے ظفر اقبال کا بیانیہ بہت واضح ہے۔ متن کے حوالے سے نیا آہنگ ایک ہی لسانی اکائی میں موجود ''تضاد، تشکیک، عجب، توسیع، اختلاف، یا گنجائش'' دریافت کرنا اور اختراع کرنا کہلائے گا۔ ایسے ہی شعر کو آفاقی آدرش سمجھنے والوں نے اُسے ایک فاصلے سے دیکھنے کی چیز سمجھ اور بنا لیا ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ادب زندگی کی جمالیاتی تشکیل اور تفہیم کا نام ہے۔ تاہم جو زندگی اور سماج ہمارے ہاں ادب میں نظر آتا ہے وہ ایک ایسا ''آئیڈیل'' ہے جس کا حصول ناممکن بنا دیا گیا۔ ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اپنے تمام تہذیبی لوازمات کے ساتھ من وعن ہمارے ادبی تخلیقی تجربے میں آنی چاہیے۔ غالب کے ہاں ایک ایسا ہی ''آئیڈیل'' ہے جو، اُس کی غزل کو مہابیانیہ بنا دیتا ہے۔ محض پوجنے کی چیز، جب کہ ظفر اقبال کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ظفر نے نہ صرف موضوعاتی تنوع کو اپنے ہاں جگہ دی بلکہ زبان کی گرہیں کھولیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں اُن کا کہنا ہے:

"شاعری میں مزاح، شگفتگی اور پھکڑ پن بھی ہو سکتا ہے،
کیونکہ زندگی بہت متنوع ہے۔ اس لیے جیسی زندگی ہے شاعری بھی ویسی
ہی ہونی چاہیے۔ زندگی کے جتنے رنگ ہیں اتنے رنگ شاعری کے بھی
ہونے چاہئیں۔"

ریحانہ قمر اور سرور ارمان کو دیے گئے ایک اخباری انٹرویو سے اقتباس۔

گویا تخلیق کار کے "افکارِ عالیہ" دراصل اُس کی ایک سماجی اور فکری اختراع ہیں جو ایک لحاظ سے سماجی اکائیوں سے منفرد اور ارفع ہونے کی ایک خُو ہے، یہ ایک لحاظ سے احساسِ کمتری ہے، زندگی اپنے تمام تر پھکڑ پن کے ساتھ تخلیق کار کی تخلیق میں نمایاں ہونی چاہیے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق کار کا تعلق اپنے زمینی سماج سے ہے اور اُس کا برتا ہوا لفظ کسی آفاقی مخلوق کے لیے نہیں ہے، تب ہی تخلیق کردہ لفظ کو سماجی بیانیوں کے تناظر میں دیکھا جا سکے گا۔ زبان کے حوالے سے کوئی بھی ماورائی طاقت اپنا حصہ بطور جبر نہیں ڈالتی بلکہ یہ ایک انفرادی اور سماجی آزادی کا نام ہے جو عام انسان سے لے کر تخلیق کار کے ہاں ایک جیسی آزادی کا قائل ہے۔ لیکن زبان سمیت ادب کو آفاقی آدرش بنانے پر نجانے کیوں ہمارا روایتی اُردو نقاد سر توڑ کوششیں کر رہا ہے۔ یہ اپنے تئیں طاقت کے حصول کی کوشش ہے۔ زبان کو سائنسی تناظر میں دیکھنا اور اسے ایک آفاقی آدرش بنانا۔ لیوتارڈ نے کہا تھا۔ "سائنس دان، مکینک، اور ٹولز کسی سچ کی تلاش کے لیے نہیں، بلکہ طاقت کے حصول کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔"

حوالہ: لیوتارڈ: دا پوسٹ ماڈرن کنڈیشن: اے رپورٹ آن نالج۔
امریکہ: یونیورسٹی آف منی سوٹا پریس: ۱۹۸۴

ظفر اقبال کے ہاں اسکیپ ازم کا سماجی پرتو بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

کانوں سے انگلیاں نہ نکالو تو کچھ نہیں
سنتے رہو تو روز نہیں نئی داستان ہے

اس شعر میں ہمارے ہاں کا بورژوا سماج اور جیو پولیٹکل منظر نامہ واضح ہوتا ہے، جو اپنی فکری دریافت سے دور ہے۔ غالب کے ہاں معروض کی ایک غیر متعین شکل کو تجسیم کرنے کی کوشش ہے، لیکن جیسا کہ ظفر اقبال خود اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ زندگی کا تنوع تخلیق میں در آنا چاہیے۔

ایسے ہی اس شعر میں واضح ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کی سماجی فراریت کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً ادب کی ہی ایک ارفع اختراعی صورت، میڈیا پر پیش کیا جانے والا ہائی پر منظر نامہ، حتیٰ کہ ہمارا تہذیبی منظر نامہ جو کہ خالصتاً سماجی اور اجتماعی ہے کو بھی ایسے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بورژوا سماج کی بنیادی اکائیوں کو سماجی حرکت میں اِن وے لڈ کر دیتا ہے۔ پاکستان کا تہذیبی اور سیاسی منظر نامہ ہمارے سامنے ہے، اس پر مذکورہ بالا شعر کتنا صادق آتا ہے۔ غالبؔ کا تخلیقی پینڈولم مجبوب اور مابعد الطبیعات کے کہیں بیچ اٹک کے رہ گیا۔ حالانکہ اس دور کی سماجی بافتوں کو گونا گوں مسائل کا سامنا تھا۔ غالبؔ کا اسکیپ ازم دیکھیے:

قرض کی پیتے تھے ے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالبؔ کے حوالے سے ایک کتاب ''غالبؔ شناسی اور نیاز ونگار'' مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر نے احتشام حسین کے حوالے سے لکھا ہے:

''غالبؔ کا زمانہ عام انسانوں کے لیے تقلید اور روایت پسندی کا زمانہ تھا اور حساس انسانوں کے لیے تشکیک کا۔ غالبؔ بھی شک کا شکار تھے۔ لیکن شکوک کو روند کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔''

حوالہ: غالبؔ شناسی اور نیاز ونگار: ڈاکٹر سلیم اختر صفحہ نمبر ۹

یہیں مزید ایل آر گوردن پونکایا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''غالبؔ نے اپنے اشعار میں ہمیشہ بدلتی ہوئی دنیا کا تصور پیش کیا، جن میں مخالف عناصر کا اتحاد اور تناقض دونوں موجود ہیں۔ غالب جدھر نگاہ اُٹھاتے ہیں انھیں ضدین کا یہ اتحاد و تناقض نظر آتا ہے۔''

حوالہ: غالبؔ شناسی اور نیاز ونگار: ڈاکٹر سلیم اختر صفحہ ۱۰۔

اگر مذکورہ بالا تنقیدی متن کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ غالبؔ کا عہد ایک فکری ''ٹرانسفورمیشن'' کا عہد تھا۔ اُس کے ہاں کوئی کلی منظر نامہ زمینی حقائق کی سطح پر متشکل نہیں ہوتا۔ حالانکہ اُردو ادب میں مابعد جدیدیت کی رو شاید اپنی کلی صورت میں اب بھی وقوع پذیر نہیں ہو سکی۔ اب واقعتاً غالبؔ کا عہد تہذیبی، سماجی اور فکری انتشار کا عہد تھا تو جو سماج اُس کی شاعری میں متشکل

ہوتا ہے وہ زمینی حقیقتوں سے ارفع اور آئیڈیل محسوس ہوتا ہے گویا غالبؔ کا سماجی منظر نامہ ایک اختراعی منظر نامہ تھا اور ایک طرح سے یہ ایک فرد کا فکری تضاد اور فرار ہے۔ ایسے ہی جیو پولیٹکل سماج سے اقبالؔ بھی دو چار تھے۔ تاہم اُن کے ہاں آفاقی آدرش سے تعلق اور وفا کی صورت اُن کے لسانی اور تخلیقی تجربے کا حاصل دکھائی دیتی ہے۔ تاہم ساتھ ساتھ وہ تہذیبی ریاضتیں جو اس عصر کی دسترس میں نہ ہو پائی تھیں، اُن کا رونا انھوں نے معاصرین کی نسبت بہت ارفع جمالیاتی سطح پر رو دیا ہے۔ ظفرؔ اقبال نے اپنے عصر کی تہذیبی دریافت کا در اپنی لسانی تشکیل سے وا کیا ہے اور وہ نہ صرف ایسا کرتے ہیں بلکہ اُس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ اِس دفاع کا ایک معنی یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ تمام اضطراری عمل دراصل دانستہ عمل تھا۔ کرافٹ اور شعری رو کے درمیان سے جمالیات کشید کرنا اور وہ ایک اور قسم کی ''ٹرانسفورمیشن'' میں رہتے ہوئے جب آپ ایک ایسی تہذیب کا حصہ ہوتے ہیں جہاں زمینی وابستگی ایک طرف اور آفاقی آدرش ایک طرف کرتے ہوئے ایک تہذیبی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب آپ ایک آزاد وطن میں اپنی شناخت کے حصول کے لیے سانس تو لیتے ہیں لیکن نئی شہریت اور عالم کاری کے ہاتھوں آپ اپنی اصل شناخت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں، تو کیا یہ سب عوامل آپ کی شاعری میں در نہیں آنے چاہئیں؟ کیا ظفرؔ اقبال کے علاوہ کسی اور معاصر نے یہ سماجی عُجب اِس شدومد کے ساتھ محسوس کیا اور کیا وہ ان کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں جمالیاتی سطح پر لا سکے، اِس کا جواب یقیناً مشکل نہیں ہے۔ تاہم ہمارا روایتی نقاد شتر مرغ کی طرح ریت میں گردن دابے رومانی تنقید سے نکل ہی نہیں پاتا۔ ظفرؔ اقبال کلی طور پر محض کلیشے کی سطح پر سماجی بیانیوں سے انحراف نہیں برتتے۔ درج ذیل شعر دیکھیے:

اک ہوا اس طرح سے پابند رکھتی ہے مجھے
خاک سے ہوتا ہے جیسے ہر شجر باندھا ہُوا

یعنی زمین اور روایت سے جڑ کر نمویاب ہونا اور اپنی شاخوں کو جس جگہ، جہاں چاہے لے جانا ہی نئی شعری تہذیبی دریافت ہے۔ اِس سے ظفرؔ اقبال پر یہ اعتراض بھی ان وے لڈ ہو جاتا ہے جو، اُن کے بارے میں عام طور سے ہوتا ہے کہ ظفرؔ اقبال نے غزل کو ہی اپنا شعور بنایا اور مستزاد یہ کہ وہی روایتی بحور اور نظامِ عروض اُن کے ہاں ہے، غزل کی ہیئت تک تو تبدیل کر نہیں سکے، لیکن ایسا نہیں ہے، ظفرؔ اقبال کے ہاں دیگر زبانوں کے الفاظ کا بطورِ خاص ردیف کے طور پر استعمال

ہوا، اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مابعد ظفؔر اقبالی منظرنامے پر جس تواتر سے شعرا ایسے لسانی تجربے سے گزر رہے ہیں وہ بے مثل ہیں اور کئی کے ہاں ظفؔر اقبال کی اِس لسانی توسیعت نے بہت منفرد ذائقہ پیدا کیا ہے۔ ظفؔر اقبال کے ہاں اپنے اور ہمارے عہد کی زبان ہے، وہ انداز، وہ اطوار، وہ زندگی۔ وہاب اشرفی عالم کاری سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''گلوبلائزیشن کے اِس زمانے میں جہاں ادب آفاقی نظر آتا ہے، وہاں اِس امر کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ اِس کے مضمرات میں اپنے ملک کے حوالے بہ ہر طور موجود ہوتے ہیں۔ آدابِ زندگی، طور طریقے یہاں تک کہ مجلسی زندگی کا انداز بھی اِسی کا حصہ ہے، جو ہم جیتے رہتے ہیں اور جو ہماری اپنی مٹی کا خمیر رکھتا ہے۔''

ظفؔر اقبال کا عہد کاسموپولیٹن ازم اور گلوبلائزیشن کا عہد ہے، یہ وہ عہد ہے جب سماجی علوم پہ انگشت اُٹھائی جارہی تھی، سماج فکری سطح پر دولخت تھا، سماجی اِکائیاں نئے بیانیوں کی زد پر تھیں، اِس عہد کو ظفؔر اقبال نے اپنے ہاں مجسم کیا، ہمارا طرزِ حیات، ہماری نئی فکری روایت اور تہذیبی تصادم کے ساتھ ساتھ لسانی نئے پن کو ظفؔر اقبال نے نہ صرف شاعری بلکہ نثر میں بھی مجسم کیا۔ ظفؔر اقبال نے محض لسانی تبدیلی سے مصرع کی ہیئت کو تبدیل نہیں کیا بلکہ وہ اِس بات کے بھی قائل ہیں کہ مصرع معنوی لحاظ سے بھی بے عیب ہونا چاہیے۔ گویا غالبؔ کے تتبع میں لکھنے والے جو دانستہ یا غیر دانستہ کوئی معنوی یا لسانی کڑی چھوڑ دیتے ہیں، یا کوئی ابہام چھوڑ دیتے ہیں، ظفؔر اقبال اِس کی نفی کرتے ہیں، شعر جب تک قاری کے ذہن کو لسانی، جمالیاتی یا معنوی سطح پر مس نہ کرے، وہ محض کرافٹ کا نمونہ ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ظفؔر اقبال کا شعری بیانیہ مابعد ظفؔر اقبال شاعری کے لیے مہا بیانیہ ہے، اور جو شاعری اِس سے ہو رہی ہے، بھلے وہ معنوی لحاظ سے ارفع نہ ہو، تاہم اِس میں نئے معنی اور استعارے کی تلاش کی سعی ضرور آتی ہے جس کا سارا کریڈیٹ ظفؔر اقبال کو جاتا ہے اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

◆◆◆

ظفؔر اقبال......شاعرِ ہفت بیاں

سروؔر جاوید (کراچی)

میں جب بھی کسی صاحبِ اُسلوب شاعر پر کوئی تنقیدی تحریر رقم کرنے کی سعی کرتا ہوں تو شاعری کی بنیادی تعریف اور تصور سے انحراف کیے بغیر ایسی تعریف وضع کرنے کی کاوش کرتا ہوں جو زیرِ مطالعہ شاعر کے شعری اظہار کی فوری تفہیم میں مدد فراہم کر سکے۔ میری یہ کوشش اکثر کامیاب رہتی ہے۔ مَیں نے کم و بیش 27 صاحبِ طرز شعراء پر اپنے مضامین میں شاعری کی تعریف کی تقریباً اتنی ہی صورتیں وضع کی ہیں۔ مگر ظفؔر اقبال اوکاڑوی ثم لاہوری کے بارے میں کوئی ایسی مختصر تعریفِ شاعری کارگر نظر نہیں آئی یعنی میں اُن کے بارے میں ایسی مختصر تعریف وضع کرنے میں کامیاب دس سے زیادہ نہیں ہو سکا کیوں کہ پہلے شعری مجموعۂ کلام کی اشاعت یعنی ’’آبِ رواں‘‘ کی اشاعت سے ’’گلافتاب‘‘ سمیت دیگر مجموعوں کی اشاعت تک ظفؔر اقبال نے اپنے اظہار کا پیرہن اس طرح بار بار تبدیل کیا کہ شاعری کی تعریف کا کوئی ایک وضع کردہ پہلو، اُن کو سمجھنے میں خاطر خواہ معاونت نہیں کرتا نظر آتا۔ سو، اب یہ کہا جانا چاہیے کہ ظفؔر اقبال ایک صاحبِ طرز شاعر اور شاعرِ ہفت بیاں ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے وفور کے لیے پے بہ پے تجربے اتنے تواتر سے کیے کہ ایک ظفؔر اقبال میں کئی ظفر اقبال پیدا ہو گئے۔ میں نے علامہ اقبؔال کے لیے یہی جملہ اُن کے تفکر اور تخیلِ زندگی میں متواتر مگر وقیع تبدیلیوں کے حوالے سے لکھا تھا جب کہ ظفؔر اقبال کے لیے یہ جملہ اُن کی سیمابی کیفیتِ اظہار کی تشفی کے لیے اُن کی تخلیقی صلاحیت کے وفور کے سبب نیرنگیٔ اظہار کے حوالے سے ہے۔ میرے اس بیان کو اُن کی تعریف کی کاوش میں شمار کیا جانا چاہیے کیوں کہ میں اُن سے متاثر ہونے والوں میں شامل ہوں اور اپنے پہلے مجموعۂ کلام کے دیباچے

میں یہ اعلان کر چکا ہوں کہ ظفر اقبال کی شاعری کا تاثر میں نے اُن جانے میں قبول کیا تھا۔ جب میں نے 1968ء میں شاعری کا آغاز کیا تھا۔

بات دراصل یہی ہے کہ ظفر اقبال ایک صاحبِ طرز اور صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں جن کے اشعار میں شگفتگی اور تازہ بیانی کی ایسی نوعیت ہے جو شاید ہی کسی اور غزل کے شاعر میں پائی جاتی ہو۔ اس طرح ظفر اقبال کی تعریف و توصیف تو ممکن ہے مگر توضیح ممکن نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ شاعری کی جمالیاتی قدر تجریدی قدر ہے اور اس کے تعین کا کوئی مرئی اور مطلق پیمانہ موجود نہیں ہے۔ سو اہلِ ادب کو ظفر اقبال کی شاعری کی جمالیاتی قدر کو (جو شاعری کی اصل قدر ہے) سمجھانے کے لیے بہ طور مثال یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے غالب کے یہاں مصرعے کی تراش و خراش اپنا الگ اہتمام رکھتی ہے اور جیسے جوش، یگانہ، مخدوم، مجروح سلطان پوری، فیض کی غزل دلوں کو فتح کرتی ہے (اور عہدِ موجود میں فراز نے جس طرح خوب صورت مصرع تراشی کی ہے یا مدنی اور رضی اختر شوق اور رئیس فروغ اور شکیب جس کی مثالیں ہیں) وہی پُرکاری، وہی شگفتہ بیانی ظفر اقبال کی شاعری کا حصہ ہے اور اس وصف میں وہ بہت سوں سے اوّل ہیں جب کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک انوکھا طرزِ اظہار جو قاری کو جذباتی سطح کے ساتھ فکری سطح پر بھی ایک انوکھی فرحت بخشتا ہے، دراصل ظفر اقبال کی شناخت ہے۔

میں نے یہاں انوکھا کے لفظ کی گردان کی ہے جس کا مطلب نہ صرف یہ ہے کہ شاعری کی تاثراتی کیفیت اور وہ کیفیت جو کسی صاحبِ طرز شاعر کو دوسرے صاحبِ طرز شعراء سے مختلف اور ممیز بناتی ہے لفظوں میں اظہار نہیں پا سکتی۔ صرف یوں ہو سکتا ہے کہ ظفر اقبال کے کلام کا مطالعہ استحسان کی فضا میں کیا جائے تب اُن کی شاعری کی یہ صفات آج کے پڑھنے والے پر عیاں ہوں گی کہ جو گزشتہ کئی نسلوں پر عیاں ہیں۔ آج کے پڑھنے والے (قاری) کی بات میں نے اس لیے بھی کی ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ نیا قاری (عام قاری) شاید ظفر اقبال سے اس طرح واقف نہیں ہے جیسے میں اور میری نسل کے لوگ اُن سے واقف تھے اور جس طرح اُن کی شاعری ہمیں متاثر کرتی تھی۔ میرے لیے یہ بات دکھ کی بات ہے کہ تقریباً پانچ برس قبل کراچی کے ایک نام نہاد عالمی مشاعرے میں ناظمِ مشاعرہ نے انھیں کسی تعارف کے بغیر کلام سنانے کی زحمت دی (جب کہ

کم درجہ بھارتی شعراء کے لیے وہ طویل تعارفی کلمات ادا کرتے رہے تھے) اور عوام نے بھی ظفر اقبال کو اس طرح نہیں سنا جس طرح سنا جانا چاہیے تھا۔ کہنا یہ ہے کہ زمانے کی تیز رفتاری اور میڈیا کی ترقی نے ہمیں باخبر کی بجائے بے خبر کر دیا ہے اور ضروری ہے کہ ہم اپنے قد آور شعراء کا تازہ مطالعہ اور ان کے شعری احتسان کو پیش کرتے رہیں۔ تاہم میرے اس ادعا کا میری اس تحریر کے اسباب سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی محض یہ احساس میری اس کاوش کا سبب نہیں بلکہ ظفر اقبال کی شاعری اس کا آہنگ اور اس کا قد وقامت ہمیشہ مجھ سے اس بات کا متقاضی رہا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ظفر اقبال نے اپنے پہلے شعری مجموعے آبِ رواں کی اشاعت کے بعد دوسرے مجموعے ''گلافتاب'' سمیت اپنے کئی مجموعہ ہائے شاعری میں بہت سے بامعنی اور وقیع تجربات کے ساتھ کئی بے معنی تجربات (غالباً اسی زمانے کی جدیدیت سے متاثر ہو کر) کر ڈالے اور اس کے بعد تو گویا تانتا بندھ گیا۔ ''گلافتاب'' کے ساتھ ہی اُن کے مجموعے ''رطب ویابس''، ''غبار آلود سمتوں کا سراغ''، ''سرِ عام'' اور ''عیب وہنر'' میں اُن کے اظہار کے پیرہن کئی بار بدلے جو ایک طرف ظفر اقبال کی قادر الکلامی کی دلیل بنے اور دوسری طرف وسعتِ بیان کی صورتوں کی تلاش میں ان کی سیمابی کیفیت کی دلیل بھی قرار پائے۔ وفورِ اظہار کی اس کیفیت میں یوں بھی ہوا کہ ظفر اقبال نے صوتی تاثر بلکہ محض صوتیہ پر مشتمل وضع کردہ الفاظ سے شاعری بنانے کی سعی بھی کی بلکہ تخلیقات کا ڈھیر لگا دیا۔ ''گلافتاب'' اور بعد ازاں انھوں نے شعری جمالیات سے باہر بلکہ اس اقلیم میں نامانوس اور اکثر (یعنی دو شعری مجموعوں میں) عامیانہ الفاظ کو اپنی غزل کا حصہ بنایا۔ تجربات کا یہ سلسلہ جب ذرا ٹھہر اور پر آیا تو انھوں نے لفظوں کی طرف اس طرح توجہ کی کہ مصدر کو کہیں اسم بنایا اور کہیں اس سے صفت بنائی اور اس جرأتِ رندانہ کو اپنا اختصاص جانا مگر یوں لگتا ہے کہ اُنھوں نے جان بوجھ کر خود کو متنازعہ بنا لیا۔ مگر اس ادعا کا اظہار بھی کیا کہ:

ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس مذکورہ غزل میں ظفر اقبال نے خوب صورتِ اظہار کے ساتھ خوب صورت زبان بھی استعمال کی گئی ہے اور پوری غزل میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے

بگاڑ کی طرف مائل بھی سمجھا جا سکے۔ ظفر اقبال میں یہی صفت ہے جو ان کو بڑے منصبِ شعری پر فائز کرتی ہے کہ وہ ایک ماہر کلاسیکی گلوکار کی طرح بنیادی راگ اور سُر سے کبھی الگ بھی ہو جاتے ہیں اور کئی راگوں اور راگنیوں کو اختیار بھی کرتے اور طویل وقفہ گزارتے ہیں مگر اچانک اسی راگ پر واپس آ جاتے ہیں جیسے وہ کہیں گئے ہی نہیں تھے۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ان کی شاعری کی پہلی کتاب آب رواں کی بات کر رہا ہوں کہ جس کے بعد کی شاعری میں انھوں نے اچانک انحراف کیا اور گلافتاب اور رطب و یابس میں تجربے کیے مگر پھر غبار آلود سمتوں کے سراغ میں وہی پیرایہ اظہار اچانک دوبارہ عود کر آیا۔

یہ ضرور ہے کہ غبار آلود سمتوں کے سراغ کی شاعری میں متضاد کیفیات موجود ہیں اور اس کے بعد سے عیب و ہنر تک یہی مرکب اظہار کی صورت نظر آتی رہی ہے۔ جس میں قاری کا دل موہ لینے کی کیفیت کی شاعری بھی موجود ہے اور وہ شاعری بھی جسے تجرباتی یا نئے تجربوں کی شاعری کہا جاتا ہے۔ تاہم اس سے ڈاکٹر وحید قریشی کو شبہ ہوا کہ ظفر اقبال نے انشاء اللہ خان سے بلکہ بقول ان کے قلندر بخش جرات سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ میرے خیال میں انشا سے ظفر اقبال کا رشتہ شگفتگیِ اظہار کے سبب ملایا جا سکتا ہے مگر جرأت کا اثر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر صاحب نے غالباً ظفر اقبال کا مطالعہ بڑی تاخیر سے اور شاید ضرورتاً کیا ہے وگرنہ ظفر اقبال تو غالب کے قبیلے کا شاعر ہے۔ مصرع تراش، سخن تراش، ظرافت سے مملو، عشق میں تفکر اور تفکر میں عشق کو گوندھ کر خوش طبعی، خوش بیانی اور شگفتگیِ اظہار کے ساتھ شاعری کرنے والا شاعر ہے۔ اس شگفتگی میں کبھی ظرافت بھی در آتی ہے:

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفر
آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے

یہی ظفر اقبال ہے۔ وہ ظفر اقبال جس پر قلندر بخش جرأت کا چند اشعار کے تناظر میں گمان گزرے ظفر اقبال نہیں ہے۔

میں نے ابتدا میں ظفر اقبال کا کلام مختلف ادبی رسائل میں پڑھا تھا جس زمانے میں ناصر کاظمی، باقی صدیقی، ابنِ انشاء، نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے اور پھر فیض احمد فیض کی

طرف نوجوان قاری کا سفر شروع ہو گیا تھا اور بھی کئی جید نام تھے جو پرانی غزل کی روایت سے متصل ہونے کے باوجود سکۂ رائج الوقت تھے۔ میں 60ء کی دہائی کی ابتدا میں ایک روشن خیال طالبِ علم کی حیثیت میں سیاست کی طرف زیادہ راغب تھا۔ تاہم ادب اور خصوصاً شاعری کے مطالعے سے وابستہ تھا اور یہ عجب بات تھی کہ اس وقت میں اور میری نسل کے نوجوان قاری صرف شاعری پڑھتے تھے شاعر کے نام کو خاطر میں لائے بغیر۔ سو یوں ہوا کہ ظفرؔ اقبال کا نام تو مجھے یاد نہیں ہوا مگر ان کے بہت سے اشعار میری یادداشت کا حصہ بن گئے۔ یہ بہت بعد میں ہوا کہ آبِ رواں کے باقاعدہ مطالعے میں مجھے وہ اشعار نظر آئے اور وہ بھی جب میں شاعری شروع کر چکا تھا اور میرے اظہار میں ظفرؔ اقبال کے مصرعوں کا اثر یعنی ان کی تراش کا اثر غیر محسوس طریقے سے عیاں ہو چکا تھا۔ جن اشعار نے مجھے اس زمانے میں متاثر کیا جب کہ میں اشعار کے خالق سے واقف نہیں تھا۔ ان میں سے چند یہ تھے:

فرازِ شام سے گرتا رہا فسانۂ شب
گدائے گوہرِ گفتار نے سُنا ہی نہیں

☆

تختۂ لالہ کی ہر شمعِ فروزاں جانے
کس بھلاوے میں مجھے دیکھ کر لہرائی ہے
اپنے ہی پانو کی آواز سے ڈر جاتا ہوں
میں ہوں اور رہ گزرِ بیشۂ تنہائی ہے

☆

در پہ سورج ہے کھڑا اُٹھ بیٹھو
سحرِ شب ٹوٹ چکا اُٹھ بیٹھو
چشمۂ صبح سے قطرہ قطرہ
گر رہی ہے یہ صدا اُٹھ بیٹھو

پھر کسی درد نے پہلو بدلا
اور چپکے سے کہا اُٹھ بیٹھو

☆

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تُو نہ ملا
پھر آج میکدۂ دل سے لوٹ آئے ہیں
پھر آج ہم کو ٹھکانے کا ہم سبو نہ ملا

☆

دل کا پتا سرشکِ مسلسل سے پوچھیے
آخر وہ بے وطن بھی اِسی کارواں میں تھا
جس دل کو آج کنجِ اماں کہہ رہے ہیں لوگ
آسیبِ آرزو اسی اُجڑے مکاں میں تھا

☆

پکی سڑکوں والے شہر میں کس سے ملنے جائیں
بھولے سے بھی پانو پڑے تو بج اُٹھتی ہے کھڑانو
آتے ہیں کھلتا دروازہ دیکھ کے رک جاتے ہیں
دل پر نقش بٹھا جاتے ہیں یہی ٹھٹکتے پانو

☆

کوئی تو شے شرارت بھری کالی آنکھوں میں بے چین ہے
کچھ تو ہے جس پہ ہم شمع اُمید کی لو بجھاتے نہیں
ہنستے گالوں کے گہرے نشیبوں میں کیا جانے کیا سحر ہے
ورنہ ہم سے پرانے کھلاڑی تو یوں مات کھاتے نہیں

☆

خوشی ملی تو یہ عالم تھا بدحواسی کا
کہ دھیان ہی نہ رہا غم کی بے لباسی کا
گزر نہ جا یونہی رخ پھیر کر سلام تو لے
ہمیں تو دیر سے دعویٰ ہے روشناسی کا
خدا کو مان کہ تجھ لب کو چومنے کے سوا
کوئی علاج نہیں آج کی اُداسی کا

☆

دل خوں اگر نہ ہو تو یہاں پوچھتا ہے کون
لے کر پھرا کرے کوئی حال تباہ بھی
کل پھر وہ موجِ آب کی صورت نکل گیا
حائل نہ ہو سکی ہوسِ بے پناہ بھی

☆

اُس کی ہر طرزِ تغافل پہ نظر رکھتی ہے
آنکھ ہے دل تو نہیں ساری خبر رکھتی ہے

☆

ملا تو منزلِ جاں میں اُتارنے نہ دیا
وہ کھو گیا تو کسی نے پکارنے نہ دیا
رواں دواں ہے یونہی کشتیٔ زماں اب بھی
مگر وہ لمحہ جو دل نے گزارنے نہ دیا

میں نے عرض کیا ہے کہ تمام اشعار وقفہ وقفہ سے میرے اور مجھ جیسے نوجوان اہلِ سخن کے حافظہ کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ اس تخصیص کے بغیر کہ یہ ظفر اقبال کا کلام تھا کیوں کہ اس دوران ناصر کاظمی، ابنِ انشا، مصطفیٰ زیدی، باقی صدیقی، فیض احمد فیض اور فرید جاوید کے اشعار بھی حافظہ میں جگہ بناتے رہے تھے اور ہمیں اس وقت صرف اچھے اشعار سے غرض تھی اُن کے خالق سے کوئی

علاقہ نہ تھا سوائے اس کے اس وقت کے میڈیا ریڈیو پاکستان یا کسی گلوکار کی طرف سے یہ نہ بتایا جائے کہ یہ شعر ناصر کا ہے یا فیض کا یا باقی صدیقی کا یا حفیظ ہوشیار پوری کا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک شعر ادبی فضا میں گونجا:

سخن سرائی تماشا ہے شعر بندر ہے
شکم کی مار ہے شاعر نہیں مچھندر ہے

اس شعر کو ہم نے اعلیٰ مزاح کے خانے میں رکھا اور اس سے عرصہ تک لطف لیا اور تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کسی مزاحیہ شاعری کا ٹکڑا نہیں بلکہ ظفر اقبال کی ایک سنجیدہ اور خوب صورت غزل کا مطلع ہے۔ یہ گویا ظفر اقبال سے ہمارا پہلا باقاعدہ تعارف تھا جس کے بعد ان کی غزل ہم تلاش کر کے پڑھنے لگے۔ اب بلا تاخیر عرض کرنا ہے کہ سخن کا یہ ڈھب جو بعد ازاں ان کے مزاج شاعری میں چونکانے والے عنصر کی طرح سامنے آیا۔ "تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" طرح ابتدا سے ہی حصہ تھا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اُسے منظور نہیں چھوڑ جھگڑتا کیا ہے
دل ہی کم مایہ ہے اپنا تو اکڑتا کیا ہے
جانتا ہے کہ اُتر جائے گی دل میں مری بات
ورنہ سن لے تو بتا تیرا بگڑتا کیا ہے

☆

دل کی ویرانی کا منظر اس قدر کالا نہ تھا
فرش پر مٹی نہ تھی دیوار پر جالا نہ تھا

☆

وہ جان مانگے تو دے دو اُسی پہ بس کیا ہے
جو پھنس گئے ہو تو اب اور پیش و پس کیا ہے

☆

دل کا یہ دشت عرصۂ محشر لگا مجھے
میں کیا بلا ہوں رات بہت ڈر لگا مجھے

☆

کھینچ لائی ہے یہاں لذتِ آزار مجھے
جہاں پانی نہ ملے آج وہاں مار مجھے

ان اشعار میں سوائے اس کے کوئی بات نہ تھی کہ ظفؔر اقبال اُن الفاظ کو بھی غزل میں استعمال کرنا چاہتے تھے جو غزل کی جمالیات سے باہر ہیں اور کہیں پورا یا آدھا مصرع غزل کی جمالیات سے باہر نظر آتا ہے۔ پھر یہ رویہ آئندہ کی شاعری میں مستقل رویے کی صورت میں سامنے آیا۔ ''گلافتاب'' کی شاعری میں کم اور اس کے بعد کی شاعری میں بڑی شدومد کے ساتھ۔ تاہم ظفؔر اقبال کی شاعری میں یہ صورت محض قاری کو چونکانے کی خواہش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سخن سرائی تماشا والے شعر میں نیا اُسلوب بھی نظر آتا ہے مگر باقی اشعار میں ظفؔر اقبال نے نامانوس الفاظ کا خواہ مخواہ استعمال کیا ہے وگرنہ مصرع تراشی کا جو ہنر انھیں آتا ہے اور اکثر وہ صورتِ اظہار جو، اُن سے نسبت رکھتی ہے اس سے کوئی بعید نہ تھا کہ یہ مصرعے بھی خوب صورت زبان کا مظہر ٹھہرتے۔ اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے ان کے مزاحیہ مطلع والی غزل (سخن سرائی تماشا ہے شعر بندر ہے) کے باقی اشعار درج کرنا ضروری ہے:

ہے جستجو کبھی اپنا بھی رنگِ رخ دیکھوں
تری تلاش نہیں تو تو میرے اندر ہے
مزے کی بات ہے اُس کو بھجن سکھاتے ہیں
جو خود ہی مورتی ہے اور خود ہی مندر ہے
جزیرۂ جہلا میں گھرا ہُوا ہوں ظفؔر
نکل کے جاؤں کہاں چار سو سمندر ہے

یہ ہیں ظفؔر اقبال، مصرع تراشی کے اُس ہنر میں ماہر جو، اُن سے ہی مخصوص ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ظفؔر اقبال کی شاعری کی اس صفت کو محسوس کرنے کے لیے ایک اعلیٰ ذوق کے قاری کی

ضرورت ہے اور ایسے تنقید نگار کی ضرورت ہے جو خود بھی شاعر ہو۔ یہ بات میں نے اپنے نظریہ تنقید کے خلاف تحریر کی ہے مگر جس نوعیت کی تنقید اور تنقیدی مضامین مجھے ظفر اقبال کی پہلی کلیات میں پڑھنے کو ملے ہیں اور جسے میں تدریسی تنقید کے خانے میں ڈالتا ہوں ان کے بموجب یہ جملہ شاملِ تحریر ہو گیا ہے کہنا یہ ہے کہ تفہیمِ شعر کے ساتھ شاعری کے استحسان کا فریضہ انجام دینا ان دو بزرگوں کے لیے تو غالباً ممکن ہی نہیں تھا جن کے مضامین شاملِ اشاعت کیے گئے لیکن دیگر نے بھی تعریف کا حق تو ادا کیا لیکن ظفر اقبال کے کلام کی اس صفت کی طرف رجوع نہیں کیا جو ظفر اقبال کو دیگر معاصر شعراء سے ممیز اور کہیں ماورا کرتی ہے۔

اس گفتگو کو یعنی ظفر اقبال کے غیر روایتی تجربوں کی گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل میں اس بات پر بہر حال اصرار کرنا چاہتا ہوں کہ ظفر اقبال کی وہی شاعری اہلِ ادب کی اکثریت کا ادبی سرمایہ ہے اور ان کے جمالیاتی احساس کا وقیع حصہ ہے جو آبِ رواں کی صورت میں سامنے آیا تھا اور جو آج تک کی شاعری میں کوندے کی طرح لپکتا نظر آتا ہے۔ ظفر اقبال کی اسی شاعری کو اور اس کی خوب صورتی کو ان پر لکھے گئے تنقیدی مضامین سے پایا نہیں جا سکتا اور ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ ان کی شاعری جس صفت کی بنا پر میری نسل کے حافظے کا حصہ بنی تھی اور آج کا قاری بھی ان کے کلام کے ایسے مطالعے میں اس سے گزر سکتا ہے جو استحسانی فضا میں ہو۔ یہ شرط میں نے خواہ مخواہ عاید کی ہے وگرنہ ان کا کلام جب بھی سماعت اور بصارت سے گزرے گا اسی طرح قاری کو اپنے حصار میں لے لے گا جس طرح گزشتہ کئی نسلیں ان کے حصار میں آئی تھیں۔ مگر یہ شرط عاید کرنے کا سبب بلکہ ذمہ دار خود ظفر اقبال ہیں کہ انھوں نے نئے نئے تجربات پر مبنی شاعری کا ڈھیر بلکہ کئی ڈھیر لگا دیے ہیں جن سے گزرتے ہوئے ان کی شاعری کے جمالیاتی رخ سے محظوظ ہونا اس وقت تک عام قاری کے لیے ممکن نہیں جب تک اسے احساس نہ ہو جائے کہ وہ ظفر اقبال کی شاعری سے گزر رہا ہے جہاں تجربے کی بے کیفی کے دوران بھی جمالیات اور ظفر اقبال کی مخصوص جمالیاتِ شعر اپنا اظہار کسی وقت بھی کر سکتی ہے۔

ظفر اقبال کی شعری جمالیات ہر بڑے شاعر کی طرح لفظوں کے انتخاب اور اس سے بڑھ کر مصرعوں کی تراش اور بنت سے پیدا ہوتی ہے جس کا ماخذ لفظوں کا وہ در و بست ہے جو شاعر کو امتیاز

اور اختصاص بخشتا ہے۔ اُسلوب اور طرزِ اظہار کی خوب صورتی کی بات دراصل اسی لیے کلیشے بنتی جا رہی ہے کہ شاعری کی پرکاری کسی شاعر کے یہاں اس کی انفرادیت محض محسوس کی جاسکتی ہے اور اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے اور اسی پر اصرار کرتا ہوں کہ غالبؔ سے فیضؔ تک ہر شاعری کی اپنی الگ خوب صورتی ہے جو محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ظفرؔ اقبال کی جمالیاتِ شاعری اپنا الگ مزاج اور سواد رکھتی ہے۔ البتہ کچھ علامتی باتوں کا ذکر ممکن ہوسکتا ہے کہ جس طرح میں نے فراقؔ کا حوالہ تجرباتی شاعری کے دوران بے رنگی کو موضوع بناتے ہوئے دیا تھا۔ اسی طرح میں محسوس کرتا ہوں کہ ظفرؔ اقبال کے یہاں شاعری میں جو پُرکاری کی فضا ہے اور نئے تجرباتِ شاعری میں جو طنطنہ ہے وہ غالبؔ کے بعد ظفرؔ اقبال کا رشتہ یگانہؔ چنگیزی سے جوڑتا ہے۔ محسوس کیجیے اور آج کے تناظر میں دیکھیے کہ ظفرؔ اقبال شاعری کی مختلف نوعیتوں کے انبار لگانے کے بعد آج بھی ایک ہی بحر میں اور زمیں اور کبھی کبھی قافیہ بدل کر تواتر سے غزلیں تخلیق کرتے ہیں اور انھیں شائع بھی کراتے ہیں اور ایک طرف اپنی زود گوئی کی داد پاتے ہیں اور دوسری جانب یہ نظر آتا ہے کہ ان کی غزل میں بے معنویت بھی نہیں ہے اور کوئی غزل ان کی فنکارانہ صفت سے خالی بھی نہیں ہے۔ مگر وہ لفظوں کے نامناسب یا نامانوس صورتوں کے استعمال سے نہیں چوکتے اور کسی اعتراض کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔

مگر میں ظفرؔ اقبال کے وصفِ شعر کی بنیاد اُن کی مصرع تراشی کے ہنر پر رکھتا ہوں اور موادِ شعر پر اندازِ اظہار کو فوقیت دینے کے تنقیدی رویے پر اصرار کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ظفرؔ اقبال کی شعری جمالیات کی انفرادیت ہی ان کا اصل سرمایہ اور اصل شناخت ہے۔ میں گفتگو کو تشنہ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا اور اُن کے تجربات تک بات کا دائرہ پھیلانا چاہتا ہوں مگر اس سے ظفرؔ اقبال کی اس شاعری سے محظوظ ہونے اور پڑھنے والوں کو محظوظ کرنے کے لیے کچھ منتخب اشعار پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس ادعا کے ساتھ کہ یہ اشعار صرف آبِ رواں سے نہیں ہیں بلکہ اُن کتابوں کا بھی حصہ ہیں جو متنازعہ رہی ہیں:

کبھی اُنگلیوں کی اشارتوں میں چھپی چھپائی عبارتیں
کبھی لعلِ سُرخ میں گفتگو کا برہنہ باب کُھلا ہُوا

یہ مہک جو تیر کی طرح میرے مشامِ جاں میں در آئی ہے
اسی باغ میں ہے یہیں کہیں وہ سیہ گلاب کھلا ہوا

☆

اور بھی ہیں قفس کئی دورِ شب ملال سے
پانو نکالیے کبھی سلسلہ سوال سے
رات وہی ہے ارجمند ذات وہی ہے سربلند
لمحۂ جاں گزر گیا جسم کے ماہ و سال سے

☆

جسم کے ریگ زار میں شام و سحر صدا کروں
منزل جاں تو دور ہے طے یہی فاصلہ کروں
شاخ ہلی تو ڈر گیا دھوپ کھلی تو مر گیا
کاش کبھی تو جیتے جی صبح کا سامنا کروں

☆

گنگ ہے خاکسترِ خوں بولتا پھرتا ہوں میں
خواب کے موتی ہیں جن کو رولتا پھرتا ہوں میں

☆

بحر سنسان ہے گہر کے بغیر
دشت ویراں ہے نقشِ پا کے سوا
پسِ دیوار کچھ نہیں باقی
نوحۂ منشِ ناروا کے سوا

☆

دھوکا ہوا تھا آبِ رواں پر سراب کا
رختِ سفر ہے بس وہی لمحہ عذاب کا

☆

رات کا زہر بجھاتے رہے بینائی میں
چھپ کے بیٹھی رہی تصویر تماشائی میں
لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

ظفر اقبال کے ان اشعار کی تخلیق اور ہم تک ان کی رسائی کا زمانہ وہ ہے جب مجھے سیاسی قیدی کی صورت ایوب خاں کی حکومت کے ہاتھوں قید و بند اور بعد ازاں بے روزگاری کے سبب پڑھنے کا وقت زیادہ ملتا تھا۔ پھر بھٹو صاحب کی حکومت میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ ان زمانوں میں میں نے شعراء کے کلام کا مطالعہ ان کے نام کے حوالے سے کرنا شروع کر دیا تھا اور ظفر اقبال کی غزلیں تلاش کر کے پڑھی جاتی تھیں اور اس مطالعے کا اپنے ہم عصر نوجوان شاعروں سے تبادلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس زمانے میں ظفر اقبال پر کبھی علامہ اقبال اور کبھی عزیز حامد مدنی کے اثر کا گمان بھی ہوا مگر پھر یہ خیال زیادہ دیر قائم نہیں رہتا تھا اور یوں بھی تھا کہ ''آب رواں'' کی عجیب و غریب منفرد لہجے والی غزلوں کے ساتھ کی غزلیں سامنے آئیں۔ جس کی بناء پر ظفر اقبال پر پہلے تجریدی تحریک کا اثر نظر آیا پھر وہ انحراف غزل کی طرز سخن کی طرف جاتے نظر آئے جسے غالباً اس زمانے میں اینٹی غزل کا نام اس وقت کے نام نہاد جدیدیت پسندوں نے دیا تھا جن میں افتخار جالب اور انیس ناگی پیش پیش تھے۔ اس مختصر دورانیے کے بعد ظفر اقبال لفظ کے بجائے صوتیہ پر مبنی شاعری (بصورت غزل) کرتے نظر آئے۔ یہ سارے زمانے مختصر ہیں لیکن ظفر اقبال کے کلام کا حصہ ہیں جن میں قاری کو چونکانے کی صفت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں یعنی اس کے معیار میں کوئی اضافہ تو نہیں ہوا مگر وہ شہرت میں سب سے آگے نکل گئے تھے (یہ فراز کی عوامی مقبولیت سے پہلے کی بات ہے) ان تمام رجحانات کے منتخب اشعار سلسلہ وار ملاحظہ فرمائیں:

بادل کی سیاہ سرزمین پر
بجلی کا درخت سے اُگا تھا

مچھلی باہر گئی ہوئی تھی
پانی کا مکان بے صدا تھا
افراتفری مچی ہوئی تھی
خوشبو کا چراغ بجھ گیا تھا
سر میں تلوار سی چلی تھی
سینے پر پھول سا کھلا تھا

☆

سبز کوٹ افسوں نشیلی چھائی تھی چاروں طرف
ہمہمہ ہنجار ہیکل ہاو ہو سے دور تھا
حرف کی زنجیر زرد آزار تھی میرے لیے
میں الف کی آرزو میں شین سے مجبور تھا

☆

دو دھڑوں کے درمیاں جب رات کو گولی چلی
آنگناں میں سنسنی تھی بیریاں پر بور تھا

☆

تند کی تہہ میں طلب تھی تنگ میں تاخیر تھی
تلخیِ تسکیں تعاقب تیز کی تصویر تھی

☆

ساحلوں سونے سیہ تھے پانیوں پایاب تھے
دور کے دریا بظاہر سبزی سیلاب تھے
آسماں انکار تھا رازوں کا ربطِ رایگاں
زرد سے زرداب تھے یا سرخ سے سرخاب تھے
نم نشیں تھی سرمئی سلوٹ کی سنگ آمیز سطح
ایک فٹ کے فاصلے پر دو سفید گلاب تھے

☆

گرجا گھنگھور کو بہ کو پر
برسا منہ زور آرزو پر
گربز تجسیم سامنا سا
ارژنگ اتار دوبدو پر
الیف ایل اصرار خشم خوبی
عکساں رقصاں نمو نمو پر

☆

تصویر ترنگ برق بارش
عکسی نقشی ہر آئینے میں
سل سنگ ثبات سنسناہٹ
آہنگ اسار ٹوٹنے میں
مینہ مرگ مجامعت مہورت
مندرج لہو کے لائحے میں

یہ اشعار ظفؔر اقبال کی تجریدی شاعری کے ہیں جہاں جنسی تلذذ کے کسی اشارے کے سوا کسی احساس کا سمجھنا ہم جیسے اسیران شاعری کے لیے ممکن نہ تھا۔ مگر ظفؔر اقبال اس سے بھی آگے (جدیدیت کی لایعنی اور ادھوری بات) لفظ کے بے معنی ہونے اور صوتیہ کی حقانیت کے چکر میں صوتیہ پر مبنی شاعری کی طرف بھی بڑھ گئے اور بڑے طمطراق سے بڑھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

چمک چمکار نے شب شیرنے کے
مزے محکم الف انجیرنے کے
لہو لہلوٹ سیاہی پھیلویں پھب
کڈھب کاغذ طلب تحریرنے کے
سڑک سل سلسلے تنگیں دنگیں
چھلڑ چھل چھانونے رہ گیرنے کے

☆

دلدر درمیاں دلدارنے کا
تلخ تنہا الف انکارنے کا
صفر مشکل بنا آساں عقوبت
مساوی بے عدد زنہارنے کا
کڑی کڑیل انوکھ اندام اگھ سگھ
سفر سکھ سلسلہ جھنکارنے کا
چلکویں چیز چڑھ چوگان چوکھ
کرن قابو ہرگ ہشیارنے کا

سو سے زائد اشعار پر مشتمل اس غزل اور ایسی کئی غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کیفیت اظہار کا دورانیہ خاصا رہا تھا تاہم اِس ضمن میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ظفؔر اقبال صوتیہ تک زیادہ دیر محدود نہ رہ سکے اور بعد ازاں پرانے لفظوں کی ہیئت کو بگاڑنے یا مصرعوں میں پنجابی تڑکا لگانے میں مصروف ہوگئے۔ گلافتاب کے آغاز میں انھوں نے اپنی اس کاوش کو خود ہی خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ یہ اُردو زبان کی پژمردگی اور تھکن دور کرنے کے لیے ضروری تھا اور یہ بھی کہ ان کی کتاب اُردو مستقبل کا خواب نامہ ہے۔ لفظوں کے بگاڑ کے حوالے سے بھی کئی باتیں ظفر اقبال نے اپنے پیش لفظ میں کی ہیں۔ ظفؔر اقبال کی یہ شاعری ساتویں دہائی کی ہے اور اب ہم اس کی اگلی صدی کی دوسری دہائی میں کیا محسوس کرتے ہیں وہ ظفؔر اقبال بھی جانتے ہیں اور ان کے نادان نقاد نما حمایت کار بھی۔ ظفؔر اقبال کا یہ رخ اچھا نہیں تھا مگر اس کا ذکر ضروری تھا اس لیے بھی کہ ہمارے پیشِ نظر شاعر کا پورا سفر ہونا چاہیے اور اس لیے بھی کہ اسی سے ظفؔر اقبال کی تخلیقی توانائی کا اندازہ ہوتا ہے جس کا تسلسل آج بھی موجود ہے۔ ان رویوں کو ظفؔر اقبال نے خود بھی ترک کر دیا ہے اور لفظوں کو بگاڑی ہوئی صورت میں استعمال کرنے کے رویے کے علاوہ ظفؔر اقبال کی آج کی شاعری اپنے بے مثال مصرع طرازی کے فن کے ساتھ آج بھی جاری نظر آتی ہے۔

''گلافتاب'' کے بعد ''رطب دیابس'' کے نام سے جو مجموعۂ کلام سامنے آیا۔ اس دوران

ظفر اقبال نے ظریفانہ طریقِ سخن زیادہ تر استعمال کیا جس کا رنگ کہیں کہیں تیز ہوا مگر درمیان میں وہ شعلۂ سخن بھی اپنی جھلک دکھاتا رہا جو صرف ظفر اقبال کا خاصہ ہے۔ دونوں باتوں کے حوالے سے یہ اشعار ملاحظہ کریں اور آخری شعر پر توقف کریں تو آپ کو ظفر اقبال کا قامت اُسی بلندی پر نظر آئے گا:

قافیے کی بند گلیوں کا گداگر کر دیا
اُس نے کیسے کام پر مجھ کو مقرر کر دیا

☆

ستر پوشی ہے قافیہ بندی
ہاں ذرا کس کے باندھیے شلوار
کام کتنوں کا ہی تمام ہوا
جب بھی اوچھا پڑا زبان کا وار

☆

روکو گے تو ہم کریں گے دنگا
بن جائے گا بات کا بتنگا
خیر آپ بھی بدمعاش ہوں گے
میں ہوں ذرا مختلف لفنگا

☆

دو دن میں ہی اُس کو چھوڑ نسا
کیا تھا وہ ہیولۂ ہوس سا

☆

عینک لیجے اگر بدلوا
روز آئے نظر نیا ہی جلوہ

☆

آگ دو دن میں ہو گئی ٹھنڈی
حضرتِ دل دکھا گئے جھنڈی
یوں بجی ہے پھٹی پرانی اُمید
شام کے وقت جس طرح رنڈی

☆

قافیہ چاہیے کھانے کے لیے
یعنی مطلع میں کھپانے کے لیے
شاعری اصل کہاں ہے کہ ظفرؔ
دانت ہیں یہ تو دکھانے کے لیے

☆

تنہا ہی جشنِ مرگِ معانی منائیں ہم
لیکن حصارِ حرف سے باہر صدا تو آئے

اس آخری شعر کی آنچ کو محسوس کیجیے اور اب ''رطب و یابس'' سے کچھ منتخب اشعار بھی دیکھیے:

ہوائے دل بھی نہ تھی موسمِ دعا بھی نہ تھا
بدن پہ وقت کچھ ایسا کبھی پڑا بھی نہ تھا
بکھر گیا تھا ذرا سا وہ رنگ راز تو اب
مجھے ہی فکر تھی ساری اُسے پتا بھی نہ تھا

☆

توڑ ڈالیں سب حدیں اور مسئلہ حل کر دیا
خود بھی سودائی ہوئے اُس کو بھی پاگل کر دیا
ٹوٹ کر الجھی بدن سے وصل کی سرکش ہوا
ایک ہی جھونکے نے کیا جنگل میں منگل کر دیا

میں ''رطب و یابس'' کی شاعری کو رد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا کہ اس میں ایک چٹپٹا پن

بہر حال ہے جو عامیانہ شاعری میں ہوتا ہے اور جہاں ظفؔر اقبال کی حس ظرافت کا تڑکا بھی لگا ہوا ہو تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ سو اس زمانے میں یعنی ساتویں دہائی (بیسویں صدی) میں اس کا بہت شور رہا۔ مگر جو اشعار (تین اشعار) میں نے نقل کیے وہ ظفؔر اقبال کی شاعری کا اصل حصہ ہیں اور یہی کلام ظفؔر اقبال کی پہچان ہے۔

اس کے بعد کے مجموعوں میں خصوصاً ''غبار آلود سمتوں کا سراغ'' کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ظفؔر اقبال ''آبِ رواں'' کی شاعری کی طرف واپس آگئے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے قبل ہی مراجعت کے آثار ظفؔر اقبال کے ان اشعار میں نمایاں ہو گئے تھے:

غزل کا شور ہے اندر پرانا
بہت گونجے گا یہ پیکر پرانا

☆

غزل میں تھے بہت آزادہ رو ظفؔر لیکن
تلازمات کی زنجیر سے رہا نہ ہوئے

☆

سیدھے سیدھے شعر کہتے سب کو خوش آتے ظفؔر
کیا کیا جائے کہ اپنی عقل میں افتور تھا

اس آخری شعر میں ظفؔر اقبال نے فتور میں الف لگا کر شاید صفت کا آخری صیغہ شمار کیا ہے مگر غزل کی طرف مراجعت صاف نظر آتی ہے اور اس غزل کی طرف جس سے انھوں نے اپنے کو اہلِ ذوق اور اہل تنقید کے تئیں منوایا تھا اور جو آج تک اُن کی پہچان ہے۔

میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ غزل کی صنف میں اس کے اصول مسائل اور شرائط کے خلاف ظفؔر اقبال کا واویلا مجھے صرف ان کے مزاجِ شعر میں چونکانے اور قاری کو حیرت زدہ کرنے کی صفت کا اعادہ نظر آتا ہے ورنہ غزل کے تنگ نائے نے ان کو کبھی پابند نہیں بنایا۔ وسعتِ بیان جو ان کے یہاں غالب کی طرح موجود تھی اس نے انھیں ممیز و ممتاز بنایا تھا تاہم شعری تجربوں کی جو خواہش اور اہلِ شہر کی کم مائیگی کے خلاف جو غصہ اور جھنجلاہٹ ان کے ذہن میں تھی اس کے اظہار

کی صورت بھی قواعدِ غزل کے خلاف ان کے نعرہ مستانہ سے ہی نکلی۔ ''رطب ویابس'' سے ''سرِعام'' اور ''عیب وہنر'' کی شاعری تک معاشرہ اور معاشرت پر طنز کے نشتر رکھنے کی خواہش ان کے کلام کا حصہ بھی ہے اور اس کی وجہِ نزول بھی ہے۔ اس دوران ان کی شاعری میں تجربوں والی شاعری ہے اور غزل کے قواعد سے بغاوت کی شاعری بھی ہے اور ہر جگہ ان کا طنزیہ لہجہ نمایاں ہے۔ مگر عامیانہ شاعری کی عمداً کاوش کے ساتھ وہ شاعری بھی جاری رہتی ہے۔ جو ظفر اقبال کے اندروں سے طلوع ہوتی ہے اور ''آبِ رواں'' سے عیب وہنر تک ظفر اقبال کے شعری تسلسل کی نوید بنتی ہے۔ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ''غبار آلود سمتوں کا سراغ''، ''رطب ویابس''، ''سرِعام'' اور ''عیب وہنر'' سے:

یہ اتفاق نہیں ہے جو رنگ زرد اُس کا
کبھی کبھی مرے چہرے سے بھی جھلکتا ہے

☆

دن رات یوں نہ خوف کا گٹھڑ اُٹھائے پھر
یہ بوجھ اپنے سر سے جھٹک کر اُتار دے
چہرے سے جھاڑ پچھلے برس کی کدورتیں
دیوار سے پرانا کیلنڈر اُتار دے

☆

نکل کے دل سے رکے اشک اندھیری آنکھوں میں
مسافرانِ محبت کو آئی شام کہاں
کرے گا تو ہی انھیں داغ بوسہ پر آزاد
اب اور جا کے بکیں گے ترے غلام کہاں

☆

وہی بکھراؤ ہے بکھراؤ میں یک سوئی بھی
آئینہ جانتا ہے عکس کی عیاری کو

بھوک وہ نشہ نازک ہے کہ جب ٹوٹے گا
جی ترس جائے گا اس طرح کی سرشاری کو

☆

یہ درسِ امن واماں کیا ہے خوب جانتا ہوں
کہ یہ فریب تو اکثر دیا گیا ہے مجھے

☆

کھینچ لے جاتی ہے سب کو یہ ہنر خاک میں ہے
آسماں زاد ہوں لیکن مرا گھر خاک میں ہے
کوئی افلاک سے اُترے گا نہ ان کی خاطر
شب نشینوں کی اگر ہے تو سحر خاک میں ہے

میں نے ظفر اقبال کے اشعار زیادہ تعداد میں نقل کیے ہیں جس کا سبب اس بات پر اصرار کرنا بھی ہے کہ ان کی شاعری کی خوب صورتی کا تسلسل آج تک جاری ہے دوسری جانب ظفر اقبال کی شاعری کے اتنے رخ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنے کے لیے ایسا ضروری تھا۔ ایک جملے کا اضافہ کرنا ضروری ہے جو میرے ایک ادعا میں غلطی کی گنجائش سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہے کہ ظفر اقبال نے غزل کے قواعد کے خلاف واویلا نہیں کیا بلکہ غزل کے مروّجہ اصولوں کے نام پر غزل کے شعراء کی اکثریت نے (مشاہیر اور صاحبِ طرز شعراء کے سوا) جس طرح شاعری کو یک رخا اور یک رنگا بلکہ بے رنگ بنا دیا ہے ظفر اقبال اس کے نکتہ چیں ہیں۔ ان کے مضامین میں اور اس سے قبل ان کے اشعار میں بھی اس کا اظہار ہے کہ قافیے اظہار کے بجائے محض قافیہ بندی کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں اور تلازمات کا استعمال بوجھل اور بلا ضرورت شاعری کی دلیل بن گیا ہے۔ دوسری جانب وہ غزل کے امکانات کے بھی شاکی ہیں۔ مگر یہ آخری بات ان پر جدیدیت پسندوں کے ذاتی نظریات کے اثرات کا شاخسانہ ہے وگرنہ ظفر اقبال نے اپنا اظہار غزل میں ہی کیا ہے کیونکہ وہ بہ حیثیت صنف، غزل کی طاقت سے واقف ہیں۔ غزل کے امکانات کے بارے میں منفی صورت میں قمر جمیل بہت زیادہ رطب اللسان رہتے تھے اور یوں بھی ہوا تھا کہ ان کے حلقے

کے لوگ ان کے مزاحیہ جملوں کو بھی اصولی بات بلکہ اصول کی طرح دہراتے نظر آتے تھے۔ قمر جمیل کی گفتگو کا جادو رئیس فروغ اور رسا چغتائی جیسے باکمال غزل گویوں پر بھی چل گیا تھا اور دونوں کچھ عرصے کے لیے غزل سے تائب رہے پھر کیا ہوا کہ خود قمر جمیل اور پھر رسا چغتائی غزل کی طرف واپس آ گئے مگر رئیس فروغ سے زندگی نے وفا نہیں کی۔

میں غزل کی وکالت نہیں کر رہا صرف شاعری کی وکالت کر رہا ہوں۔ بھارت کے ایک معروف شاعر عرفان صدیقی سے جب ایک جدیدیے نے سوال کیا کہ غزل کے امکانات تو ختم ہو گئے ہیں تو آپ ابھی تک اس سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں تو عرفان صدیقی نے کہا تھا کہ غزل تو ذریعہ اظہار ہے۔ شاعری کے امکانات ختم ہوئے ہیں نہ ختم ہوں گے سو غزل کے امکانات بھی ختم نہیں ہو سکتے۔ ظفر اقبال نے امکانات کو کسی اور طرح بھی دیکھا اور ساتویں دہائی میں جدیدیت کے کچے پکے خیالات سے متاثر ہو کر (جو نام نہاد اہلِ تنقید نے اپنے ادھورے مطالعے کے سبب رائج کیے تھے) ظفر اقبال نے غزل کی بہت سی بگڑی ہوئی شکلیں بھی تخلیق کیں مگر غزل کی خوب صورت شاعری بھی انھیں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ایسی بانکی غزل یعنی غزل کی خوب صورت شاعری اپنی انفرادی صورت میں ظفر اقبال کا خاصہ بھی ہے اور اسی منفرد لہجے کی شاعری کے سبب ظفر اقبال عہدِ موجود میں اُردو شاعری کا اہم نام ہے بلکہ اہم ترین غزل گو شعراء کی مختصر ترین فہرست کا حصہ ہے۔

میں ظفر اقبال سے متاثر ہوتا رہا۔ دیگر شعراء سے بھی متاثر ہوتا رہا اور یہ ہمہ وقت سوچتا رہا کہ آخر انفرادی یعنی انفرادیت رکھنے والا شعری اظہار جو ہر صاحبِ اُسلوب شاعر کے یہاں ہوتا ہے مگر سب کے یہاں مختلف بھی ہوتا ہے اور وہ کیا چیز ہے جس نے ظفر اقبال کے کلام کو دل پذیر بنا رکھا ہے۔ دروبست لفظی جو خوب صورتیِ اظہار کی بنیاد ہے وہ کس طرح پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے اور ظفر اقبال کے مصرعوں اور اشعار میں جو کاٹ اور طرح داری ہے اس کو محسوس کیسے کیا جاتا ہے۔ اس فکر کی دامن گیری نے مجھے عرصہ تک پریشان رکھا اور اس کا جواب عرصہ دراز تک مجھے نہیں مل پایا کہ شاعری کی وہ قدر کیا ہے جو دقیق فکری سرمایہ رکھنے والے کلام کے مقابلے میں قاری کے دل تک رسائی میں سبقت رکھتی ہے۔ پھر مجھ پر کھلا کہ شاعری کی سب سے بڑی جہت اور صفت

اس کی سمعی قدر ہے۔ سمعی قدر کی اصطلاح میں ایک تھیوری کی طرح آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں اور وہ ظفر اقبال کی شاعری پر بھی منطبق ہوئی ہے۔ شاعری کی سمعی قدر سے میری مراد کسی شاعری کو براہ راست سماعت کرنے سے نہیں ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ آخر کار شاعری قاری کے پاس کاغذ پر (یا اب اسکرین پر) تحریر کی شکل میں ہی پہنچتی ہے۔ مگر آپ جب بھی شاعری کو پڑھتے ہیں تو لفظ دراصل آپ کے ذہن کے ایوان سماعت میں وررود کرتے ہیں۔ اس بات کو صحافت کی زبان میں اور اس کے اصولوں کے ذریعے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ لفظ دراصل بولتے بھی ہیں۔ اخبار کی سنگل سرخی اگر اندر کے صفحات پر ہو تو سرگوشی کرتی ہے اور باہر کے صفحہ پر ہو تو اس کی آواز قدرے بلند ہوتی ہے اور اس طرح دو کالم اور تین کالم کی سرخی میں یہ آواز بلند سے بلند تر ہو جاتی ہے اور شہ سرخی میں الفاظ چیخنے لگتے ہیں۔

اس بات کو ذہن میں رکھیے اور سرگوشی اور نسبتاً بلند آواز کے حوالے سے محسوس کیجیے تو شاعری کا ایک صوتی تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں ایوانِ سماعت میں مرتب ہوتا ہے جو اسے وجدانی سطح پر یا آسان لفظوں میں اسے جذباتی اور احساس کی سطح پر متاثر کرتا ہے۔ یعنی پڑھنے والے کے جذبات اور احساسات میں تموج پیدا کرتا ہے۔ یہ تاثر یا صوتی پیراڈائم ہر بڑے شاعر کی شاعری میں مختلف نوعیت رکھتا ہے اور اسی کو محسوس کر کے ہم شاعری کی تفہیم بھی کرتے ہیں اور ہر شاعر کے لہجے کی انفرادیت بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ صوتی پیراڈائم موسیقی کی سمفنی کی طرح ہے کہ اگر بکھر جائے تو شاعری کی اثر انگیزی فوری طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اگر کسی شعر کا ترجمہ کیا جائے یا محض اس کو نثر میں تبدیل کیا جائے (ان ہی الفاظ کے ساتھ) تو شعر کا تاثر فوری طور پر ختم ہو جاتا ہے اور اثر انگیزی کے بجائے بے کیفی جنم لیتی ہے۔ محسوس کیجیے کہ ظفر اقبال کی شاعری میں جو ظفر اقبال کے پہلے مجموعے آبِ رواں میں اپنی بہار نظر آتی ہے شاعری کا صوتی پیراڈائم ایک انوکھا تاثر قائم رکھتا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری کا صوتی پیراڈائم ہی ان کی شاعری کی طلسماتی اثر پذیری کی بنیاد ہے۔ یہ بات ہر بڑے شاعر اور ہر صاحب اسلوب شاعر کی شاعری کے لیے درست ہے مگر میں یہاں ظفر اقبال کی بات کر رہا ہوں کہ ان کی شاعری میں لفظوں کے اپنے منفرد انتخاب اور لفظی تراکیب

اور سب سے بڑھ کر مصرعوں میں لفظوں کے درو بست سے جو صوتی فضا قاری کے ایوانِ سماعت میں مرتب ہوتی ہے وہ ظفرؔ اقبال کا شعری کارنامہ ہے۔ ظفرؔ اقبال کچھ بھی سوچتے ہیں...... اور اپنے (بقولِ خود) اُلٹے سیدھے خیالات میں جو کچھ بھی کہتے ہیں ان کی شاعری کے اثر انگیز ہونے کا ماجرا یہی ہے۔ غزل میں بھی نظم میں بھی بلکہ ہر صنفِ سخن میں جہاں جہاں شاعری موجود ہے یہی موج موجزن ہے۔ ظفرؔ اقبال کی شاعری کے اسی مختلف صوتی اثر انگیز پیراڈائم نے ہمیں متاثر کیا ہے اور ان کی شاعری آئندہ بھی پڑھنے والوں کو متاثر کرتی رہے گی۔ اس میں صنفِ غزل بھی مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس کے ذریعے شاعری کی پہنچ عام قاری تک آسان ہے۔ ظفرؔ اقبال زندہ رہیں اور اچھی شاعری کرتے رہیں۔ انھوں نے اپنی خوب صورت شاعری کے علاوہ بھی اپنے قاریوں کے بڑے حلقے بنائے ہیں۔ یہ بھی ان کے اہم شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ میں نے صوتی پیراڈائم کی بات نظم کے حوالے سے بھی کہیں کی ہے مگر اتنی تفصیل اور وضاحت سے نہیں جتنی اس مضمون میں کی ہے اس کا ثواب بھی ظفرؔ اقبال کو پہنچتا ہے۔

بحوالہ: ظفریاب...... مرتب: دلاور علی آزر......

(رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی)

◆◆◆

بھرا پڑا تھا مکیں سے مکان پہلے ہی
ملے ہُوئے تھے زمین آسمان پہلے ہی

اُسی نواح میں اُس کا نشاں مِلا آخر
بھٹک رہا تھا جہاں اپنا دھیان پہلے ہی

نہیں ضرور، تعارف کراؤ کچھ اپنا
کہ دیکھ بیٹھے ہیں یہ آن بان پہلے ہی

گلی میں دُھوپ کا اندازہ تھا بہت ہم کو
منگا لیا ہے جو یہ سائبان پہلے ہی

نہ جانے کس لیے دُہرانا چاہتے ہیں اِسے
کہ سُن چکے ہیں اگر داستان پہلے ہی

رکاوٹوں کے سبب آخر آپ آ نہ سکے
یہ جانتے تھے ہم اے مہربان پہلے ہی

مگر بھی جانے کی اب تو نہیں تھی گنجائش
کہ دے چکے تھے ہم اپنا بیان پہلے ہی

ابھی تو ہم نے محبت سے باز آنا تھا
اُٹھا کے چل دیئے وہ پائے دان پہلے ہی

چلے تھے جس سے کوئی شے خریدنے کو ظفرؔ
بڑھا چکے تھے وہ اپنی دکان پہلے ہی

اگلا سا کرشمہ کوئی پانی میں نہیں تھا
پانی میں اگر تھا تو روانی میں نہیں تھا

اک دوست میں جو مجھ کو نظر آیا ہے اکثر
وہ زہر میرے دشمنِ جانی میں نہیں تھا

حیرت ہے، کسی شوخ پہ مرمٹنے کا یہ شوق
جیسا ہے بڑھاپے میں، جوانی میں نہیں تھا

یک سُو تھا ترے ایک اشارے میں بھی کچھ
کچھ بھی مری آشفتہ بیانی میں نہیں تھا

گُم نامیٔ دائم کا یہ پیرایہ کسی طور
پہلے تو مری ہستیٔ فانی میں نہیں تھا

رہتا تھا محبت سے سروکار تو سب کو
ایسا بھی یہ بازار گرانی میں نہیں تھا

ہم اس سے توقع ہی کوئی باندھتے اتنی
ایسا بھی کوئی موڑ کہانی میں نہیں تھا

الفاظ ہی آپس میں کھڑکتے تھے پس و پیش
ایسا تو کوئی شور معانی میں نہیں تھا

خالی تھی سراسر ظفرؔ آثار سے اُس کے
کوئی بھی نشاں اُس کی نشانی میں نہیں تھا

حصارِ حبس میں ہوں، اور ہوا ہونا ضروری تھا
وہ اک دیوار جس میں راستہ ہونا ضروری تھا

لرزتے تھے جہاں رنگِ ہوا کے موسمی پردے
وہیں ٹوٹا ہوا خوابِ نوا ہونا ضروری تھا

جو سب کچھ ہو چکا تو پھر بھی یاد آیا نہیں مجھ کو
کہ اتنی کارفرمائی میں کیا ہونا ضروری تھا

لگایا تھا کسی نے کام کوئی میرے ذمے بھی
کہ جو کچھ ناروا تھا وہ روا ہونا ضروری تھا

ضروری تھا بہت مِلنا بھی اُس کو ایک بار اب کے
مگر دوبارہ ملنے کو جُدا ہونا ضروری تھا

اگر مجھ کو سفر پر وہ روانہ کرنے والے تھے
تو رستے میں کوئی جنگل ہرا ہونا ضروری تھا

مرے ہونے کے جب سارے تقاضے ہو گئے پورے
تو اس کے بعد کوئی دوسرا ہونا ضروری تھا

کسے ہم ڈھونڈتے پھرتے رہے دشت و بیاباں میں
وہ آخر کون تھا جس کا پتا ہونا ضروری تھا

ظفرؔ اب اور کتنی دیر تک آخر دھڑکتا دل
یہ وہ گنبد تھا جس کا بے صدا ہونا ضروری تھا

مسائل بڑھ گئے ہیں، گفتگو ہونا ضروری ہے
ہمارا آپ کا اب رو بہ رو ہونا ضروری ہے

نکل بھاگے نہ وہ اور اُس کو گھیرے میں لیے رکھیں
کہ ساری رات اُس کے چارسُو ہونا ضروری ہے

محبت کی ذرا سی تھرتھری کافی ہے دونوں کو
نہ میں ہونا ضروری ہے نہ تو ہونا ضروری ہے

خصائل تجھ سے ہوں گے خوب روؤں میں بہت، لیکن
کوئی اپنا تمھارا رنگ و بو ہونا ضروری ہے

کسی صورت کوئی سر میں سوادِ خواب ظاہر ہو
مگر سر میں تمھاری آرزو ہونا ضروری ہے

ہیں اُس جیسی بہت شکلیں کچھ اُس سے خوب تر بھی ہیں
مگر میرے لیے وہ ہو بہ ہو ہونا ضروری ہے

اب اُس کی دھمکیوں کا تو اثر مجھ پر نہیں کوئی
سو، میرے ساتھ اُس کا دُو بہ دُو ہونا ضروری ہے

تلاشِ اُس بے نشاں کی اِس قدر آساں بھی مت سمجھیں
کہ اپنا کم سے کم بھی کُو بہ کُو ہونا ضروری ہے

ظفرؔ، ان آنسوؤں کا رنگ بدلے گا ابھی، لیکن
کچھ اِس سے پیش تر دل کا لہو ہونا ضروری ہے

رہائش کے لیے اُس دل میں گھر ہونا ضروری نہیں
ہمارے حال کی اُس کو خبر ہونا ضروری نہیں

غنیمت ہے جو تنہا بوجھ اپنا ہی اُٹھا لیں ہم
ہمارے ساتھ اب رختِ سفر ہونا ضروری نہیں

بدل جاتا ہے موسم چار اشکوں سے ہی کافی سا
جُدائی میں یہ بارش رات بھر ہونا ضروری نہیں

ہم اُس کے ساتھ پیوستہ ہیں اتنی دُور رہ کر بھی
برابر رشتۂ شاخ و شجر ہونا ضروری نہیں

کچھ اُس کو دیکھ لینا بھی بہت ہے دوسرے چوتھے
ملاقاتیں ابھی شام و سحر ہونا ضروری نہیں

خدا چاہے تو ہوتے جائیں گے اسباب خود پیدا
اب اُس کی جستجو میں دَر بہ دَر ہونا ضروری نہیں

جدھر ہوں گے زمانے آپ ہو گا اُس طرف اپنا
اِدھر ہونا نہیں لازم، اُدھر ہونا ضروری نہیں

نبڑ سکتا بھی ہے یہ عشق یوں تو چار دن میں ہی
یہ حالت وہ ہے جس کا مختصر ہونا ضروری نہیں

محبت ایک دہشت ہے بجائے خود، ظفرؔ ورنہ
کسی کا خاص کوئی اِس میں ڈر ہونا ضروری نہیں

●

مجھے یوں تو پختہ یقیں ہے میرے گمان میں نہیں آئے گا
اگر آ گیا تو کبھی وہ میرے بیان میں نہیں آئے گا

ہے اگرچہ بات جمی ہُوئی، مجھے یاد آتا ہے آج بھی
وہی اُکھڑا اُکھڑا سا ذائقہ جو زبان میں نہیں آئے گا

کوئی نقش ہے، کوئی نام ہے، نہ وہ خاص ہے، نہ وہ عام ہے
میری دھڑکنوں پہ دَھرا ہُوا مرے دھیان میں نہیں آئے گا

کہیں بود و باشِ دلِ گرفتہ میں ہے بھی اور نہیں بھی ہے
کہ یہ وہ مکیں ہے جو پوری طرح مکان میں نہیں آئے گا

ابھی پاس ہے تو شباہت اُس کی نظر میں رکھیے سنبھال کر
جو چلا گیا تو دوبارہ جان پچھان میں نہیں آئے گا

مجھے سب خبر ہے کہ جس کے پیچھے یہ عمر میں نے گزار دی
وہی نقشِ پا مری جستجو کے جہان میں نہیں آئے گا

یہ جو بات بات میں احتیاط کا عکس ہے تو اِسی لیے
کہ نکل گیا تو پلٹ کے تیر کمان میں نہیں آئے گا

جو ابھی سے گرد و غبار ہونے لگا ہے سلسلۂ سخن
یہ وہ ماجرا ہے کہ میرے نام و نشان میں نہیں آئے گا

کسی در پہ آپ چلے ہی آئے ہیں بن بُلائے اگر، ظفؔر
تو سوالِ وصل سے فرق آپ کی شان میں نہیں آئے گا

نہیں داؤ کوئی بھی کارگر، کسی چال میں نہیں آ رہا
مرے پانیوں میں تو ہے مگر، مرے جال میں نہیں آ رہا

یہ جو طرفہ طرز و طلسم سا، کوئی ٹوٹتا ہوا جسم سا
مرے بازوؤں میں سمٹ رہا ہے، خیال میں نہیں آ رہا

اُسے جا کے پوچھیے تو سہی کہ زمانہ ہو گیا اور وہ
کسی رنگ سے نہیں مِل رہا، کسی حال میں نہیں آ رہا

کسی آنے والے کی اِس بہار میں ہوں گی اور نشانیاں
کہ وہ پہلے کی طرح اب ترے خد و خال میں نہیں آ رہا

مرے آس پاس جو رونقیں سی لگائے رکھتا ہے رات دن
کوئی ہے ضرور، مگر وہ میری سنبھال میں نہیں آ رہا

کوئی خاص بات اگر ہے اِس میں کہیں نظر نہیں آئے گی
وہی عام سا ہے، مگر کسی بھی مثال میں نہیں آ رہا

ابھی کتنی اور نئی نویلی فضائیں ہیں مری منتظر
مگر آج کل تو وہ اور ہی پر و بال میں نہیں آ رہا

کہیں زورِ سیلِ سخن میں چاہیے اور ہی کسی ڈھنگ سے
یہ وہ چشمہ ہے جو کئی دنوں سے اُبال میں نہیں آ رہا

کسی دن، ظفرؔ یہاں کوئی تازہ تنازعہ ہی اُٹھائیے
کوئی گفتگو ہو، مزہ جواب و سوال میں نہیں آ رہا

یہ سعیٔ ناتمام جو یوں ہے براہِ راست
وہ اس لیے کہ اُس کا فسوں ہے براہِ راست

ہم نے بھی اُس کو چھوڑ دیا اُس کے حال پر
دل ہے کہ یوں بھی خوار و زبوں ہے براہِ راست

جاتا کسی ذریعے سے اُس تک تو ٹھیک تھا
اُس کو یہ اعتراض ہے، کیوں ہے براہِ راست

اُس کا بھی سب حساب و کتاب اُس کے پاس تھا
اپنے لیے جو صبر و سکوں ہے براہِ راست

اُس کی رسائی میں نہیں اب پیچ و خم کوئی
جس خواب میں یہ خلوتِ خوں ہے براہِ راست

اب صرف خاک اُڑانے کی نیت کا ہے سوال
ہے صاف راہِ دشت، جنوں ہے براہِ راست

اب وہ ہماری سوچ کی سلوٹ میں کیا سمائے
جو اختیار سے بھی فزوں ہے براہِ راست

اب اُس کے آنے جانے کی ہے فکر کیا ہمیں
جو آپ ہی درون و بروں ہے براہِ راست

پھر بھی کسی سبب کی ضرورت ہے، اے ظفرؔ
حالاں کہ چھت کھڑی ہے، ستوں ہے براہِ راست

کچھ انتظار نہ ہموار وہ اثر سے ہُوا
جو اور ہی کسی تدبیرِ کارگر سے ہُوا

یہ جان و مال تو گھر میں بھی ہم گنوا لیتے
ہُوا تو ایک یہی تجربہ سفر سے ہُوا

ہمارے ساتھ سلوک ایک سا رہا، یعنی
جو ہونے والا تھا گھر سے وہ دَر بہ دَر سے ہُوا

کبھی ہماری یہ حالت نہیں بدل سکتی
ہمارا سامنا ہر روز اِس خبر سے ہُوا

وہ کوئی اور ہی شے تھی ڈبو گئی جو ہمیں
گزر اگرچہ ہمارا بھی لہر پر سے ہُوا

کبھی کبھار ورود اُس کا اتنی دیر کے بعد
چلو ہُوا تو سہی شہر میں جدھر سے ہُوا

ہمارے ساتھ کیا جو سلوک دُنیا نے
شروع کام یہ سارا ہی اپنے گھر سے ہُوا

خراب کام ہمارا یہاں جو سچ پوچھیں
کبھی اِدھر سے ہُوا اور کبھی اُدھر سے ہُوا

مرے لہو میں وہ چڑیوں کا شور ہے کہ ظفرؔ
جو کام شاخ سے ہونا تھا وہ شجر سے ہُوا

کچھ آسماں سے ہُوئی اور کچھ زمیں سے ہُوئی
ہَوا میں ساری خرابی کہیں یہیں سے ہُوئی

کوئی عجب غلطی تھی میانِ سجدۂ سنگ
جو آستاں سے ہُوئی یا مری جبیں سے ہُوئی

ہُوا تھا دل سے بُلند اک عَلَم بغاوت کا
مِرے حساب میں شورش وہیں کہیں سے ہُوئی

جو اتنی دیر سے پانی میں ہاتھ مارتے ہیں
یہ جستجو بھی کسی خوابِ تہ نشیں سے ہُوئی

چمک یہ کیا ہے کہ پیدا جو میری آنکھوں میں
ہُوئی تو ایک ترے رنگِ جاگزیں سے ہُوئی

عجیب صورتِ احوال تھی جو سچ پوچھیں
خطا کے بعد مری چشمِ آفریں سے ہُوئی

کسے بتائیں پریشاں کس قدر اب تک
ہماری طبع ترے خوابِ اوّلیں سے ہُوئی

بپا ہے اتنی جو رونق دریچۂ دل میں
سو، کچھ مکاں سے ہُوئی اور کچھ مکیں سے ہُوئی

اگرچہ سب کو دِکھاتے ہیں اپنے عیب ظفرؔ
یہ خود نمائی بھی آغاز تو ہمیں سے ہُوئی

پیام و نامہ مرے نام جا بہ جا سے ہُوئے
کبھی فضا سے ہُوئے اور کبھی خلا سے ہُوئے

چمک جو آئی ہما و ثنا کی آنکھوں میں
چراغ اور بھی روشن مری صدا سے ہُوئے

ہُوئے ضرور وہ یک سُو ہمارے ساتھ، مگر
الگ الگ سے ہُوئے اور جدا جدا سے ہُوئے

شمارِ بوسہ میں تھی بھول چُوک ہی اتنی
شروع اِس لیے ہر بار ابتدا سے ہُوئے

مریضِ ہجر کو تریاق تھا ترا انکار
ہُوئے بھی ہم تو شفایاب کس دوا سے ہُوئے

یہاں ہیں وہ بھی کہ دشمن کو دوست کرتے ہیں
وہ ایک ہم کہ شناسا نہ آشنا سے ہُوئے

جو ہوگئے ہیں تو بس اپنے آپ ہی، ورنہ
نہ ہم دعا سے ہُوئے اور نہ بددعا سے ہُوئے

ہماری منت و محنت کا یہ کرشمہ نہیں
کہ برگزیدہ تو ہم اُس کی خاکِ پا سے ہُوئے

ظفر، میں حبس کی حالت میں تھا کئی دن سے
پھر ایک روز مرے رابطے ہَوا سے ہُوئے

دل اُس کو دینے کی تصدیق دردِ سر سے ہُوئی
شروع اب کے جو خیرات اپنے گھر سے ہُوئی

ہُوئی ہے دُور بہرحال راہ گُم کر کے
تھکان جتنی بھی اِس رائگاں سفر سے ہُوئی

ہماری اُس کی اگر صلح تھی بہت ہر وقت
تو اُس کے ساتھ عداوت بھی شہر بھر سے ہُوئی

ہماری طرز و روش میں کوئی جو تبدیلی
ہُوئی بھی ہے تو کسی بات کے اثر سے ہُوئی

یہاں اگر خس و خاشاک منتظر تھے مرے
کیا ہے اُس نے بھی توفیق جو شرر سے ہُوئی

خیال و خواب کے چکّر میں وہ بھی ہے، میں بھی
کچھ اِس طرح کی مری دوستی بھنور سے ہُوئی

جو دل سے اُبھری ہے طوفانِ تُند سے ہٹ کر
مری نجات اُسی موجِ مختصر سے ہُوئی

یہی بہت ہے محبت میں پیش رفت کوئی
چلو ہُوئی تو سہی بیش و کم جدھر سے ہُوئی

میں اُس کے بعد سے چلتا ہی آرہا ہوں ظفر
جو ایک بار شناسائی رہ گزر سے ہُوئی

یہ رُو بہ رُو سے ہُوا ہے نہ دُو بہ دُو سے ہُوا
معاملہ جو پسِ پردہ گفتگو سے ہُوا

نڈھال کر گئی یورش جو آئی اندر سے
وگرنہ حملہ تو مجھ پر چہار سُو سے ہُوا

مجھے تو مار گئی تھی کمی محبت کی
میں زندہ دوسری بار اُس کی آرزو سے ہُوا

وہ رُت بھی آئی کہ جب ایک بار تو محروم
میں رفتہ رفتہ خود اپنے ہی رنگ و بو سے ہُوا

ہے اب جو روزنِ دل سے ہَوا کی آمد و رفت
تو کام یہ بھی غلط کار کی رفو سے ہُوا

چراغ آپ جو لائے تھے، ساتھ ہی لے جائیں
سیاہ خانہ تو روشن مرے لہو سے ہُوا

یہ بے سبب تو نہیں دل کا پھُولنا پھَلنا
ہَرا یہ باغ اِن آنکھوں کی آب جُو سے ہُوا

جو شہر میں مری رُسوائی کا کبھی سامان
ہُوا تو بڑھتی ہُوئی میری آبرو سے ہُوا

ہماری صورتِ احوال ہے یہی کہ ظفرؔ
جو کام دوست نے کرنا تھا وہ عدو سے ہُوا

یہ آب و تاب زمیں سے نہ آسماں سے ہُوئی
جہاں سے دُور تھا میں، روشنی وہاں سے ہُوئی

میں سوچتا ہوں کہ تھیں عذر خواہیاں تو بہت
صحیح معنوں میں شرمندگی کہاں سے ہُوئی

تھے اُلٹے سیدھے اشارے بھی ہم نوا اپنے
کسی کے سامنے لغزش اگر نہ ہاں سے ہُوئی

براہِ راست جو طوفاں سے ہم کلام تھا میں
تو مری بات سفینے نہ بادباں سے ہُوئی

زمانہ خوش تھا بہت جھوٹ کی ملاوٹ پر
کہ یہ شروع جو میری ہی داستاں سے ہُوئی

یہ رنگ ہے مری رُسوائی کا عجیب کہ میں
وہیں وہیں تھا معزز جہاں جہاں سے ہُوئی

میں چپ رہا تو بہت عافیت میں تھا ورنہ
وہاں تو ساری خرابی مرے بیاں سے ہُوئی

رواں خبر کسی بنیاد کے اُکھڑنے کی
مرے مکاں سے نہیں، تیرے لامکاں سے ہُوئی

ستم ظریفیٔ قسمت تو دیکھیے کہ ظفرؔ
چُھٹی شراب تو یاری کلیم خاں سے ہُوئی

توڑتا ہوں کہیں بناتا ہوں
آسماں سے زمیں بناتا ہوں

مہک اُٹھتی ہے بے دلی کیا کیا
آس کو یاسمیں بناتا ہوں

سانپ کو پالتا ہوں جانیے کب
میں ابھی آستیں بناتا ہوں

کہیں خود کو بھی دیکھ پاؤں کبھی
ایسی اک دُوربیں بناتا ہوں

موت اور زیست ہیں مری صنعت
یہ کھلونے یہیں بناتا ہوں

ایک دوزخ بنا چکا ہوں، اب
اپنی خلدِ بریں بناتا ہوں

پہلے تشکیل دیتا ہوں خود کو
اور کچھ بعد ازیں بناتا ہوں

کبھی دل ہی نہیں بنا پاتا
کبھی دنیا و دیں بناتا ہوں

صبح کو سُرمگیں بناتے ہُوئے
شام کو شبنمیں بناتا ہوں

ایک تارے کو توڑ کر اُس سے
سات ماہِ مبیں بناتا ہوں

خواب دیکھا تھا من و سلویٰ کا
اور، نانِ جویں بناتا ہوں

رمزِ چون و چناں سے ہٹ کر میں
علّتِ آن و ایں بناتا ہوں

کوئی کنکر ہے کاٹ کر جس کو
ایک دیوارِ چیں بناتا ہوں

جا نکلتا ہوں خود کسی جانب
جب اُسے ہم نشیں بناتا ہوں

خوش نما کی بگاڑتا ہوں شکل
بدنما کو حسیں بناتا ہوں

پہلے کرتا ہوں زلزلے تیار
پھر مکان و مکیں بناتا ہوں

شہر کرتا ہوں میں جہاں مسمار
پھر نیا بھی وہیں بناتا ہوں

آخر اک عمر کی تگ و دو سے
بوسۂ اوّلیں بناتا ہوں

نیند کو مخملیں بناتے ہوئے
خواب کو مرمریں بناتا ہوں

ظلمتِ زمہریر کے اندر
آہ کو آتشیں بناتا ہوں

سانس لیتا ہوں اور پھر اس سے
شعلۂ واپسیں بناتا ہوں

موجۂ موسمِ خزاں جیسے
کیا بہار آفریں بناتا ہوں

چور ہیں میرے گھر کے رکھوالے
ڈاکوؤں کو امیں بناتا ہوں

اک سراپا نیاز ہے وہ پری
میں جسے نازنیں بناتا ہوں

ہے مرا اعتقاد ہی ایسا
ہر گماں کو یقیں بناتا ہوں

ساتویں آسمان پر ہے جسے
شاہ رگ سے قریں بناتا ہوں

آپ بنتے ہیں شور و شعر ظفرؔ
میں یہ چیزیں نہیں بناتا ہوں

کسی اندرونی سہارے پہ تھا
ابھی خواب اپنے کنارے پہ تھا

کچھ ایسے ہی تھے روز و شب اور کچھ
تمھارا اثر بھی ہمارے پہ تھا

یہیں تھا کہیں اس دفعہ وہ غبار
سو نقشے میں تھا یا نظارے پہ تھا

وہ مضمون پھیلا بہت شہر میں
وہ موسم بہت دیر سارے پہ تھا

نتیجہ نکلنا ہی تھا کچھ نہ کچھ
کہ سارا ہی زور استخارے پہ تھا

ہماری تو ہر سعی ناکام تھی
سبھی انحصار اب تمھارے پہ تھا

فلک تھا کوئی اور زیرِ فلک
ستارہ سا اور اک ستارے پہ تھا

اُسے ہی یہ عادت نہیں پڑ سکی
مرا تو مدار اب دوبارے پہ تھا

منافع دیا جس نے شام و سحر
وہی کاروبار اب خسارے پہ تھا

بھنور ہی مرا منتظر تھا، کہ میں
سوار اپنے ہی تیز دھارے پہ تھا

نتیجہ ملاقات کا منحصر
شکایات کے گوشوارے پہ تھا

ہمارا بھی مقروض تھا بال بال
ترا بھی گزرا اُدھارے پہ تھا

نکلواتے اِس میں سے تختے تو آپ
تنا سا ہمارا جو آرے پہ تھا

نئی چھینٹ ہے اپنی شلوار پر
نہ وہ داغ اُس کے غرارے پہ تھا

کہاں جا کے پہنچا ہے اب کیا خبر
سفر اپنے خس کا شرارے پہ تھا

گدھے نے اُٹھائی ہُوئی تھی زمین
مرا بوجھ بھی اُس بچارے پہ تھا

کبھی آن کر دیکھ لیتے تو آج
وبال اور قسمت کے مارے پہ تھا

کوئی بات ہے جو بگاڑے پہ ہے
کوئی کام تھا جو سنوارے پہ تھا

وہ دریا تھا، اور دیکھتے دیکھتے
کسی طرح سے پار اُتارے پہ تھا

یہ کیا ہے کہ سب کو یہاں اعتراض
ہمارے تمھارے گزارے پہ تھا

پَروں میں پگھلنے لگی پیاس جب
پرندہ کسی آب پارے پہ تھا

کوئی دن تو یہ شہسوارِ ہوس
اکیلا ہی بھاری ہزارے پہ تھا

حریفوں سے ماتھا لگایا فضول
گھمنڈ اِسی قدر بھائی چارے پہ تھا

عجب راز تھے رس بھرے اُس کے ہونٹ
غضب رنگ آلو بخارے پہ تھا

کچھ ایسا ہی تھا کھیل، ردِ عمل
نہ جیتے پہ تھا اور نہ ہارے پہ تھا

نچوڑ معانی کا نکلا ہے خوب
کہ سارا ہی بوجھ استعارے پہ تھا

ظفرؔ خوش ہُوا جو مجھے دیکھ کر
رُکا میں بھی اُس کے اشارے پہ تھا

روتے گاتے جائیں گے
جاتے جاتے جائیں گے

آبادی وہی بڑھتی جائے
ہم تو آتے جائیں گے

سنو یا نہیں سنو تم
ہم بتلاتے جائیں گے

پہلی بار تو پیار سے
پاس بٹھاتے جائیں گے

دُنیا سے جاتے ہُوئے
چاند بجھاتے جائیں گے

مریں گے کھا کھا کر، مگر
پھر بھی کھاتے جائیں گے

گھومتی ہُوئی زمین کو
اور گھماتے جائیں گے

آئے تھے جس کام سے
یاد دِلاتے جائیں گے

مار پڑی ہے ظفؔر کو
سر سہلاتے جائیں گے

گور کنارے کھڑے ہیں
اور ہم سارے کھڑے ہیں

پاس اندھیرا ہے بہت
دُور ستارے کھڑے ہیں

مِلا نہیں پہلے بھی کچھ
اب دوبارے کھڑے ہیں

چلتا ہے خود ہی خَلا
اور سیّارے کھڑے ہیں

اور قطاریں باندھ کر
سبھی بچارے کھڑے ہیں

چلتے چلتے رُک گئے
سبھی نظارے کھڑے ہیں

سورج، چاند اور یہ زمیں
کیا ہرکارے کھڑے ہیں

ہم بھی اپنی اک طرف
دال بگھارے کھڑے ہیں

بیٹھی ہے ہر جا، ظفرؔ
راج دُلارے کھڑے ہیں

گورا دن اَور کالی ریت
اپنی دیکھی بھالی ریت

پانی سُوکھا دریا کا
اور رہ گئی خالی ریت

جھکڑ تھا سر سے اُونچا
مشکل ہی سے ٹالی ریت

ہم جو آپ گداگر تھے
ہم سے ہُوئی سوالی ریت

اُس کے لیے سنبھالا پانی
اپنے لیے بچا لی ریت

پاؤں میں اُس کے بچھوائی
اپنے سر پر ڈالی ریت

اب کے پڑا عجیب سفر
نیا تھا دشت، نرالی ریت

یہی ہماری وحشت ہے
جا کر وہاں اُڑا لی ریت

یہی ہنر اپنا تھا ظفرؔ
ڈالے خواب، نکالی ریت

آگے پیچھے دریا
اوپر نیچے دریا

میں دریا کے آگے
میرے پیچھے دریا

دائیں بائیں آبادی
بیچوں بیچ دریا

سوکھ گئے ہیں آخر
کیسے کیسے دریا

میری راہ میں آئے
کیسے، کتنے دریا

پوچھے حال ہمارا
آتے جاتے دریا

رُخ جو موڑ سکے گا
سارے اُس کے دریا

کوئی وقت صحرا ہے
کوئی زمانے دریا

آ کے ظفرؔ نے دیکھے
جلنے والے دریا

طبعاً تو وہ اتنا کوئی بدخُو بھی نہیں ہے
غصے پہ بہرحال اُسے قابو بھی نہیں ہے

شامل نہیں گو اپنے عقیدے میں کسی طور
اُس جیسا کسی اور میں جادو بھی نہیں ہے

کیا باغ ہے جس میں کوئی رنگت نہ ہو تیری
کیا پھول ہے جس میں تری خوشبو بھی نہیں ہے

یوں اُس نے پریشان بھی کر رکھا ہے مجھ کو
کچھ دن سے طبیعت مری یک سُو بھی نہیں ہے

آواز سے ہٹ کر بھی پکارا ہے کئی بار
روتا بھی ہوں اور آنکھ میں آنسو بھی نہیں ہے

ہنگامہ بپا بھی کیے رکھا یہاں مل کر
دیکھا تو کہیں میں بھی، کہیں تو بھی نہیں ہے

کچھ دن سے مرا ذہن بھی ہے مجھ سے الگ سا
اور ساتھ مری قوتِ بازو بھی نہیں ہے

ظاہر میں تو کانٹا بھی نہیں پاؤں میں اپنے
اور دل میں کوئی تیر ترازو بھی نہیں ہے

کب سے ہوں ظفرؔ زیرِ علاج اُس کے شب و روز
لیکن کہیں کچھ فرق سرِ مُو بھی نہیں ہے

مری زمیں نہ ترا آسماں محبت ہے
کوئی پتا نہیں چلتا کہاں محبت ہے

مجھے ہی چھو کے گزرتی نہیں ہے کیوں آخر
یہ میرے چاروں طرف جو رواں محبت ہے

مرے ہی ذکر سے خالی رکھا گیا ہے اُسے
چھڑی ہُوئی جو یہاں داستاں محبت ہے

مرے لہو میں عداوت کا زور ہے اتنا
وہاں میں ہو نہیں سکتا جہاں محبت ہے

جھڑا ہُوا کوئی پتّا شجر سے ہے کہیں عشق
پڑا ہُوا کوئی خالی مکاں محبت ہے

کچھ اُس کے سامنے اظہار ہو نہیں سکتا
کہ سر بہ سر مرا عجزِ بیاں محبت ہے

یہ بات کرتی ہے اور بولنے نہیں دیتی
اگرچہ دیکھنے کو بے زباں محبت ہے

لگاؤ میں بھی طبیعت ہے نکتہ چیں اُس کی
سو پہلے بحث ہے، اور بعد ازاں محبت ہے

بھلا یہ عمر تھی کوئی محبتوں کی، ظفرؔ
عجیب طرح کی یہ ناگہاں محبت ہے

آتی ہے میرے سمت صدا اور دُور سے
چلنے لگی ہے کوئی ہوا اور دُور سے

پہلے ہی مجھ سے دُور تھا اک شخص اور اب
کوئی پکارتا ہے ذرا اور دُور سے

ہوتا نہیں ہوں میں جو کبھی اُس کے آس پاس
کُھلتے ہیں اُس کے بندِ قبا اور دُور سے

جتنا قریب آنے کی رکھتا ہوں جستجو
دیتا ہے مجھ کو اپنا پتا اور دُور سے

طے کی ہے میرے دل سے ہی سب نے شبِ سفر
دیتا ہے روشنی یہ دیا اور دُور سے

بارش نے دُھو دیئے تھے سر و برگِ آرزو
جنگل یہ لگ رہا تھا ہَرا اور دُور سے

دیکھیں گے لوگ بھی یہ کرشمہ جدائی کا
چمکے گا اِس کا رنگِ وفا اور دُور سے

اِن فاصلوں میں ہی مرا قصّہ ہُوا تمام
جب دیکھتا تھا مجھ کو خدا اور دُور سے

میں اور دُور ہونے ہی والا ہوں اب ظفرؔ
دے گا سنائی میرا کہا اور دُور سے

آتا رہا نظر مرا گھر اور دُور سے
لگتا رہا مجھے یہ سفر اور دُور سے

ملنے لگی ہے اب تو کچھ اندر کی اِطلاع
آنے لگی ہے اب تو خبر اور دُور سے

فصلِ غبار پہلے ہی تھی اُس کے اِرد گرد
آتا نہیں ہے اب جو نظر اور دُور سے

بدلی ہُوئی سی لگتی رہی شام کی یہ شکل
دیتے رہے دِکھائی شجر اور دُور سے

وہ پاس آ رہے گا تو جاؤں گا میں کہاں
لگنے لگا مجھے کوئی ڈر اور دُور سے

لالچ میں نفع کے اُسے میں نے پھنسا دیا
پہنچا سکا نہ کوئی ضرر اور دُور سے

خس خانۂ ہوس میں لبِ سُرخ کا خیال
سب کچھ جلائے گا یہ شرر اور دُور سے

پاس آ کے دیکھ لو گے تو کُھل جائے گا بھرم
لگتے ہیں میرے عیب و ہنر اور، دُور سے

ایسا وہ دُور پار قبیلے سے تھا ظفرؔ
مجھ پر ہُوا ہے اُس کا اثر اور دُور سے

امید ہے نہ تری آرزو محبت ہے
جو ہے تو ایک یہی گفتگو محبت ہے

زوالِ عمر کے بے سمت موڑ پر شاید
رُکا ہُوا یہ رگوں میں لہو محبت ہے

یہ کوئی اور ہے دونوں کے آس پاس کہیں
کہ اصل میں تُو نہ میں ہوں نہ تُو محبت ہے

مِلی ہُوئی ہے کسی شے میں اور چیز کوئی
اگرچہ دیکھنے میں ہُو بہ ہُو محبت ہے

کریں گے خوار یہ پیچیدہ راستے مجھ کو
کہ موڑ مڑتا ہوں اور دُو بہ دُو محبت ہے

اِس آئنے میں بدلتی ہے کیا تری صورت
ٹھہر کے دیکھ ترے رُو بہ رُو محبت ہے

سمائی اُس کی ہو کیا تنگ باغِ دنیا میں
چھلک رہی جو کوئی رنگ و بو محبت ہے

کسی نمازِ ہوس کی ادائی چاہتی ہے
یہ تیرے سامنے جو باوضو محبت ہے

ہے اُس سے بچ کے نکلنا بھی ایک بات ظفرؔ
یہاں جو پھیلی ہُوئی چار سُو محبت ہے

یہ دائرہ ہے، سو اِس کا سفر محبت ہے
ہے ایک بار تو بارِ دگر محبت ہے

جو اِس میں رہتے نہیں مستقل تو بات ہے اور
وگرنہ اصل میں اپنا تو گھر محبت ہے

اُلجھ گیا ہے یہ دل جس کی جان کاری میں
خیال خواب ہے اِس کا، خبر محبت ہے

اِس اِبتلا میں میسر بھی ہو کہیں کہ یہاں
کبھی نہیں تو کبھی رات بھر محبت ہے

دلوں کو کھول کے دیکھو تو اِن میں بھی نفرت
برائے نام ہے اور بیش تر محبت ہے

لگائے رکھیے کسی اور بات میں اِس کو
ابھی نہیں کہ ابھی بے اثر محبت ہے

توازن اور تناسب کی رہ گئی تھی کمی
طویل عمر ہے اور مختصر محبت ہے

میں اتنی دیر سے گپ شپ سمجھ رہا تھا جسے
پتا چلا ہے کہ وہ سر بہ سر محبت ہے

خموش رہ کے بھی کرتے ہیں بعض کام ظفرؔ
ہے شور کس لیے اتنا اگر محبت ہے

چاند سا کوئی لبِ بام بھی آ جاتا ہے
گُم نام ہے تو سرِعام بھی آ جاتا ہے

یوں تو بیمار بہت ہوں مگر اِس اثنا میں
اکثر اکثر مجھے آرام بھی آ جاتا ہے

میں کہیں بھی نہیں ہوتا ہوں یہاں اور نہ وہاں
کبھی اِس طرح کا ہنگام بھی آ جاتا ہے

رات کا راستہ روشن نہیں رہتا، لیکن
اِس اندھیرے میں کوئی نام بھی آ جاتا ہے

بادلوں اور ہواؤں کا مسافر ہی سہی
طائرِ خواب تہِ دام بھی آ جاتا ہے

کبھی آغاز کا ملتا بھی نہیں کوئی سراغ
ایک دم سامنے انجام بھی آ جاتا ہے

دھوپ کی دھول اُڑا کرتی ہے دن بھر، لیکن
ساتھ ہی سلسلۂ شام بھی آ جاتا ہے

گھاس بھی تُو نے کسی دن نہیں ڈالی ہم کو
اور ہم پر ترا الزام بھی آ جاتا ہے

روز بے کار بھی پھرتے ہیں محبت میں ظفرؔ
اور ایسے میں کوئی کام بھی آ جاتا ہے*

اگر اپنے تمھارے درمیاں حائل نہیں ہونا
تو ایسے دائرے میں اِس طرح داخل نہیں ہونا

محبت کام ایسا ہے کہ اِن حالات میں اُس نے
کبھی آساں نہیں ہونا، کبھی مشکل نہیں ہونا

ہم اپنا آپ گُم کر بیٹھیں گے ایسی بھیڑ میں شاید
اِسی خاطر تمھارے خواب میں شامل نہیں ہونا

نکل پڑنا وہ دشت و در کو خالی چھوڑ کر، لیکن
کبھی دریا نہیں ہونا، کبھی ساحل نہیں ہونا

دھرے ہی رہ گئے سارے ارادے، ساری تدبیریں
کہ سوچا تھا کبھی اُس کی طرف مائل نہیں ہونا

ہمیں معلوم ہے کوشش تو کرنی فرض ہے لیکن
ہمیں یہ بھی خبر ہے اِس سے کچھ حاصل نہیں ہونا

توجہ بھی نہیں اُس کی ہمارے حال پر کوئی
تو پھر کیا ہے یہ اُس کا اِس قدر غافل نہیں ہوا

بھَلے ہی مِل چکا اِس زہر کا تریاق بھی لیکن
ابھی کچھ دیر تک اِس کا اثر زائل نہیں ہونا

ظفرؔ رکھے ہُوئے ہیں یہ دلائل کس لیے جاری
اگر اِس بحث میں اُس نے کبھی قائل نہیں ہونا

یہ کاروبارِ محبت اگر کرو آغاز
جہاں سے چھوڑ دیا تھا، وہیں سے ہو آغاز

اب اِس طرح سے تو یہ ناتمام ہی رہتا
ہمارے خوابِ سفر کا ہُوا تھا جو آغاز

نتیجہ چھوڑنا ہے پھر خدا کی مرضی پر
کریں گے ایک دفعہ اور بات کو آغاز

اِس اہتمام کا انجام ابھی سے ظاہر ہے
جو اَب کی بار بھی ہونا ہے گومگو آغاز

عجب نہیں کوئی کردار ہو ہمارا بھی
کسی طرف سے کہانی کریں بھی تو آغاز

غبارِ بے خبری میں یہ سلسلہ ہو شروع
اُسے پتا نہ چلے، اِس دفعہ ہو وہ آغاز

پھر اُس کو توڑ چڑھانا تو کام اپنا ہے
ہمیں جو ٹھیک سے مِل جائیں ایک دو آغاز

اُسے وہیں پہ بالآخر تو ختم ہونا ہے
ہزار بار یہاں سے کریں بھی گو آغاز

پھر اُس کے بعد تو خود چل پڑے گا کام ظفرؔ
جو ایک بار کسی طرح کر سکو آغاز

الفاظ کی شاخوں پہ ثمر ہی نہیں آتا
جو بات کریں اُس میں اثر ہی نہیں آتا

وہ سامنے ہوتا ہے تو کُھلتی نہیں آنکھیں
اِس روشنی میں مجھ کو نظر ہی نہیں آتا

گھر آنے کی اُمید رکھے بیٹھے ہیں جس پر
اب تو وہ سرِ راہ گزر بھی نہیں آتا

حق گوئی میں پیچیدگیاں ہوتی ہیں اتنی
سچ کہتا ہوں مجھ کو یہ ہنر ہی نہیں آتا

تصویر دِکھاتے ہیں جو دیکھیں نہیں جاتی
بتلاتے ہیں وہ کام جو کر ہی نہیں آتا

ہم اُس کی توقع پہ چلے جاتے ہیں بے سُود
اک موڑ جو دورانِ سفر ہی نہیں آتا

کسی چھاؤں کی دُھن میں ہیں کہ رستے میں ہمارے
دیوار تو آتی ہے، شجر ہی نہیں آتا

مشہور ہیں، آوارگیاں شہر میں اُس کی
کیا کیجیے، کم بخت اِدھر ہی نہیں آتا

اب آگئے ہیں خانہ بدر کرنے ظفرؔ کو
وہ شخص تو مدّت ہُوئی گھر ہی نہیں آتا

ہم بھی راضی نہیں تھے صدمۂ جاری کے لیے
آپ کا عشق بھی تھا وقت گزاری کے لیے

بین خالی ہی بجانا تو غلط ہے کہ تمھیں
سانپ بھی چاہیے کوئی پٹاری کے لیے

سفرِ شوق میں چلتے رہے پیدل ہی سدا
ہم جو چھوڑ آئے تھے آدھی کو بھی ساری کے لیے

اتنا لالچ بھی کیا اور ہمیں کچھ بھی نہ ملا
ہم جو چھوڑ آئے تھے آدھی کو ساری کے لیے

خواہشِ وصل کو شنوائی ہی کافی ہے بہت
اور کیا چاہیے تقدیر کی ماری کے لیے

اپنی اوقات بہت جانتا پہچانتا ہے
نگہِ لطف ہی کافی ہے بھکاری کے لیے

ایک موقع جو طلب تم سے کیا تھا ہم نے
کیا وہ رکھا ہے کسی ہفت ہزاری کے لیے

یہ بھی کیا کم ہے کہ مجمع تو لگا رکھا ہے
اور کیا چیز ہے درکار مداری کے لیے

خود قطار اپنی سے باہر ہوئے جاتے ہیں ظفرؔ
جو پریشان بہت ہیں مری باری کے لیے

ہَوا کے سامنے دیوار اُسار دی گئی ہے
جو سانس لینے کی مہلت اُدھار دی گئی ہے

جنھیں نظر نہیں آتی وہ عینکیں لگوائیں
کہ اِس زمین کی قسمت سنوار دی گئی ہے

ضمیر بوجھ تھا آخر بچا کھچا ہی سہی
ہمارے سر سے یہ گٹھڑی اُتار دی گئی ہے

تلاش کیجیے اِس میں ہی جیت کے آثار
یہاں جو آخری بازی بھی ہار دی گئی ہے

چمک مِلائی گئی ہے کوئی سیاہی میں
ہماری آپ کی صورت نکھار دی گئی ہے

گھڑی تھی جس میں قبولِ دعا کی سر تا سر
وہ رات بھی یہاں سو کر گزار دی گئی ہے

کنوئیں میں پھینک دیا گیا ہے ہمیں اور پھر
بچاؤ کی یہی صورت قرار دی گئی ہے

یہ بے بضاعتی اپنی تھی جس لیے ہر شے
بس ایک اشارۂ ابرو پہ وار دی گئی ہے

اُسے بھی ایک رعایت ہی جانیے کہ ظفرؔ
ہمیں ہمارے ہی جوتوں کی مار دی گئی ہے

وہیں سے دُور ہُوئے ہیں جہاں سے دُور نہیں
وہ لوگ جو مرے وہم و گماں سے دُور نہیں

سمجھ رہا ہوں کہ ہیں صرف روشنی کے لیے
وہ بجلیاں جو مرے آشیاں سے دُور نہیں

جہاں پہ بیٹھ گئے ہاتھ پاؤں توڑ کے ہم
وہ شہرِ خواب سُنا ہے وہاں سے دُور نہیں

دلِ فسردہ کو خالی نہ چھوڑ جایا کر
مکیں وہی ہے جو اپنے مکاں سے دُور نہیں

سوال صرف مری کاہلی کا ہے ورنہ
یہ پیاس وہ ہے کہ آبِ رواں سے دُور نہیں

عجب طرح کا یہ رنگِ رسائی ہے اب کے
وہیں سے فاصلے پر ہوں جہاں سے دُور نہیں

رکھا ہُوا ہے ستاروں سے رابطہ میں نے
زمین پر ہوں، مگر آسماں سے دُور نہیں

بھلے ہی وہ مجھے سمجھیں نہ ہم سفر اپنا
غبار ہو کے بھی میں کارواں سے دُور نہیں

میں روز اپنے کناروں سے دیکھتا ہوں ظفرؔ
کہاں سے دُور ہے دُنیا کہاں سے دُور نہیں

بِگرا پڑا کوئی منظر بچا لیا گیا ہے
وگرنہ کھیل تو سارا دِکھا لیا گیا ہے

کسی کو دھیان کہاں چور کے پکڑنے کا
یہاں پہ شور ہی اتنا مچا لیا گیا ہے

کہیں وہاں بھی کوئی کام ہی نہ کر جاؤں
مجھے اِسی لیے واپس بُلا لیا گیا ہے

کسی شکستہ پرانے چراغ پر ہے نظر
کہ اپنی ذات کا سورج بجھا لیا گیا ہے

بچا ہے نالہ و شیون کا وقت ہی باقی
جو گیت آخری تھا وہ بھی گا لیا گیا ہے

بس ایک آنکھ میں اپنی حیا کا پردہ تھا
سو احتیاط سے وہ بھی ہٹا لیا گیا ہے

کہیں مِلی نہیں مزدوریاں مجھے اپنی
کہیں معاوضہ میرا دبا لیا گیا ہے

کسی کو گھر سے ہی بے دخل کر دیا گیا اور
کسی پلاٹ پہ قبضہ جما لیا گیا ہے

مکان بیچ کے تاوان بھر دیا ہے، ظفرؔ
اور اپنے لختِ جگر کو چھڑا لیا گیا ہے

ہنسی میں تھے کبھی شامل نہ رو دیئے گئے ہیں
جو لوگ پانے سے پہلے ہی کھو دیئے گئے ہیں

گزر چکا ہے وہ چھوڑا گیا ہُوا پانی
پھر ایک بار کنارے بھگو دیئے گئے ہیں

غلط ہُوا کہ صحیح، اب ملال کیا کرنا
ہم اہلِ وضع جہاں بھی سمو دیئے گئے ہیں

جہاں زمیں تھی بہت خشک اور پتھریلی
وہیں یہ نامِ خدا لے کے بو دیئے گئے ہیں

پہنچ گیا ہے سب اسباب تو ہمارا کہیں
مگر ہم آپ کہیں اور ڈھو دیئے گئے ہیں

کچھ اس طرح سے بھی آسان کی گئی مشکل
جو تَیر سکتے نہیں تھے ڈبو دیئے گئے ہیں

کسی کے پاس کہیں ایک بھی نہ رہنے دیا
کسی کو ایک کے بدلے میں دو دیئے گئے ہیں

یہاں سے جا نہیں سکتے ہیں اب کہیں بھی کہ ہم
تمھارے تیرِ طلب میں پِرو دیئے گئے ہیں

نئے ہی لگنے سے پرہیز کیجیے گا، ظفرؔ
قبا سے داغ پرانے تو دُھو دیئے گئے ہیں

سمندروں کے جو سمجھو سفر دیئے گئے ہیں
ہماری ناؤ کے اندر بھنور دیئے گئے ہیں

ہم اِس مکانِ ہوا میں ہیں آج بھی جس میں
نہ فرش و بام نہ دیوار و در دیئے گئے ہیں

زمیں سمجھ لیا پانی کو ہم نے، اور اِس پر
قدم کسی نہ کسی طرح دھر دیئے گئے ہیں

دھوئیں میں لپٹی ہوئی دی گئی ہے شام کہیں
کہیں پسینہ پسینہ شجر دیئے گئے ہیں

سوال جتنی بھی تفصیل سے کیے گئے ہوں
یہاں جواب بہت مختصر دیئے گئے ہیں

یہ کیفیت ہے بہت دیر سے ہماری یہاں
ہیں اپنے آپ سے خالی نہ بھر دیئے گئے ہیں

پڑے ہیں بیچ میں ہم بھی مگر زیادہ و کم
اِدھر دیئے گئے ہیں یا اُدھر دیئے گئے ہیں

نہیں دیئے ہیں تو کچھ بھی نہیں دیا ہے وہاں
جہاں دیئے گئے ہیں سر بہ سر دیئے گئے ہیں

ظفرؔ ہماری تن آسانیاں کوئی دیکھے
جو ہونے والے نہ تھے کام کر دیئے گئے ہیں

ہمیں بگاڑ دیا یا بنا لیے گئے ہیں
بس ایک چاکِ ہوا پر چڑھا لیے گئے ہیں

رُکی ہوئی ہے کہیں درمیان ہی میں یہ رات
جو سو گئے تھے وہ سارے جگا لیے گئے ہیں

لٹک گئے ہیں میانِ ہوا و حبس کہیں
جو ہم زمین سے اوپر اُٹھا لیے گئے ہیں

جنھیں ہماری تباہی کی سمت جانا تھا
قدم وہ سارے کے سارے اُٹھا لیے گئے ہیں

ہم آج بھی ہیں کسی بزمِ ناز کے پابند
اُٹھا دیئے گئے ہیں یا بِٹھا لیے گئے ہیں

کسی کی حسبِ ضرورت رہا شمار اپنا
گھٹا دیئے گئے ہیں یا بڑھا لیے گئے ہیں

جو خاص لوگوں پہ ظاہر کیے گئے ہیں یہاں
وہ عام آدمیوں سے چھپا لیے گئے ہیں

اگرچہ شہر بدر کر دیئے گئے ہیں مگر
پڑی ہے جب بھی ضرورت بُلا لیے گئے ہیں

پولس کے ساتھ ظفرؔ ٹک مُکا کیا آخر
اور اپنے آدمی سارے چھڑا لیے گئے ہیں

نئے کے ساتھ پرانے مِلا دیئے گئے ہیں
کہ اگلے پچھلے زمانے مِلا دیئے گئے ہیں

اب اور طرح کی دانش مِلا کرے گی یہاں
کہ پاگل اور سیانے مِلا دیئے گئے ہیں

جو رہنا چاہتے تھے ایک دوسرے سے الگ
وہی بہانے بہانے مِلا دیئے گئے ہیں

اب اور طرح کا انصاف ہی ملے گا یہاں
عدالتوں سے جو تھانے مِلا دیئے گئے ہیں

ہے اب تو سب کے لیے ایک سنگ ہی کافی
کہ سارے آئنہ خانے مِلا دیئے گئے ہیں

کوئی پتا نہیں چلتا کسی کا آپس میں
یہاں پہ سارے گھرانے مِلا دیئے گئے ہیں

جو کوئی دیکھتا سنتا نہیں توجہ سے
تو گفتگوؤں میں گانے مِلا دیئے گئے ہیں

کسی کی ٹھیک سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا
کہ تیرے میرے فسانے مِلا دیئے گئے ہیں

خوشی غمی کا مزہ ایک ساتھ اُٹھاؤ، ظفرؔ
کہ نوحے اور ترانے مِلا دیئے گئے ہیں

مِلا دیئے ہیں تو سارے مِلا دیئے گئے ہیں
سبھی جو خواب ہمارے مِلا دیئے گئے ہیں

تلاش کر لیا دریا نے راستہ کوئی اور
یہاں پہ جب سے کنارے مِلا دیئے گئے ہیں

کچھ اِس طرح سے کہ آپس میں بات نہ کرسکیں
برائے نام پکارے مِلا دیئے گئے ہیں

الگ الگ بھی رکھے تھے کہیں ہمارے لیے
کبھی کبھی یہ اشارے مِلا دیئے گئے ہیں

یہی بہت ہے کسی اور کے ستاروں میں
اگر ہمارے ستارے مِلا دیئے گئے ہیں

ہم اپنے خواب الگ دیکھتے رہے تھے، مگر
اب اِن میں خواب تمھارے مِلا دیئے گئے ہیں

وہ ایک بار کا مِلنا بھی کوئی مِلنا تھا
اِس لیے تو دوبارے مِلا دیئے گئے ہیں

حسابِ عمر کی اِس اُونچ نِیچ میں ہم نے
جو دن نہیں تھے گزارے مِلا دیئے گئے ہیں

یہ کاروبار اکٹھا جو کر لیا ہے، ظفرؔ
منافعوں میں خسارے مِلا دیئے گئے ہیں

ازل کے مارے ہوئے کامران ہو گئے ہیں
کہ جو زمیں بھی نہ تھے آسمان ہو گئے ہیں

تمہارے دل سے نکلنے کے بعد شاید ہم
پھر ایک بار یہاں بے مکان ہو گئے ہیں

تمہارے بعد ہمیں خلق نے سنبھال لیا
سمجھ رہے تھے کہ بس بے امان ہو گئے ہیں

کوئی بھی تجھ سے ملاقات کر نہیں سکتا
ہم اپنے آپ ترے ترجمان ہو گئے ہیں

کبھی اِنھی کو بہت اختلاف تھا ترے ساتھ
جو لوگ آج ترے ہم زبان ہو گئے ہیں

نہ مِل سکا یہاں جن کا سراغ اپنا ہی
وہی کچھ آپ کے نام ونشان ہو گئے ہیں

وہ ایک ہم ہیں کہ بے دخل ہو گئے ہیں وہاں
مزارعان جہاں مالکان ہو گئے ہیں

یہ ہو بھی سکتا ہے دُہرائے اک زمانہ کبھی
یہ ہم جو بھولی ہُوئی داستان ہو گئے ہیں

معاملات جو ناقابلِ بیاں تھے، ظفرؔ
ہمارے عہد میں وہ بھی بیان ہو گئے ہیں

خوشی کی بات ہے پھر پاک باز ہو گئے ہیں
نیاز مند بہت تھے بے نیاز ہو گئے ہیں

تحفظات ہمارے ہی تھے بہت اب تک
اور، اب اُنھیں بھی کئی اعتراض ہو گئے ہیں

وہ سطح اتنی جو ہموار تھی محبت کی
بہت وہاں بھی نشیب و فراز ہو گئے ہیں

پڑے ہُوئے تھے بہت کام اِس کے ساتھ ہمیں
سو، بعض ہو نہ سکے اور بعض ہو گئے ہیں

ہمیں ہی فرق نہیں کوئی پڑ سکا، ورنہ
سب اپنے ساتھ کے پتھر گداز ہو گئے ہیں

بالآخر اُن کو اُنھی کی رضا پہ چھوڑ دیا
جو دل سے دُور کبھی دل نواز ہو گئے ہیں

ہماری بات بگڑنے میں کچھ کسر نہیں اب
جو ہم خود اپنے لیے کارساز ہو گئے ہیں

ہماری شب کا نہ آغاز ہو سکے شاید
کہ اپنی شام کے سائے دراز ہو گئے ہیں

کچھ آپ بھی تو کریں عاقبت کی فکر، ظفرؔ
کہ اب تو رِند بھی اہلِ نماز ہو گئے ہیں

چلتی رُکتی تھی ہوا، ابر گھنیرا نہیں تھا
رات بیتی ہوئی تھی اور سویرا نہیں تھا

روشنی رات کی اپنی تھی گلی کوچوں میں
چاند نکلا نہیں تھا اور اندھیرا نہیں تھا

ایک بے چین مسافر تھا لہو میں میرے
شاخِ دُنیا پہ کہیں میرا بسیرا نہیں تھا

میری تحویل میں تھیں شہر کی ساری سڑکیں
جن دنوں تیری گلی میں میرا پھیرا نہیں تھا

کچے دھاگے سے بندھے تھے کوئی دن کے لیے ہم
تُو بھی میرا نہیں، میں بھی کوئی تیرا نہیں تھا

زندگی اپنی گزر سکتی نہیں تیرے بغیر
یہ خیال اور کسی کا سہی میرا نہیں تھا

مال تُو نے بھی نہ ہونے دیا ظاہر اپنا
اک شریف آدمی تھا، میں بھی لٹیرا نہیں تھا

مجھے ملتی بھی گئی راہ نکلنے کے لیے
ٹھیک سے تیری محبت نے بھی گھیرا نہیں تھا

بیٹھتا اُٹھتا کہاں جا کے ترے ساتھ ظفرؔ
ایک جاگیر تو تھی ہی، تیرا ڈیرہ نہیں تھا

یہ جو دیوار اُسارتے ہیں آپ
کوئی بدلہ اُتارتے ہیں آپ

روز کرتا ہوں انتظار کہ اب
کون سا رُوپ دھارتے ہیں آپ

احتیاطاً جواب دیتا ہوں
جانے کس کو پکارتے ہیں آپ

روز مُردوں کو کرتے ہیں زندہ
اور زندہ کو مارتے ہیں آپ

راستے بند ہیں اُدھر صاحب
جس طرف کو سدھارتے ہیں آپ

رات کی تو خبر ہمیں بھی نہیں
دن کہاں پر گزارتے ہیں آپ

ملنے آئیں گے ایک دن مجھ سے
یہ بھی شیخی بگھارتے ہیں آپ

وہ بغاوت میں کر بھی سکتا ہوں
مجھ کو جس پر اُبھارتے ہیں آپ

بد دعا جائیے کسی کی ظفرؔ
جیت کر یہ جو ہارتے ہیں آپ

دیکھتے ہیں نہ بھالتے ہیں آپ
اک مصیبت میں ڈالتے ہیں آپ

کام جو روز کا ضروری ہو
اُسے کل پر ہی ٹالتے ہیں آپ

ہو رہے ہیں اُسی قدر ضائع
جتنا خود کو سنبھالتے ہیں آپ

میرا احوال پوچھنے کے لیے
وقت کیسے نکالتے ہیں آپ

کھوٹا سکّہ ہوں میں تو کیوں مجھ کو
سرِ بازار اُچھالتے ہیں آپ

یہ نیا ربطِ خاص ہے کوئی کیا
بولتے ہیں نہ چالتے ہیں آپ

یہ تو پھر بھی رہیں گے ویسے ہی
کیوں اندھیرے اُجالتے ہیں آپ

اتنے سانچے ہیں آس پاس مگر
خود ہی ڈھلتے نہ ڈھالتے ہیں آپ

اپنی صحت کی فکر ہے جو ظفرؔ
یہ بھی اک روگ پالتے ہیں آپ

خبر سے دُور ہوں، خواب و خیال سے باہر
مگر نہیں ہوں کسی احتمال سے باہر

محبت اب مری تقدیر کا لکھا ہی سہی
کبھی نکال مجھے اِس وبال سے باہر

مجھے لگائے کوئی آ کے راہ پر کہ ابھی
بھٹکتا پھرتا ہوں وہمِ وصال سے باہر

خود آ بھی سکتا ہے میری مدد کو یہ پانی
نکل بھی سکتا ہوں میں تیرے جال سے باہر

ہے اِرد گرد اِسی کے ذرا جو غور کرو
جواب ہو نہیں سکتا سوال سے باہر

میں رہ سکا نہیں اوقات میں کبھی اپنی
کیا وہی جو ہے میری مجال سے باہر

مجھے کچھ اپنے ہی جیسوں کے ساتھ رہنے دو
کرو مجھے نہ سراسر مثال سے باہر

مرا کمال یہی ہے اگر نکل آؤں
کسی طرح سے کسی دن زوال سے باہر

کیا تھا جس کے لیے اتنا اہتمام ظفرؔ
وہ بات رہ گئی ہے عرضِ حال سے باہر

وہ رہ گئے جو ترے انتخاب سے باہر
پڑے ہیں شعر ہمارے کتاب سے باہر

ترا اشارہ بھی اِس میں ضرور شامل تھا
نکل گیا ہوں جو یوں تیرے خواب سے باہر

عمارتیں نظر آئیں گی ہر طرف کیا کیا
نکل کبھی دلِ خانہ خراب سے باہر

چمک رہی تھی کوئی شے مرے اندھیرے میں
ترے خیال تری آب و تاب سے باہر

کوئی ستارہ مری رہ نمائی کیا کرتا
سفینہ تھا ہی مرا سیلِ آب سے باہر

سو وہ بھی قید کے اندر تھی جانیے کب سے
ہوا نہیں تھی ذرا بھی حباب سے باہر

یہ عمر چاہتی کیا ہے جو ایک مدّت سے
پڑی ہے میرے کتاب و حساب سے باہر

جو باغ ہے تو یہاں تنگ دامنی کیسی
گلاب اور بہت ہیں گلاب سے باہر

ظفر ہماری سمجھ ہی کسی کو آ نہ سکی
ہیں انقلاب میں اور انقلاب سے باہر

رہوں میں شام کے اندر کہ شام سے باہر
نہیں ہے یہ بھی مرے انتظام سے باہر

اُسے نکالتا رہتا ہوں رائگاں شب و روز
دریچہ و در و دیوار و بام سے باہر

اُسے خبر نہ ہوئی، اور میں رہا موجود
بہت قریب کہیں اُس کے دام سے باہر

ہجومِ خلق سے ہٹ کر کبھی سنے مری بات
ملے کبھی مجھے دیدارِ عام سے باہر

پھر اُس کے بعد کھُلا ہی نہ اُس کا دروازہ
گئے تھے ہم تو کہیں اپنے کام سے باہر

کبھی کبھی مری پہچان ہی نہیں رہتی
نکل بھی جاتا ہوں میں اپنے نام سے باہر

جو کر سکے نہیں اِس بار اُس کا کام تمام
نکل سکا نہیں خنجر نیام سے باہر

یہ نام و ننگ، یہ شہرت نہیں مرا سروکار
تلاش کر مجھے میرے مقام سے باہر

ہے کائنات ظفرؔ ایک اِس سے آگے بھی
نکل کے دیکھ سلام و کلام سے باہر

صدائے گفت و شنید اور زبان سے باہر
وہی کہوں گا کہ جو ہے بیان سے باہر

اُٹھا بھی سکتا ہوں میں بوجھ اِس کہانی کا
نکل بھی سکتا ہوں اب داستان سے باہر

سفینہ رُک نہیں سکتا ہے روکنے سے مرے
ہُوا نکلتی نہیں بادبان سے باہر

ہُوا کبھی نہ رہائش کا مسئلہ پیدا
مکان میرے لیے تھا مکان سے باہر

پڑی ہُوئی تھی مصیبت جو سانس لینے کی
نکل سکا ہی نہیں اِس تھکان سے باہر

کُھلا ہے اب کہیں جا کر کہ یہ مری ہستی
تھی میرے وہم کے اندر، گمان سے باہر

ہَوائیں اُس کی مرے رابطے میں ہیں اب بھی
جو ایک اور جہاں ہے جہان سے باہر

بدلتا جاتا ہے ماحول ہی بہت گھر کا
مِلا کریں گے اب اُس مہربان سے، باہر

جو تھا تو صرف یہی شاعری کا شوق ظفرؔ
جو کر گیا ہے مجھے خاندان سے باہر

نہ بُلائے ہُوئے ہیں اور نہ پکارے ہُوئے ہیں
جانے کس بات پہ ہم پھر بھی تمھارے ہُوئے ہیں

ہو رہا ہے کوئی اپنا بھی ارادہ ظاہر
اور کچھ تیری طرف سے بھی اشارے ہُوئے ہیں

اب دوبارہ ہُوئی کیوں اُس کی محبت واجب
ہم نے یہ قرض تو پہلے ہی اُتارے ہُوئے ہیں

ایک رُسوائی ہی رہتی تو کوئی بات نہ تھی
یہاں کچھ اور بھی نقصان ہمارے ہُوئے ہیں

خشک دریا ہی رہے ریت کی رنگت بن کر
اب جو پانی نظر آیا ہے کنارے ہُوئے ہیں

کچھ نئی طرح کی مہلت کوئی ملتی ہم نے
یہ شب و روز تو پہلے بھی گزارے ہُوئے ہیں

جب نہیں تھے تو کسی کا بھی نشاں تک نہیں تھا
اور ہُونے پر اَب آ کے ہیں تو سارے ہُوئے ہیں

آسماں پر تو کوئی دیکھ نہ پایا تھا ۔ ہمیں
ٹوٹ کر اب جو گرے ہیں تو ستارے ہُوئے ہیں

زندگی میں تو مِلا پیار کسی کا نہ ظفرؔ
اب کہیں جا کے ہم اللہ کو پیارے ہُوئے ہیں

صورتِ خاک تری راہ پہ ڈالے ہُوئے ہیں
خود کو گرنے سے اِسی طرح سنبھالے ہُوئے ہیں

کیوں ترستا ہے اُنھی کے لیے ہر شام یہ دل
جو ہمارے کبھی دیکھے نہ ہی بھالے ہُوئے ہیں

سچ بتا یہ بھی شرارت کوئی تیری تو نہیں
ہر طرف یہ جو اندھیروں میں اُجالے ہُوئے ہیں

عمر بھر اپنی تو اصلاح کسی سے نہ ہُوئی
اور تھک ہار کے اب تیرے حوالے ہُوئے ہیں

روشنی کی ہے جب آنکھوں کی خدا کو واپس
تب کہیں جا کے تجھے دیکھنے والے ہُوئے ہیں

اپنے دریاؤں میں پانی تو نہیں تھا، پھر ہم
کون سی لہر تھی وہ جس کے اُچھالے ہُوئے ہیں

دی ہے دستک تو نکل آیا ہوں خود ہی باہر
اتفاقات یہاں یہ بھی نرالے ہُوئے ہیں

باہر اپنا کوئی پہلے ہی نہیں تھا کوئی
اب یہ حالت ہے کہ گھر سے بھی نکالے ہُوئے ہیں

کیا بتائیں کہ محبت کے علاوہ بھی ظفرؔ
روگ ہم نے یہاں کچھ اور بھی پالے ہُوئے ہیں

آخری ہوں کہ ترے گھاٹ پہ پہلا ہُوا میں
جتنا دھویا گیا ہوں اتنا ہی میلا ہُوا میں

سیرگاہیں مری نظروں میں کہاں جچتی ہیں
ہوں جو کچھ دیر ترے باغ میں ٹہلا ہُوا میں

ڈالتا رہتا ہوں پھر تیری محبت اِس میں
دوسری بار جو اپنے لیے تھیلا ہُوا میں

یہ ترا خوف ہے یا اپنی ہی دہشت کوئی
سحر و شام یہ رہتا ہوں جو دَہلا ہُوا میں

احترام اور محبت میں نہیں فرق بہت
ہو کے بوڑھا تو یہاں اور بھی چھیلا ہُوا میں

مجھ میں کیفیتیں دونوں ہیں یہ ناز اور نیاز
کبھی مجنوں ہُوا ہوں اور کبھی لیلیٰ ہُوا میں

جیت بھی میری ہے اور ہار بھی میری اپنی
اِسی نئے کھیل میں نہلے پہ جو دَہلا ہُوا میں

صاف ستھرا نظر آؤں گا بہ ظاہر تو مگر
اندر اندر سے بہت میلا کچیلا ہُوا میں

دیکھ کر خود کو ظفرؔ ہوتی ہے وحشت کیا کیا
بے محابا ہوں جو ہر سمت کو پھیلا ہُوا میں

باہر کے مطابق ہو کہ اندر کے مطابق
یہ خواب نہیں اپنے برابر کے مطابق

خوش ہے جو وہ آرام طلب قید میں دل کی
آسائشیں اِس جیل میں ہیں گھر کے مطابق

کھایا نہ پیا، ویسے کے ویسے ہی اُٹھ آئے
اُس دعوتِ شیراز سے محضر کے مطابق

پتھر کے مطابق مجھے سر تو ہے میسر
ہوتے جو مرے پاؤں بھی چکّر کے مطابق

دونوں کے توازن میں خلل ہے کوئی جیسے
یہ رات جو ہوتی نہیں دن بھر کے مطابق

اوروں کے تصرّف میں جو ہے دوسروں کا رزق
مِلتا ہے یہاں سب کو مقدّر کے مطابق

لوگ اِس لیے کھا جاتے ہیں دھوکا کہ ذرا بھی
باہر نہیں میرا، مرے اندر کے مطابق

یہ سوچ کے پھر چھوڑ دیا دھیان ہی اُس کا
وہ پھول نہیں تھا مرے کالر کے مطابق

جھگڑے ہی یہ پیدا نہیں ہونا تھے کسی طور
میں شعر جو کہتا، ظفرؔ اکثر کے مطابق

٥

چلتا رہا گر سلسلہ سازش کے مطابق
نکلے گا نتیجہ کد و کاوش کے مطابق

یہ ترکِ تعلق بھی ہے اب تیری رضا سے
وہ ربط بھی تھا تیری ہی خواہش کے مطابق

ویسے ہی تھے جس طرح سے تُو نے ہمیں رکھا
تھا حال ہمارا جو پرستش کے مطابق

کچھ آخری معیارِ محبت نہیں اب کے
ہوتے ہیں یہاں فیصلے رنجش کے مطابق

دن ڈوبتا چڑھتا تھا کبھی پوچھ کے مجھ سے
چلتی تھیں ہوائیں مری لرزش کے مطابق

کیا جانیے کیوں میرے مقدّر کا ستارہ
رہتا ہے ابھی تک تری گردش کے مطابق

آندھی سے کوئی پیڑ بھی جڑ سے نہیں اُکھڑا
گیلی ہوئی مٹّی بھی نہ بارش کے مطابق

لوگوں کے بہت کام کیے آپ نے دن رات
کرتے کوئی میری بھی گزارش کے مطابق

ہم سے تو ظفرؔ خوش نہیں اب شہر میں وہ بھی
رہتے ہیں یہاں جس کی سفارش کے مطابق

پہلے ہی ٹھیک طرح سے ہوں ٹوٹا ہُوا میں
گھٹتا بڑھتا نہیں اُس شوخ کا تولا ہُوا میں

چیر سکتا کبھی اِس رات کے سناٹے کو
روشن آواز کی گہرائی سے بولا ہُوا میں

کہیں اطراف و جوانب سے نہ ڈھونڈو مجھ کو
اِن ہواؤں میں ہی موجود ہوں گھولا ہُوا میں

روشنی کرتے ہُوئے جا کے بِگروں گا بھی کہیں
خوش نہ ہوں لوگ اگر آگ بگولہ ہُوا میں

سعی بے سُود ہے ساری کہ یہ ممکن ہی نہیں
بند ہو جاؤں کسی اور کا کھولا ہُوا میں

اِس توقع پہ کہ تُو ہی مجھے کر دے گا بحال
تجھ تک آیا ہوں جو اِس طرح مدھولا ہُوا میں

ایک ہی وضع کا پابند نہیں رہ سکتا
اِس لیے بھی کبھی ماشہ، کبھی تولہ ہُوا میں

مجھے تقسیم کیا اُس نے کئی ٹکڑوں میں
ایک سے چار ہُوا چار سے سولہ ہُوا میں

وقت ایسا تو ہمیشہ نہیں رہنے کا، ظفرؔ
کبھی قائم بھی تو ہو سکتا ہوں ڈولا ہُوا میں

وقت بے وقت کہ ویلے سے کویلا ہُوا میں
اور کا اور ہوں سو بار کا جھیلا ہُوا میں

بے وفائی تری میرا ہی مقدّر ٹھہری
تیرا دل جیتنے والا بھی اکیلا ہُوا میں

خاک میں جذب نہ ہو جاؤں ترے آنے تک
منتظر ہوں ترے رستے پہ اُنڈیلا ہُوا میں

اپنی مرضی سے تو شاید نہ یہ ہمّت کرتا
آ گھسا ہوں تری محفل میں دھکیلا ہُوا میں

اتنا خوش خوش نہ پھرو مجھ سے لگا کر بازی
جیت بھی سکتا ہوں اِس کھیل میں کھیلا ہُوا میں

ساتھ ہی لے گیا وہ رونقیں دل کی یک دم
آن کی آن میں اُجڑا ہُوا میلہ ہُوا میں

اپنی ہی بستیاں غرقاب کیے بیٹھا ہوں
کس نئے خواب کے سیلاب کا ریلہ ہُوا میں

ایک حد تک ہے یہ آوارہ خرامی میری
جا بھی سکتا ہوں کہاں تیرا نکیلا ہُوا میں

ایک ہی وقت میں غائب ہوں نہ موجود ظفؔر
شہر والوں کے لیے ایک جھمیلا ہُوا میں

کچھ روئیے ہی تھے ایسے کہ غصیلا ہُوا میں
بے سبب تو نہیں میٹھے سے کسیلا ہُوا میں

یہ محبت ہی وہ کیچڑ تھا جو آخر آخر
ایک دن منہ پہ مَلا اور بجیلا ہُوا میں

کہیں گرتی رہی شبنم وہ مری شام سے دُور
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گیلا ہُوا میں

دُور رہتا تھا بہت اپنی اَکڑ میں لیکن
تنگ چولی نظر آئی ہے تو ڈھیلا ہُوا میں

دھیان رکھنا کہ اِسی شور شرابے میں کہیں
تیرے قابو سے نکل جاؤں نہ کیلا ہُوا میں

پہلے پہلے رہی مجھ میں بھی لہو کی رنگت
خاک سے رنگ جو پکڑا ہے تو پیلا ہُوا میں

اپنے ٹکڑے جو کیا کرتا ہوں اب شام و سحر
کچھ پتا ہی نہ چلا اور کٹیلا ہُوا میں

آسماں زہر کی صورت مرے اندر پھیلا
دھوپ کی لہر کچھ ایسی تھی کہ نیلا ہُوا میں

چھال اُتری تو ظفرؔ سوکھ بھی جاؤں شاید
تھوڑا اچھا تو نظر آؤں گا چھیلا ہُوا میں

مسترد ہو گیا جب تیرا قبولا ہُوا میں
یاد کیا آؤں گا اِس طرح سے بھولا ہُوا میں

بات مجھ میں بھی کچھ اِس طرح کی ہوگی کہ یہاں
کبھی واپس ہی نہ ہوتا تھا وصولا ہُوا میں

خاک تھی، اور ہوا تھی مرے اندر باہر
دشت اک سامنے تھا اور بگولہ ہُوا میں

نہیں مرنے میں بھی درکار تعاون مجھ کو
چھت سے اپنی ہی نظر آؤں گا جھولا ہُوا میں

وقت وہ تھا کہ خد و خال نمایاں تھے مرے
اب یہ حالت ہے کہ بس ایک ہیولا ہُوا میں

یہ بھی سچ ہے کہ عمل مجھ پہ کسی نے نہ کیا
ورنہ کہنے کو تو مشہور مقولہ ہُوا میں

اک نحوست ہے مرے موسموں پر چھائی ہُوئی
ہے یہی وجہ کہ پھلتا نہیں پھُولا ہُوا میں

پھر کسی سے بھی گرہ مجھ پہ لگائی نہ گئی
کوئی بے ڈھب ہی بہت مصرعِ اولیٰ ہُوا میں

موت کے ساتھ ہُوئی ہے مری شادی سو ظفؔر
عمر کے آخری لمحات میں دولہا ہُوا میں

ہوں وہ پہلا سا پرانا کہ نرالا ہُوا میں
رفتہ رفتہ جو ترا چاہنے والا ہُوا میں

تو مجھے ایک اشارے سے اُٹھائے کسی دن
زندہ ہو جاؤں ترے سامنے ڈالا ہُوا میں

مجھے باہر سے پذیرائی مِلی ہے ورنہ
یہ وہی ہوں تری محفل سے نکالا ہُوا میں

تجھ سے نسبت تو کوئی خاص نہیں تھی میری
اِس بھرے شہر میں کیوں تیرا حوالہ ہُوا میں

یہ کسی اور کے گھیرے میں نہ آیا تھا کبھی
ہوتے ہوتے جو ترے چاند کا ہالہ ہُوا میں

کیفیت اور ہی کچھ ہے مرے اندر باہر
کہ اندھیرا ہُوا ہوں اور نہ اُجالا ہُوا میں

اپنی کوشش بھی مجھے چاہیے کرنی کوئی اب
گر بھی سکتا ہوں کہیں تیرا سنبھالا ہُوا میں

اکثر اوقات کناروں سے چھلک جاتا ہوں
زور کرتا ہُوا، اپنا ہی اُچھالا ہُوا میں

ایک ہونا بھی مرے واسطے مشکل تھا ظفرؔ
کون سے لوگ ہیں یہ جن سے دوبالا ہُوا میں

کام اب کے جو ہمارا نہیں ہونے والا
یہ سمندر بھی کنارہ نہیں ہونے والا

رائگاں آنکھوں میں جلتا بھی رہے دل کا لہو
یہ چراغ اب کے ستارہ نہیں ہونے والا

حال مست آپ بھی رہتے ہیں شب و روز ظفرؔ
اُس طرف سے بھی اشارہ نہیں ہونے والا

جس کے ہونے کی لگا رکھی ہے اُمید بہت
کچھ تو ہو جائے گا سارا نہیں ہونے والا

خاک سے بے خبری کیوں نہ رہے گی ہر دَم
کہیں اپنا ہی اُتارا نہیں ہونے والا

پھر کسی کا کوئی ہو ہی نہیں سکتا ہے یہاں
میں اگر اب بھی تمھارا نہیں ہونے والا

خس و خاشاک تو یک سُو ہیں کبھی کے، لیکن
شوق اپنا ہی شرارہ نہیں ہونے والا

موقع جس کو غنیمت نہیں جانا تم نے
اب یہ امکان دوبارہ نہیں ہونے والا

آتے جاتے ہیں وہی سانپ سیاست کے ظفرؔ
کبھی خالی یہ پٹارہ نہیں ہونے والا

کبھی باہر، کبھی اندر نہیں ہونے والا
اب یہ ہنگامہ برابر نہیں ہونے والا

میں بھی ملبوس نہ بن پاؤں گا اُس کا ہرگز
اور وہ بھی مرا بستر نہیں ہونے والا

بات ایسی ہے کہ سُن کر بھی نہ سُن سکتے ہوں
کام یہ وہ ہے کہ ہو کر نہیں ہونے والا

رہ گیا تھا کبھی ہونے سے جو پہلے بھی یہاں
وہی اِس بار مکرر نہیں ہونے والا

اپنے حصّے کی سزا میں جو بھگت بیٹھا ہوں
ظلم اب اور تو مجھ پر نہیں ہونے والا

ہوں جو نکلا ہُوا اک بار ترے ہاتھوں سے
اب کسی طور میسر نہیں ہونے والا

جا بہ جا یہ جو نئے لوگ ہیں اِن میں آخر
کون ہے جو مرا ہم سر نہیں ہونے والا

چل رہا ہے مرا سب سے کوئی جھگڑا ابھی، سو میں
کارواں سے ابھی باہر نہیں ہونے والا

میں جو پہلے ہی بہت سخت ہوں اندر سے ظفرؔ
اور اُسے دیکھ کے پتھر نہیں ہونے والا

جس طرح چاہیے ویسا نہیں ہونے والا
لوٹ چلیے کہ تماشہ نہیں ہونے والا

ہو سکا ہے یہاں جتنا بھی غنیمت سمجھو
رہ گیا ہے جو بقایا نہیں ہونے والا

دیکھتے رہیے کوئی خوابِ قناعت کہ یہاں
ہونے والا بھی زیادہ نہیں ہونے والا

ریت پر پیاس نے کچھ اور چمکنا ہے ابھی
اپنا صحرا ابھی دریا نہیں ہونے والا

اپنا آغاز ہی مشکوک اگر ہے تو یہاں
کوئی انجام ہمارا نہیں ہونے والا

واردات ایک نئی اور انوکھی ہو گی
ہو چکا ہے جو دوبارہ نہیں ہونے والا

کہیں چھوڑی ہی نہیں تُو نے کوئی گنجائش
اِس طرح سے تو گزارہ نہیں ہونے والا

دوسروں سے ذرا ہٹ کر جو کہی تھی میں نے
ابھی اُس بات کا چرچا نہیں ہونے والا

میں بھی سمجھے ہُوئے تھا دوسروں کی طرح ظفرؔ
کہ مرے شہر پہ حملہ نہیں ہونے والا

کبھی غبار، کسی دن دُھواں گزرتا ہوں
تری زمیں پہ اگر آسماں گزرتا ہوں

شجر بہت ہیں مرے ساتھ ساتھ چلنے کو
تو شاخ شاخ پہ میں آشیاں گزرتا ہوں

سفینہ میرے ہی رحم و کرم پہ ہے پھر بھی
ہوا نہیں ہے، مگر بادباں گزرتا ہوں

فسانہ ایک ہی مجھ میں رُکا ہُوا ہے مگر
سنو! تو روز نئی داستاں گزرتا ہوں

یہاں پہ کوئی نہیں ہے سنائی دے کس کو
میں ایک دشت ہوں جس پر اذاں گزرتا ہوں

میں اپنے پاؤں کی مٹّی کبھی نہ چھوڑ سکا
سفر میں ہوتے ہُوئے بھی مکاں گزرتا ہوں

کہیں تو ہو گی یہ میٹھی مراد پُوری بھی
جبیں پہ رکھّا ہُوا آسماں گزرتا ہوں

میں خود ہی اپنی امان گاہِ خواب ہوں جس پر
یہ جسم سوچتا ہوں اور جاں گزرتا ہوں

اِسی قدر یہ گزرگاہِ گفتگو ہے ظفرؔ
زباں پکارتا ہوں اور بیاں گزرتا ہوں

جو اپنے آپ سے ایک آرزو گزرتا ہوں
تو جیسے اُس کی رگوں میں لہو گزرتا ہوں

یہ خاک ہے جو مرا عکس اُچھالتی ہے یہاں
اِس آئنے سے ابھی ہُو بہ ہُو گزرتا ہوں

کہیں پڑا ہُوا جھونکا ہوں اپنے اندر ہی
ہَوا کے ساتھ کبھی سر بہ سر گزرتا ہوں

یہ خواب ہے کوئی اور میں خیال ہوں جس کا
یہ دشت ہے کوئی اور آب جُو گزرتا ہوں

میں دیکھ لیتا ہوں جھنکار سی کوئی ہر روز
کہ اپنے سامنے سے جیسے تُو گزرتا ہوں

جو پا لیا ہے نہ کھویا ہے آج تک اب بھی
تلاش ہے نہ کوئی جستجو گزرتا ہوں

میں اپنی آپ بھی آواز سُن نہیں سکتا
تو کس طرح کی یہاں گفتگو گزرتا ہوں

ہَوا لگی ہے مجھے شہر کی بھی آخرکارِ
کہ دوست لگتا ہوں لیکن عدو گزرتا ہوں

ظفؔر نمازِ محبت بھی کیا عبادت ہے
کہ بعد میں کہیں جا کر وضو گزرتا ہوں

چاند تاروں کا حوالہ بھی کہیں ہے شاید
آسماں لگتا ہے لیکن یہ زمیں ہے شاید

دل تو خالی تھا اِسی طرح بڑی مدّت سے
اِس کے ہمسائے میں اب کوئی مکیں ہے شاید

دیکھنا چاہیے اطراف میں اپنے بھی کہیں
میں جسے ڈھونڈنے نکلا ہوں یہیں ہے شاید

کس کو معلوم ہے کیا اُس کا ارادہ ہے کہ جو
دُور ہوتا ہُوا کچھ اور قریں ہے شاید

اِس اندھیرے کو یہ کرتا ہُوا اتنا روشن
ٹوٹ کر گرتا ہُوا ماہِ مبیں ہے شاید

زندگی جیسے کوئی مشق سی لگتی ہے مجھے
اصل جو کام ہے وہ بعد ازیں ہے شاید

سجدہ بھی لوحِ مناجات میں ایسا ہُوا گُم
نقشِ پا جس کو سمجھتا ہوں جبیں ہے شاید

میں تو ہو ہی نہیں سکتا ہوں تری دُنیا میں
حدِ امکاں میں یہاں تُو بھی نہیں ہے شاید

ظفؔر اقبال کا کیا نام و نشاں پوچھتے ہو
جہاں اِس کو نہیں ہونا تھا وہیں ہے شاید

ہمارے اندر کوئی تو باہر لکھے ہُوئے تھے
کہ جو بھی تھے فیصلے برابر لکھے ہُوئے تھے

کوئی کھنڈر تھا اور اُس کی مٹتی ہُوئی عمارت
منڈیر تھی اور وہاں کبوتر لکھے ہُوئے تھے

کتاب میں رہ گئے تھے بھرتی کے خواب سارے
وہی حذف کر دیئے جو بہتر لکھے ہُوئے تھے

جنھیں مٹایا تھا اُس نے دیوارِ دوستی سے
وہ سارے مضمون اب ہَوا پر لکھے ہُوئے تھے

خدا کی قدرت ہے لہلہائیں اُنھی میں فصلیں
جو کھیت پٹواریوں نے بنجر لکھے ہُوئے تھے

وہ دُور آبِ سراب کا دُھوپ میں چمکنا
ہمارے صحراؤں پر سمندر لکھے ہُوئے تھے

کبھی نہیں کھولنے بچھانے کی نوبت آئی
ہماری تقدیر میں جو بستر لکھے ہُوئے تھے

ہماری قرأت ہی ڈھنگ سے کر سکا نہ کوئی
کہ ہم ذرا دوسروں سے ہٹ کر لکھے ہُوئے تھے

کٹی ظفرؔ عمر جن کی ساری مسافرت میں
اُنھی کے ناموں کے سامنے گھر لکھے ہُوئے تھے

ہُوئی نہیں جو ابھی تک محبت اب کیا ہو
کسی طرح سے بھی اس کی وضاحت اب کیا ہو

اگر بہار گزر گئے ہیں تو بات ختم ہُوئی
گزر گئی ہے جو سر سے قیامت اب کیا ہو

جب ایک دوسرے پر اعتبار ہی نہ رہا
یہ کاروبار ہے اس میں شراکت اب کیا ہو

یہ سوچنا ہے کہ برباد ہو گیا کیا کچھ
جو بچ رہا ہے ابھی اس کی صورت اب کیا ہو

یہ ایک خواب پریشاں کہ بے لباس ہُوا
جو کرنا چاہوں بھی، اس کی حفاظت اب کیا ہو

نہ تھا مضائقہ اس میں کچھ ایسا پہلے ہی
تو اس میں کوئی نئی بھی قباحت اب کیا ہو

جو اس سے پہلے نہیں تھی کبھی کسی لمحے
تو خاص تم کو ہماری ضرورت اب کیا ہو

نتائج آئیں گے ترغیب کے تناسب سے
صلہ ہی کچھ نہیں ملنا تو محنت اب کیا ہو

جو لڑ سکے نہیں اپنا مقدمہ ہی ظفرؔ
دلیل دیجیے کیوں کر وکالت اب کیا ہو

کسی بہانے سے اب دوبارے کُھلے ہُوئے تھے
کہ حبس تھا اور بٹن تمھارے کُھلے ہُوئے تھے

ابھی میں سمتِ سفر ہی طے کر نہیں سکا تھا
مرے لیے راستے تو سارے کُھلے ہُوئے تھے

مچی ہُوئی جیسے کوئی بھگدڑ سی آسماں پر
بندھی ہُوئی تھی ہوا، ستارے کُھلے ہُوئے تھے

یہاں جو تھا انتظار دریا کو پانیوں کا
مثالِ آغوش کیا کنارے کُھلے ہُوئے تھے

اِسی لیے پھر پھرا کے میں واپس آ گیا ہوں
کہ میرے اِس شہر میں گزارے کُھلے ہُوئے تھے

وہاں کہیں میں ہی چوک میں آ کے رُک گیا تھا
جہاں مرے سامنے اشارے کُھلے ہُوئے تھے

کہ شہر سے جیسے کوچ ہی کر رہا ہوں میں اب
حساب جتنے تھے میرے بارے کُھلے ہُوئے تھے

پڑھا ہُوا ذہن سے کھرچنے کی خاطر اب تو
قدم قدم پر یہاں ادارے کُھلے ہُوئے تھے

ظفؔر کسی چور نے بھی شب بھر نہ کی توجہ
وگرنہ دروازے تو ہمارے کُھلے ہُوئے تھے

پتا نہیں چل رہا کہاں سے بندھے ہُوئے ہیں
زمیں پہ ہیں اور آسماں سے بندھے ہُوئے ہیں

ہماری وابستگی کوئی راز بھی نہیں اب
وہیں سے کھولو ہمیں جہاں سے بندھے ہُوئے ہیں

نہیں کسی کے بھی پاس تحریر تو ہماری
بندھے ہُوئے ہیں تو بس زباں سے بندھے ہُوئے ہیں

گواہی اپنے خلاف جھوٹی تو تھی، مگر ہم
جو دے چکے ہیں، اُسی بیاں سے بندھے ہُوئے ہیں

فریب کاری ہے سر بہ سر بندوبست اپنا
جہاں سے لگتے نہیں وہاں سے بندھے ہُوئے ہیں

تھا ایک دَم مشکل اور آساں ہمارا مِلنا
ہیں بے سراغ اور کسی نشاں سے بندھے ہُوئے ہیں

ہمیں کناروں سے دُور لے جا رہے ہیں یک سر
ہَوا کے جھونکے جو بادباں سے بندھے ہُوئے ہیں

ہماری حیثیت اِس سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی
غبار ہیں، اور کارواں سے بندھے ہُوئے ہیں

نکل کے جاتے بھی ہم یہاں سے ظفرؔ کہیں کو
مگر کریں کیا کہ اِس مکاں سے بندھے ہُوئے ہیں

بے نام جس قدر ہیں اُنھیں نام دے سکوں
شاید یہ کارنامہ سر انجام دے سکوں

اِس حال میں بھی میری تمنّا ہے یہ کہ میں
کام آسکوں ترے کہ تجھے کام دے سکوں

ہارا ہوں آپ اور مجھے اُس کی تلاش ہے
اپنی شکست کا جسے الزام دے سکوں

اتنا بھی کامیاب نہیں ہو سکا کہ میں
کوئی ثبوتِ کوششِ ناکام دے سکوں

اتنا تو اختیار مجھے ہونا چاہیے
جس کو دعا نہ دوں اُسے دشنام دے سکوں

مشکل میں ہے جو اُس کو سہولت کروں بہم
مطلوب ہو جسے اُسے آرام دے سکوں

مجھ سے سوال اُس نے کیا ہے جو صبح دم
اُس کا جواب میں بھی کسی شام دے سکوں

دیکھوں تو یہ بھی فرضِ کفایہ ہے سر بہ سر
دل کا اُسے اگر کہیں پیغام دے سکوں

چھپ کر مرا سراغ نہ لیتا پھرے ظفرؔ
یہ مشورہ اُسے جو سرِعام دے سکوں

کچھ سبب ہی نہ بنے بات بڑھا دینے کا
کھیل کھیلا ہُوا یہ اُس کو بُھلا دینے کا

اپنے ہی سامنے دیوار بنا بیٹھا ہوں
ہے یہ انجام اُسے رستے سے ہٹا دینے کا

ایک مقصد تو ہُوا ڈھونڈنا اُس کا ہر سُو
لطف ہی اور ہے پانے سے گنوا دینے کا

رابطہ روکنا مقصد نہیں کچھ اور ہے یہ
درمیاں میں کوئی دیوار اُٹھا دینے کا

آنے والوں کو، طریقہ مجھے آتا ہے بہت
جانے والوں کے تعاقب میں لگا دینے کا

یونہی چپ چاپ گزر جایئے اِن گلیوں سے
یہاں کچھ اور ہی مطلب ہے صدا دینے کا

اک ہنر پاس تھا اپنے سو نہیں اب وہ بھی
جو دِکھائی نہیں دیتا ہے دِکھا دینے کا

سب کو معلوم ہے اور حوصلہ رکھتا ہوں ابھی
اپنے لکھے ہُوئے کو خود ہی مٹا دینے کا

ٹوٹ پڑتی ہے قیامت کوئی پہلے ہی ظفرؔ
قصد کرتا ہوں جو فتنے کو جگا دینے کا

بند آنکھوں میں وہی خوابِ جوانی کچھ ہے
میں سناتا ہی رہوں گا جو کہانی کچھ ہے

ایسے لگتا ہے کہ پیاسا ہی رہوں گا یونہی
یعنی جب تک مرے اطراف میں پانی کچھ ہے

چلتا رہتا ہے جو دریائے تماشا دن رات
اس میں ٹھہراؤ زیادہ ہے، روانی کچھ ہے

پاس اپنے بھی ہے یک طرفہ محبت کا حساب
کچھ تو لکھا ہُوا ہے اور زبانی کچھ ہے

اُس کے ہونے کا سبب اور بھی ہے اِس کے سوا
اور نشانات سے آگے بھی نشانی کچھ ہے

گھر میں جو بیٹھے ہُوئے دُور نکل جاتا ہوں
اِس میں بھی سلسلۂ نقل مکانی کچھ ہے

اب بھی جس یاد کو سینے سے لگائے ہُوئے ہوں
جا بہ جا بھُولی ہُوئی اور پرانی کچھ ہے

کیا کہیں گے اِسے موسم کی شرارت کے سوا
تُو نہیں بھی ہے تو یہ شام سہانی کچھ ہے

آبِ الفاظ کا ہی سارا کرشمہ ہے ظفرؔ
جس کی پہنائی میں یہ موجِ معانی کچھ ہے

آگ ہے، راکھ ہے اپنے لیے سارا کچھ ہے
شہرِ برباد میں جتنا بھی ہمارا کچھ ہے

کچھ بچا ہی نہیں اور اپنی کفایت کے لیے
کچھ سمندر ہے یہاں اور کنارہ کچھ ہے

یہ محبت ہے کہ بیگانہ روی ہے اُس کی
مدّعا اور ہی کچھ اور اشارہ کچھ ہے

دل کے اندر ہے نہ باہر ہے کہیں وہ لیکن
اب کئی روز سے لگتا ہے دوبارہ کچھ ہے

اپنے معمول سے ہٹ کر بھی نہیں کچھ لیکن
یہاں تقدیر ہے کچھ اور ستارہ کچھ ہے

اپنے باہر کی خبر لائے بھی ہیں تو پھر کیا
اپنے اندر سے اگر ہم نے گزارا کچھ ہے

بس اُسی آن میں دیکھا تو نہیں تھا کچھ بھی
جس گھڑی ہم نے یہ سوچا کہ شرارہ کچھ ہے

کھول کر آنکھ جو دیکھا ہے تو خالی تھی نظر
آنکھ اُٹھا کر جو نہ دیکھا تو نظارا کچھ ہے

ختم کر دی ہے اگر بات ہی اُس نے تو ظفرؔ
جا کے لے آؤ واں سے جو تمھارا کچھ ہے

گہرا بھی پانی، اُتھلا بھی پانی ہے
نالی میں بہنے والا بھی پانی ہے

پیاس بجھانی ہے تو سونگھو مت اُس کو
یعنی پی جاؤ جیسا بھی پانی ہے

آتی ہے جی میں کہ وہیں کے ہو رہے
کہیں کہیں اتنا میٹھا بھی پانی ہے

جس کے سبب سے سارا کنواں پلید ہُوا
نہیں نکالا تو کتّا بھی پانی ہے

دُور دُور تک لہریں لیتا خواب سراب
دُھوپ میں دیکھو تو صحرا بھی پانی ہے

اتنا نہیں کہ میں آرام سے ڈوب سکوں
رات کے دریا میں جتنا بھی پانی ہے

بہت پرانی پیاس بجھائے کہاں جا کر
میری طرح سے خود پیاس بھی پانی ہے

کہیں تمھارے پانی سے تھوڑا آگے
اسی نواح میں کچھ میرا بھی پانی ہے

کوتوں کھدروں میں ٹھہرا میں ہوں ظفرؔ
رستوں پر آتا جاتا بھی پانی ہے

کوئی بھی اختیار اچھا بُرا چلنے نہیں دیتا
وہ سب خود کر رہا ہے اور پتا چلنے نہیں دیتا

کھڑا ہوں اور مرے آگے رکاوٹ بھی نہیں کوئی
جو سچ پوچھیں تو مجھ کو راستہ چلنے نہیں دیتا

اندھیرا بھی ہے، پتّوں پر پسینہ بھی مگر اُس نے
سحر روکی ہُوئی اور ہوا چلنے نہیں دیتا

کبھی اُٹھوا رہا ہے سارا سودا ہی دکانوں سے
کبھی بازار میں سکّہ مرا چلنے نہیں دیتا

وہ لے کر چل رہا ہے سب کو اپنی سرپرستی میں
کسی کو اپنی مرضی سے جدا چلنے نہیں دیتا

ہمارے ہاتھ ہی باندھے ہُوئے اُس نے نہیں، وہ تو
کسی کو بھی یہاں اپنے سِوا چلنے نہیں دیتا

بہت کچھ بند ہے، اور اس گھڑی کچھ کہہ نہیں سکتے
کہ چلنے دے رہا ہے کیا تو کیا چلنے نہیں دیتا

وہاں درپیش ہے سارے سمندر کا سفر ہم کو
جہاں کشتی کو خود ہی ناخدا چلنے نہیں دیتا

ظفؔر، زنجیر میرے پاؤں میں ہے میری اپنی ہی
مجھے آگے مرا رنگِ نوا چلنے نہیں دیتا

ایک ہی جیسی کمی کوئی ہمارے میں ہے
میں بھی خسارے میں ہوں، تُو بھی خسارے میں ہے

جانے محبت ہے یہ، یا وہی بے گانگی
بات ہی ایسی کوئی تیرے اشارے میں ہے

خواب مرے دُور ہی مجھ سے کہیں رہ گئے
کوئی سمندر میں ہے، کوئی ستارے میں ہے

میرے اندھیروں سے تھا اُس کا گزر ایک راز
آج بھی پھیلی ہوئی روشنی سارے میں ہے

مجھ کو نظر تو یہاں کچھ بھی نہیں آ رہا
پھر بھی سمجھتا ہوں میں کوئی نظارے میں ہے

جس کی خبر چاہیے، جس سے حذر چاہیے
میرے بھنور میں نہیں، میرے کنارے میں ہے

کھول کے بیٹھو اگر اپنی کتابِ وفا
وہ بھی ذرا دیکھنا جو مرے بارے میں ہے

یہاں وہاں چار سُو اُڑتا پھرے کوئی دَم
اتنی ہَوا تو ابھی غم کے غبارے میں ہے

میں بھی یہاں ہوں کہیں اُس کی نظر میں، ظفرؔ
وہ بھی کئی روز سے میرے پکارے میں ہے

ایک تو میں نے بھی جا کر وہاں دانائی نہ کی
اس دفعہ ٹھیک سے اُس نے بھی پذیرائی نہ کی

فرق رکھنا ہی پڑا جائز و ناجائز میں
اتنی اُس نے بھی مری حوصلہ افزائی نہ کی

فائدہ سادگی اُس کی سے اُٹھاتے کوئی دن
دل تو کہتا بھی رہا، ہم نے ہی شنوائی نہ کی

اصل میں ہم بھی زیادہ کوئی بیمار نہ تھے
اور سچ پوچھیں تو اُس نے بھی مسیحائی نہ کی

کچھ مزہ ہی کبھی آیا نہیں جب تک میں نے
شامل اوقاتِ ملاقات میں تنہائی نہ کی

پیش رفت اُس کے مقدر میں نہیں تھی جس نے
اختیار ایک دفعہ بھی کبھی پسپائی نہ کی

کیسے لگنا تھا یہاں اُس کا تماشا جس نے
زندگی بھر کبھی پروائے تماشائی نہ کی

اور بھی عیب کئی طرح طرح کے ہوں گے
اک خوشامد ہے جو ہم نے کبھی کروائی، نہ کی

اُس کے شر سے مجھے محفوظ بھی رہنا پڑتا
اِس لیے میں نے کسی سے ظفرؔ اچھائی نہ کی

گالیوں کا جواب گولی سے
اب کریں گے خطاب گولی سے

کیا عجب ہے جواب چُکایا جائے
یہاں سارا حساب گولی سے

چھائے ہر سمت موت کی مستی
آئے بُوئے شراب گولی سے

خون مہکے گا شاہ راہوں پر
اور کِھلیں گے گلاب گولی سے

آپ بُوٹوں سے واجبِ تعظیم
آپ عزت مآب گولی سے

کوئی بم ہی چلایئے گا کہ یہ
نہ رُکیں گے، جناب گولی سے

وقت ایسا بھی آ رہا ہے کہ جب
پھوڑیئے گا حباب گولی سے

روکنے جا رہے ہو جس کو وہی
آئے گا انقلاب گولی سے

اب ظفرؔ خلق پر اُترتا ہے
ہر عذاب و ثواب گولی سے

کہاں کا عشق اگر بات ہی نہیں ممکن
ہماری تجھ سے ملاقات ہی نہیں ممکن

کہیں یہ بیٹھ سکیں دو گھڑی سہولت سے
سو اس قبیل کے حالات ہی نہیں ممکن

ہم اور حال میں ہوتے ہیں، آپ اور کہیں
ہمارے آپ کے اوقات ہی نہیں ممکن

گھٹا میں نام کو پانی نہیں رہا ہے کہیں
سو اِس لیے کہیں برسات ہی نہیں ممکن

ازالہ ہو سکے یہ بات دُور کی ہے بہت
سرے سے کوئی شکایات ہی نہیں ممکن

یہاں فریبِ فراغت بھی کون کھائے گا
کہ دن کے بعد جہاں رات ہی نہیں ممکن

اُسی گلی میں کوئی پھر رہا ہے کاسہ بہ دست
کہ جس میں صدقہ و خیرات ہی نہیں ممکن

نہ صرف خواب کا دروازہ بند ہے کب سے
یہ حال ہے کہ خیالات ہی نہیں ممکن

یہاں پہ فکرِ جوابات ہو کسے کہ ظفرؔ
جہاں پہ کوئی سوالات ہی نہیں ممکن

خواب و خیال سے بھی زیادہ ہے دستیاب
دُنیا جو چاہتے ہو تو دُنیا ہے دستیاب

خود سوچ کس طرح سے گزرتی ہے زندگی
تو ہے کہیں نہ اب ترے جیسا ہے دستیاب

جس کی تلاش تھی وہی ناپید ہے یہاں
کہنے کو شہر میں ہمیں کیا کیا ہے دستیاب

جس چیز کی طلب ہے وہی اُس کے ہاں نہیں
اخلاق تو کچھ اور بھی اچھا ہے دستیاب

ہم چاہتے ہیں اس لیے غائب ہے سر بہ سر
اور چاہتے نہیں ہیں لہٰذا ہے دستیاب

اِس سے زیادہ کا ابھی لالچ نہیں درست
اُتنا ہی ٹھیک ہے یہاں جتنا ہے دستیاب

آنکھیں تھیں جب تو کوئی تماشا نہ تھا کہیں
آنکھیں نہیں ہیں اور تماشا ہے دستیاب

دروازہ گر نہیں ہے تو کچھ یہ بھی کم نہیں
دیوار میں جو ایک دریچہ ہے دستیاب

یوں ہے کہ ڈوبنے کی اجازت نہیں ظفرؔ
حالاں کہ آس پاس ہی دریا ہے دستیاب

جو ایک بار تھا وہ دوبارہ ہے دستیاب
کھویا ہُوا ہمارا ستارہ ہے دستیاب

ہلتے نہیں ہیں آپ ہی اپنی جگہ سے ہم
حالاں کہ اُس کا تازہ اشارہ ہے دستیاب

اپنا بھی ہے جلوسِ تمنّا رواں دواں
اُس کو بھی زندہ باد کا نعرہ ہے دستیاب

اپنی خرید سے بھی ذرا کم پہ بیچ آئے
اور نفع کے بجائے خسارہ ہے دستیاب

اب تک معاملہ ہے زبانی ہی وصل کا
تھوڑا نصیب میں ہے نہ سارا ہے دستیاب

کوئی خیال اُس کا میسر ہمیں بھی ہے
اُس کو بھی کوئی خواب ہمارا ہے دستیاب

اب کیا یہاں مکانِ محبت بنائیں ہم
اینٹیں ہیں دسترس میں نہ گارا ہے دستیاب

پہلے تو یہ بھی اپنا مقدر نہ تھا مگر
کچھ دن سے انتظار تمھارا ہے دستیاب

دریا ہے ایک بُھولی ہُوئی داستاں ظفرؔ
پانی نہیں ہے، اور کنارہ ہے دستیاب

شہر میں کوئی نئی بات چلائی ہوئی ہے
خود تو دیکھی نہیں جو چیز دِکھائی ہوئی ہے

سر کا جو بوجھ تھا رستے میں جھٹک آیا ہوں
ایک گٹھڑی ابھی کاندھے پہ اُٹھائی ہوئی ہے

اُس کے اپنے بھی مسائل ہیں بہت اُلجھے ہوئے
خلق اِس شہر کی تیری بھی ستائی ہوئی ہے

عرض و اظہار پہ جو کان ہی دھرتا نہیں وہ
یہ کہانی اُسے پہلے بھی سنائی ہوئی ہے

کچھ نہیں جانتا میں، پھر بھی مجھے پوچھتے ہیں
سب کو حالاں کہ یہی بات بتائی ہوئی ہے

پاس آتا نہیں کیوں، جانتا ہے اس کے لیے
دُور سے ہم نے کوئی چیز منگائی ہوئی ہے

جیسے رہتی ہو کسی خفیہ خزانے کی تلاش
شہر میں ساری ہی سڑکوں کی کُھدائی ہوئی ہے

ساتھ رہنا بہت اپنا بھی ضروری ہے مگر
سب سے پہلے یہاں اپنی ہی جدائی ہوئی ہے

جس میں رکھا گیا ہے ایک دریچہ بھی ظفر
درمیاں میں کوئی دیوار اُٹھائی ہوئی ہے

نہیں ہے وہ تو کچھ اُس کا گماں ہی رہ جائے
چلو، زمیں نہ سہی آسماں ہی رہ جائے

یہ کاروبار ہے اِس کا حساب تو کر لیں
غلط نہیں ہے جو آخر زیاں ہی رہ جائے

حدیں ہماری اگر طے نہ ہو سکیں یک سر
یہ بحرِ خواب اگر بے کراں ہی رہ جائے

یہاں جو شاخِ ہوا پر بنائے بیٹھے ہیں
تو کیا ضرور ہے یہ آشیاں ہی رہ جائے

ہمارے گھر میں بھی رہتی ہے ٹوٹ بہت
وہ لامکاں ہے تو اب لامکاں ہی رہ جائے

ہمیشہ لٹتے رہیں خامشی سے ہم سرِ راہ
یہ ایک صورتِ امن و اماں ہی رہ جائے

ہمارا نام تو رہنا ہے خیر کیا باقی
کہیں کہیں کوئی شاید نشاں ہی رہ جائے

ہمارے بعد ہوا کا خراج ہو کوئی اور
بجھے چراغ تو اُس کا دھواں ہی رہ جائے

بدل سکے گا کچھ آب و ہوا ہی اپنی ظفرؔ
وہ چار دن اگر آ کر یہاں ہی رہ جائے

سفر کے نام پہ عزمِ سفر ہی رہ جائے
جو ساز و رخت پڑا اپنے گھر ہی رہ جائے

پڑے گی شام بھی لوٹ آئیں گے پرندے بھی
ہوا نہیں تو کہیں یہ شجر ہی رہ جائے

چلا گیا ہے مگر کچھ نہ کچھ تو ہے باقی
یہی بہت ہے اگر اس قدر ہی رہ جائے

ہمارا اور تو کچھ بھی بچا نہیں پُورا
ہمارا خواب یہاں سر بہ سر ہی رہ جائے

ہمارے ہونٹ تری پیاس میں رہیں شاداب
ہماری آنکھ تری رہ گزر ہی رہ جائے

تلاش کرنی ہے اُس کی نئے سرے سے ہمیں
اگرچہ عمر بہت مختصر ہی رہ جائے

وہاں قیام ہمارا اب اور کیا ہو گا
جہاں یہ خواب نہ ہو اور خبر ہی رہ جائے

بیاں میں زور بھی ہو ختم اور یہ ممکن ہے
کہ اپنی بات یہاں بے اثر ہی رہ جائے

خدا تو چھوڑ گیا ہے ظفرؔ، یہ خطۂ خاک
دعا کرو کہ یہاں پر بشر ہی رہ جائے

سو، یہ نہ ہو کہ فلک سے جدا ہی رہ جائے
ہمارا خواب یہاں پر پڑا ہی رہ جائے

یہی بہت ہے کہ آخر ہمارے کھانے کو
تمھارے شہر میں خالی ہوا ہی رہ جائے

مرا قصور نہیں ہے کہ ایک بار کوئی
جو دیکھ لے تو تجھے دیکھتا ہی رہ جائے

عجیب صورتِ حالات ہو اگر کسی دن
زمیں پہ خلق نہ ہو، اور خدا ہی رہ جائے

یہ زور ہے تو کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے کبھی
یہ زخم ہے تو کوئی دن ہرا ہی رہ جائے

ہمیں بھی اب کوئی پروا نہیں ہے، بے شک وہ
لگا ہُوا ہے جہاں پر لگا ہی رہ جائے

یہاں قرینۂ اظہار کے بدلنے کو
جو میں نہیں تو کوئی دوسرا ہی رہ جائے

اگرچہ میں نہ رہوں گا، مگر یہ ممکن ہے
کسی گلی میں یہ میری صدا ہی رہ جائے

کوئی نشاں تو رہے سامنے ہمارے ظفر
کہ منزلیں نہ سہی راستہ ہی رہ جائے

روا ملے ہُوئے ہیں، ناروا ملے ہُوئے ہو
مگر تم آپ ہی کہہ دو یہ کیا ملے ہُوئے ہو

الگ ملے ہُوئے ہو اصل میں تو دوسروں سے
بچے کھچے ہُوئے ہم سے جدا ملے ہُوئے ہو

ہمارے ساتھ جو کُھل ہی نہیں رہے ہو ابھی
ملے تو صورتِ بند قبا ملے ہُوئے ہو

برائے خلق بھی ملنا تو چاہیے کسی دن
کہ آج تو یونہی بہرِ خدا ملے ہُوئے ہو

پھر اُس کے بعد کبھی نیند ہی نہیں آئی
ہمیں جو ایک دفعہ خواب سا ملے ہُوئے ہو

یہ کوئی اور الگ بات ہے محبت سے
جو اتنی دُور سے بھی ہم سے آ ملے ہُوئے ہو

پھر اُس کے بعد اُسے اچھا نہیں لگا کچھ بھی
جو ایک بار کسی سے ذرا ملے ہُوئے ہو

یہ شہر جو ہمیں اب کاٹنے کو دوڑتا ہے
اسی میں ہم سے کبھی جابہ جا ملے ہُوئے ہو

ہمیں تو بیچ میں چھوڑا ہُوا ہے، جانِ ظفرؔ
وہ کوئی اور ہیں اب جن سے جا ملے ہُوئے ہو

فلک سے دُور تھا، خالی زمیں مِلی ہُوئی تھی
سو وہ بھی ساری کی ساری نہیں مِلی ہُوئی تھی

نہ جانے کس لیے ہتھیار ہم نے ڈال دیے
جہاں کہیں ہمیں فتحِ مبیں مِلی ہُوئی تھی

خوشی کے ساتھ مرا رابطہ رہا اکثر
کہیں پہ بچھڑی ہُوئی تھی، کہیں مِلی ہُوئی تھی

وہ چیز اپنے نصیبوں ہی میں نہ تھی ورنہ
یہیں پہ کھو گئی ہے جو یہیں مِلی ہُوئی تھی

ثوابِ سجدہ سے محروم تھے ہمیں ورنہ
ہمیں بھی دوسروں جیسی جبیں مِلی ہُوئی تھی

اس آرزو میں ملاوٹ نہیں ہُوئی ہے کہ یہ
اک اور شے سے کہیں تہ نشیں مِلی ہُوئی تھی

کچھ اور طرح کا بھی اشتراک تھا اُن میں
نہ کوئی طبعِ مکان و مکیں مِلی ہُوئی تھی

معاملات ہیں اپنے ہی کچھ محبت کے
جہاں الگ اُسے سمجھے وہیں مِلی ہُوئی تھی

جو عقل ہم سے رہی اتنے فاصلے پہ ظفرؔ
سمجھ رہے تھے کہ اپنے تئیں مِلی ہُوئی تھی

دل تمھارے چمنستاں میں کہیں کھو گیا ہے
اب مِلو یا نہ مِلو کام تو سب ہو گیا ہے

نقش کر کے مری آنکھوں میں زبانی پیغام
دل پہ لکھی ہُوئی تحریر کوئی دھو گیا ہے

منزلِ خواب کا درماندہ مسافر یہ لہو
اک ذرا دیر کو جاگا ہے تو پھر سو گیا ہے

آبیاری نہیں کرنی تھی جو اُس نے آ کر
کس لیے بیج محبت کا یہاں بو گیا ہے

خوب مہمان تھا وہ صاحبِ خانہ اک دن
ساتھ چلنے کو جو تیار ہُوا تو گیا ہے

ہاتھ خالی ہی کوئی لے کے پلٹتا آخر
کوئی بھی خواب خزانے کی طرف جو گیا ہے

ایک ہی طرح کا غم اور خوشی ہے کہ یہاں
بیٹھے بیٹھے ہی کوئی ہنس دیا ہے، رو دیا ہے

رونقِ شہر میں وہ بات ہی باقی نہیں اب
میں گیا ہوں نہ مرے ساتھ کہیں وہ گیا ہے

منتقل دیکھیے خود ہوتا ہے کس دن کہ ظفرؔ
اپنا سامان تو سارا ہی وہاں ڈھو گیا ہے

پلٹا نہیں شام کا کبوتر
تھا جیسے وہ نام کا کبوتر

اب اُڑ جو گیا تو اُڑ گیا بس
وہ آپ کے بام کا کبوتر

دانہ کچھ ڈال کر پھنساتے
تھا آپ کے کام کا کبوتر

کچھ دیر تو خوب پھڑپھڑاتا
اِس خواہشِ خام کا کبوتر

کیا اپنے پڑاؤ کے کنارے
کیا اُس کے پیام کا کبوتر

ٹکتا نہیں فرشِ خواب پر بھی
وہ اُس کے خرام کا کبوتر

اِس رزقِ حلال میں کسی دن
پھڑکے جو حرام کا کبوتر

اِس عہدِ خواص میں بھی اب تو
اُڑتا ہے عوام کا کبوتر

پرواز کرے ظفرؔ کہاں تک
اس طرزِ کلام کا کبوتر

ممکن نہ تھی جو اُس سے، محبت بھی کر دِکھائی
پھر اُس کے ہی خلاف بغاوت بھی کر دِکھائی

اپنے ہی خوں کی خاک اُڑائی جہاں تہاں
صحرا سے دُور رہ کے یہ وحشت بھی کر دِکھائی

جو واقعہ تھا اُس کو فسانہ سا کہہ دیا
جو داستاں تھی ہم نے حقیقت بھی کر دِکھائی

پوچھا ہمارا حال بھی موسم کے ساتھ ساتھ
اُس نے ہمارے ساتھ مروّت بھی کر دِکھائی

آیا بھی وہ تو ویسا ہی جانے دیا اُسے
یوں اُس کے ساتھ ہم نے شرافت بھی کر دِکھائی

اُس کے بغیر جی نہیں سکتے تھے ایک پَل
ہم نے مآلِ کار یہ ہمّت بھی کر دِکھائی

ہم جو بزعمِ خویش تھے ہشیار بھی بہت
سارے معاملات میں غفلت بھی کر دِکھائی

موقع مِلا تو عرضِ ہوس اُس کے رُو بہ رُو
تھوڑی بھی اور حسبِ ضرورت بھی کر دِکھائی

مرنے کی شکل بھی نظر آتی رہے ظفرؔ
جینے کی اب یہ آخری صورت بھی کر دِکھائی

کج ادائی نہ کر، خدا سے ڈر
یوں خدائی نہ کر، خدا سے ڈر

کھولنے دے مجھے یہ بندِ قبا
بے حیائی نہ کر، خدا سے ڈر

اتنے گہرے طویل ساتھ کے بعد
اب جدائی نہ کر، خدا سے ڈر

میں نے جو بات کہہ رکھی ہے اُسے
گئی آئی نہ کر، خدا سے ڈر

چیز واپس جو دی ہے، اب اُس کو
پھر پرائی نہ کر، خدا سے ڈر

آ کے لگ بھی گلے سے اور فقط
منہ دِکھائی نہ کر، خدا سے ڈر

اتنا اچھا نہیں بنا مجھ کو
یہ بُرائی نہ کر، خدا سے ڈر

خار و خس دل کے ساتھ رہنے دے
یوں صفائی نہ کر، خدا سے ڈر

نہیں کرنے کا تیرے کام ظفرؔ
دیکھ، بھائی، نہ کر، خدا سے ڈر

صرف تھوڑا سا بھورا بھورا ہوں
یہ نہیں ہے کہ چھان بورا ہوں

بینڈ باجہ ہوں میں ترنم کا
اور تغزل کا تان پورہ ہوں

کبھی عبدالشکور ہوتا تھا
آج کل تو فقط شکورا ہوں

مِل کے وہ بھی ہوا ہے چیں بہ جبیں
دیکھ کر میں بھی منہ بسورا ہوں

فن خوشامد کا سیکھیے مجھ سے
سامنے سب کے جی حضورا ہوں

چائے کا بھی ہے ذائقہ مجھ میں
لاکھ لسی بھرا کٹورا ہوں

اُس نے بھی تاڑ کر مجھے دیکھا
صرف میں ہی نہیں جو گھورا ہوں

ہوں کراچی پہنچ کے دسترخوانی
اور پنجاب میں کندورا ہوں

وہ بھی ہیں جلدباز کچھ تو ظفر
یا فقط میں ہی ناصبورا ہوں

دل سے تا دیر جو پیوستہ رہے، بھول گئے
وہ ہمیں بھول گیا، ہم بھی اُسے بھول گئے

یہ یقیں خود کو بھی مشکل ہی سے آیا ہو گا
کہ جو ہم اتنی سہولت سے تجھے بھول گئے

بھول جانے کا سبب یاد نہیں ہے ہم کو
یہی لگتا ہے کہ بس بھول گئے، بھول گئے

بات اس طرح بھی اب ختم نہ ہو سکتی تھی
کچھ نہ کچھ یاد رہا وہ بھی جسے بھول گئے

نیکیاں تُو نے ہماری بھی کہاں یاد رکھیں
اور ہم بھی کبھی احسان ترے بھول گئے

دوسروں کا تو یہاں ذکر ہی کیا ہے، ہم تو
وہ بھی وعدے جو کبھی خود سے کیے بھول گئے

ہم کچھ اتنے بھی نہ تھے تیری رضا کے پابند
جانے کیوں پھر بھی تجھے تیرے لیے بھول گئے

اب جو پوچھو تو بتا ہی نہیں سکتا ہوں کہیں
کہ کسے یاد رکھا اور کسے بھول گئے

اے ظفر ضعفِ دماغ اور بھلا کیا ہو گا
کہ یہاں ہم کبھی تھے بھی کہ نہ تھے بھول گئے

ہواؤں میں جو ہمیں کوئی گھر مِلا ہُوا تھا
تو ساتھ ہی کوئی حکمِ سفر مِلا ہُوا تھا

نہ جانے کیوں مجھے اچھا نہ لگ رہا تھا بہت
شجر کے ساتھ جہاں بھی شجر مِلا ہُوا تھا

وہ ایک بار بھی ہم سے مِلا نہ تھا جس کو
سمجھ رہے تھے کہ بارِ دگر مِلا ہُوا تھا

کچھ اس کی اپنی ہی نیّت میں فرق تھا کوئی
اُدھر بھی دُور تھا ہم سے جدھر مِلا ہُوا تھا

رَوا رکھے ہُوئے تھا کیوں وہ اجنبیّت سی
ہمارے ساتھ دل اُس کا اگر مِلا ہُوا تھا

وہ اپنے آپ ہی قائل سا ہو گیا ورنہ
بیان تو ہمیں کچھ بے اثر مِلا ہُوا تھا

بروئے کار اُسی کو نہ لا سکے تھے کبھی
جو اختیار ہمیں سر بہ سر مِلا ہُوا تھا

اُسی پہ ناز نہ کرتے تو اور کیا کرتے
ہمیں جو عیب کی صورت ہنر مِلا ہُوا تھا

جدائی مار گئی تھی ہمیں اُسی کی ظفؔر
جو ایک بار سرِ رہ گزر مِلا ہُوا تھا

یہاں مِلا ہُوا ہے یا وہاں مِلا ہُوا ہے
زمیں کے ساتھ کہیں آسماں مِلا ہُوا ہے

کسی کو ہو کوئی صیاد سے شکایت کیا
کہ اُس کے ساتھ اگر باغباں مِلا ہُوا ہے

بچاؤ کی نکل آئی ہے یہ تبھی صورت
ہمارے ساتھ جو اُس کا بیاں مِلا ہُوا ہے

کچھ اتنا یاد نہیں آ رہا کہ وہ ہم سے
مِلا ہُوا تو ہے لیکن کہاں مِلا ہُوا ہے

وہ اختلاف بھی کرتا رہے تو کیا کہ یہاں
یہی بہت ہے کوئی ہم زباں مِلا ہُوا ہے

ہمیں خبر نہیں لیکن تمھارے ساتھ کہیں
ہمارا سلسلۂ داستاں مِلا ہُوا ہے

اُسی کے ساتھ ملاقات ہو نہیں سکتی
مکاں کے ساتھ ہی جس کے مکاں مِلا ہُوا ہے

ہر ایک چیز خریدی ہے مہنگے بھاؤ یہاں
یہ خواب ہے جو ہمیں رائگاں مِلا ہُوا ہے

وہ جس کو ڈھونڈ رہے ہیں کہیں نہیں ہے ظفرؔ
ابھی تو اُس کا یہی اک نشاں مِلا ہُوا ہے

خبر کسی کو نہیں کس کے لیے مِلے ہُوئے تھے
کہ سلسلوں میں کئی سلسلے مِلے ہُوئے تھے

ہُوا تھا رنگ نیا ہی کوئی ظہور پذیر
سفید و سرخ تھے جن میں ہَرے مِلے ہُوئے تھے

سفر میں کوئی ملاقات کا ہی امکاں تھا
نہ راستوں سے کہیں راستے مِلے ہُوئے تھے

کسی مکیں کا بھی ہمسائیگی نہ تھا سروکار
مکاں تو سارے وگرنہ بڑے مِلے ہُوئے تھے

رہا نہیں تھا کوئی امتیاز ہی باقی
بھلے تو تھے مگر اُن سے بُرے مِلے ہُوئے تھے

وہیں سے دل شکنی بھی ہماری ہوتی رہی
جہاں سے ہم کو بہت حوصلے مِلے ہُوئے تھے

شجر میں شور تھا، اور شام تھی اُڑتی ہُوئی
کہ پتے اور پرندے سبھی مِلے ہُوئے تھے

وہ کیا زمانہ تھا جب کچھ خبر نہ تھی ہم کو
کہ کس سے بچھڑے ہُوئے تھے کسے مِلے ہُوئے تھے

ہمارے پاؤں ہی ٹکتے نہ تھے زمیں پہ ظفرؔ
نئے نئے جو کسی سے گلے مِلے ہُوئے تھے

وہ کھیل کس لیے ہر سمت میرے جاری تھا
کہ جس کو ٹھیک سمجھنے سے میں بھی عاری تھا

سُبک اگرچہ رہی تیرے فیصلے کی گھڑی
وہ ایک پل مرے دل پر زیادہ بھاری تھا

اُسے کچھ اتنی بھی پروا نہ تھی محبت کی
کہ اُس کے پاس یہ مضمون اختیاری تھا

تو یوں ہُوا کہ فقط ریت رہ گئی اُس میں
وہ بحر جس کو بہت زعمِ بے کناری تھا

اُڑی ہُوئی تھی جو افواہ اُس کے آنے کی
سو دشت و در پہ کوئی انتظار طاری تھا

دراز کرتا نہیں آپ تو میں دستِ سوال
کہ اصل میں تو یہ دل ہی کوئی بھکاری تھا

اگرچہ نفع و ضرر سب کا مسئلہ ہے یہاں
مگر وہ شوخ زیادہ ہی کاروباری تھا

رواں دواں تھے یونہی قافلے محبت کے
کوئی شکار تھا اِن میں کوئی شکاری تھا

جو لفظ لفظ تماشا دِکھا گیا ہے ظفرؔ
تو کیا غلط ہے کہ شاعر نہیں مداری تھا

ہر ایک لفظ کہ جو مرکزِ معانی تھا
مری زمیں کا وہی رنگ آسمانی تھا

کچھ اُس کے دل میں کوئی زہر ہو تو ہو شاید
وگرنہ شوخ کا لہجہ تو زعفرانی تھا

وہ جس سے نیند کا رُخ ہی بدل گیا آخر
لُٹا پِٹا سا وہی خوابِ ناگہانی تھا

کھڑا ہوں میں ترے انکار کی زمیں پہ ابھی
مرے لیے وہی اک لمحہ جاوِدانی تھا

اُسی پہ سب کو یقیں آ گیا تھا سنتے ہی
مرے بیان کا حصّہ جو داستانی تھا

اُسی میں اپنے کنارے بہت نکل آئے
وہ بحر جس کو بہت زعمِ بے کرانی تھا

کسی طرح سہی، دُنیا کی سیر تو کر لی
اگرچہ اصل سبب اِس کا بے مکانی تھا

جہاں یہ لوگ بہت بھاؤ تاؤ کرتے تھے
وہاں پہ اپنا سروکار رائگانی تھا

نہیں تھی چیز کوئی اور اپنے دریا میں
بچا کھچا سا ظفرؔ میں تھا اور پانی تھا

رات اندھیری ہے اور کوئی جگنو نہیں مِل رہا
دشت کیسا ہے یہ جس میں آہو نہیں مِل رہا

جس سے ظاہر ہو اُس کو خبر ہے مرے حال کی
بات میں کوئی بھی ایسا پہلو نہیں مِل رہا

کیا کہیں، اور بھی کتنی چیزوں سے محروم ہوں
صرف اتنا نہیں ہے کہ بس تُو نہیں مِل رہا

ایک ہاری ہُوئی اپنی ہمّت کی ہے جستجو
اور، کھویا ہُوا زورِ بازو نہیں مِل رہا

اُس ملاقات میں ایک ہونے کی خواہش نہ تھی
اِس جدائی میں رونے کو آنسو نہیں مِل رہا

کیا ہوا تھی کہ لوگوں کو پتّے سے بکھرا گئی
سب پریشان ہیں، کوئی یک سُو نہیں مِل رہا

اس قدر شیون و شور کچھ بے سبب تو نہیں
کوئی دُکھ ہے کہیں جس کا دارُو نہیں مِل رہا

ساری پابندیاں ہیں ہمارے تمھارے لیے
اور کوئی اُصول ان پہ لاگو نہیں مِل رہا

زندگی ہے سمندر کے رحم و کرم پر ظفؔر
کیسی کشتی ہے یہ جس کو چپّو نہیں مِل رہا

ڈوبتے بھی نہیں، اور کنارہ نہیں مِل رہا
آگے بڑھنے کا ہم کو اشارہ نہیں مِل رہا

یہ وہ کارِ زیاں تھا جو مِل کر کیا تھا، مگر
اِس منافع سے حصّہ ہمارا نہیں مِل رہا

جو ہمیں زندگی میں مِلا ہی نہیں تھا کبھی
اب یہ تکرار ہے وہ دوبارہ نہیں مِل رہا

زخم اپنا کسی پھول سے آج بھی دُور ہے
اک ستارے سے اپنا ستارہ نہیں مِل رہا

پہلے ہم اپنی قیدِ انا میں رہے کوئی دن
کچھ دنوں سے مزاج اب تمہارا نہیں مِل رہا

ایک پیاسا ہوں پانی کو ہر دَم ترستا ہُوا
کوئی خس ہوں کہ جس کو شرارہ نہیں مِل رہا

یوں کئی دوسروں کا بھی دعویٰ ہے اِس پر ابھی
مِل رہا ہے تو سارے کا سارا نہیں مِل رہا

ایک دیوار تھی جو گرا دی تھی خود ہی کبھی
کیا غلط ہے جو ہم کو سہارا نہیں مِل رہا

اپنے صحرا سے ہے ریت اپنی ہی غائب ظفرؔ
اپنے دریا میں اپنا ہی دھارا نہیں مِل رہا

کوئی مشکل نہیں تھا جو آساں نہیں مِل رہا
داستاں کے لیے مجھ کو عنواں نہیں مِل رہا

سر میں چھائے ہُوئے خوابِ وحشت سے شرمندہ ہوں
خاک اُڑانے کو اپنا بیاباں نہیں مِل رہا

بے حسی ہے گھٹا بَن کے چھائی ہُوئی شہر پر
کوئی حیراں، پریشاں، پشیماں نہیں مِل رہا

بھیک دینے کا اُس نے ارادہ کیا تو سہی
ڈھونڈتا ہوں مگر اپنا داماں نہیں مل رہا

دیکھتا رہا بلندی سے شام اور شہر اور دُھواں
خیمۂ خوابِ خواہش نمایاں نہیں مِل رہا

کیا وہ کافر تھا جس کو مسلمان کرنے گئے
واپس آئے تو اپنا ہی ایماں نہیں مِل رہا

گھر کی چیزوں کو زیر و زبر کر رہا ہوں بہت
اور کھویا ہُوا ایک ارماں نہیں مِل رہا

دشت ہے ایک سرحد ہی جس کا نہیں دُور تک
درد ہے کوئی تو جس کا درماں نہیں مِل رہا

جیب میں روز کی طرح پیسے ہیں تھوڑے ظفرؔ
اور بازار میں کچھ بھی ارزاں نہیں مِل رہا

پیچھے آگے تو کیا باہر اندر نہیں مِل رہا
ڈھونڈتا ہوں جسے وہ برابر نہیں مِل رہا

ایک دیوار کے بعد ایک اور دیوار ہے
راستہ کوئی بھی گھر کے باہر نہیں مِل رہا

ہے رواں ایک تپتے ہُوئے دشت کی بس ہَوا
کوئی جھونکا بھی دریا کے رُخ پر نہیں مِل رہا

اس سے بہتر تو یہ تھا کہ مِلتا نہ ہرگز کوئی
جو کسی طرح سے بھی مکرر نہیں مِل رہا

دست و بازو کبھی، زلف و رخسار ہیں دستیاب
کوئی ٹکڑوں میں ہے اور سراسر نہیں مِل رہا

جو نہیں چاہئیں ہر طرف، ہر گھڑی ہیں وہی
جس کا مِلنا ضروری ہے اکثر نہیں مِل رہا

جھومنا چاہتا ہوں جو موسم کی ہے جستجو
گھومنا چاہتا ہوں تو محور نہیں مِل رہا

اب یہ آنکھیں ہیں اور تیرگی ہے سفر در سفر
ڈھونڈتا ہوں مگر کوئی منظر نہیں مِل رہا

میں پریشاں پھرتا ہوں کوچہ بہ کوچہ ظفؔر
دیر سے شہر میں اپنا ہی گھر نہیں مِل رہا

کیا مِلا تھا کہیں اور اب کیا نہیں مِل رہا
تجھ سے اچھا تو کیا، تیرے جیسا نہیں مِل رہا

اتنے لوگوں میں مِلنا بھی کچھ کم نہیں ہے، مگر
چاہتا بھی ہے لیکن علیحدہ نہیں مِل رہا

اک تمنا کی تَل چھٹ پڑی رہ گئی ہے مگر
جو مِلا تھا کبھی اب دوبارہ نہیں مِل رہا

کوئی صورت نکالوں تو کیا اپنی اصلاح کی
وہ بُرا ہوں جسے کوئی اچھا نہیں مِل رہا

دُھند اور دُھول ہے سارے رستوں پہ پھیلی ہُوئی
کیا تماشا ہے، رنگِ تماشا نہیں مِل رہا

وہ کنارہ تھا اور پاؤں کے نیچے مٹی نہ تھی
ڈوبتا جا رہا ہوں تو دریا نہیں مِل رہا

راستے کاٹ بیٹھا ہوں سب رفتہ رفتہ مگر
امتحانِ سفر کا نتیجہ نہیں مِل رہا

آئے تھے ہم کہاں سے یہاں اور کدھر جائیں گے
آج تک اپنا ہی آگا پیچھا نہیں مِل رہا

کھو چکا ہوں کہیں اپنے دشتِ سخن میں ظفؔر
مجھ کو باہر نکلنے کا رستہ نہیں مِل رہا

الگ الگ اور جدا جدا سے بچے ہُوئے ہیں
جو سر پہ آئی ہُوئی بَلا سے بچے ہُوئے ہیں

ہمارے ہونے کی اور کیا ہو دلیل کافی
کہ خلق سے اور کبھی خدا سے بچے ہوئے ہیں

بچے ہُوئے ہیں تو کوئی احساں نہیں کسی کا
کہ ہم تو اپنے ہی بچ بچا سے بچے ہوئے ہیں

وگرنہ ہم دُور سے کہیں دستیاب ہوتے
کہ خشک پتے ہیں اور ہَوا سے بچے ہُوئے ہیں

کہیں ترے لطفِ ناگہاں کی دُہائی دی ہے
کہیں ترے ظلمِ نارَوا سے بچے ہُوئے ہیں

ہماری صحت کا راز ہے آج کل اِسی میں
کبھی دوا سے، کبھی دعا سے بچے ہوئے ہیں

ہم اپنے اندر دُبک کے بیٹھے ہوئے ہیں جب سے
اَلا بَلا سے، ہَما شُما سے بچے ہُوئے ہیں

ہمیں کسی رات گھیر لینا ہے اُس نے آخر
ابھی جو اک خوابِ خوش نما سے بچے ہُوئے ہیں

پھٹے ہُوئے ہیں یہاں پہ کانوں کے جب سے پردے
ظفرؔ کبھی آپ کی صدا سے بچے ہُوئے ہیں

کہیں خدا سے، کہیں بشر سے ڈرے ہوئے ہیں
بتائیں کیا ہم کدھر کدھر سے ڈرے ہوئے ہیں

یہاں پہ جی بھر کے ہم کو لوٹا گیا ہمیشہ
جو رہ گزر سے زیادہ گھر سے ڈرے ہوئے ہیں

کبھی سراسیمہ تھے ستم گاریوں سے تیری
یہ لوگ اب تیری درگزر سے ڈرے ہوئے ہیں

نہیں سروکار تیرے عیبوں سے کچھ زیادہ
کہ ڈرنے والے ترے ہنر سے ڈرے ہوئے ہیں

نکل بھی آئے ہیں اور کنارے لگے ہیں آ کر
مگر ابھی تک اُسی بھنور سے ڈرے ہوئے ہیں

جہاں بھی لے جائے اب یہ اپنی خطر پسندی
اُسی طرف جائیں گے جدھر سے ڈرے ہوئے ہیں

ہمارا اِس بار جی نہیں لگ رہا ہے ورنہ
ٹھہر گئے ہیں نہ ہم سفر سے ڈرے ہوئے ہیں

یہ خوف معمول کے مطابق نہیں ہمارا
کہ ہم کسی دوسرے ہی ڈر سے ڈرے ہوئے ہیں

ظفؔر کبھی بھول کر جو تم سے بھلائی کی تھی
سو آج بھی ہم تمھارے شر سے ڈرے ہوئے ہیں

آغاز تھا جیسا بھی، انجام تماشا کر
باتیں ہی سنی تُو نے، اب کام تماشا کر

اِن روشنیوں میں ہیں رعنائیاں بھی کیا کیا
وہ صبح سہی روشن، یہ شام تماشا کر

اِس راستہ کے پردے میں پوشیدہ ہے دن کوئی
تکلیف کے اندر سے آرام تماشا کر

دراصل تو دونوں میں کچھ فرق نہیں ایسا
وہ خاص بھی دیکھا ہے، اب عام تماشا کر

کر کوئی خریداری، کچھ بیچ سلف سودا
بازار میں داخل ہو، اور بام تماشا کر

ہم کچھ نہیں کہتے جو خدمات ہماری ہیں
جو تُو نے دیا ہے وہ انعام تماشا کر

شاید کہ نکل آئے تو خود ہی سبب اُس کا
مچتا ہُوا محفل میں کُہرام تماشا کر

پہل تو کبھی ایسی تُہمت نہیں آئی، تُو
معصوم سہی، لیکن الزام تماشا کر

ظاہر کی مروّت پر خوش ہو نہ ظفرؔ اتنا
پوشیدہ ہے جو اِس میں پیغام تماشا کر

اوپر بھی تماشا ہُوا نیچے بھی تماشا ہو
اور اصل تماشے سے پہلے بھی تماشا ہو

اِس خوابِ سفر میں ہے کافی یہ تماشا بھی
میں چاہتا ہوں لیکن، آگے بھی تماشا ہو

توفیق ہو ارزانی بینائی ہے آگے بھی
یہ ہاتھ ہوں آنکھوں پر، ایسے بھی تماشا ہو

مُڑ کر بھی وہی دیکھوں جو سامنے ہو منظر
جیسا ہو مرے آگے، پیچھے بھی تماشا ہو

تھوڑی سی جگہ ہم کو درکار تو ہے لیکن
کرنا ہے بہر صورت جیسے بھی تماشا ہو

دیکھی نہ جھلک ہم نے اُس طرفہ عجائب کی
رکھتے ہو چھپا کر بھی کہتے بھی تماشا ہو

آوارہ خرامی کو نکلیں تو سرِ راہے
جاتے بھی تماشا ہو، آتے بھی تماشا ہو

غم اور خوشی ہم کو درکار ہے کچھ ایسی
روتے بھی تماشا ہو، گاتے بھی تماشا ہو

دُنیا سے کریں گے ہم جب کوچ ظفرؔ اپنا
آ سے بھی تماشا ہو، یا سے بھی تماشا ہو

تھا اصل میں کم کم ہی اکثر جو تماشا تھا
اندر جو تماشا ہے، باہر جو تماشا تھا

تھا فرق اندھیرے میں اتنا نہ اُجالے میں
دن میں تھا نظر آیا شب بھر جو تماشا تھا

بجلی سی چمکتی تھی، اولے سے برستے تھے
بادل ہی لگا سب کو سر پر جو تماشا تھا

جلسے میں وہی اپنے آیا ہے بصد مشکل
بھرپور تماشے سے کم تر جو تماشا تھا

جب آنکھ اُٹھائی تو بچ ہی نہیں سکتے تھے
سینے میں لگا سیدھا خنجر جو تماشا تھا

لوگوں کو نظر آتا کس طرح کہ وہ اب کے
دیکھا کیے باہر سے اندر جو تماشا تھا

مطلب ہی نہ تھا کوئی اک دوسرے سے گویا
دیکھا نہ سنا پہلے گھر گھر جو تماشا تھا

اُس پر مرے لوگوں کی کس طرح نظر پڑتی
وہ اصل تماشے سے ہٹ کر جو تماشا تھا

باتیں تو ظفرؔ سب ہی بڑھ چڑھ کے بناتے ہیں
دیکھا نہ کسی نے بھی منظر جو تماشا تھا

تھے خود ہی تماشائی ایسا ہی تماشا تھا
دِکھلا دیا جو ہم نے اتنا ہی تماشا تھا

کچھ اور بھی تھا شاید ہٹ کر وہ تماشے سے
جو دُور سے تو سب کو لگتا ہی تماشا تھا

کیا جانیے کیا سوجھی اور بیچ میں چھوڑ آئے
حالاں کہ ابھی تک تو آدھا ہی تماشا تھا

ہنگامہ تو ایک اُٹھا، رونق تو لگی کوئی
وہ آپ کا محفل میں آنا ہی تماشا تھا

اِس شہر سے کوئی بھی شامل نہ ہُوا، ورنہ
تقریب تھی پہلی ہی، پہلا ہی تماشا تھا

دیوانہ تھا، لڑکے تھے پتھر لیے ہاتھوں میں
کچھ آپ بھی دیکھ آتے، اچھا ہی تماشا تھا

ہم دیکھ کے ہنستے بھی، روتے بھی رہے اکثر
بیٹھے تھے لگا کر جو اپنا ہی تماشا تھا

جیسا بھی کہو اُس کو حق بات ہے اتنی سی
جس طرح کا مجمع ہے ویسا ہی تماشا تھا

اُس دن ظفرؔ اُمڈے تھے خوش رنگ سے جو بادل
اُس روز فلک پر سے برسا ہی تماشا تھا

کہیں فسانوں کہ داستانوں میں رہ گئے ہیں
ہم اپنے گزرے ہوئے زمانوں میں رہ گئے ہیں

عجب نہیں ہے کہ خود ہوا کے سپرد کر دیں
یہ چند تنکے جو آشیانوں میں رہ گئے ہیں

مکین سب کوچ کر گئے ہیں کسی طرف کو
اب اُن کے آثار ہی مکانوں میں رہ گئے ہیں

سنا کرو صبح و شام کڑوی کسیلی باتیں
کہ اب یہی ذائقے زبانوں میں رہ گئے ہیں

پسند آئی ہے اِس قدر خاطر و تواضع
جو میہماں سارے میزبانوں میں رہ گئے ہیں

ہمیں ہی شو کیس میں سجا کر رکھا گیا تھا
پڑے ہمی شہر کی دکانوں میں رہ گئے ہیں

ابھی یہی انقلاب آیا ہے رفتہ رفتہ
جو رونے والے تھے ناچ گانوں میں رہ گئے ہیں

الگ الگ اپنا اپنا پرچم اُٹھا رکھا ہے
کہ ہم قبیلوں نہ خاندانوں میں رہ گئے ہیں

ظفرؔ زمیں زاد تھے، زمیں سے ہی کام رکھا
جو آسمانی تھے آسمانوں میں رہ گئے ہیں

ٹھہر گئے ہیں تو ہم سہاروں میں رہ گئے ہیں
اگر چلے ہیں تو رہ گزاروں میں رہ گئے ہیں

چھلک سکیں باہر اتنی کوشش تو کی ہے، لیکن
اُچھل اُچھل کر بھی ہم کناروں میں رہ گئے ہیں

سوادِ ساحل پہ منتظر تھا کوئی مگر ہم
پھر اپنے پانی کے تیز دھاروں میں رہ گئے ہیں

ہمارے کس کام یہ نئی زندگی کی مہلت
سوائے اِس کے کہ اپنے پیاروں میں رہ گئے ہیں

بھگت گئے سب ہماری باری ہی آ نہ پائی
یہاں کھڑے ہم یونہی قطاروں میں رہ گئے ہیں

یہ لگ رہا ہے ہمارے حصّے کے سارے دریا
وہیں کہیں اپنے کوہساروں میں رہ گئے ہیں

یہ ایک امانت ہے جس کو لوٹانا چاہتا ہوں
ترے ستارے مرے ستاروں میں رہ گئے ہیں

مزہ تو یہ ہے سنور گئی عاقبت انھی کی
جو چار دن ہم گناہ گاروں میں رہ گئے ہیں

ظفرؔ، رہا ہو کے آئیں گے دیکھنا کسی دن
ہوا کے جھونکے جو شاخ ساروں میں رہ گئے ہیں

ہُجے ہُجے، اور راستوں پر پڑے ہُوئے ہیں
کہ ہم ستارے ترے فلک سے جھڑے ہُوئے ہیں

ہوائیں بھی اپنے راستوں پر رواں ہیں یونہی
درخت بھی ایک خامشی میں کھڑے ہُوئے ہیں

یہ کیفیت ہے کہ اب سنبھالے نہیں سنبھلتے
میں خوش نہیں ہوں جو میرے دریا چڑھے ہُوئے ہیں

کوئی زمانہ تھا ہم یہاں خواب تھے کسی کا
اور اب کسی اور ہی کے ماتھے مڑھے ہُوئے ہیں

کہاں تک اس راستے پہ جانا ہے، سب خبر ہے
کہ یہ سبق تھوڑا تھوڑا ہم بھی پڑھے ہُوئے ہیں

کوئی نہیں ہے جو پیش رفت اپنی روک سکتا
غلط نہیں ہے کہ اپنی حد سے بڑھے ہُوئے ہیں

ہماری نسبت ہے خاک سے اور ثبوت یہ ہے
کہ ہم تو زندہ ہی اِس زمیں میں گڑے ہُوئے ہیں

کسی کے پلّے ہی کیا پڑے شاعری ہماری
کہ لفظ کچھ بے حساب ہم نے جڑے ہُوئے ہیں

مزاج ہی مل نہیں رہا ہے ظفرؔ کچھ اپنا
کہ آپ تو جیسے ہر کسی سے لڑے ہُوئے ہیں

ہیں نقشِ دیوار، جا بہ جا سے مٹے ہُوئے ہیں
سو، کچھ تو بارش نے، کچھ ہوا سے مٹے ہُوئے ہیں

گھر اور باہر ہماری حالت ہے ایک جیسی
یہاں الگ سے، وہاں جُدا سے مٹے ہُوئے ہیں

زیادہ بدلے نہیں ہیں کچھ خال و خد ہمارے
ہنوز باقی تو ہیں، ذرا سے مٹے ہُوئے ہیں

بُجھے ہُوئے ہیں کئی ستارے سے آسماں پر
جو رہ گزر پر بھی نقشِ پا سے مٹے ہُوئے ہیں

حدیں ہیں اور تیرے دَم قدم سے ہیں غیر واضح
حروف ہیں اور مری صدا سے مٹے ہُوئے ہیں

ہمارا مِٹنا بھی اک تماشا تھا آ کے دیکھو
مٹے ہُوئے ہیں تو کس ادا سے مٹے ہُوئے ہیں

قصور اِس میں کہیں کسی اور کا نہیں ہے
کہ ہر کہیں اپنی ہی خطا سے مٹے ہُوئے ہیں

وہ اصل صورت میں اپنی خود بھی نہ آئیں گے اب
جو تیری مرضی، تری رضا سے مٹے ہُوئے ہیں

ظفرؔ وہ تحریر ہیں جسے پڑھ سکے نہ کوئی
کٹے پھٹے اور جگہ جگہ سے مٹے ہُوئے ہیں

گزر گئیں مدّتیں، برابر کھڑے ہُوئے ہیں
ہمیں نہ چھیڑو، ہم اپنے اندر کھڑے ہُوئے ہیں

کسی کے آنے کے منتظر بھی نہیں اگر ہم
تو کس لیے ایک رہ گزر پر کھڑے ہُوئے ہیں

یونہی ذرا بند ہے ابھی داخلہ ہمارا
اِسی لیے آج گھر سے باہر کھڑے ہُوئے ہیں

بِٹھا دیا تھا ہمیں جِھڑکنے کے بعد اُس نے
کسی توقع پہ اب مکرر کھڑے ہُوئے ہیں

اِسی طرح سے ہے اِن ہواؤں میں اپنا ہونا
کہیں پہ بہتر، کہیں پہ کم تر کھڑے ہُوئے ہیں

اب اپنا سود و زیاں سمجھتے ہیں، اِس لیے ہم
کسی کے پاس، اور کسی سے ہٹ کر کھڑے ہُوئے ہیں

کسی اشارے پہ ہیں یہی موم ہونے والے
جو لگ رہا ہے کہ جیسے پتھر کھڑے ہُوئے ہیں

دیے ہیں اور روشنی نہیں دے رہے کہیں پر
درخت ہیں اور کب سے بنجر کھڑے ہُوئے ہیں

یہ آپ کی بزم ہی کا آداب ہے کہ ہم نے
ظفرؔ کو دیکھا ہے جب بھی اکثر کھڑے ہُوئے ہیں

کہیں پہ موجود اور کہیں سے ہٹے ہُوئے ہیں
زمین پر ہیں مگر زمیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

کہیں گئے ہیں نہ جانے والے ہیں سانپ اپنے
یہیں پہ ہیں لیکن آستیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

کمی کوئی آ رہی ہے رُسوائیوں میں شاید
کہ داغ اب کے مری جبیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

یہ فاصلے گھٹتے بڑھتے بھی ہیں، سو آج کل وہ
قریب تو ہیں، ذرا قریں سے ہٹے ہُوئے ہیں

مکیں بھی رہتے ہیں اِن مکانوں میں اجنبی سے
مکاں بھی جیسے کہیں مکیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

جُڑے ہُوئے ہیں وہ دوسروں کے تو ساتھ اب بھی
ہٹے ہُوئے ہیں تو بس ہمیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

ہماری آنکھیں ہی خالی ہیں مدّتوں سے
مگر وہ منظر کہیں یہیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

ستم تو یہ ہے کہ ہاں بھی کرتے نہیں ہیں کُھل کر
اگرچہ وہ آج کل نہیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

خراب اُفتادِ طبع نے بھی کیا ظفرؔ کو
جہاں پہ اچھے لگے وہیں سے ہٹے ہُوئے ہیں

کہیں ہم اپنی ہی بے کرانی میں رہ گئے ہیں
کہ باہر آئے نہیں ہیں، پانی میں رہ گئے ہیں

بُرا بھلا واقعہ ہی کچھ باہر آ سکا ہے
ہمارے کردار سب کہانی میں رہ گئے ہیں

پہنچ گیا ہے یہاں کہیں کا کہیں زمانہ
مگر، ہمیں تیری باغ بانی میں رہ گئے ہیں

کبھی کناروں میں راستہ رُک گیا ہمارا
کبھی کسی زور کی روانی میں رہ گئے ہیں

ترا فسوں ہی ترے فسانے میں بولتا ہے
ترے نشاں ہی تری نشانی میں رہ گئے ہیں

شکایت اپنی بھی کوئی بے جا نہیں زیادہ
کوئی تو رَخنے بھی رازدانی میں رہ گئے ہیں

وہاں پہ وہ انقلاب آنا ہی تھے جو آئے
کہ مست ہم اپنی خوش گمانی میں رہ گئے ہیں

کوئی کسر رہ گئی ہے الفاظ میں کہیں پر
کئی دقیقے یہاں معانی میں رہ گئے ہیں

مطالبات اے ظفر ہمارے لکھے ہُوئے تھے
جو رہ گئے ہیں تو کچھ زبانی میں رہ گئے ہیں

کسی گماں سے، کسی یقیں سے جُڑے ہُوئے ہیں
کہیں سے اُکھڑے ہُوئے، کہیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

کچھ ایسی پیچیدہ تو نہیں ہے جُڑت ہماری
جہاں سے توڑا گیا، وہیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

ہمیں جدائی نہیں تھی اُس ذات سے گوارا
اِس لیے اپنے ہم نشیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

کوئی سلوک آسماں نے اچھا نہیں کیا تھا
سو، اپنی چھوڑی ہُوئی زمیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

یہ زہر شاید کبھی ہمارے بھی کام آئے
اسی لیے مارِ آستیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

ہمارے اندر ہیں جو بھی ہیں فاصلے ہمارے
کہ دُور سے، اور کبھی قریں سے جُڑے ہُوئے ہیں

ابھی تو ممکن نہیں کہیں جاگنا ہمارا
ابھی اُسی خوابِ اوّلیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

ہمارے اندر کی برف شاید اِسی سے پگھلے
جو ہم اُس آوازِ آتشیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

ظفرؔ انھیں بھی پناہ مِلتی نہیں کہیں پر
ہمارے دشمن جو تھے ہمیں سے جُڑے ہُوئے ہیں

عجب نہیں ہے جو رفتگاں سے جُڑے ہُوئے ہیں
زمیں پہ آ کر بھی آسماں سے جُڑے ہُوئے ہیں

بہت صفائی سے ہم کو جوڑا گیا ہے اب کے
پتا نہیں ہم کہاں کہاں سے جُڑے ہُوئے ہیں

ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ سکتے ہیں پھر وہیں سے
خیال رکھنا جہاں جہاں سے جُڑے ہُوئے ہیں

جب آئے دن بجلیاں لپکتی ہیں اپنی جانب
تو کس لیے شاخِ آشیاں سے جُڑے ہُوئے ہیں

سفر میں یوں تو کسی نے شامل نہیں کیا ہے
مگر، کسی طرح کارواں سے جُڑے ہُوئے ہیں

کبھی تھے پیوستہ ایک ہی خوابِ خوش نما سے
اور اب کسی رنجِ رائگاں سے جُڑے ہُوئے ہیں

کسی کسی گُم شُدہ ستارے کی جستجو ہے
جو آج بھی تیری کہکشاں سے جُڑے ہُوئے ہیں

اب اپنی وابستگی کا احوال کیا بتائیں
جہاں نہیں بھی تھے ہم وہاں سے جُڑے ہُوئے ہیں

ظفؔر، ہماری یہ بے بسی کوئی آ کے دیکھے
زباں کو توڑا ہے اور زباں سے جُڑے ہُوئے ہیں

عرب سے اُٹھ کر کہیں عجم سے جُڑے ہُوئے ہیں
زیادہ ہوتے ہُوئے بھی کم سے جُڑے ہُوئے ہیں

ہمارے ساتھ اُس کو آ کے جوڑا ہے مصلحت نے
کہیں نہیں جُڑ سکے تو ہم سے جُڑے ہُوئے ہیں

اُکھڑ گئے تھے کسی سبب سے تو اب دوبارہ
بڑا تردُّد کیا ہے، گم سے جُڑے ہُوئے ہیں

اب آخری بار اُس کے جلسے میں جائیں گے ہم
اُسے بھی لے کر مریں گے، بم سے جُڑے ہُوئے ہیں

ہماری راہیں بھی اب تو مشکل نہیں ہیں، لیکن
ابھی تو اپنے ہی پیچ و خم سے جُڑے ہُوئے ہیں

کہیں پہنچتے ہیں یا نہیں، اِس کا ذکر چھوڑو
قدم ہمارے کسی قدم سے جُڑے ہُوئے ہیں

کسی کا تحریر پر نہیں اختیار کوئی
کہ سارے کاغذ کسی قلم سے جُڑے ہُوئے ہیں

ہم اپنی اوقات سے جو باہر نہیں نکلتے
ہماری خوشیوں کے خواب غم سے جُڑے ہُوئے ہیں

ظفرؔ، کہ اُمیدوارِ جنّت بھی ہیں سراسر
خدا کے ہوتے ہُوئے صنم سے جُڑے ہُوئے ہیں

نظر نہیں آ رہا جدھر سے لگے ہُوئے
ڈرے ہُوئے اپنے اپنے گھر سے لگے ہُوئے ہیں

لگا تو رکھی ہے گھر میں چوروں نے سیندھ لیکن
پتا نہیں چل رہا کدھر سے لگے ہُوئے ہیں

بگاڑ دیتے ہیں شکل جب بھی ذرا سی نکلے
جسے بنانے میں عمر بھر سے لگے ہُوئے ہیں

خبر کبھی لا سکیں کہیں شاید اُس طرف کی
ہم اپنی دُھن میں جو بے خبر سے لگے ہُوئے ہیں

مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے خود میں
یہ بازوؤں کے بجائے پَر سے لگے ہُوئے ہیں

مرے علاوہ تمھیں بھی اک دن دِکھائی دیں گے
کہ جو ہواؤں میں یہ شجر سے لگے ہُوئے ہیں

ہوا گزرتی ہے اور کبوتر گُنگتے پھرتے
جہاں کبھی مجھ میں بام و در سے لگے ہُوئے ہیں

کبھی جو دیکھو تو آ کے پھیلاؤ بھی ہمارا
کہ ہم بہ ظاہر تو مختصر سے لگے ہُوئے ہیں

ظفرؔ سمجھتے ہیں نفع نقصان خوب اپنا
جو فائدے میں کسی ضرر سے لگے ہُوئے ہیں

مقام ہی اور تھا جہاں سے مِلے ہُوئے تھے
کہ ہم زمیں سے نہ آسماں سے مِلے ہُوئے تھے

تمھیں ہی کچھ یاد ہو کہ میں تو بُھلا چکا ہوں
کہاں سے بچھڑے تھے ہم، کہاں سے مِلے ہُوئے تھے

نکل رہے تھے تمام اطراف سے گزر کر
ہوا کے جھونکے جو درمیاں سے مِلے ہُوئے تھے

سُنائے ہم نے بھی انجمن میں وہی کہ ہم کو
وہ چند ٹکڑے جو داستاں سے مِلے ہُوئے تھے

اخیر تک شہر بھر پہ کچھ بھی ہُوا نہ ظاہر
کہ راز بھی اپنے رازداں سے مِلے ہُوئے تھے

بجا ہے اپنائیت جو پیدا نہیں ہُوئی ہے
مکیں ہی کب کے یہاں مکاں سے مِلے ہُوئے تھے

چلا کیے ہیں معاملے ہی سبھی زبانی
کہ لوگ دل سے نہیں زباں سے مِلے ہُوئے تھے

وہاں پہ مسجد سے باہر آواز کیسے جاتی
جہاں مؤذن ہی خود اذاں سے مِلے ہُوئے تھے

ظفرؔ، سزا بھی یہاں کہاں قاتلوں کو مِلتی
کہ لکھنے والے تھے جو بیاں سے مِلے ہُوئے تھے

جو دوستی سے نہ دشمنی سے مِلے ہُوئے تھے
یہ لگ رہا ہے کہ ہم ابھی سے مِلے ہُوئے تھے

ہمیں وضاحت سے یاد ہیں خدوخال اُس کے
اگرچہ اک بار سرسری سے مِلے ہُوئے تھے

جو تھی تو کس طرح کی ملاقات یہ ہماری
کہ دُور ہیں خود سے اور کسی سے مِلے ہُوئے تھے

یہ شہر اپنے لیے جو بے گانہ ہے سراسر
کہ اصل میں تو یہاں تجھی سے مِلے ہُوئے تھے

اُڑائے پھرتی ہے رات بھر دُور دُور ہم کو
تو کیوں نہ ہو جب کسی پری سے مِلے ہُوئے تھے

ہمارے احوال کا اب اندازہ خود لگائیں
کبھی جو مِلتا نہیں اُسی سے مِلے ہُوئے تھے

ہمارے رُخ پر یہ نور کیوں کر بھلا نہ آتا
کہ اندر اندر کسی بدی سے مِلے ہُوئے تھے

تو یہ سفیدی میں اک سیاہی کہاں سے آئی
اگر اندھیرے نہ روشنی سے مِلے ہُوئے تھے

ہمارے احوال ہیں، ظفرؔ موت سے بھی بدتر
کہ ہم بہ ظاہر تو زندگی سے مِلے ہُوئے تھے

توسیع

مستنصر حسین تارڑ کے نام

گھیرا ہُوا ہے اس کی حدوں نے اسے ظفرؔ
یہ شہر وہ ہے جس کے مضافات ہی نہیں

ظفؔر اقبال کی غزل کا اختصاص: چند پہلو

ظفر النقی (انڈیا)

ظفؔر اقبال کی غزل اپنے تازہ لسانی تجربات، خوش گوار انحراف اور فرسودہ مضامین و موضوعات سے اجتناب کی بنیاد پر پہچانی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی غزلوں میں جتنے لسانی اور موضوعاتی تجربے کیے ہیں شاید ہی کوئی اُردو کا دوسرا شاعر کرسکا ہو۔ لیکن اُن کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکی شعریات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اُن کی شعری روایت پر بڑی گہری نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کی کلاسیکی اور روایتی شعریات پر گہری نظر ہوگی وہی لسانی تجربے بھی کرسکتا ہے اور نحوی وصرفی قواعد (Syantax) میں تبدیلی کرکے اپنے لیے ایک نئی شعریات وضع کرسکتا ہے۔ ظفؔر اقبال نے کلاسیکی شعور اور اس کی روایت کو سمجھتے ہوئے غزل کی لسانی تشکیل کی۔ انھوں نے ایک طرف غزل کی زبان پر سخت حملے کیے تو دوسری طرف غزل کی زبان اور اس کے اظہار کے طریقوں کے امکانات بھی روشن کیے۔

ظفؔر اقبال نے اپنا نیا لسانی وموضوعاتی تجربہ ’’آبِ رواں‘‘ کی غزلوں میں شروع کردیا تھا۔ اس مجموعے کی غزلیں اُسلوب کے اعتبار سے، روایت سے کچھ الگ ہیں تاہم یہ گریز وانحراف نیم روشن ہیں لیکن وہ ’آبِ رواں‘ سے ’’گلافتاب‘‘ تک آتے آتے نئی لسانی جسارت کا ثبوت دیتے ہیں اور روایتی اُسلوب کے برعکس ایک نئی شعری ولسانی بوطیقا تیار کرتے ہیں۔ ظفؔر اقبال نے ’’گلافتاب‘‘ میں خود یہ اعلان کیا کہ:

> ’’یہ کتاب اُردو مستقبل کا خواب نامہ ہے دھندلا اور ادھورا۔
> مروّج اُردو کے ساتھ اپنی کچھ بن نہیں آئی۔ چناں چہ شعری تجربے کی

حدت میں پگھل کر اس نے یہ صورت اختیار کی ہے۔ جن چشموں سے
اِس زبان نے ابتدا میں توانائی حاصل کی اور جو ایک مدت اِس پر روک
دیے گئے تھے، میں نے اسے پھر سے رواں کر دیا ہے، کچھ کلیوں کا احیا کیا
ہے، کچھ وضع کیے ہیں۔''

اِس کے ساتھ ہی ساتھ ظفؔر اقبال نے اپنے شعری طریقۂ کار کی وضاحت کے لیے چند اور
باتیں بھی کہی ہیں:

''چھوئی موئی کے بجائے زبان کو زندہ، متحرک شے گردانتے
ہوئے میں نے اس کے ساتھ آزادیاں لی ہیں۔ پنکچویشن یکسر اُڑا دی ہے
جو معنی کو محدود و پابند کرتی ہے۔ اضافت سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔
گرائمر کی گھٹن بھی اب ویسی نہیں رہی، اب میں سانس لے سکتا ہوں۔''

(فلیپ ''گلافتاب'' ظفؔر اقبال)

ظفؔر اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ وہ لسانی تجربہ ہے جس نے غزل کی یکسر تصویر بدل دی اور انھوں نے اس کے لیے ان استعاروں، علامتوں اور ترکیبوں کو اپنی غزل سے باہر کیا جو اپنے انسلاکات اور تلازمات کے ساتھ اپنی چمک دمک کھو چکے تھے اور ان کی معنوی سطح گم ہو چکی تھی اور گھسے پٹے معانی و مفاہیم کی ترجمانی کر رہے تھے بلکہ ظفؔر اقبال اپنی غزلوں میں غیر مانوس الفاظ کے توسط سے انسلاکات کا نیا حلقہ تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی غزلوں میں معانی و مفاہیم کی نئی صورتیں پیدا کرنے کے لیے زبان کی نحوی و صرفی قواعد (Syntax) میں تبدیلی روا رکھتے ہیں۔ (جیسا کہ ظفؔر اقبال نے اپنے فلیپ میں اس کا اظہار بھی کیا ہے) اور لفظوں کے ساتھ کُھل کھیلتے ہیں، لیکن ظفؔر اقبال کے یہاں یہ توڑ پھوڑ، شکست و ریخت اور تخریب، تعمیر کا پیش خیمہ بن جاتی ہے اور یوں ایک تازہ زبان، نئے ڈکشن اور نئے اُسلوب کی تعمیر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ظفؔر اقبال اپنی غزلوں میں اُن الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں جو غزل کے لیے غیر مانوس رہے ہیں، وہی نئے پن اور ندرت و جدت کے لیے مانوس موضوعات و مضامین کی روایتی حد بندیوں سے آزاد ہو کر اس میں ہلکی سی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں

اور غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کرتے ہیں۔ ظفر اقبال نے اپنے اس شعری طریقۂ کار کا اپنے کلام میں مختلف موقعوں پر ذکر بھی کیا ہے:

کسی شے میں ظفرؔ بس کچھ ملا دیتا ہوں چپکے سے
یہ طرزِ خاص ہے میری جسے میں عام رکھتا ہوں

یہی پیرایۂ اظہار ہے جو آخر کار
اپنے جادو سے پرانے کو نیا کرتا ہوں

ظفر اقبال نے خود مختلف تنقیدی تحریروں میں اپنے اس موقف کی پُر زور وکالت کی اور اس لسانی شکست وریخت اور روایت سے انحراف کو جائز ٹھہرایا۔ اپنے ایک مضمون میں جدید غزل کی نئی شعریات کی ضرورت پر اصرار کیا ہے جس سے خود اُن کے شعری رویے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''لفظ کے استعمال میں کسی حد تک یا بقدرِ ضرورت من مانی کو روا رکھا جائے کیوں کہ اس طلسم زار میں داخل ہونے کا دروازہ صرف اور صرف لفظ ہے۔ شعر میں ایک ہی لفظ کا غیر معمولی، غیر متوقع یا غیر حقیقی استعمال معنوی لحاظ سے اس کی کایا پلٹ سکتا ہے۔ لفظ کبھی بھی اور کسی بھی مقام پر بے معنی نہیں ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ لفظ کا کوئی بھی عجیب استعمال معانی کے نئے در کھولنے کا باعث بنتا ہے۔''

(جدید اُردو غزل اور نئی شعریات کی ضرورت: ظفر اقبال 'شب خون' شمارہ ۱۹۲، صفحہ: ۸)

ظفر اقبال اپنی غزلوں میں لفظوں کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ اور رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ نحوی وصرفی قواعد میں تبدیلی کے ساتھ الفاظ کے روایتی تلفظ میں ضرورتِ شعری کے تحت ترمیم و اضافے کرتے ہیں اور لفظ کے تلفظ کو بدل دیتے ہیں۔ زیر، زبر اور پیش جہاں جیسا چاہتے ہیں ویسا استعمال کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی قافیے، وزن اور آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے ایک حرف کو بڑھا بھی دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ ظفر اقبال کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ ''گلافتاب'' کی پوری شاعری میں اس طرح کے رویے ملتے ہیں:

کون تھا جس کا یہاں جی نہ لگا جنگل میں
کون تھا جو کسی گنجان شہَر سے آیا

ظفر اقبال نے یہاں شہر (ساکن الاوسط) کو شہَر (متحرک الاوسط) کے طور پر استعمال کیا ہے تا کہ اس قافیے کو غزل کے دوسرے قوافی سے ہم آہنگ کیا جا سکے:

سیدھے سیدھے شعر کہتے سب کو خوش آتے نظر
کیا کیا جائے کہ اپنی عقل میں افتور تھا

یہاں 'فتور' کے بجائے 'افتور' استعمال کیا ہے۔ ظفر اقبال نے عام طور پر گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ اور محاورے کو اپنی غزلوں میں کچھ اس طرح کھپایا ہے کہ جو شعر کے حسن میں اضافے کا سبب بنتا ہے اور معانی و مفاہیم کی نئی دنیائیں خلق کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو ظفر اقبال غیر مانوس اور گرے پڑے الفاظ کے ذریعے اپنی شاعری کا تانا بانا تیار کرتے ہیں اور اس طرح اُن کی غزلوں میں تازگی، شگفتگی اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے:

سر سرا کر کیوں فضا میں جم نہیں جاتا ظفر
ڈور قائم ہے تو پھر کیوں ڈولتا پھرتا ہوں میں

☆

قہر تھا کالی کیسلی بھوک سے مرتا بدن
آنکھ سے اندھا تھا میں، بستر پہ ٹیڑھی کھیر تھا

☆

تن بھی ننگا، من بھی ننگا، سورج بھی ہے سخت
دھوپ کی چادر دے کے کوئی لے گیا کپڑا لتّا

☆

درِ اُمید سے ہو کے نکلنے لگتا ہوں
تو یاس روزنِ زنداں سے آنکھ مارتی ہے

اِن شعروں میں سر سرا کر، کپڑا لتّا، ٹیڑھی کھیر اور آنکھ مارنا وغیرہ ہماری روزمرہ کی گفتگو میں

بکثرت استعمال ہوتے ہیں اور جن میں بظاہر معنی اور مطلب کی کوئی خاص جہت بھی نہیں ہوتی ہے مگر ظفؔر اقبال اپنی شاعرانہ ہنرمندی اور تخلیقی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اس میں معانی و مفاہیم کی کوئی نہ کوئی نئی جہت پیدا کر دیتے ہیں اور گرے پڑے الفاظ کو اپنے دستِ ہنر سے روشن کر دیتے ہیں۔

ظفؔر اقبال کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ نئی غزل کے اُفق پر ظفؔر اقبال ایک درشت اور جارحانہ لہجہ لے کر نمودار ہوئے ہیں اور اقبالؔ اور فیضؔ کے بعد ظفؔر اقبال اپنے انفرادی اُسلوب سے ایک نیا علامتی نظام تشکیل دینا چاہتے ہیں:

سرگشتۂ سراب تھے دشتِ صدا کے ہم
ایسے کہ خود بھٹک گئے رستہ دکھا کے ہم

☆

لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی
اساسِ فکر نہ طرزِ بیاں بناتے ہیں

☆

چمکا ہے آفتابِ ہوس جنگلوں کے پار
اُٹھی ہے لہر برف بدن کے گداز کی

☆

آگے بڑھوں تو زرد گھٹا رنگ رو بہ رو
پیچھے ہٹوں تو گردِ سفر میرے سامنے

☆

منظرِ سحر خزاں کے پیچھے
کھو گئی سبز ہوا کی آہٹ

ان شعروں میں ترکیب سازی اور علامت کی تشکیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نئی نئی تراکیب وضع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ ظفؔر اقبال کے کلاسیکی شاعری کے عمیق مطالعے کا نتیجہ ہے کہ اُنھوں نے سرگشتۂ سراب، دشتِ صدا، گردبادِ ہنر، اساسِ فکر، آفتابِ ہوس، برف بدن، زرد گھٹا،

منظرِ سحر خزاں اور سبز ہوا وغیرہ جیسی نہ جانے کتنی بامعنی اور حسین تراکیب وضع کی ہیں۔ ظفر اقبال کے یہاں ترکیب سازی اور علامت کی تشکیل کا رجحان اُن کے پہلے مجموعے ''آبِ رواں'' سے لے کر آخر تک قائم رہتا ہے:

آندھیوں کے شہر میں رہتا تھا شاید اس لیے
بے در و دیوار سا رہنے کو گھر مجھ کو دیا

☆

میرے لہو کے آج خریدار تھے بہت
گویا کہ آج رونقِ بازار میں ہی تھا

☆

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

ظفر اقبال نے اپنے عہد کے موضوعات ومسائل کی ترجمانی کے لیے شہر، گھر، سمندر اور لہو کی علامتوں کا بار بار استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ علامتیں ظفر اقبال کے یہاں معاصر شاعروں سے الگ مفاہیم کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ اُنھوں نے ہوا، آندھی، زرد، زردی کی علامتیں بھی کثرت کے ساتھ استعمال کی ہیں اور یہ علامتیں اُن کے یہاں زوال، فنا، مرگ اور اِس کے علاوہ منفی اور تخریبی قوتوں کے مفاہیم کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کہیں کہیں ظفر اقبال غزل کے لیے غیر مانوس لفظ کے ذریعے ایسا علامتی پیکر تشکیل دیتے ہیں کہ یک گونہ حیرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل شعر دیکھیے کہ کس طرح ظفر اقبال نے 'شیر' کو علامتی رنگ عطا کر دیا ہے:

شیر آ کے چیر پھاڑ گیا مجھ کو خواب میں
دم بھر کو میری آنکھ لگی تھی مچان پر

ظفر اقبال نے اِس شعر میں موجودہ زندگی کی دہشت، خوف، بے نام ہراس اور نہ سمجھ میں آنے والے حادثات کو بیان کیا ہے لیکن اس شعر میں شیر اور مچان کو علامتی نوعیت حاصل ہو گئی ہے کہ 'شیر' موجودہ عہد کے حالات کے جبر وتشدد اور مسائل کی سنگینی کے مفہوم کی ترجمانی کر رہا ہے تو

'مچان' محفوظ پناہ گاہ کے معنی کو بیان کر رہا ہے کہ اب یہ شیر جو آ کے چیر پھاڑ گیا ہے وہ کون ہے؟ خواہشات کا شیر ہے یا زندگی کی ذمہ داریوں کا یا مایوسی و افلاس کا یا پھر حالات کے جبر کا۔ محفوظ مکان میں بند ہونے کے باوجود اس عہد کے عذاب سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا ہے:

سحر ہوئی تو بہت دیر تک دکھائی دیا
غروب ہوتی ہوئی رات کا کنارا مجھے

ترقی پسند غزل میں عام طور پر اس مفہوم کی ترجمانی کی گئی لیکن ظفر اقبال نے اس میں ہلکی سی تبدیلی کر کے معنی میں ایک نیا رخ پیدا کیا ہے۔ یہاں 'سحر' آزادی کے مفہوم کی ترجمانی کر رہی ہے لیکن شعر کے سیاق و سباق سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ آزادی مکمل آزادی نہیں ہے بلکہ آزادی ملنے کے بعد بھی غلامی کے اثرات زندگی میں بہت دور تک دکھائی دیتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی اور پاکستانی عوام آزاد تو ہو گئے ہیں لیکن ذہنی غلامی کا سلسلہ ابھی تک قائم ہے۔

ظفر اقبال کے اس طرح کے شعروں کو پڑھنے کے بعد جس میں فکر اور زبان دونوں سطحوں پر امکانات روشن ہیں، جب ایسے اشعار جن کا تعلق زبان و بیان کی انتہا پسندی سے ہے اور جس سے ظفر اقبال کی شاعری کافی بدنام بھی ہوئی ہے۔ قاری دونوں کے درمیان رشتہ تلاش کرتا ہے کہ ظفر اقبال کی ایسی شاعری کو اُن کے کس ذہنی رویے کا نام دیا جائے۔ شمیم حنفی نے ظفر اقبال کے اس طرح کے شعروں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''یہ زندگی کی لایعنیت یا بعض Absurd لمحات پر اظہار خیال کے بجائے فی نفسہٖ چند لایعنی لمحوں کی تصویریں ہیں۔ انھیں یک رنگی اور یکسانیت یا وجود کی دیوار سے جھانکتے ہوئے بدوضع دھبوں کی مثال سمجھنا چاہیے اور آگے بڑھ جانا چاہیے...... کیوں کہ اس دیوار پر ظفر اقبال نے جتنی تصویریں آویزاں کی ہیں، اُن کے انداز جدا جدا ہیں اور اگر انھیں کوئی عنوان دیا جا سکتا ہے تو صرف ظفر اقبال ہے۔''

◆◆◆

☆

اصغر ندیم سید

بلاشبہ ظفر اقبال نے اُردو غزل کو جو وسعت اور فکری گہرائی عطا کی ہے وہ ایک صدی پر محیط ہے۔ فنی کرشمہ سازی اور فکری نقش نگاری کے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ ذرا غور کریں تو ایک دنیا میں کئی دنیائیں آباد نظر آتی ہیں، ظفر اقبال کی غزل غیر معمولی معجزہ محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بہ ظاہر دو مصرعوں کی سادہ ادائیگی کے باطن میں ایک جہانِ دیگر کئی پرتوں میں کُھلتا چلا جاتا ہے۔ جتنی آسانی سے وہ شعر کہتے ہیں ایسا لگتا ہے کوئی ایسی آگ ہے جو کئی طرح کے گلزار بناتی چلی جاتی ہے۔ ظفر اقبال کی شاعری کے کئی انتخاب کیے جاسکتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد اور موضوعاتی تنوع نے جلال و جمال کی کیفیتوں کو سمندر جیسی وسعت عطا کردی ہے کہ انتخاب کرنے والا اس کی چکا چوند میں گھر جاتا ہے۔ کس شعر کو پکڑے اور کس کو چھوڑے، ایک غزل سے دوسری غزل تک ایسا تسلسل اور حیاتی بہاؤ ہمارا تجربہ بنتا ہے کہ اُس سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا " آبِ رواں " جب سامنے آیا تو پورا مجموعہ ایک اعلیٰ انتخاب کی مثال محسوس ہوا۔ ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے غزل کا عجز قرار دے سکیں۔ جس شاعر کا مجموعہ ہی انتخاب ہو اُس کا انتخاب کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر بھی دلاور علی آزر نے اُن کے کلام سے ایسا انتخاب پیش کیا ہے جو ظفر اقبال کی تخلیقی جہتوں کے ساتھ دلاور علی آزر کے ذوق کی بھی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ میرے لیے اس انتخاب سے اپنا انتخاب کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے میں کیا مثالیں دوں ہر غزل بے مثال ہے۔ یہ ظفر اقبال کے قاری کے لیے ایک ایسا تحفہ ہے کہ وہ اسے اپنی جیب میں رکھے یا سکہ رائج الوقت سمجھ کر ہاتھوں میں کھنکھناتا ہوا جائے۔ ظفر اقبال سے نیاز مندی کو چالیس پینتالیس سال ہونے کو آئے اس عرصے میں کبھی اُنھیں خاموشی کے وقفے میں نہیں دیکھا ایک مضطرب روح جو ہمہ وقت غزل کی دیوی کی سیوا میں مصروف رہتی ہے۔ ہر آن اُسے ایک نئی آن میں دیکھا۔ کبھی سیاسی زمانوں میں ایک ناراض باغی کی طرح ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ کبھی معاشرتی و سماجی منافقت کے خلاف اپنا غصہ ظاہر کرتا ہے۔ کبھی محبوب سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے پینترے بدلتا ہے اتنا وفور کیسے ایک ہی شاعر میں سما سکتا ہے۔ ظفر اقبال ہمیں حیران کرنے میں مصروف ہے دلاور علی آزر ایک اور انتخاب کا سامان کرو۔ یار زندہ صحبت باقی ظفر اقبال سلامت رہیں۔

◆◆◆

مجھ کو جو فراغت نہ مِلی کام کے آگے
تھی شام کوئی اور بھی اُس شام کے آگے

گھر ہو کوئی جس پر کوئی تختی بھی ہو ایسی
لکھا ہو مرا نام ترے نام کے آگے

مِلنا ہے کہیں پر وہ جہاں ہو نہیں سکتا
جاتا ہے مرا خواب در و بام کے آگے

ترتیب ہی بدلی ہُوئی ساری تھی وہاں پر
آغاز تھا اِس مرتبہ انجام کے آگے

لاچار ہی کر دیتی ہے مجھ کو کوئی خواہش
کچھ بس نہیں چلتا ہوسِ خام کے آگے

کتنی ہے مری حیثیت، اور کیا مری ہستی
کانٹا سا پڑا ہوں جو گُل اندام کے آگے

تیار تھا کرنے کو نہ بھرنے کو وہاں کوئی
آرام ہی تھا وقفۂ آرام کے آگے

دراصل کوئی بات جو ہوتی تو نکلتی
کچھ بھی نہیں خالی ترے الزام کے آگے

پھنستا بھی، ظفؔر میں تو بھلا کون سی شے پر
اِس بار تو دانہ ہی نہ تھا دام کے آگے

دیکھو جو نکل کر مری تدبیر کے آگے
اک بات زبانی بھی ہے تحریر کے آگے

سازینۂ ہستی ہیں چھنکتی ہُوئی کڑیاں
دیوانہ جو ہے رقص میں زنجیر کے آگے

اک رات سی رُکتی ہُوئی باہر، کبھی اندر
اک راستہ چلتا ہُوا رہ گیر کے آگے

دیوار پہ یہ چوکھٹا رہ جائے گا خالی
تصویر نکل جائے گی تصویر کے آگے

مایوس ہُوئے، اور بکھرتے گئے سب لوگ
چارہ نہ چلا کوئی بھی تاخیر کے آگے

منصوبۂ دل کا کبھی باندھا جو ارادہ
تخریب کھڑی ہو گئی تعمیر کے آگے

ٹالی ہے بہت بات، مگر عاقبتِ کار
ٹھہرا نہیں وہ بھی مری تقریر کے آگے

ڈھونڈو تو یہاں آج بھی وا ہے درِ امکاں
کچھ اور بھی مِل جائے گا تاثیر کے آگے

دل کے ظفرؔ، اوصاف کُھلیں گے اِسی صورت
یہ خاک اگر لائیں گے اکسیر کے آگے

انکار بھی تھا اک ترے اقرار کے آگے
دیوار کھڑی تھی کوئی دیدار کے آگے

باقی نہ بچا تھا کوئی پیسہ ہی وگرنہ
بازار تھا ایک اور بھی بازار کے آگے

بُہتان کے پیچھے کوئی بُہتان ہی بُہتان
انبار ہی انبار ہیں انبار کے آگے

امکاں تھا زیادہ کہ اُسے ساتھ ہی لے جائے
تھی تیز ہَوا ابرِ گراں بار کے آگے

تھا میرے تعاقب میں بھی کوئی سحر و شام
بندش بھی نہیں تھی مری رفتار کے آگے

اس عہدِ خرابی میں تو ہے یہ بھی غنیمت
کچھ اور نہیں ہے مرے آثار کے آگے

چل پڑتے ہیں اور سوچتے رہتے نہیں بے کار
جانا ہو جنھیں وادیٔ دُشوار کے آگے

یہ آخری منزل ہے صفیرانِ سخن کی
کچھ بھی نہیں پیرایۂ اظہار کے آگے

انجام تمھارا بھی ظفرؔ، ٹھیک نہیں ہے
پیچھے ہو کبھی اور کبھی سرکار کے آگے

وہ خواب زماں اور زمیں سے نہیں نکلا
رکھا تھا جہاں میں نے، وہیں سے نہیں نکلا

ہونا تھی مرے کفر کی جس سے کوئی تصدیق
وہ سجدہ ابھی میری جبیں سے نہیں نکلا

آغاز بھی میں کر نہیں پایا ہوں ابھی کام
اور اِس کا نتیجہ بھی کہیں سے نہیں نکلا

اک چور مکاں میں جو چھپا بیٹھا ہے کب سے
کوشش تو بہت کی ہے، مکیں سے نہیں نکلا

تھی روشنی درکار مجھے اور طرح کی
اور، کام مرا ماہِ مبیں سے نہیں نکلا

ہے ایک شکنجہ کہ مرے بس کا نہیں روگ
دُنیا سے نکل آیا ہوں، دیں سے نہیں نکلا

پانی بھی ہُوا اب مرے امکان سے باہر
ایڑی یہاں رگڑی تھی، یہیں سے نہیں نکلا

تھی دانۂ گندم میں انوکھی کوئی تاثیر
ارمان مرا نانِ جویں سے نہیں نکلا

انکار ہی وہ عُقدہ کُشا ہے کہ ظفرؔ، کام
ہے کون سا جو ایک نہیں سے نہیں نکلا

ایک خوف مرے جُثہ و جاں سے نہیں نکلا
موجود وہیں پر تھا، جہاں سے نہیں نکلا

آباد تو رکھا ہے اُسے پہلے ہی دن سے
اک عمر دُھواں میرے مکاں سے نہیں نکلا

تھا جس کی ادائی ہی مرا مقصدِ ہستی
وہ لفظ ابھی میری زباں سے نہیں نکلا

جتنے بھی نمازی تھے گھروں میں رہے بیٹھے
باہر ہی کوئی میری اذاں سے نہیں نکلا

جاری رہی تردید و وضاحت بھی کئی روز
اک پیچ مگر اُس کے بیاں سے نہیں نکلا

اک شور رہا شہر میں کچھ دن مرے دَم سے
کچھ اور مرے نام و نشاں سے نہیں نکلا

جانا تھا جنہیں وہ گئے آگے، بہت آگے
میں ہوں کہ ابھی چُون و چناں سے نہیں نکلا

اک مشقِ سخن تھی مری، افسوس کہ شاید
آگے ہی کوئی "آبِ رواں" سے نہیں نکلا

محفوظ تھا ہر طرح، ظفؔر جسم کے اندر
جب تک کہ میں اس کُنجِ اماں سے نہیں نکلا

ایسا ہے کہ میں رنجِ سفر سے نہیں نکلا
حالاں کہ زمانہ ہُوا گھر سے نہیں نکلا

اک بے خبری ہی میں گِھرا ہونے کے باوصف
میں سلسلۂ خواب و خبر سے نہیں نکلا

اچھا نہیں لگتا ہے مجھے گھر سے نکلنا
ایسا نہیں، باہر کسی ڈر سے نہیں نکلا

ہو سکتی ہے زر سے ہی یہاں عُقدہ کُشائی
اور کام کبھی بندۂ زر سے نہیں نکلا

موجوں کے تھپیڑے مجھے سہنا ہیں ابھی اور
اندر کا ہی طوفان ابھی سر سے نہیں نکلا

آتا ہے زیادہ جو کنارے سے مجھے خوف
میں اپنی خوشی میں ہی بھنور سے نہیں نکلا

میں سحر سے اُس کے نکل آیا تو ہوں، لیکن
سارا میں ابھی اُس کے اثر سے نہیں نکلا

باقی نہیں اب اور اُڑانے کے لیے خاک
پھر کیوں ہے کہ میں دشتِ ہنر سے نہیں نکلا

پھیلے گی خنک دُھوپ ظفرؔ، اُس کی گلی میں
خورشید ابھی سایۂ در سے نہیں نکلا

گزرا ہوں دوا سے تو دعا سے نہیں نکلا
ملحد ہوں، مگر خوفِ خدا سے نہیں نکلا

دستک پہ مری ناز و ادا سے نہیں نکلا
کہتا ہے کہ باہر وہ حیا سے نہیں نکلا

اُڑتا ہوا پتّا ہوں سرِ راہ گزر میں
اِس حال میں بھی اپنی ہَوا سے نہیں نکلا

اُس نے بھی خیالات سے جھانکا نہیں باہر
میں بھی کبھی اِس خواب سرا سے نہیں نکلا

گھَٹتی ہی گئی فرصتِ شب اور اِدھر میں
اِس مخمصۂ بندِ قبا سے نہیں نکلا

ہوں گے یہ مکاں اور مکیں آپ ہی روشن
بجلی کا کرشمہ جو گھٹا سے نہیں نکلا

جس طرح نکلنا تھا، نکلتا کسی صورت
ارماں وہ کسی اور طرح سے نہیں نکلا

زندہ ہوں ابھی تجھ سے جدا ہو کے اُس طور
مدّت ہُوئی میں اپنی سزا سے نہیں نکلا

میں اپنی کلیمی سے، ظفرؔ خوش بھی نہیں ہوں
اچھا ہے مرا کام عصا سے نہیں نکلا

دُنیا میں ہی دُنیا کی طرف سے نہیں آیا
پانی کوئی دریا کی طرف سے نہیں آیا

اُس عرصۂ کم ہی کو سمجھ بیٹھا ہوں سب کچھ
جو عمرِ بقایا کی طرف سے نہیں آیا

جاتے ہُوئے دیکھے کبھی صحرا کی طرف کو
ہٹ کر کوئی صحرا کی طرف سے نہیں آیا

مشکل تھا بہت میرے لیے وقفۂ آرام
اور میں اُسی اثنا کی طرف سے نہیں آیا

اپنا ہی نمائندہ ہوں، جیسا بھی ہوں، جو بھی
میں اولیٰ و ادنیٰ کی طرف سے نہیں آیا

میں خود ہی تماشا ہوں، یہی میرا ہُنر ہے
یوں خوابِ تماشا کی طرف سے نہیں آیا

میرے لیے کافی ہے مری ہستیٔ موہوم
کم ہوں، سو زیادہ کی طرف سے نہیں آیا

کچھ بے غرض اتنا بھی نہیں ہوں، مگر اِس بار
میں اہلِ تقاضا کی طرف سے نہیں آیا

جس فرش سے اُٹھا ہوں، ظفرؔ ہوں وہیں موجود
میں عرشِ معلیٰ کی طرف سے نہیں آیا

پیغام جو پیاروں کی طرف سے نہیں آیا
آیا بھی تو ساروں کی طرف سے نہیں آیا

کچھ اور تھے میرے لیے آنے کے قرینے
میں راہ گزاروں کی طرف سے نہیں آیا

اس بار تو میں کُھل کے ہی آیا ہوں کم و بیش
سربستہ اشاروں کی طرف سے نہیں آیا

دیکھا ہُوا سب کچھ ہے وہاں میرا کہ اب میں
اَن دیکھے دیاروں کی طرف سے نہیں آیا

کھلتے ہیں سبھی پھول خزاں کے مرے اندر
کیا ہے جو بہاروں کی طرف سے نہیں آیا

خود آئے ہیں پانی کی طرف کو یہ کنارے
پانی تو کناروں کی طرف سے نہیں آیا

البتہ وہ لاکھوں میں ہُوا آن کے تقسیم
جو رنگ ہزاروں کی طرف سے نہیں آیا

آخر اِدھر آیا تھا کدھر سے وہ ستارہ
جو تیرے ستاروں کی طرف سے نہیں آیا

کوئی بھی ظفرؔ، قاعدہ مجھ پر نہیں نافذ
میں اپنی قطاروں کی طرف سے نہیں آیا

سمجھو کہ برابر کی طرف سے نہیں آیا
جھونکا سا جو اندر کی طرف سے نہیں آیا

جنگل میں نہیں اور کوئی وجہِ مسرّت
پیغام کوئی گھر کی طرف سے نہیں آیا

اُس نے ہی پریشان رکھا مجھ کو شب و روز
سودا جو مرے سر کی طرف سے نہیں آیا

آیا تو سہی نیند کی نرمی پہ دبے پاؤں
وہ خوابِ معطر کی طرف سے نہیں آیا

بکھری ہُوئی خوشبو سے اُلجھتا رہا بے کار
سمٹے ہُوئے منظر کی طرف سے نہیں آیا

جب ٹوٹ رہی تھیں مرے اندر کی فصیلیں
اُس رات وہ باہر کی طرف سے نہیں آیا

کچھ شبہ سا باقی بھی رہا آنے میں اُس کے
یعنی وہ سراسر کی طرف سے نہیں آیا

دُنیا کی ہوس اُس کو نہیں تھی، مگر اب کے
وہ بندۂ بے زر کی طرف سے نہیں آیا

سب منتظر اُس کے رہے لیکن، ظفرؔ اس بار
آیا بھی تو اکثر کی طرف سے نہیں آیا

ملنے کو مِلانے کی طرف سے نہیں آیا
یہ زہر زمانے کی طرف سے نہیں آیا

آیا تو اُدھر ہی سے ہے پتھر کوئی شاید
یہ آئنہ خانے کی طرف سے نہیں آیا

میرا تو نہ ہو گا وہ کسی طور پلٹ کر
جو تیر نشانے کی طرف سے نہیں آیا

ہے اور زر و مال بھی کچھ زیرِ حفاظت
یہ سانپ خزانے کی طرف سے نہیں آیا

آیا تو سبھی اور ہی اطراف سے لیکن
کچھ وعدہ نبھانے کی طرف سے نہیں آیا

اوروں کے در و بام بھی چھوتا ہُوا وہ شوخ
میرے ہی ٹھکانے کی طرف سے نہیں آیا

تازہ ہی کوئی عذر تراشا ہے جو اب وہ
دیرینہ بہانے کی طرف سے نہیں آیا

کیوں قصہ گری اور پسند آگئی اس کو
کیوں میرے فسانے کی طرف سے نہیں آیا

حیران ہوں میں بھی کہ ظفرؔ آپ بھی اس بار
اُس خواب پُرانے کی طرف سے نہیں آیا

سمجھ لو کہ سوتے ہُوئے تھک گیا ہوں
میں دراصل ہوتے ہُوئے تھک گیا ہوں

نہیں ہے ابھی وقت ہنسنے کا میرا
ابھی تو میں روتے ہُوئے تھک گیا ہوں

رُکا ہوں کہ مکھن نکلنا ہے اِس سے
کہ پانی بِلوتے ہُوئے تھک گیا ہوں

کوئی فصل اُگنی نہیں ہے یہاں پر
بہت بیج بوتے ہُوئے تھک گیا ہوں

نہانا تو قسمت میں شاید نہیں ہے
جو کپڑے ہی دُھوتے ہُوئے تھک گیا ہوں

گرایا تھا جو راستے میں کسی دن
وہی بوجھ ڈھوتے ہُوئے تھک گیا ہوں

وہی سامنے ڈھیر ہے کنکروں کا
یہ موتی پراتے ہُوئے تھک گیا ہوں

مجھے ڈھونڈنے کے لیے کوئی نکلے
کہ میں خود کو کھوتے ہُوئے تھک گیا ہوں

ظفر کوئی صورت نکالوں گا اب کیا
کہ مٹی ہی گوتے ہُوئے تھک گیا ہوں

نہیں یہ کہ چلتے ہُوئے تھک گیا ہوں
میں رستے بدلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

کُھلے میں کہیں مجھ کو پھیلاؤ جا کر
کہ خود میں اُبلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

سُرنگ اب یہی ہو گی میرا ٹھکانہ
میں باہر نکلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

مجھے برف ہونے سے روکے نہ کوئی
جو آتش اُگلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

پشیماں نہیں اب کسی بات پر میں
بہت ہاتھ مَلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

ہے وقفہ یہ آرام کا بھی ضروری
کہ گِرتے سنبھلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

کِھلونے مرے کام کے اب نہیں ہیں
کہ اِن سے بہلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

کوئی اور بھی باغ ہو گا یہاں پر
میں اِس میں ٹہلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

ظفرؔ، چاند اُونچا بہت ہے سخن کا
میں ناحق اُچھلتے ہُوئے تھک گیا ہوں

بگڑتے سنورتے ہُوئے تھک گیا ہوں
غلط کام کرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

سفر پر روانہ ہوں اور راستے میں
ٹھٹکتے ٹھہرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

مجھے ڈوبنے دو کہ اِن پانیوں میں
میں ناحق اُبھرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

مجھے کام اچھے بھی کرنا ہیں کوئی
کہ تاوان بھرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

چڑھائی تو مشکل نہیں تھی کچھ اتنی
مگر، میں اُترتے ہُوئے تھک گیا ہوں

کہیں سبزہ گاہ اور بھی کوئی ہو گی
یہاں چُگتے چَرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

مجھے لے چلو زندگی میں بھی واپس
کہ ہر روز مرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

نکالوں کوئی اپنے اندر سے سورج
جو شب بھر ٹھٹھرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

ظفرؔ، شاید اب کے پلٹ جائے بازی
میں ہر بار ہرتے ہُوئے تھک گیا ہوں

تری سمت جاتے ہُوئے تھک گیا ہوں
کبھی واپس آتے ہُوئے تھک گیا ہوں

ہُوا ہے یہی اکثر اوقات خود بھی
کہ اُس کو تھکاتے ہُوئے تھک گیا ہوں

تھکا ہوں میں کارِ محبت میں کیسا
یہ سب کو بتاتے ہُوئے تھک گیا ہوں

کوئی تازہ تعمیر مجھ سے نہ ہو گی
کہ ملبہ اُٹھاتے ہُوئے تھک گیا ہوں

سفر کے نہیں میں رہا اب جو قابل
تو رستہ بُجھاتے ہُوئے تھک گیا ہوں

کبھی کوئی مجلس، کبھی کوئی جلسہ
میں دریاں بچھاتے ہُوئے تھک گیا ہوں

مجھے اب تو بننا ہے خود ہی تماشا
تماشا دِکھاتے ہُوئے تھک گیا ہوں

ذرا دیر رونے کی مہلت عطا ہو
بہت دیر گاتے ہُوئے تھک گیا ہوں

خوشامد میں پہنچا ہوں اِس حال کو میں
ظفرؔ، مسکراتے ہُوئے تھک گیا ہوں

اپنا ہی تھا یہ بوجھ، اُٹھایا بھی ہُوا ہے
اِس میں سے مگر ہم نے گرایا بھی ہُوا ہے

بدمست ہیں اِس دل کی صراحی سے شب و روز
تھوڑا سا لہو ہم نے بچایا بھی ہُوا ہے

ہے رختِ سفر اب بھی ضرورت سے زیادہ
سامان یہ رستے میں لُٹایا بھی ہُوا ہے

ہم نے یہ حساب آپ بھی رکھا ہے برابر
کھویا بھی ہُوا ہے یہاں پایا بھی ہُوا ہے

شاید کوئی اچھائی کی صورت نکل آئے
ہم نے یہ فریب اِس لیے کھایا بھی ہُوا ہے

نقشہ تو یہ مانوس بہت لگتا ہے، شاید
یہ شہر کہیں ہم نے بسایا بھی ہُوا ہے

ایسا ہی تھا یک طرفہ محبت کا فسانہ
کچھ یاد بھی رکھا ہے، بُھلایا بھی ہُوا ہے

ہر بار نیا کر کے سناتے ہیں جو نغمہ
پہلے سے کئی بار سنایا بھی ہُوا ہے

تفصیل ضروری بھی تھی اور اپنی طرف سے
قصہ یہ ظفرؔ، ہم نے بڑھایا بھی ہُوا ہے

اک چاند ہمارا جو ہمارا بھی ہُوا ہے
افلاک سے اپنا یہ اُتارا بھی ہُوا ہے

حق تو یہ ہے ہم خود بھی گزرتے گئے ہیں ساتھ
کہنے کو یہاں اپنا گزارہ بھی ہُوا ہے

جو ٹوٹ کے ہوتا ہے سرِ شام ہی غائب
اب وہ مری قسمت کا ستارہ بھی ہُوا ہے

سیکھا ہی نہیں کوئی سبق ہم نے یہاں پر
پہلے جو ہُوا تھا وہ دوبارہ بھی ہُوا ہے

پہلے تو رہا صرف سمندر مرے ہر سُو
پیدا کہیں اب دُور کنارہ بھی ہُوا ہے

ساحل بھی کبھی دُور رہتا ہے دریا سے بہت دُور
لہروں کے مخالف کبھی دھارا بھی ہُوا ہے

بہتے ہُوئے پانی سے سفینہ مرا باہر
تھوڑا بھی ہُوا ہے، کبھی سارا بھی ہُوا ہے

آنے کا کچھ امکان بھی ہو سکتا ہے، آخر
میں نے اُسے اِس بار پکارا بھی ہُوا ہے

پانی سے نکالا بھی ہُوا ہے، ظفرؔ اک ہاتھ
یوں لاش کو تھوڑا سا اُبھارا بھی ہُوا ہے

کچھ بات بنائی ہے بہانہ بھی ہُوا ہے
اور میری طرف کوئی روانہ بھی ہُوا ہے

ناگاہ مچی ہے کوئی ہلچل سی لہو میں
دیکھے ہُوئے وہ شکل زمانہ بھی ہُوا ہے

اتنا بھی غنیمت ہے کہ وقتی سہی، لیکن
اُس دل میں کہیں اپنا ٹھکانہ بھی ہُوا ہے

یہ سلسلۂ سنگ ہے خود ہی سبب اِس کا
واقع جو یہاں آئنہ خانہ بھی ہُوا ہے

افسانے حقیقت میں بدلتے بھی ہیں سب کے
اور اپنی حقیقت کا فسانہ بھی ہُوا ہے

مارے بھی گئے مفت میں کچھ اور یہاں پر
سو بار خطا اُس کا نشانہ بھی ہُوا ہے

دن بھر غُل و غوغا ہی مچا ہے یہاں اکثر
مدّھم جو یہاں شورِ شبانہ بھی ہُوا ہے

بچتے بھی ہیں، اور آپ ہی پھنستے بھی ہیں طائر
ہم رنگ یہاں دام کے دانہ بھی ہُوا ہے

بولو تو ظفرؔ بھسم بھی ہو جاتا ہے سب کچھ
اکثر تو زباں اپنی زبانہ بھی ہُوا ہے

مطلب کوئی اپنا ہی نکالا بھی ہُوا ہے
چکّر میں بھرے شہر کو ڈالا بھی ہُوا ہے

ہوتا رہا لوگوں کا بہت وقت بھی ضائع
اور کام یہاں کوئی نرالا بھی ہُوا ہے

دشمن بھی مرا سب سے بڑا ہے فلکِ پیر
گِرنے سے اُسے میں نے سنبھالا بھی ہُوا ہے

کچھ اور بھی مشہور ہُوا پھیل کے اک راز
اک رنگ بکھرنے سے دوبالا بھی ہُوا ہے

تھا ایک مصیبت مرا ہونا، مگر اب تک
میں نے اُسے اِس خلق سے ٹالا بھی ہُوا ہے

ملنے سے یہ موسم بھی ہُوا ہے ذرا بہتر
اور اپنی شکایت کا ازالہ بھی ہُوا ہے

روکا ہُوا میں نے بھی نہ تھا صبح کو، لیکن
کچھ میرے نہ ہونے سے اُجالا بھی ہُوا ہے

مٹّی ہے تو ہے میری اُڑائی بھی ہُوئی یہ
پانی ہے تو یہ میرا اُچھالا بھی ہُوا ہے

جس کام پہ شرمندہ ہی رہتا ہوں ظفرؔ، میں
دُنیا میں وہی میرا حوالہ بھی ہُوا ہے

دل سے باہر ہی، کسی ٹھور ٹھکانے کے بغیر
عمر گزری ہے مری اپنے زمانے کے بغیر

سخت جاں اور بھی ہوں گے کئی اِس دُنیا میں
زندہ ہوں میں بھی ترے لوٹ کے آنے کے بغیر

اب کہیں سے بھی نکلنے کی نہیں گنجائش
راستے میں کوئی دیوار اُٹھانے کے بغیر

اہلِ محفل گزرِ اوقات کریں تو کر لیں
تیرے افسوں سے الگ، میرے فسانے کے بغیر

جسے لوگوں سے چھپا کر بھی بہت رکھتا ہوں
رہ بھی سکتا نہیں وہ بات بتانے کے بغیر

وضع داری نے مجھے روک بھی رکھا ہے مگر
مسئلہ حل بھی نہ ہو گا وہاں جانے کے بغیر

دعوتِ وصل اُسے دے بھی کہاں سکتے ہیں
بوریا سا یہ محبت کا بچھانے کے بغیر

یہ کماں اور کسی کی تو نہیں ہو سکتی
تیر لگتا ہے جو یہ جا کے نشانے کے بغیر

بھک سے اُڑ جاؤں گا ایسے ہی کسی رات، ظفرؔ
تار کے ساتھ کوئی تار مِلانے کے بغیر

جاگ اُٹھا ہوں کسی خوابِ مکرر کے بغیر
میں جو اندر نہیں رہ سکتا ہوں باہر کے بغیر

ایک زنجیر انوکھی کوئی کڑیوں کے سِوا
ایک تصویر عجب سی کوئی منظر کے بغیر

ہم کم و بیش بھی رہنے کے ہیں عادی، لیکن
کچھ مزہ ہی نہیں آئے گا برابر کے بغیر

کوئی اندازہ ہی رہتا نہیں، اور اب مجھ سے
پاؤں پھیلائے ہی جاتے نہیں چادر کے بغیر

آپ کے ساتھ ضروری ہے مرا ہونا بھی
خیر کا کوئی تصور ہی نہیں شر کے بغیر

تھی جہاں ایک اکیلے کی خدائی بھی محال
اب ہمیں رہنا پڑے گا وہیں اکثر کے بغیر

واپسی پر یہاں اپنوں ہی کے ہاتھوں رہے کھیت
جیت کر آئے تھے ہم جنگ جو لشکر کے بغیر

تیرنا مچھلیوں کو وہ بھی سکھاتے ہیں جو خود
دُور دریا سے رہے اور سمندر کے بغیر

اوڑھتا ہوں کبھی اُس بُت کو بچھاتا ہوں، ظفرؔ
الغرض رات گزرتی نہیں بستر کے بغیر

دیکھ سکتا ہوں جسے تابِ تماشا کے بغیر
ہے کوئی اور بھی دُنیا تری دُنیا کے بغیر

ہیں کچھ ایسے بھی زمانے مرے آگے پیچھے
حال کے ایک طرف، ماضی و فردا کے بغیر

پھر بھی اُس گھر سے کہیں جا نہیں سکتے کہ جہاں
کچھ میسّر ہی نہیں تنگیِ بے جا کے بغیر

خاک میں بھی کئی اُٹھتے ہیں بھنور سے دن رات
ڈوبنا سہل ہے میرے لیے دریا کے بغیر

ہم طلب گار اُسی کے ہیں، بھلا ہو کہ بُرا
جو بھی کچھ ہے یہاں موجود و مہیا کے بغیر

راستہ کوئی نہ جاتا تھا وہاں سے آگے
جہاں پہنچے تھے ہم اللہ تعالیٰ کے بغیر

بات بنتی کہیں اپنے بھی سروکار سے دُور
کام چلتا کوئی اُس کے بھی سراپا کے بغیر

دل سے باہر ہی پھرا کرتی ہے خواہش اُس کی
کوئی وحشی نظر آیا تو ہے صحرا کے بغیر

ہم وہاں پر ہیں جہاں رہ نہیں سکتا ہے، ظفرؔ
کوئی پیدا کے علاوہ نہ ہویدا کے بغیر

لفظ رہ جاتے ہیں سارے ہی معانی کے بغیر
یاد آتا نہیں کچھ یاد دہانی کے بغیر

میرے صحراؤں میں تو خاک بھی اُڑتی نہیں اب
اور دریا ہیں اِسی طرح سے پانی کے بغیر

بے خبر ہوں، مگر اتنا بھی نہیں جب چاہوں
ڈھونڈ بھی سکتا ہوں میں اُس کو نشانی کے بغیر

رابطہ بھی نہیں رکھا ہُوا میں نے اُس سے
رہ بھی سکتا نہیں اُس دشمنِ جانی کے بغیر

ساز و ساماں کوئی تھا ہی نہیں خود میرے سِوا
آن پہنچا ہوں یہاں نقل مکانی کے بغیر

جو مرے سامنے ہوتا ہے وہی کچھ مرے بعد
ہوتا رہتا ہے مری ہستیٔ فانی کے بغیر

پُرسکوں شہر میں کچھ اور بھی ہوں گے، میں بھی
بہت آرام سے ہوں جوشِ جوانی کے بغیر

کُلّیات آپ مرا شوق سے پڑھ جائیں، مگر
اِس میں کچھ بھی نہیں ژولیدہ بیانی کے بغیر

ہوں تو جیسا بھی مگر میں وہ عمارت ہوں ظفرؔ
جس کی بنیاد ہی رکھی گئی بانی کے بغیر

آشیانہ نہیں لگ رہا
یہ ٹھکانہ نہیں لگ رہا

اور اپنا اب اِس شہر میں
آب و دانہ نہیں لگ رہا

جس زمانے میں رہتے تھے ہم
وہ زمانہ نہیں لگ رہا

جس سے مِلتا تھا کچھ، یہ تو وہ
آستانہ نہیں لگ رہا

نوحہ خوانی کہاں تک سنیں
وہ ترانہ نہیں لگ رہا

سعی ہر بار کرتے بھی ہیں
اور نشانہ نہیں لگ رہا

زور اس پر ہمارا بھی کچھ
غائبانہ نہیں لگ رہا

شعر کہنے چلے ہیں، کوئی
کارخانہ نہیں لگ رہا

وہ حقیقت نہیں ہے، ظفرؔ
جو فسانہ نہیں لگ رہا

پاس آتا نہیں لگ رہا
دُور جاتا نہیں لگ رہا

وہ مرے آسماں پر ابھی
جِھلملاتا نہیں لگ رہا

بات سنتا نہیں، ساتھ ہی
کچھ بتاتا نہیں لگ رہا

سب کرشمے دِکھاتا نہیں
اور، چھپاتا نہیں لگ رہا

یہ ہَوائیں اُسی کی ہیں جو
سرسراتا نہیں لگ رہا

دل دُکھاتا بہت ہے، مگر
دل دُکھاتا نہیں لگ رہا

باغ میں کام اُسی کا ہے جو
گُل کِھلاتا نہیں لگ رہا

ظاہر ایسے کرے گا کہ وہ
مسکراتا نہیں لگ رہا

خاک وحشی ظفؔر ہے اگر
دُھول اُڑاتا نہیں لگ رہا

بوجھ اُتارا نہیں لگ رہا
مجھ سے لارا نہیں لگ رہا

کچھ گزارا نہیں لگ رہا
دل ہمارا نہیں لگ رہا

خرچ ہم ہو رہے ہیں، اُدھر
کچھ تمھارا نہیں لگ رہا

یہ منافع نہیں ہے، مگر
کیوں خسارہ نہیں لگ رہا

منتشر ہو رہا ہے ہجوم
مجھ سے نعرہ نہیں لگ رہا

پُرزے پُرزے یہ دن بھی مجھے
پارہ پارہ نہیں لگ رہا

کاٹ اِس کی کبھی دیکھیے
یہ جو آرا نہیں لگ رہا

دیکھتے ہیں اُسی کو سبھی
جو نظارا نہیں لگ رہا

استعارہ بھی اب تو، ظفؔر
استعارہ نہیں لگ رہا

میں جو مرتا نہیں لگ رہا
کچھ بھی کرتا نہیں لگ رہا

اس اکیلے سفر میں کہیں
میں ٹھہرتا نہیں لگ رہا

ہے بہت وہ بھی ہتھیار بند
میں بھی ڈرتا نہیں لگ رہا

کوئی پانی میں اُترے بغیر
پار اُترتا نہیں لگ رہا

باندھتا ہوں ارادے بہت
کر گزرتا نہیں لگ رہا

یہ ہے چوکھٹ اُسی کی تو میں
کیوں پسرتا نہیں لگ رہا

جس کے ذمّے ہے سب کام وہ
کرتا دھرتا نہیں لگ رہا

میں ہی کرتا رہا ہوں یہاں
میں ہی بھرتا نہیں لگ رہا

کیا ہُوا ہے کہ جس میں، ظفرؔ
میں بکھرتا نہیں لگ رہا

آنی جانی نہیں لگ رہا
کچھ بھی فانی نہیں لگ رہا

کیا کہوں، لفظ کا یہ نچوڑ
مجھ کو معنی نہیں لگ رہا

یوں یہ دریا تو بھرپور ہے
اِس میں پانی نہیں لگ رہا

اب تو اُس کا بھی حسنِ سلوک
مہربانی نہیں لگ رہا

اور کب تک سنوں واقعہ
جو کہانی نہیں لگ رہا

یہ سفینہ بھی اب تو مجھے
بادبانی نہیں لگ رہا

ویسے لگنے کو یہ سب سفر
رائگانی نہیں لگ رہا

ہو بھی سکتا ہے، لیکن خدا
لامکانی نہیں لگ رہا

ٹوٹ کر بھی زمیں سے ظفرؔ
آسمانی نہیں لگ رہا

عیب عالی نہیں لگ رہا
اور، مثالی نہیں لگ رہا

بے مزہ ہو گئی شاعری
لفظ گالی نہیں لگ رہا

لوگ کرنے لگے اعتبار
شعر جعلی نہیں لگ رہا

آ رہا ہے اک ایسا خیال
جو خیالی نہیں لگ رہا

ہاتھ پھیلا بھی رکھا ہے، اور
میں سوالی نہیں لگ رہا

کر گئے لوگ ہجرت، مگر
شہر خالی نہیں لگ رہا

ایک مدّت سے اس شہر کا
کوئی والی نہیں لگ رہا

باغ اُس کے ہُوا ہے سپرد
جو کہ مالی نہیں لگ رہا

ایک مصرع ہی دِکھلا، ظفرؔ
جو جُگالی نہیں لگ رہا

کوئی چارہ نہیں لگ رہا
اور، دوبارہ نہیں لگ رہا

ڈوبنا چاہتا ہوں، مگر
یہ کنارہ نہیں لگ رہا

میرے ماتھے بہت دیر سے
اک ستارہ نہیں لگ رہا

کچھ سمجھ کا مری پھیر ہے
یا اشارہ نہیں لگ رہا

رات بیتی نہیں لگ رہی
دن گزارا نہیں لگ رہا

بات پوری نہیں ہو رہی
زور سارا نہیں لگ رہا

کیسے تعمیر ہو اب نئی
اینٹ گارا نہیں لگ رہا

شعر ہوتا ہے ویسے تو ٹھیک
کچھ کرارہ نہیں لگ رہا

خوش نہیں ہے اگرچہ ظفرؔ
مارا مارا نہیں لگ رہا

یہ جو قابو نہیں لگ رہا
مجھ کو آہو نہیں لگ رہا

مدّتیں ہو گئیں، اک طرف
وہ ہی بدخُو نہیں لگ رہا

اب دعا ہی لگے تو لگے
کوئی دارُو نہیں لگ رہا

شورِ شیون پہ ہے انحصار
زورِ بازو نہیں لگ رہا

ناؤ منجدھار میں پھنس گئی
ہاتھ چپّو نہیں لگ رہا

اور تو لگ رہا ہوں وہی
ایک آنسو نہیں لگ رہا

سامنے ہے مرے دیر سے
یہ مگر تُو نہیں لگ رہا

خار و خس ہے وہی چار سُو
مجھ سے جھاڑو نہیں لگ رہا

جس کے اطراف تھے سب، ظفرؔ
وہ بھی ہر سُو نہیں لگ رہا

میری باتوں کو نیا رنگ لگانے والے
اِس بہانے ہیں یہاں جنگ لگانے والے

کیا پھلے پھولے ہیں نفرت کے یہ پودے ہر سُو
دیکھ کر رہ گئے ہیں دنگ، لگانے والے

اہلِ دُنیا کا تو حربہ نہ چلا کچھ ہم پر
ہیں اب اپنا ہی کوئی ڈھنگ لگانے والے

دل کے پتھر پہ گرا کرتے تھے آنسو جو کبھی
ہیں اِس آئنے کو بھی زنگ لگانے والے

آج کر سکتے ہیں کیا آدمی کی پیمائش
یہ جریبِ نسب و ننگ لگانے والے

ڈھونڈنے نکلو تو موجود ہیں اندر باہر
اس خموشی کو بھی آہنگ لگانے والے

اب تو پرہیز کا ہی سارا چلن ہے ہر سمت
کبھی ہوتے تھے یہاں انگ لگانے والے

کیا مرے عیب و ہنر کا کرے اندازہ کوئی
تولنے میں بھی یہ پاسنگ لگانے والے

خود سفر پر کبھی نکلیں گے تو دیکھیں گے، ظفرؔ
راستے میں نئے فرسنگ لگانے والے

حرفِ دل جوئی کے طومار لگانے والے
بیچ میں چھوڑ گئے پار لگانے والے

رہ گئے ہیں یہی تسلیم و رضا کے پیکر
کیا ہُوئے نعرۂ انکار لگانے والے

تربیت آپ بھی حاصل کوئی کرتے، مجھ پر
اعتراضات کے انبار لگانے والے

پھر کہیں شہر سے درویش وہی ہے غائب
منتظر بیٹھے ہیں دربار لگانے والے

مُنہ چھپائے ہُوئے پھرتے ہیں بھری دُنیا سے
داغِ عزت سرِ دستار لگانے والے

ہم ہی تھے شاید اِس اُلجھے ہُوئے سناٹے میں
ایک آوازہ لگاتار لگانے والے

کبھی کُھل کھیلنے پر خود ہمیں اُکسائیں گے
آج پابندیٔ اظہار لگانے والے

مال اپنا ہُوا معدوم تو اب آئے ہیں
دُور و نزدیک سے، بازار لگانے والے

پہلے مسمار تو کرنا تھا اسے جانِ ظفرؔ
جس کھنڈر پر ہو یہ معمار لگانے والے

ہیں کوئی اور ہی تدبیر لگانے والے
ہم نہیں آپ کی تصویر لگانے والے

ہمیں اِس عشق سے دُوری جو نہیں تھی منظور
خود ہی تھے پاؤں کو زنجیر لگانے والے

سچ اگر پوچھیے تو بخشے ہُوئے لوگ تھے وہ
آپ کے صحن میں انجیر لگانے والے

آپ ہی کی نہیں تھی جیسے کشیدہ وہ کماں
یا کوئی اور تھے وہ تیر لگانے والے

میں جو کچھ بھی نہیں کرتا ہوں تو فارغ ہیں کہاں
میرے ذمے کوئی تقصیر لگانے والے

گھٹتے گھٹتے ہُوئے معدوم ہی ایسے کہ نہ پوچھ
رات دن نعرۂ تکبیر لگانے والے

جب کسی میں نہیں توفیق تو ہم آپ ہُوئے
شعر کو تمغۂ تاثیر لگانے والے

کوئی تعریف تو کرنے کا رَوا دار نہیں
ہر طرف پھرتے ہیں تعزیر لگانے والے

ایک دَم چاروں طرف روشنی کر دیتے تھے
ظفرؔ، آوازۂ شب گیر لگانے والے

اب جو اَوروں کو ہیں القاب لگانے والے
تھے ہمیں بھی پرِ سُرخاب لگانے والے

سُننے والوں کو ابھی جاگتے رہنا ہے کہ ہم
داستاں میں ہیں نیا باب لگانے والے

ڈوب کر بھی کوئی فارغ تو نہیں بیٹھے ہیں
محفلیں اپنی تہہِ آب لگانے والے

یوں بُجھانی بھی ہمیں خود بھی پڑی ہے کہ یہ آگ
تھے کوئی اپنے ہی احباب لگانے والے

کر گئے ہیں مری ہر شام اندھیروں کے سپرد
کھڑکیوں میں کبھی مہتاب لگانے والے

کرتے رہتے ہیں عبادت میں بھی محنت کتنی
اپنے ماتھوں پہ یہ محراب لگانے والے

چمنِ شعر شگفتہ ہے کہ باقی ہیں ابھی
رَوِشوں پر گلِ نایاب لگانے والے

کام اچھے نہیں، لیکن مجھے کرنا ہی پڑے
یہی الفاظ پہ اَعراب لگانے والے

دوسروں سے، ظفرؔ، اچھے بھی وہی رہتے ہیں
خیمۂ وصل پسِ خواب لگانے والے

٥

ستم کی تیز تُنک دھار سے نہیں مرتا
خیال ہے، کسی تلوار سے نہیں مرتا

رہے گا زندہ کہ ہے زندگی کی خُو جس میں
کوئی بھی میری تری مار سے نہیں مرتا

یہ زندہ رکھتے ہیں اُلٹا مجھے، سو میں ہرگز
معاملات کی بھرمار سے نہیں مرتا

مرے لیے ہے یہ جینے کا اک بہانہ، سُو میں
اِسی لیے دلِ بیمار سے نہیں مرتا

یہ لوگ موت کو خود ہی گلے لگاتے ہیں
یہاں کوئی کسی آزار سے نہیں مرتا

ہم اپنا کام الگ کر چکے ہیں خود سے کہ یہ
ہماری موت کے آثار سے نہیں مرتا

ہے اِس کی موت یہ اظہار کی فراوانی
کہ شعر قلّتِ اظہار سے نہیں مرتا

ہمارے مال کا گاہک نہیں، نہ ہو بے شک
یہ سرد مہریٔ بازار سے نہیں مرتا

وہ مار ڈالے گا اقرار سے تجھے جو، ظفرؔ
سمجھ گیا ہے یہ انکار سے نہیں مرتا

اپنا ہی فلک، اپنی زمیں چاہیے مجھ کو
اِس وقت، ابھی اور یہیں چاہیے مجھ کو

اب یاد نہیں چاہیے کیا، اور کہاں پر
حالاں کہ کوئی چیز کہیں چاہیے مجھ کو

جو شے کبھی تھی ہی نہیں دراصل جہاں پر
حیراں ہوں وہی اور وہیں چاہیے مجھ کو

حیرت ہے کہ اِس اتنی چکاچوند کے باوصف
کھڑکی میں کوئی ماہِ مبیں چاہیے مجھ کو

تعمیر جو کر بیٹھا ہوں مرضی کے مطابق
اِس گھر کے لیے کوئی مکیں چاہیے مجھ کو

یہ فیصلہ اب لوگ ہی کرتے ہیں کہ ہر وقت
کیا چاہیے، کیا چیز نہیں چاہیے مجھ کو

میں تاکہ اُسے بھیج سکوں اور بھی آگے
جو دُور ہے اور اپنے قریں چاہیے مجھ کو

فی الحال جو درکار مجھے ہے وہ ہے کچھ اور
یہ سب تو کہیں بعد ازیں چاہیے مجھ کو

بے شک رہے اوروں کی ضرورت بھی مقدّم
کچھ تو ظفرؔ اپنے بھی تئیں چاہیے مجھ کو

کیا جانیے کیوں بارِ دگر چاہیے مجھ کو
کچھ دن مرا چھوڑا ہُوا گھر چاہیے مجھ کو

اِس خواب پہ اب جی نہیں سکتا ہوں زیادہ
اب خواب کے اندر کی خبر چاہیے مجھ کو

میں پھاند بھی لیتا ہوں اِسے وقتِ ضرورت
لیکن کبھی دیوار میں در چاہیے مجھ کو

سمت اپنی بدل لیتا ہوں میں آپ ہی، ورنہ
ہوتا ہے اُدھر ہی وہ جدھر چاہیے مجھ کو

کر لوں گا اِرادہ بھی محبت کے سفر کا
فی الحال تو کچھ زادِ سفر چاہیے مجھ کو

اب چیز مکمل مجھے اچھی نہیں لگتی
ہر شے میں کہیں کوئی کسر چاہیے مجھ کو

چڑیاں بھی چلی آئیں گی اور شور بھی ہو گا
اِس شام کے آنگن میں شجر چاہیے مجھ کو

دِکھلاتا ہوں الفاظ کا نیرنگِ تماشا
تاثیر سے مطلب نہ اثر چاہیے مجھ کو

ظاہر نہیں کرتا ہوں، ظفرؔ اِس کی ضرورت
کہتا نہیں کیوں صاف اگر چاہیے مجھ کو

میرے جو آس پاس تھی دُنیا کہیں سے لاؤ
پھر مجھ کو چاہیے ہے، دوبارہ کہیں سے لاؤ

جس سے بُجھے ہُوئے بھی جل اُٹھیں سبھی چراغ
ایسی کوئی ہوائے تماشا کہیں سے لاؤ

رویا ہُوا لہو کہیں مِلتا نہیں اگر
کھویا ہُوا وہ خواب ہی میرا کہیں سے لاؤ

ایسے تو آئے دن ہُوا کرتے ہیں واقعات
جیسا کبھی ہُوا نہیں، ایسا کہیں سے لاؤ

اک عمر سے رُکا ہُوا ہے راہ میں کہیں
جو آ نہیں رہا وہ زمانہ کہیں سے لاؤ

اوروں کے ساتھ بھی یونہی لاتے رہو، مگر
ایک آدھ بار تو اُسے تنہا کہیں سے لاؤ

ہو اتنی روشنی کہ نظر کچھ نہ آ سکے
یہ آب و تاب کم ہے، زیادہ کہیں سے لاؤ

رکھتے ہیں لین دین کا پورا یہاں حساب
واپس کرو گے اُتنا ہی، جتنا کہیں سے لاؤ

جس میں سبھی کا حق ہو برابر کا، اے ظفرؔ
تقسیم کے لیے وہ خزانہ کہیں سے لاؤ

موجیں وہ مارتا ہُوا پانی کہیں سے لاؤ
پانی اگر نہیں تو روانی کہیں سے لاؤ

تبدیل اِس طرح تو نہ ہوں گے یہ روز و شب
تھوڑی طبیعتوں میں گرانی کہیں سے لاؤ

یہ طرزِ نو کا شعر بہت خوب ہے، مگر
کچھ اس کے ساتھ وضع پرانی کہیں سے لاؤ

کرتا نہیں لکھے ہُوئے پر کوئی اعتبار
کوئی خبر جو ہے تو زبانی کہیں سے لاؤ

رونق تمام اُس کے نہ ہونے سے ہے یہاں
وہ ہے اگر تو اُس کی نشانی کہیں سے لاؤ

ہو گا مِلا جُلا ہی یہاں کاروبار اب
جو واقعہ بھی ہو وہ کہانی کہیں سے لاؤ

کرنا ہے دوستوں نے بھی ویسا ہی کام اگر
میرے لیے وہ دشمنِ جانی کہیں سے لاؤ

کرنا تھا میں نے لفظ کو زندہ سو کر دیا
اب اطّلاعِ مرگِ معانی کہیں سے لاؤ

پہلا تو کھینچ تان کے موزوں ہُوا، ظفرؔ
اب ہو سکے تو مصرعِ ثانی کہیں سے لاؤ

موجود ہے وہ اُس کو سراسر کہیں سے لاؤ
آگے نہ آسکے تو برابر کہیں سے لاؤ

میں مستقل ہی اُس کا طلب گار ہوں، مگر
فی الحال تو اُسے کوئی دَم بھر کہیں سے لاؤ

خوشبو بھی جو بکھیرتا ہو چاندنی کے ساتھ
اِس بار تو وہ ماہِ معطر کہیں سے لاؤ

جو پردۂ نظر پہ اُترتا نہیں ہے صاف
دیکھوں پھر ایک بار، وہ منظر کہیں سے لاؤ

پھرتا ہے کس خیال میں جانے اِدھر اُدھر
وہ گھر کا آدمی ہے، اُسے گھر کہیں سے لاؤ

خیراتِ بوسہ گھر تو نہیں آ کے دے گا وہ
ڈھونڈو کہیں پہ اُس کو، سو جا کر کہیں سے لاؤ

اُس کا حساب ہونا تو ہو گا مآلِ کار
کم کم کہیں سے لاؤ کہ اکثر کہیں سے لاؤ

کوئی سراغ شامِ صدا سے ہو سُرخ رُو
کوئی چراغ بامِ ہوا پر کہیں سے لاؤ

باہر جو دُور دُور ٹہلتا ہے، اے ظفر
اک رات اُس کو خواب کے اندر کہیں سے لاؤ

تدبیر کچھ کرو، کسی عنواں کہیں سے لاؤ
مشکل ہے جو بہت اُسے آساں کہیں سے لاؤ

لا کر اُنھیں بتاؤ، بدلنے کو ہے یہ رُت
حیراں کہیں سے لاؤ، پریشاں کہیں سے لاؤ

میں خود تو واپس آنے کے قابل نہیں رہا
زحمت اُٹھاؤ، مجھ کو پشیماں کہیں سے لاؤ

گھر میں ہی خاک اُڑائیے کب تک اِسی طرح
باہر نکل کے اپنا بیاباں کہیں سے لاؤ

لوگوں کو اعتراض ہی باقی نہیں رہا
پنہاں کہیں سے لاؤ کہ عریاں کہیں سے لاؤ

آ کر کسی کے زخم پہ مرہم رکھو کبھی
جا کر کسی کے درد کا درماں کہیں سے لاؤ

اندر کے موسموں کا بھی ہے اُن پہ انحصار
وہ ابر، وہ ہَوا وہ گلستاں کہیں سے لاؤ

ٹھہری ہُوئی ہے رات بہت دیر سے اِدھر
جیسے بھی ہو، وہ صبحِ گریباں کہیں سے لاؤ

جو ہر طرح سے کُفر کی ٹکر کا ہو، ظفر
ایسے ہی ڈیل ڈول کا ایماں کہیں سے لاؤ

تصویرِ تیرگی میں اُجالا کہیں سے لاؤ
گر وہ نہیں تو اُس کا حوالہ کہیں سے لاؤ

چپ چاپ بہہ رہا ہے تو کافی نہیں ہے یہ
اِس آبِ آرزو میں اُچھالا کہیں سے لاؤ

خود بھی یہاں سے نقلِ مکانی کرو شروع
میرے لیے بھی دیس نکالا کہیں سے لاؤ

رونے لگا ہوں آ کے ہنسا دو مجھے کہیں
گرنے کے ہوں قریب، سنبھالا کہیں سے لاؤ

آنکھیں بھی ہوتی جائیں تر و تازہ ایک بار
دیکھا ہو جس کو اور نہ بھالا، کہیں سے لاؤ

یہ کام وہ ہے جو مرا دیکھا ہُوا ہے سب
لازم ہے کوئی طور نرالا کہیں سے لاؤ

طبعِ رواں کو روک سکوں جس سے ایک دم
موجود ہے اگر تو وہ آلہ کہیں سے لاؤ

کرنا کسی کے عیب و ہنر کا حساب پھر
پہلے تمیزِ ادنیٰ و اعلیٰ کہیں سے لاؤ

جنگل میں مور ناچ رہا ہے ابھی، ظفرؔ
جلدی سے کوئی دیکھنے والا کہیں سے لاؤ

ہوتے نہیں جو چاند ستارے کہیں سے لاؤ
اور، لاسکو تو سارے کے سارے کہیں سے لاؤ

ہم چاہتے ہیں بارِ دگر اُن کو دیکھنا
کھوئے ہُوئے وہ خواب ہمارے کہیں سے لاؤ

پہلے بھی لا چکے ہو، بہت شکریہ، مگر
اُس دیرِ آشنا کو دوبارے کہیں سے لاؤ

پانی میں سمت ہی کوئی باقی نہیں رہی
میرے کٹے پھٹے وہ کنارے کہیں سے لاؤ

عبرت کی خاطر اُن کو ذرا میں بھی دیکھ لوں
وہ وعدۂ وصال کے مارے کہیں سے لاؤ

ہمّت فزائی کے مجھے دو لفظ تھے بہت
میں نے یہ کب کہا تھا سہارے کہیں سے لاؤ

میں دیکھتا ہوں کچھ مرے بس میں جو تھا کبھی
تھے جو وہ اختیار تمھارے کہیں سے لاؤ

نکلا ہے پھر جلوسِ محبت اُسی طرح
میں تو بُھلا چکا ہوں، وہ نعرے کہیں سے لاؤ

مدّت سے پھُسپھسا ہے، ظفرؔ منہ کا ذائقہ
دو چار شعر آج کرارے کہیں سے لاؤ

مزہ کچھ تو ملے گا موج کو منجدھار کرنے میں
بھلے ہی ڈوب جاؤں میں یہ دریا پار کرنے میں

محبت لفظ تھا، مشکل بہت پیش آئی تھی ہم کو
جسے مستور رکھنے میں، جسے اظہار کرنے میں

یہ لگتا ہے، لگے گی اور کافی دیر دُنیا کو
ہمیں اک دن تمھارے خواب سے بیدار کرنے میں

تمھیں پہنچا ہو کوئی فائدہ اِس کا تو پہنچا ہو
ہمیں دوبارہ اِن حالات سے دوچار کرنے میں

ہماری موت کو کچھ اور بھی آسان ہونا تھا
ہماری زندگی کچھ اور بھی دُشوار کرنے میں

کبھی لپکا تھا جن کو اک جگہ مِل جُل کے رہنے کا
وہی اب مُستعد ہیں درمیاں دیوار کرنے میں

گڑھے بھی کھودنے کا کام ساتھ اِس کے رہا جاری
بہت مصروف تھے جب راستہ ہموار کرنے میں

لگاتے اینٹ ایک آدھ اپنی بھی تعمیر میں کوئی
وہ جن کی عمر گزری ہے مجھے مسمار کرنے میں

ظفؔر، کس سے شکایت کیجیے جا کر، کہ بیش و کم
ہمارا ہاتھ بھی ہے اُس کو دُنیادار کرنے میں

ہیں نقصانات یوں تو اور بھی تعجیل کرنے میں
میں خود معدوم ہو جاتا ہوں کچھ تشکیل کرنے میں

ہمارا وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے اور ہم بھی
ہنر مندی سی کچھ رکھتے ہیں قال و قیل کرنے میں

محبت پر ذرا اک تازگی آجائے گی اِس سے
سو، کیا نقصان ہے لمبی سی ایک تعطیل کرنے میں

کئی اسباب ایسے اور بھی موجود ہیں، یہ بھی
رکاوٹ ہے تمھارے حکم کی تعمیل کرنے میں

بُرا بھی شعر کہنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے
مدد کرتا ہے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے میں

اِسی مصروفیت میں رات دن رہتے ہیں، کیا کیجے
کہیں ارسال ہونے میں، کہیں ترسیل کرنے میں

نکالی ہیں کئی خود شعر کی زنجیر سے کڑیاں
مکمل صورتِ اظہار کی تقلیل کرنے میں

میں اُن الفاظ کا بہتر کوئی مصرف نکالوں گا
جو استعمال ہوں گے آپ کی تذلیل کرنے میں

ظفرؔ، اُس کو اَدھورا چھوڑ دو اب بھی تو بہتر ہے
پریشانی میں ہو جس کام کی تکمیل کرنے میں

غزل کہتے نہ خود کو اِس قدر بدنام کر جاتے
کہیں ہم بھی شریفانہ سا کوئی کام کر جاتے

ہمارے بعد کُھلنا ہے اگر شاعر نہیں تھے ہم
یہ بہتر تھا اگر خود ہی صلائے عام کر جاتے

اَدھورا ہی نہ سب کچھ چھوڑ دیتے جیتے جی آخر
کسی آغاز کا ہم بھی کوئی انجام کر جاتے

غضب یہ ہے کہ صاف انکار بھی اُس سے نہ ہو پایا
کہ نااُمید ہو کر ہم بھی کچھ آرام کر جاتے

مکمل طور پر رُسوائی تو قسمت نہ تھی اپنی
وہ تھوڑا سا ہمیں بھی موردِ الزام کر جاتے

وہ عرضِ آرزو پر چھوڑتے ردِعمل کچھ تو
کہیں پر سرزنش ہوتی، کہیں دشنام کر جاتے

ہمارے سامنے ہوتا گھڑی بھر وہ رُخِ روشن
دھڑکتی دُھوپ کے اندر ہم اپنی شام کر جاتے

چلو اچھا ہُوا اُس بزم میں حاضر نہ تھے، ورنہ
وہاں بھی گفتگو ہم کوئی بے ہنگام کر جاتے

اِرادہ ہی نہیں تھا کامیابی کا ظفرؔ کوئی
یہی کچھ تھا کہ تھوڑی کوششِ ناکام کر جاتے

اگر ہم اور بھی لفظوں کو بے توقیر کر جاتے
کسی نے بھی نہ ہونا تھا، کسے دل گیر کر جاتے

ہماری بھی سمجھ میں شاعری اپنی نہیں آئی
وگرنہ ہم کسی صورت اِسے تفسیر کر جاتے

ہَوا میں تھا وہ سب کچھ، رہ گیا نذرِ ہَوا ہو کر
اگر ہوتا کسی قابل تو ہم تحریر کر جاتے

بہت کچھ آپ کے جلسے کی رونق ہی بڑھاتے ہم
کہیں نعرہ لگا دیتے، کوئی تقریر کر جاتے

گزر جاتے اِدھر سے بھی کسی دن بے نیازی سے
ہماری خاک پر چلتے، اِسے اکسیر کر جاتے

ابھی تو صبر کا پھل اور میٹھا ہونے والا تھا
سَو، بہتر تھا اگر ہم اور بھی تاخیر کر جاتے

نکل جانا تمھارے شہر سے اچھا بھی تھا، لیکن
کم از کم واپس آنے کی کوئی تدبیر کر جاتے

ہمارا انہدام اُس کے لیے ترجیح اوّل تھی
وگرنہ وہ یہاں اپنا بھی کچھ تعمیر کر جاتے

کُھلا ہی چھوڑ رکھا تھا ظفرؔ کو شہر میں ہم نے
وہ دیوانہ نہیں تھا، کس لیے زنجیر کر جاتے

کچھ خدا نے بھی ہے اِن حالات میں رکھا ہُوا
فرق ہے کچھ آپ نے بھی بات میں رکھا ہُوا

آنسوؤں کے زور میں بھی شعلۂ دل ہے بلند
جل رہا ہے یہ دیا برسات میں رکھا ہُوا

خود بھی میں چادر سے باہر پاؤں پھیلاتا نہیں
کچھ مجھے اُس نے بھی ہے اوقات میں رکھا ہُوا

دھوپ سی اس کے کناروں سے جھلکتی ہے ابھی
کوئی دن بھی ہے ہماری رات میں رکھا ہُوا

اندر اندر ہے کوئی بے برکتی بھی موج زن
قحط سا بھی ہے اِسی بُہتات میں رکھا ہُوا

دیکھنے کی چیز ہے، لیکن چھپانے کی بھی ہے
ہے جو اک منظر ترے باغات میں رکھا ہُوا

دیکھ لیتا ہے محبت سے تو ہے کیا یہ بھی کم
ورنہ کیا باقی ہے اپنی ذات میں رکھا ہُوا

میری ہوسکتی ہے اُس کے ساتھ کیا نسبت کہ وہ
ایک سورج ہے مرے ذرّات میں رکھا ہُوا

آپ بھی اپنے تئیں کوشش تو کرتے ہیں، ظفرؔ
اُس نے بھی سب کچھ ہے اپنے ہاتھ میں رکھا ہُوا

میرے احوال پہ جو حُزن و ملال آپ کا ہے
یہ خبر آپ کی ہے، اور خیال آپ کا ہے

دیر سے مائلِ پرواز ہوں میں اپنے تئیں
اور اطراف میں پھیلا ہُوا جال آپ کا ہے

اِس اشارے سے تو ہوتا نہیں یہ بھی معلوم
یہ جواب آپ کا ہے یا کہ سوال آپ کا ہے

دیکھ سکنے کا بھی امکاں نہیں اتنا اب تو
ہم کو معلوم ہے مِلنا تو محال آپ کا ہے

ہم کسی اور زمانے کے لیے تھے شاید
یہ صدی وہ ہے کہ ہر سال ہی سال آپ کا ہے

ہے مرے پاؤں میں زنجیر کسی اور کی بھی
اور، دن رات مرے سر پہ وبال آپ کا ہے

خرچ کرنے سے کسی طرح نہ ہو گا کہیں کم
کچھ اِسی طرح کا یہ مال و منال آپ کا ہے

کچھ مرے پاؤں ہے پکڑے ہُوئے یہ خاکِ سفر
کچھ مرے چاروں طرف خوابِ وصال آپ کا ہے

آپ جو اپنے کمالات پہ نازاں ہیں، ظفؔر
یہ بھی لکھ لیں کہ یہی عہدِ زوال آپ کا ہے

موسم کوئی بہتر نہ فضا چاہیے مجھ کو
تھوڑی سی کہیں تازہ ہوا چاہیے مجھ کو

کچھ خوف خرابی کہ الگ ہے مجھے درکار
اک طُرفہ تباہی کہ جُدا چاہیے مجھ کو

میں چاہتا ہوں کوئی توازن بھی ہو موجود
اچھا ہوں بہت اور بُرا چاہیے مجھ کو

یہ ذائقۂ زندگی اتنا نہیں مطلوب
کافی سے زیادہ ہے، ذرا چاہیے مجھ کو

اک وصل کی پُڑیا سے نکلتا ہے یہاں کام
بیماریٔ ہجراں کی دوا چاہیے مجھ کو

برسے نہ کہیں، اپنا سماں تو کوئی باندھے
ایسی کوئی گھنگھور گھٹا چاہیے مجھ کو

کچھ مستحق اتنا تو نہیں ہوں، مگر اِس وقت
موسیٰ نہیں میں، اور عصا چاہیے مجھ کو

دراصل تو شاید مجھے خود بھی نہیں معلوم
بدلے ہُوئے حالات میں کیا چاہیے مجھ کو

میں جُز کے ظفرؔ چاہتا ہوں بیٹھنا سب میں
ڈر ہے کوئی اور تنگیٔ جا چاہیے مجھ کو

کیا جانیے اچھی کہ بُری چاہیے مجھ کو
خواہش کوئی آنکھوں میں نئی چاہیے مجھ کو

یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ صورتِ زیبا
پھر چاہیے ہے یا کہ ابھی چاہیے مجھ کو

کیوں منتظر اُس کا ہوں ابھی سے، نہیں معلوم
اک چیز ہے ایسی جو کبھی چاہیے مجھ کو

پورے کسی شاداب شجر کا نہیں گاہک
ایک آدھ کوئی شاخ ہری چاہیے مجھ کو

میں ایک جگہ پر کبھی جم کر نہیں بیٹھا
اب کے بھی وہی در بہ دری چاہیے مجھ کو

ہوں اتنا زیادہ کہ سنبھالا نہیں جاتا
کافی کوئی اپنے میں کمی چاہیے مجھ کو

چھوڑا تھا جسے راہ میں بے صرفہ سمجھ کر
پھر اُس کی ضرورت ہے، وہی چاہیے مجھ کو

مدّت سے یہاں ہے مجھے کچھ اور ہی درکار
اِس عمر میں نیکی نہ بدی چاہیے مجھ کو

ہوتا ہے ظفؔر دونوں طرف رنگِ محبت
کوئی مجھے چاہے تو کوئی چاہیے مجھ کو

کیا کچھ نہ یہاں اور وہاں چاہیے مجھ کو
جو چاہتا ہوں وہ بھی کہاں چاہیے مجھ کو

میں ٹٹولنے آیا ہوں پُرانی کوئی بندش
کچھ بولنے آیا ہوں، زباں چاہیے مجھ کو

کچھ اپنے بھروسے پہ ہی چلنا ہے بہرطور
ہو گا کوئی موجود جہاں چاہیے مجھ کو

اندر سے ہی میں شاید اُسے ڈھونڈ نکالوں
اُس کا کوئی تھوڑا سا نشاں چاہیے مجھ کو

آخر تو نکالے گا جگہ میرے لیے بھی
ہوں اُس کا مکیں اور مکاں چاہیے مجھ کو

میں شہر سے باہر تو نکلنے کا نہیں تھا
دراصل کوئی جائے اماں چاہیے مجھ کو

سودا ہے مرے پاس بھی کچھ بیچنے والا
گھر کے کسی کونے میں دُکاں چاہیے مجھ کو

کرلوں گا بیاں بھی کوئی شامل کہیں اِس میں
فی الحال تو کچھ رنگِ بیاں چاہیے مجھ کو

کچھ دن سے، ظفرؔ شور ہے جتنا مرے اندر
کچھ طبع بھی اُتنی ہی رواں چاہیے مجھ کو

پلکوں پہ چمکتا ہُوا آنسو ہی بہت ہے
اتنی سی محبت کی یہ خوشبو بھی بہت ہے

کھینچا تو کھنچا آئے گا دل ساتھ ہی اِس کے
یہ تیرِ تغافل کہ ترازو ہی بہت ہے

قائم ہے محبت کا گماں جس کی بدولت
ہر لحظہ بدلتی یہ تری خُو ہی بہت ہے

کچھ دُھوپ ترے چہرے کی درکار ہے مجھ کو
اوروں کو ترا سایۂ گیسو ہی بہت ہے

میں کیسے نکل سکتا ہوں اِس خواب سے باہر
پھیلا ہُوا اطراف میں جادو ہی بہت ہے

تعمیر کیا دل کو بھرے شہر نے مِل کر
اور خانہ خرابی کے لیے تُو ہی بہت ہے

جاتے ہُوئے دیکھا تو ہے آج اُس نے پلٹ کر
حالات میں یہ فرق سرِ مو ہی بہت ہے

اب اِس کو بکھرنے میں بھی کچھ وقت لگے گا
کچھ دن سے طبیعت میری یک سُو ہی بہت ہے

خود سے ہوں، ظفؔر برسرِ پیکار شب و روز
اور مجھ کو مری قوتِ بازو ہی بہت ہے

کھپت ہوتی ہے ویسی مال کی جیسی ضرورت ہو
محبت اب وہاں ہو گی جہاں اُس کی ضرورت ہو

میں چادر سے زیادہ پاؤں پھیلایا نہیں کرتا
وسائل سے نہیں بڑھتی مری جتنی ضرورت ہو

ضروری ہی نہ تھی میرے لیے جو اَب کسی صورت
میں خود حیرت زدہ ہوں وہ مری اب بھی ضرورت ہو

روابط کچھ نہیں، اور کام پڑ جاتا بھی ہے اُس سے
کبھی ایسی ضرورت ہو، کبھی ویسی ضرورت ہو

کبھی تو اِس قدر مجبور بھی ہونا پڑا مجھ کو
کہ سوچا جس طرح بھی ہوسکے پوری ضرورت ہے

اندھیرا ہو ہمارے چار سُو، اور اُس اندھیرے میں
اندھیرا اور بھی کوئی ہو اور اندھی ضرورت ہو

چلے ہی آئے ہیں جب ہم تو اب کیا فرق پڑتا ہے
کوئی سچا تقاضا ہو، کوئی جھوٹی ضرورت ہو

زیادہ بوجھ بھی بننا نہیں چاہیں گے ہم اُس پر
پڑیں ساری کے پیچھے کیا اگر آدھی ضرورت ہو

ظفرؔ، طبعِ رواں رکھتی ہے مجھ کو تنگ بھی، یعنی
وہاں مضموں نکلتا ہے جہاں معنی ضرورت ہو

ہوا کے آئنے میں عکسِ آرزو کوئی تھا
وگرنہ میں ہی کہیں پر تھا اور نہ تُو کوئی تھا

مرا وجود بھی ہوتا گیا تھا خود روشن
کہ میرے سامنے اُس رات شمع رُو کوئی تھا

کسی طرف سے نکلنے کی راہ تھی نہ کوئی
میں درمیان میں اور میرے چار سُو کوئی تھا

جو اَب نہیں تو کبھی بھی نہیں کہ شام بہ شام
اِسی نواح میں اپنا بھی ہم سبو کوئی تھا

وہ جا چکا تھا جہاں سے وہاں پہ کیوں اب تک
رُکا رُکا ہُوا طوفانِ رنگ و بو کوئی تھا

اِنھی چھلکتے ہُوئے ساحلوں کے بیچ کہیں
بھرا پڑا کبھی دریائے نرم خُو کوئی تھا

نہیں مِلا تو ہے یہ اور بات، ورنہ یہاں
تمام عمر وہی میری جستجو کوئی تھا

نہیں بھی تھا تو رہے جابہ جا نشاں اُس کے
اگر وہ تھا تو سمجھ لو کہ ہُو بہ ہُو کوئی تھا

ظفرؔ کی یاد بس اتنی سی رہ گئی باقی
کہ شہر میں کبھی موضوعِ گفتگو کوئی تھا

یہ جو کہیں شگفتہ چمن چاہیے مجھے
سچ پوچھیے تو کوئی بدن چاہیے مجھے

جس میں سے میں ہواؤں کی صورت گزر سکوں
ایسا ہَرا بھرا کوئی بَن چاہیے مجھے

اِس تیرگی کو توڑنا بھی چاہتا نہیں
سورج کو چھوڑ، صرف کرن چاہیے مجھے

سونے کا آج یوں بھی اِرادہ نہیں مرا
بستر پہ ایک آدھ شکن چاہیے مجھے

درکار ہوں کسی کو، نہیں اتنی روشنی
میں چاند ہوں اگر تو گہن چاہیے مجھے

اک روز تاکہ اِس سے میں ہجرت بھی کر سکوں
کچھ اِس لیے بھی اپنا وطن چاہیے مجھے

میں مر چکا ہوں، اور نہیں چاہیے ہے کچھ
لفظوں کا پاک صاف کفن چاہیے مجھے

تعبیر کوئی بھی نہ ہو جس کی کسی کے پاس
ایسا ہی ایک خوابِ سخن چاہیے مجھے

کام اُس سے جیسے خاص پڑا ہو کوئی، ظفرؔ
حالاں کہ صرف بول بچن چاہیے مجھے

کتنا مجبور ہے دل اِس کو بتانا ہی پڑا
اپنی اوقات پہ آخر مجھے آنا ہی پڑا

اُس سے آگے تو کہیں کچھ بھی نہیں تھا، لیکن
اور کچھ دُور اُسی راہ پہ جانا ہی پڑا

تھے تو خوش باش بہت ہم مگر ایسے میں کہیں
کوئی ہم کو بھی یہاں رنج اُٹھانا ہی پڑا

دل نے روشن تو رکھی شامِ ملاقات، مگر
یہ چراغ اُس کی سفارش پہ بُجھانا ہی پڑا

ہم جو ہر حال میں تھے اُس کی رضا کے طالب
حرفِ انکار بھی آنکھوں سے لگانا ہی پڑا

حالتِ دل کا بیاں ایک حقیقت تھی، مگر
اِس میں بھی تھوڑا بہت جھوٹ مِلانا ہی پڑا

یاد کرنا ہی پڑا بھُولنے والے کو بہت
جس کو ہم یاد رہے اُس کو بھلانا ہی پڑا

سوچ پر کوئی نئی سوچ جو غالب آئی
اپنے لکھے ہُوئے کو آپ مٹانا ہی پڑا

اتنا بے رنگ تھا ہنگامۂ ہستی کو ظفرؔ
چار و ناچار اُسے ڈھونڈ کے لانا ہی پڑا

◆

پہلے ہی چاہیے تھا نہ اب چاہیے مجھے
جو چاہتا ہوں اصل میں کب چاہیے مجھے

خار و خسِ بدن تو ٹھکانے لگے کہیں
ایسے میں اُس کا شعلۂ لب چاہیے مجھے

مجھ پر تو کچھ کُھلے نہ کُھلے میری احتیاج
وہ آپ مان جائے گا جب چاہیے مجھے

میں انتخاب کر نہیں سکتا ہوں، اِس لیے
جو کچھ بھی دستیاب ہے، سب چاہیے مجھے

ہر چیز خرچ ہوتی چلی جا رہی ہے، جب
سارا ہی کچھ نمٹ گیا، اب چاہیے مجھے

میں آپ وقت میں سے گزرتا ہوں اِس طرح
دن چاہیے ہو اور نہ شب چاہیے مجھے

ہونا نہ ہونا اُس کا تو ہے بات بعد کی
پہلے تو دل میں اُس کی طلب چاہیے مجھے

چلتا نہیں ہے ڈھنگ پرانا تو میرے ساتھ
یعنی کچھ اور ہی کوئی ڈھب چاہیے مجھے

سنتا ہوں جس طرح کی بھی کہہ دے کوئی، ظفرؔ
حالاں کہ بات کوئی عجب چاہیے مجھے

اُسے خیال ہو میرا، مرا خیال نہیں
کہ بڑھ کے اس کے کوئی بے تُکا خیال نہیں

وہ ایک پھول جو دل میں مہکتا رہتا ہے
ہو شاید اور ہی کچھ، آپ کا خیال نہیں

مِلا جُلا تو کرو، پاس اگر نہیں رہتے
کہ یوں بھی ٹھیک ہے، یہ بھی بُرا خیال نہیں

یہ خواب سا جو بدن سے گزرتا رہتا ہے
کچھ اس خیال سے اپنا جُدا خیال نہیں

یہ دونوں اپنی روانی میں چلتے رہتے ہیں
نہیں خیال ہَوا، اور ہَوا خیال نہیں

کٹے گا سارا سفر کاٹنے سے ہی اب تو
ہے اور ہی کوئی شے، راستا خیال نہیں

یہ باندھنے سے کم و بیش ہو تو ہو، ورنہ
کچھ اپنی ذات میں کوئی بڑا خیال نہیں

جو سوچیے تو کئی رنگ سے بکھرنے لگیں
سو، اس طرح کا کوئی دوسرا خیال نہیں

اسی خیال کی شکلیں ہیں بے شمار، ظفرؔ
کہ یہ بھی کوئی بدلتا ہُوا خیال نہیں

خود سے کوئی غرض ہے نہ تُو چاہیے مجھے
اب دوست کے بجائے عدو چاہیے مجھے

بھرنا ہے میں نے اِس میں نئی آرزو کا رنگ
خالی ہی اپنے دل کا سبو چاہیے مجھے

جو سیدھی راہ سے مجھے بھٹکا دے ایک بار
چیلا سا چل پڑا ہوں، گُرو چاہیے مجھے

جس میں سِوائے اپنے مجھے سب دِکھائی دے
ایسا ہی ایک آئنہ رُو چاہیے مجھے

اُس کا وجود ہے مجھے درکار ہر طرف
وہ اِس نواح میں ہمہ سُو چاہیے مجھے

پہلی ہی طرح کا وہ گوارا ہے وہ، مگر
کچھ فرق اِس دفعہ سرِ مو چاہیے مجھے

ہنسنے کی خاطر ایک ہوا چاہیے جہاں
رونے کی خاطر ایک لہو چاہیے مجھے

اتنی تو ہو کہ میرا پسینہ ہی سوکھ جائے
ڈرتے ہیں جس سے لوگ وہ لُو چاہیے مجھے

کب سے پھٹا ہُوا ہے جو یہ آسماں، ظفرؔ
آنکھوں میں ایک خوابِ رفو چاہیے مجھے

سمٹا رہوں گا جس میں وہ حد چاہیے مجھے
کوتاہ دوسروں سے جو قد چاہیے مجھے

خوش وقت ہو سکوں تو بڑی بات ہے، مگر
کچھ اِس کے ساتھ نیتِ بد چاہیے مجھے

برکت زیادہ ہو گئی ہے میرے کام میں
ہلکا سا اہتمامِ حسد چاہیے مجھے

جتنا بھی ہوں زیادہ و کم، ٹھیک ہے، مگر
اِس میں کوئی شمار و عدد چاہیے مجھے

اندازہ اپنا میں بھی لگاؤں کسی طرح
تھوڑا سا طول و عرضِ بلد چاہیے مجھے

خرچہ چلا سکوں جو محبت کا ساتھ ساتھ
اتنی سی فالتو کوئی مد چاہیے مجھے

میں خود بھی آسرا کوئی کرتا ہوں پیش و کم
تھوڑی سی آپ کی بھی مدد چاہیے مجھے

ظاہر ہو مجھ سے میرے زمانے کی ہر خبر
رازِ ازل سے نہ رنگِ اَبد چاہیے مجھے

اوروں کا ذمّہ دار، میں ہرگز نہیں، ظفرؔ
اپنے لیے ہی اپنی سند چاہیے مجھے

یوں تو جینے کا جھمیلا نہیں جاتا مجھ سے
کھیل اب اور یہ کھیلا نہیں جاتا مجھ سے

مجھ کو بھی ساتھ ہی لے جائے گا جب جائے گا
رنگِ رُسوائی اکیلا نہیں جاتا مجھ سے

دل کے میدان میں اک بھیڑ لگی رہتی ہے
یہ تمناؤں کا میلہ نہیں جاتا مجھ سے

خواہشِ وصل پہ قابو نہیں چلتا میرا
اُونٹ یہ آج نکیلا نہیں جاتا مجھ سے

اب تو پانی بھی زیادہ نہیں گہرا اِس کا
پھر بھی ٹٹو یہاں ٹھیلا نہیں جاتا مجھ سے

چار و ناچار یہیں تک اُسے لے آیا ہوں
وقت کو اور دھکیلا نہیں جاتا مجھ سے

میری توفیق ہے پیچھے تو ہدف ہے آگے
دُور یہ اور غلیلہ نہیں جاتا مجھ سے

فالتو ہی سہی اِس جسم کی بوتل میں لہو
یہ سڑک پر بھی اُنڈیلا نہیں جاتا مجھ سے

سبھی رُخصت ہُوئے جو خواب پرانے تھے، ظفرؔ
یہ نیا اور نویلا نہیں جاتا مجھ سے

صبحیں کئی دنوں سے ہیں میری جو شام رنگ
کیا جانے کس طرف کو گئے ہیں تمام رنگ

آنا تھا جن کو آ نہ سکے، اور دُور تک
پھیلا ہُوا تھا چاروں طرف انتظام رنگ

اب جس قدر بھی طائرِ دل ہوشیار ہو
کیا بچ سکے کوئی جہاں دانہ ہو دام رنگ

انجام تو خبر نہیں کیا ہو، مگر یہاں
آغازِ کار میں بھی ہے اک اختتام رنگ

یہ کیا کہ اُس سے اپنی ملاقات بھی ہُوئی
اور دل سے دُور تر ہی رہا شادکام رنگ

کس سمت سے چڑھا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں
جس چاند نے دیئے ہیں یہ دیوار و بام رنگ

اچھا ہُوا کہ پہلی ہی بارش میں ڈھل گیا
دل پر چڑھا ہوا تھا کسی کا جو خام رنگ

بے کار بیٹھنا بھی مشقت سے کم نہیں
اپنے لیے تو ہے یہ فراغت بھی کام رنگ

اُلجھے ہُوئے جو خاص طریقوں میں ہیں، ظفرؔ
وہ کیا ہُوا جو آپ کا ہوتا تھا عام رنگ

اُس ذاتِ پاک کا یہ کرم چاہیے مجھے
سجدے کی خاطر ایک صنم چاہیے مجھے

اُس سے الگ بھی رہ نہیں سکتا ہوں میں اگر
یہ امتزاج بھی کوئی دَم چاہیے مجھے

پھر ایک بار اُس کے مُکرنے کی ہے طلب
دوبارہ اپنے سر کی قسم چاہیے مجھے

کیسے بتا سکوں اُسے اپنا مطالبہ
ہر وقت جو زیادہ و کم چاہیے مجھے

اپنی پسند کا مجھے اندازہ ہی نہیں
سارا ہی کچھ یہاں پہ بہم چاہیے مجھے

دونوں کے بَین بَین ہی درکار ہے، کہ آج
کچھ شہد چاہیے ہے نہ سَم چاہیے مجھے

جس پر اُڑا پھروں میں فضا میں خوشی خوشی
ایسا کوئی غبارۂ غم چاہیے مجھے

توصیف میں بھی ہجو کا امکاں ہو بیش و کم
تعریف میں بھی پہلوئے ذَم چاہیے مجھے

سیدھا سا ہے بیانِ محبت مرا، ظفرؔ
سر اُس کے آستانے پہ خَم چاہیے مجھے

سایہ اپنے ہی برابر نہیں آتا میرا
ایک سورج ہے کہ سر پر نہیں آتا میرا

واپسی کا یہ سفر اور طرح کا ہے کوئی
چلتا جاتا ہوں، مگر گھر نہیں آتا میرا

ہُو کا عالم ہے سراسیمگیٔ دل کی طرف
شور باہر سے جو اندر نہیں آتا میرا

چلتا جاتا ہوں بہت دیر سے میں ساتھ اِس کے
وہی دیوار ہے، اور در نہیں آتا میرا

ایک ہی بار بھی آنے کی غلط فہمی ہے
کوئی پیغام مکرر نہیں آتا میرا

مدّتوں سے مرے ایمان کو تازہ کرنے
کیوں میرے پاس وہ کافر نہیں آتا میرا

ایک تصویر میرے سامنے چلتی ہے، مگر
ایک دیکھا ہُوا منظر نہیں آتا میرا

میری پہچان ہی گُم ہونے لگی ہے اب تو
جو کچھ اندر ہے وہ باہر نہیں آتا میرا

آنے والا ہوں ابھی نرغۂ دشمن میں، ظفرؔ
اپنے میدان میں لشکر نہیں آتا میرا

رنگ پھولوں پہ فراواں نہیں آتا میرا
پاس چل کر جو گلستاں نہیں آتا میرا

پردۂ خواب پہ امکان ہے میرا بھی، مگر
داستاں آتی ہے، عنواں نہیں آتا میرا

اپنی ہی خاک اُڑانی ہے مجھے آخرِ کار
راستے میں جو بیاباں نہیں آتا میرا

کیا مُہم ہے مجھے درپیش کہ اِس میں اکثر
مرحلہ کوئی بھی آساں نہیں آتا میرا

سب کے ہی ساتھ لگا میں بھی کھڑا ہوں، لیکن
کوئی باری، کوئی امکاں نہیں آتا میرا

کھاتے اپنے میں ہی پڑ جاتا ہے جو کچھ بھی کروں
سر کسی اور کے احساں نہیں آتا میرا

جتنی کوشش بھی کروں، دامنِ دل پر اُس کے
رنگ اتنا بھی نمایاں نہیں آتا میرا

یہ سفر وہ ہے کہ میں نیم دِلی سے ہوں رواں
راہ میں قریۂ ویراں نہیں آتا میرا

خواہشیں اس کی وہیں ہیں جہاں چھوڑی تھیں، ظفرؔ
خود تو آ پہنچا ہوں، ساماں نہیں آتا میرا

حال اگر اور پریشاں نہیں کرتے میرا
کام جیسا بھی ہے آساں نہیں کرتے میرا

لاعلاج ایک تو میرا یہ مرض بھی ہے بہت
اور کچھ آپ بھی درماں نہیں کرتے میرا

زور مجھ میں بھی وہ اگلا سا نہیں ہے باقی
شور کچھ وہ بھی فراواں نہیں کرتے میرا

خود ہی مسمار ہُوا جاتا ہے رفتہ رفتہ
شہر کچھ آپ تو ویراں نہیں کرتے میرا

آئنہ بندئ گلشن میں ہی مصروف ہیں بس
اِرد گرد اور تو حیراں نہیں کرتے میرا

میں بھی غارت گرِ موسم ہوں کہیں ساتھ اُن کے
لوگ ہی باغ بیاباں نہیں کرتے میرا

ہاتھ اپنے ہی مددگار نہیں ہو سکتے
یہ اگر چاک گریباں نہیں کرتے میرا

تا کہ لوگوں میں بھی عزت مری باقی نہ رہے
ذکر کرتے ہیں تو پنہاں نہیں کرتے میرا

وہ ظفرؔ، میرے بھی خواہ نہیں ہو سکتے
جو کوئی عیب نمایاں نہیں کرتے میرا

پوری کی طرح کے نہ اُدھوری کی طرح کے
لگتے ہیں یہاں کام عبوری کی طرح کے

اِس موجِ محبت کو ترستے ہیں کہ جب ہم
دُوری میں بھی ہوتے ہیں حضوری کی طرح کے

اُس شوخ کی خصلت میں جو ہے تلخی و تُرشی
کچھ ذائقے اِس میں بھی ہیں چُوری کی طرح کے

کچھ اُس کے رویّے نے بھی ڈالا ہے خلل سا
کچھ ہے بھی دماغ اپنے فتوری کی طرح کے

رہ جاتے ہیں جو اُس کی ملاقات میں ہر بار
ہوتے ہیں بہت کام ضروری کی طرح کے

ناراض ہو جن طور طریقوں پہ ہمارے
ہوتے ہیں ذرا غیر شعوری کی طرح کے

بے صبر جنھیں کہتے ہو، دیکھو تو اُنھی کے
اطوار ابھی تک ہیں صبوری کی طرح کے

کچھ زاویہ بینائی کا ہو جائے اگر ٹھیک
ناری بھی لگیں گے ہمیں نوری کی طرح کے

اِس خاکِ خبردار کے جلوے تو، ظفرؔ دیکھ
سرسبز کی صورت، کہیں بھُوری کی طرح کے

اِس عافیت میں برقِ بَلا سے مجھے گزار
ہوں مستجاب، دشتِ دُعا سے مجھے گزار

اک طرح سے ہوں میں بھی ترا دوسرا بدن
آج اپنے ساتھ اپنی قبا سے مجھے گزار

میں اپنے رنگ بھولتا جاتا ہوں سر بہ سر
گر ہو سکے تو میری صدا سے مجھے گزار

یوں ہی پڑا رہوں گا پسینے میں تر بہ تر
چاہے کسی طرف کی ہَوا سے مجھے گزار

پہلے ہی مرچکا ہوں تو پھر زندہ کر مجھے
زندہ ہوں میں تو قوسِ قضا سے مجھے گزار

گرنے میں اور سنبھلنے میں کوئی رہے نہ فرق
کچھ اِس طرح کی لغزشِ پا سے مجھے گزار

صرف ایک بار مجھ سے جدا کر مجھے کہیں
صرف ایک بار اپنی فضا سے مجھے گزار

یہ مُعجزہ بھی تو ہی سر انجام دے تو دے
کوشش کر اور تنگیٔ جا سے مجھے گزار

اِن چیتھڑوں میں مجھ کو اُلجھنا نہیں، ظفرؔ
ہرگز نہ اپنی خواب سَرا سے مجھے گزار

مانوس اجنبی سہی، گھر سے مجھے گزار
مثلِ ہوا دریچہ و در سے مجھے گزار

اِس راستے سے میرے گزرنے کی بات چھوڑ
پہلے تُو آ کے گردِ سفر سے مجھے گزار

اتنے ہجوم سے میں نکل پاؤں گا نہ خود
آ، اور یہاں پہ اپنے ہُنر سے مجھے گزار

میری تلاش میں کبھی نکلے تھے، اور جو
خود کھو چکے ہیں، اُن کی خبر سے مجھے گزار

یہ جانتے بھی ہیں، مجھے پہچانتے بھی ہیں
اِن راستوں پہ چاہے جدھر سے مجھے گزار

اندازہ میں بھی اپنی دلیری کا کچھ لگاؤں
تُو بھی اِسی لیے کسی ڈر سے مجھے گزار

مجھ پر بھی کاروبار ہو یہ منکشف کبھی
اس رہ گزارِ نفع و ضرر سے مجھے گزار

ڈرتا نہیں، بہت سے بہت ڈوب جاؤں گا
اس چشمِ نیل گُوں کے بھنور سے مجھے گزار

منظر تمام دیکھ چکا ہوں یہاں، ظفرؔ
جس سمت کچھ نہیں ہے اُدھر سے مجھے گزار

شہ راہِ دل کہ جادۂ جاں سے مجھے گزار
تیرے ہی راستے ہیں جہاں سے مجھے گزار

زرخیزیاں مجھے کئی درکار ہیں نئی
موقع مِلے تو آبِ رواں سے مجھے گزار

میں بھی کسی بہانے سبک سار ہو سکوں
اک رات اپنے خوابِ گراں سے مجھے گزار

میں پھر سے بے نشاں نہیں رہ جانا چاہتا
آہستگی سے میرے نشاں سے مجھے گزار

کچھ مجھ کو اتنی تیز روانی نہیں پسند
رُک رُک کے موجۂ گزراں سے مجھے گزار

خاشاک و خار و خس مری بنیاد ہے وہی
کچھ سوچ کر ہی شعلۂ جاں سے مجھے گزار

میں خود بھی ایک پیکرِ پیکار ہوں، مگر
جنگ و جدل میں امن و اماں سے مجھے گزار

گر ہو سکے تو دُوہری مصیبت بھی یہ اُٹھا
میں خود جہاں نہیں ہوں وہاں سے مجھے گزار

کب سے بیان ہونے کی حسرت میں ہے ظفرؔ
قصّہ سمجھ کے اپنی زباں سے مجھے گزار

ہلکی ہوا ہوں، سرو و سمن سے مجھے گزار
صرف ایک بار اپنے چمن سے مجھے گزار

میلی سی ایک سبز اندھیرے کی لہر ہوں
اِس روشن اور پاک بدن سے مجھے گزار

دن رات جو دَمکتے ہیں خواب و خیال میں
ایسے ہی آج دشت و دَمن سے مجھے گزار

جاتے ہُوئے ہی دیکھ لوں آب و ہوائے دل
گر ہو سکے تو میرے وطن سے مجھے گزار

اے آفتابِ تازہ، تجھے اختیار ہے
مُجھ سے کرن گزار، کرن سے مجھے گزار

مصروفِ کار تیرے ہی کہنے پہ ہوں کہیں
تو ہی کبھی فراغتِ فن سے مجھے گزار

پھر ایک بار اپنا بھلا چاہتا ہوں میں
دوبارہ میرے عیبِ سخن سے مجھے گزار

آؤں گا پھر نئے کسی اُسلوب کی طرف
پہلے طریق و طرزِ کُہن سے مجھے گزار

گزرے گا کیوں نہ سُوئی کے ناکے سے بھی ظفرؔ
پر، شرط یہ ہے بول بچن سے مجھے گزار

بہتر ہے آسماں نہ زمیں سے مجھے گزار
میں جس جگہ پڑا ہوں وہیں سے مجھے گزار

آگے بھی اور پیچھے بھی میں ہوں، اِس لیے
فی الحال کوہسار و یمیں سے مجھے گزار

کل ہاتھ آؤں یا نہیں اِس کام کے لیے
گزروں گا آر پار، کہیں سے مجھے گزار

میں روشنی کی طرح بناتا ہوں اپنی راہ
گزروں گا آر پار، کہیں سے مجھے گزار

یا رکھ مجھے یونہی مرے انکار کا اسیر
یا عرصۂ گمان و یقیں سے مجھے گزار

میں کر چکا ہوں گہرے اندھیروں کا سفر
اب رہ گزارِ ماہِ مبیں سے مجھے گزار

میں پاس بیٹھنے کے تو لائق نہیں مگر
کافی ہے یہ کہ اپنے قریں سے مجھے گزار

کچھ فرق فرش و عرش میں ہو گا ہی لازماً
اک دن کسی بہشتِ بریں سے مجھے گزار

اک سنگِ صبر باندھ مرے پیٹ پر، ظفرؔ
اور احتیاجِ نانِ جویں سے مجھے گزار

ایذائے مدعا طلبی سے مجھے گزار
تنگ آچکا ہوں جس سے، اُسی سے مجھے گزار

جاتے نہیں کہیں بھی تو یہ بات ہے الگ
سب میرے راستے ہیں، کہیں سے مجھے گزار

پانی مرے پَروں کو بھگو ہی نہ دے بہت
بارش کسی ٹھہرتی ہُوئی سے مجھے گزار

یہ اِس جگہ سے تیز گزرنے کی ہے گھڑی
اور میں یہ چاہتا ہوں ابھی سے مجھے گزار

کچھ کام تو نہیں ہے، مگر یونہی ایک شام
میں چاہتا ہوں، اپنی خوشی سے مجھے گزار

میں پیاس تو بُجھانے کے حق میں نہیں مگر
اِس انتہائے تشنہ لبی سے مجھے گزار

یا کچھ بتا کہ میں نے پہنچنا ہے کس جگہ
یا اِس خمارِ بے سفری سے مجھے گزار

میں تیز چل تو سکتا ہوں، لیکن جو ہو سکے
اِس راستے میانہ روی سے مجھے گزار

لاعلم کر دوبارہ کسی طرح سے، ظفرؔ
آ، اور اتنی باخبری سے مجھے گزار

داؤ اور پیچ کی بُہتات لگانے والے
کبھی پکڑے نہ گئے گھات لگانے والے

ہو گئے اپنی ہی خود آب و ہوا سے محروم
دل کے اطراف میں باغات لگانے والے

مال تو، دیکھ لو اُن کا بھی نہیں بِکتا ہے
ہیں جو آواز ترے ساتھ لگانے والے

پھر جو دیکھا تو ہم ایسے بھی تھے بے نام ونشاں
جا بہ جا اپنے نشانات لگانے والے

خشک آنکھوں سے پھرا کرتے ہیں گاتے ہنستے
آنسوؤں کی کبھی برسات لگانے والے

پڑ گئے تنگ محبت کی مشقّت سے وہی
تھے جو اِس کام میں دن رات لگانے والے

آخرِکار ترے ہاتھ لگے بھی ہم کو
تھے جو اک بار تجھے ہاتھ لگانے والے

ہر جگہ ہیں مری تعریف کے طالب بھی وہی
ہر جگہ میری شکایات لگانے والے

رُکتے رُکتے بھی یہاں دل کو لگایا ہے، ظفرؔ
ورنہ ہرگز نہ تھے حالات لگانے والے

دُھند چھٹنے لگے، خوابوں میں صفائی آئے
اور طبیعت میں ذرا نرم نوائی آئے

دن بھر اُس شوخ سے بھرپور ملاقات کے بعد
شوق سے آئے اگر شامِ جدائی آئے

اُس نے دینا ہی نہیں میری محبت کا جواب
گو سفارش کے لیے ساری خدائی آئے

میرے حصّے میں ترے گھر سے کچھ آئے تو سہی
کوئی اچھائی نہیں ہے تو بُرائی آئے

دل کرائے پہ ہی اُٹھ جائے کہیں، سوچتا ہوں
اس بڑھاپے میں کہیں سے تو کمائی آئے

اتنا بے زار ہُوا بیٹھا ہوں اُس جینے سے
نہیں میری تو کسی اور کی آئی آئے

فیصلہ ہو گا عدالت کا یہاں میرے خلاف
چاہے ہر روز نئی میری صفائی آئے

خود تو اِس اندھے کنوئیں میں نہیں میں گر سکتا
دوست آئے کہیں، میرا کوئی بھائی آئے

راہ گُم کردہ ہوں جب راہ نما ہی تو، ظفرؔ
پھر کہاں سے روشِ راہ نمائی آئے

وہی آغاز کو انجام لگانے والے
کام خود کر کے مرا نام لگانے والے

رائگاں بھی کبھی منظور نہیں تھے جو مجھے
ہیں وہی آج مرے دام لگانے والے

اِنھی اطراف میں ہوتے تھے کبھی شام کے وقت
ایک مہتاب لبِ بام لگانے والے

کوئی تخمینۂ تعزیر میں ہیں برسرِکار
کوئی اندازۂ انعام لگانے والے

بات ہوتی ہے تو چرچا بھی ہُوا کرتا ہے
کچھ غلط بھی نہیں الزام لگانے والے

دن ڈھلا ہی نہیں اُس روز کسی طور کہ وہ
تھے مرے نام کوئی شام لگانے والے

کامیابی سے جنھیں کوئی غرض ہی نہیں تھی
ایک ہم تھے دلِ ناکام لگانے والے

فائدے میں وہی رہ جائیں تو کچھ دُور نہیں
شعر کو تکمۂ ابہام لگانے والے

ہم تو تیار تھے پھنسنے کے لیے آپ، ظفرؔ
کیوں تکلف میں پڑے دام لگانے والے

پیغام اُس کا ٹھکرانا ہے یا نہیں
کیا معلوم وہاں جانا ہے یا نہیں

یہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں اب کی بار
اُس کے سامنے تھرّانا ہے یا نہیں

طور اطوار سے ہی اُس کے کُھل جائے گا
بات ہماری وہ مانا ہے یا نہیں

سردی بڑھتی جاتی ہے، کیا حکم ہے
محفل کو اب گرمانا ہے یا نہیں

پہلے ہی یہ فیصلہ ہونا چاہیے
کام وہ کر کے پچھتانا ہے یا نہیں

ایک بار ہی بیٹھ کے اب یہ طے کر لیں
مِل کر رونا اور گانا ہے یا نہیں

ابھی نہیں کہہ سکتے دیکھ رہے ہیں سب
شہر پہ بادل چھانا ہے یا نہیں

صبح نکلتے وقت کوئی نہیں جانتا
شام کو واپس گھر آنا ہے یا نہیں

ایک خواب ہے، دیکھیں گے، اِس میں، ظفرؔ
ساتھ اُس کو بھی اُلجھانا ہے یا نہیں

کسی بھی طرح کی تاکید سے نہیں مرتا
بیان جو بھی ہو، تردید سے نہیں مرتا

کُھلی ہُوئی کسی تفصیل پر جو زندہ ہے
بندھی ہُوئی کسی تمہید سے نہیں مرتا

مرا تو آپ مرے گا خود اپنی مرضی سے
عدو کسی مری تائید سے نہیں مرتا

بس اتنی بات نظر میں رہے، یہاں پانی
ہماری آپ کی اُمید سے نہیں مرتا

مرے گا اور کسی تال میل سے شاید
اگر کوئی مری تقلید سے نہیں مرتا

کہ اِس میں بیٹھتے ہیں میرے چاہنے والے
یہ میرا سایہ ہے خورشید سے نہیں مرتا

میں لفظ اور طریقے سے مار دیتا ہوں
اگر تلفّظ و تشدید سے نہیں مرتا

جو مارنا ہے تو آ، شاعری سے مار مجھے
کہ دوست میں تری تنقید سے نہیں مرتا

شنید سے جو ظفرؔ بچ رہے تو یاد رکھو
تمھاری طرح کسی دید سے نہیں مرتا

اپنا یقین ہوں نہ کسی کا گماں ہوں میں
اب پھر جہاں میں ہو نہیں سکتا وہاں ہوں میں

تردید کر رہا ہے تو کر شوق سے مری
کچھ اِس کے باوجود بھی تیرا بیاں ہوں میں

رہنا نہیں کسی نے تو ڈھونڈے کوئی کہاں
کھویا ہُوا مکان کے اندر مکاں ہوں میں

اک ڈھول ہے کہ میرے پس و پیش ہے یہاں
میں ایک فرد بھی نہیں اور کارواں ہوں میں

بے روک ٹوک مجھ سے گزرتی ہے اب ہَوا
ایسا کٹا پھٹا سا کوئی بادباں ہوں میں

پڑتے ہیں مجھ میں عکس درختوں کے دُور دُور
ایسا ہَرا بھرا کوئی آبِ رواں ہوں میں

کرتے ہیں کاروبار تو کچھ اور لوگ ہی
لیکن، کسی کا نفع، کسی کا زیاں ہوں میں

میری بھی جو سمجھ میں نہیں آ رہی بہت
اور اِس کے باوجود بھی اپنی زباں ہوں میں

آتا نہیں ہے سُن کے نمازی کوئی اِدھر
صحرائے خواب میں ظفرؔ ایسی اذاں ہوں میں

کبھی جو کچھ بھی نہیں، اور کبھی محبت ہے
یہ بُجھتی جلتی ہُوئی سی کوئی محبت ہے

کرے گی خاتمہ دونوں کا ایک ساتھ، کہ یہ
تمھاری پہلی، مری آخری محبت ہے

خبر نہیں اِسے ہم روک بھی سکیں کہ نہیں
جو اپنے ہاتھوں سے ، گرتی ہُوئی محبت ہے

لگی ہُوئی بھی ہے دل کو بُری طرح سے مگر
نہیں ہے یہ بھی کہ بس دل لگی محبت ہے

کچھ اور طرح کا رشتہ ہے اک عجیب و غریب
کہ دشمنی ہے نہ یہ دوستی محبت ہے

ہیں اُس کے اپنے زمانے اور اپنے ہی شب و روز
جو مستقل ہے نہ یہ عارضی محبت ہے

سیاہ و سبز غروب و غبار کے پیچھے
لرزتی، رُکتی ہُوئی روشنی محبت ہے

میں جانتا ہوں ابھی میں جو مر نہیں سکتا
تو اِس لیے بھی کہ دل میں ابھی محبت ہے

یہ عمر کوئی محبت کی ہے، بتا تو سہی
تُو آپ کیا ہے، ظفرؔ کیا تری محبت ہے

گُم ہُوا دیکھتے دیکھتے کون تھا
ڈھونڈ کر ہم جسے لائے تھے، کون تھا

کوئی منزل نہیں تھی کہیں سامنے
پھر بھی وہ راستے راستے کون تھا

جو عقب میں رہا جانتے تھے اُسے
یہ نہیں کُھل سکا سامنے کون تھا

بام پر جو بھی تھا لگ رہے گا پتا
لیکن اُس رات چھت کے تلے کون تھا

تھا اگر کوئی اُس کی نہیں فکر ہی
وہ نہیں تھا کہیں اِس لیے کون تھا

پہلے آتا نہیں تھا گماں ہی میں وہ
پھر جو واپس ہُوا خواب سے کون تھا

اِس جہاں سے پَرے کوئی تھا، ٹھیک ہے
لیکن اِس سے بھی آگے پَرے کون تھا

جس کا ہونا ہی مشکوک ہے آج تک
اُس کے بارے کوئی کیا کہے، کون تھا

اور اِس کے سِوا پوچھتے کیا، ظفرؔ
یعنی وہ کون تھا، اور یہ کون تھا

میرے اندر وہ میرے سِوا کون تھا
میں تو تھا ہی مگر دوسرا کون تھا

لوگ بھی کچھ تعارف کراتے رہے
مجھ کو پہلے ہی معلوم تھا، کون تھا

لوگ اندازے ہی سب لگاتے رہے
وہ جبیں کس کی تھی، نقشِ پا کون تھا

مجھ سے مِل کر ہی اندازہ ہو گا کوئی
وہ الگ کون تھا، وہ جدا کون تھا

کوئی جس پر نہ تھا موسموں کا اثر
بعد ساون کے بھی وہ ہرا کون تھا

جس کو احوال سارا تھا معلوم، وہ
بے خبر راستے میں پڑا کون تھا

منتظر جس کی دُنیا رہی دیر تک
دُور سے کوئی آتا ہُوا کون تھا

آئی جس کی مہک اِس سے پہلے کہیں
وہ سوارِ کمندِ ہَوا کون تھا

ریزہ ریزہ ہی پہچان میں تھا ظفرؔ
جانتے تھے سبھی جا بہ جا کون تھا

دیکھتے تھے جدھر کو، اُدھر کون تھا
کوئی تھا بھی تو بارِ دگر کون تھا

شام تک تو فقط میں ہی تھا ہر طرف
اِس کے بعد اِس قدر رات بھر کون تھا

کاش اب تو یہ عُقدہ کوئی کھول دے
سامنے کون ہے، بام پر کون تھا

حیثیت مرکزی بھی یہاں اُس کی تھی
گھر میں اپنے، مگر در بہ در کون تھا

بند آنکھوں سے ہم اک طرف ہو گئے
کچھ بھی دیکھا نہیں تھا کدھر کون تھا

اُس کے ٹکڑے تو تھے اپنی پہچان میں
یہ نہیں جانتے سر بہ سر کون تھا

جس میں شعلہ نہ تھا، آگ تھی کون سی
جس کا سایہ نہیں تھا، شجر کون تھا

جس نے پانی پَروں پر نہ پڑنے دیا
طائرِ آب تھا وہ مگر، کون تھا

راستہ تھا الگ جس کا اپنا، ظفرؔ
جانتے ہیں کہ وہ ہم سفر کون تھا

یہ زمیں کون تھی، آسماں کون تھا
کوئی بتلائے، اپنا یہاں کون تھا

میں نے ہم راز سب کو بنایا، مگر
شہر بھر میں مرا رازداں کون تھا

گفتگو سب سے تھی، یہ تو معلوم ہو
ہم نفس کون تھا، ہم زباں کون تھا

عمر بھر جس میں ہم آتے جاتے رہے
وہ درخت اور وہ آشیاں کون تھا

طے کیا جس سے پانی کا سارا سفر
ناؤ تھی کون سی، بادباں کون تھا

سُن رہے تھے کبھی شوق سے اور پھر
پوچھتے تھے پسِ داستاں کون تھا

سب سے خوش تھے، کوئی فرق رکھا نہیں
مہرباں اور نامہرباں کون تھا

ہم جہاں جایا کرتے تھے شام و سحر
کچھ نہیں جانتے تھے وہاں کون تھا

کرتے رہتے تھے نقلِ مکانی، ظفرؔ
یہ مکیں کیا تھے اور وہ مکاں کون تھا

دماغ سے کوئی اپنے خلل نکالا ہے
یہی تو مسئلے کا ایک حل نکالا ہے

نہ دیکھتے ہیں کسی کی طرف نہ بولتے ہیں
عجیب سا کوئی طرزِ عمل نکالا ہے

کیا ہے اُس کی جگہ اب دماغ کو حاضر
دلِ فسردہ کا نعم البدل نکالا ہے

پھر اس سے باز نہیں آئیں گے کسی صورت
اِرادہ ذہن سے کوئی اٹل نکالا ہے

بہانہ وضع کیا تھا جو بات کرنے کا
تو بات روکنے کا بھی محل نکالا ہے

یہ زندگی کی تہوں میں چھپا کے رکھا ہُوا
پھر آج کس لیے خوابِ اجل نکالا ہے

اِسی سے ہوں گی مری ساری منزلیں آسان
یہ راستے کا جو تھوڑا سا بَل نکالا ہے

حذف کیا ہے سخن سے تمام پھکوپن
نہ اُس کا حصہ کوئی مبتذل نکالا ہے

کبھی قرینے پرانے کیے ہیں ترک، ظفرؔ
طریقہ اور ہی ایک آج کل نکالا ہے

یہ عام سا خاص کیوں ہُوا تھا
دل اتنا اُداس کیوں ہُوا تھا

مشکل آئی تھی کس وجہ سے
جو دُور تھا، پاس کیوں ہُوا تھا

مِلنا ہی تو اُس سے تھا، مگر میں
محرومِ حواس کیوں ہُوا تھا

میں تھا ہنسنے ہنسانے والا
رونا مجھے راس کیوں ہُوا تھا

چلنے سے تھی میری زندگانی
رُکنا مری پیاس کیوں ہُوا تھا

پورا ہی نہ تھا کسی طرف سے
وہ میرا لباس کیوں ہُوا تھا

بوئی تھی میں نے تو سیاہی
وہ کھیت کپاس کیوں ہُوا تھا

اُس نے جو نکلنا ہی نہ تھا، تو
اِس دل کی بھڑاس کیوں ہُوا تھا

ہونا ہی نہ تھا ظفر نے آدھا
پھر سَو سے پچاس کیوں ہُوا تھا

وہم زر و مال کیوں ہُوا تھا
تم کو یہ خیال کیوں ہُوا تھا

حملہ آور ہُوا جو مجھ پر
اب وہ مری ڈھال کیوں ہُوا تھا

میری ہی طرح کا ہونے والا
خود اپنی مثال کیوں ہُوا تھا

اور اتنے زوال کے دنوں میں
ظاہر یہ کمال کیوں ہُوا تھا

اِتنے بڑے سانحے کا مجھ کو
تھوڑا سا ملال کیوں ہُوا تھا

چھوٹی سی بات پر گلی میں
یہ جنگ و جدال کیوں ہُوا تھا

مرنا کیوں ہو گیا مصیبت
جینا جنجال کیوں ہُوا تھا

اوروں کی ہے یہ بھی کوئی سازش
اپنا یہ حال کیوں ہُوا تھا

مشکل ہے ظفرؔ، جواب جس کا
پیدا وہ سوال کیوں ہُوا تھا

ابھی ہوتے ہوتے جو ہنسنے کو ہے
تو خود ہی سمجھ لو کہ پھنسنے کو ہے

یہ دل ایک خوشبو سے بھر جائے گا
کلی کوئی اندر ٹپکنے کو ہے

ہوائیں لگاتی رہیں اپنا زور
یہ بادل یہاں پر برسنے کو ہے

پُرانی عمارات گِرنے کے بعد
نیا شہر بھی کوئی بسنے کو ہے

نکلنے کو ہے آسمانوں سے کچھ
زمیں میں کوئی چیز دھنسنے کو ہے

تبسّم ہُوا ہے نمودار ابھی
ابھی مجھ پہ فقرہ وہ کسنے کو ہے

ابھی چُومنے کو نہیں ہے وہ حسن
ابھی دیکھنے اور ترسنے کو ہے

بالآخر مری آستیں کا یہ سانپ
مجھے ہی کسی روز ڈسنے کو ہے

اُسے توڑنا چاہتے ہو، ظفرؔ
جو انجیر ابھی اور رسنے کو ہے

نیا اک زمانہ جو آنے کو ہے
خبر اُس کی سارے زمانے کو ہے

چھپے گا کہاں تک ابھی اور تُو
یہ دُنیا ترا کھوج پانے کو ہے

نہیں وصل کا شائبہ دُور تک
مگر، کوئی بستر بچھانے کو ہے

وہ پتھر ہو یا پھول ہو، کچھ بھی ہو
خبر اُس کی آئینہ خانے کو ہے

کسی وضع کا، پاس شاید کہیں
نئے کو نہ ہو تو پُرانے کو ہے

خبردار رہنا کہ پھر سے یہ وقت
کسی چیز میں کچھ مِلانے کو ہے

میں کرتا نہیں آب و دانے کی فکر
مری فکر خود آب و دانے کو ہے

مرا وقت ہے راستے میں پڑا
کہ آنے کو ہے اور نہ جانے کو ہے

ظفؔر نے جھٹک کر گرایا تھا جو
وہی بوجھ سر پر اُٹھانے کو ہے

ہوا میں کوئی رنگ بھرنے کو ہے
یہیں ایک صورت اُبھرنے کو ہے

نظر آئیں گے پیڑ پودے تمام
کوئی دم میں پانی اُترنے کو ہے

ہے تبدیل ہونے کو رنگِ زمیں
کوئی اِس جگہ پاؤں دھرنے کو ہے

کُھلی رکھیں آنکھیں ابھی اہلِ شہر
عجب اک تماشا گزرنے کو ہے

بہت دیر کے بعد قسمت مری
بگڑنے کو ہے یا سنورنے کو ہے

ہوں پیچھے کسی کے جو میں بھی پڑا
مرا کام بھی کوئی کرنے کو ہے

مسافر سے یہ لوگ ہیں بے خبر
کہ چلنے کو ہے یا ٹھہرنے کو ہے

دھماکا کوئی ہونے والا ہے کیا
کسی چیز سے خلق ڈرنے کو ہے

اِسی حال میں گُم رہے گا ظفرؔ
کہ جینے کو ہے اور نہ مرنے کو ہے

محبت کا موسم بدلنے کو ہے
ہوا اور ہی کوئی چلنے کو ہے

رہے گی نہ رنگت زمیں کی یہی
کہیں ایک چشمہ اُبلنے کو ہے

ہُوئیں کچی آبادیاں فکر مند
کناروں سے پانی اُچھلنے کو ہے

بہت دُور پودا جو پیدا ہُوا
یہاں پھُولنے اور پھَلنے کو ہے

بُجھا تھا ابھی جو چراغِ ہوس
دوبارہ کسی طور جلنے کو ہے

اندھیرے میں جنبش نہیں ہو رہی
بہت دیر سے شام ڈھلنے کو ہے

جو باہر تھا اندر نہیں جا سکا
جو اندر نہیں تھا، باہر نکلنے کو ہے

کسی اور کو راہ دیتی ہُوئی
مصیبت مرے سر سے ٹلنے کو ہے

مدارات بھی ہو چکی ہیں، ظفرؔ
سَو پھر یہ مسافر بھی چلنے کو ہے

پیدا یہ غبار کیوں ہُوا ہے
اور آخری بار کیوں ہُوا ہے

میں کب سے کھڑا ہوں اِس کنارے
دریا مرے پار کیوں ہُوا ہے

سب کچھ تبدیل ہوتے ہوتے
شبنم سے شرار کیوں ہُوا ہے

دیکھا ہُوا راستہ یہ میرا
دُشوار گزار کیوں ہُوا ہے

گھیرے میں لیے ہُوئے ہوں خود کو
ہر سُو یہ حصار کیوں ہُوا ہے

جو پاؤں پکڑ رہا تھا پہلے
اب سر پہ سوار کیوں ہُوا ہے

چھوڑا تھا جو کام دل نے اُس پر
پھر سے تیار کیوں ہُوا ہے

پہلے تو نہیں تھا یہ طریقہ
مجمع یہ قطار کیوں ہُوا ہے

آباء تو ظفرؔ نہیں تھے ایسے
پھر شعر شعار کیوں ہُوا ہے

کوشش ناکام کیوں ہوئی ہے
خواہش الزام کیوں ہوئی ہے

تھے یوں تو حلال خور، ہم پر
وہ شکل حرام کیوں ہوئی ہے

سورج تو ابھی کھڑا ہے، دیکھو
پھر شہر میں شام کیوں ہوئی ہے

اچھا نہیں لگ رہا تھا کس کو
یہ روک، یہ تھام کیوں ہوئی ہے

اتنا خاموش رہ کے وہ آنکھ
پھر محوِ کلام کیوں ہوئی ہے

کیسی گُم نام تھی محبت
ایسی بدنام کیوں ہوئی ہے

جو خاص تھی ایک عادتِ بد
ہر سمت وہ عام کیوں ہوئی ہے

جینے سے پیش تر ہی آخر
یہ عمر تمام کیوں ہوئی ہے

تھی راہ سفر کی جو ظفرؔ، وہ
اب جائے قیام کیوں ہوئی ہے

خوش بھی تھے، اور ملول بھی تھے ہم
سنگ تو تھے ہی، پھول بھی تھے ہم

لوگ اپنائے بھی رہے ہم کو
ایک شوقِ فضول بھی تھے ہم

ذمّہ دار اور بھی تھی یاد کوئی
کوئی اپنی ہی بھول بھی تھے ہم

اپنے سر پر سوار ہوتے ہُوئے
اِس کے قدموں کی دُھول بھی تھے ہم

مُسترد بھی کیے رکھا ہم کو
اور اُس کو قبول بھی تھے ہم

عرش سے فرش پر پہنچنے کی
ایک شانِ نزول بھی تھے ہم

اُس نے کوشش ہی ٹھیک طرح نہ کی
ورنہ سہل الحصول بھی تھے ہم

کوئی رقبہ نکالتا تو سہی
عرض بھی، اور طول بھی تھے

مُچھکے رہنے کے باوجود، ظفرؔ
ڈھیلی ڈھالی سی چُول بھی تھے ہم

ایک رنگِ ملال بھی تھے ہم
تیرے خواب و خیال بھی تھے ہم

رنگِ پندار بھی تھا رُخ پہ، مگر
اک مجسّم سوال بھی تھے ہم

کچھ نہ تھے، اور کچھ نہ ہوتے ہُوئے
تیرے شیشے میں بال بھی تھے ہم

یوں تو کثرت بھی تھے یہاں اپنی
اور یہیں خال خال بھی تھے ہم

جیسے باسی کڑھی میں آتا ہے
ایسا ہی ایک اُبال بھی تھے ہم

لااُبالی بھی تھے طبیعت کے
اپنی ہی دیکھ بھال بھی تھے ہم

نظر آتے تھے جس قدر آساں
اس سے بڑھ کر مُحال بھی تھے ہم

لوگ کہتے تھے بے مثال، مگر
آپ اپنی مثال بھی تھے ہم

خود کمایا تھا، یہ کمالِ ظفرؔ
آپ اپنا زوال بھی تھے ہم

کیسے کیسے اُداس بھی تھے ہم
جب ترے آس پاس بھی تھے ہم

تُو نے جب پائمال کرنا تھا
نرم اور سبز گھاس بھی تھے ہم

شوق بھی تھا کسی سے ملنے کا
جس گھڑی بد حواس بھی تھے ہم

کچھ زمانہ ہمیں سمجھ نہ سکا
کچھ بعید از قیاس بھی تھے ہم

تَن پہ تھا جامۂ غبار بھی تب
جب کبھی خوش لباس بھی تھے ہم

جہاں جام و سبو لبالب تھے
وہیں خالی گلاس بھی تھے ہم

اپنے اندر تھے ایک دریا بھی
اَبدی ایک پیاس بھی تھے ہم

روزِ اوّل سے تھی نہ یہ صورت
اہلِ دُنیا کو راس بھی تھے ہم

ہم سے اچھے تھے عام لوگ، ظفرؔ
ورنہ کہنے کو خاص بھی تھے ہم

مکیں گزرنے سے پہلے مکاں گزرتا ہوں
زمیں کا پھول ہوں اور آسماں گزرتا ہوں

کہ یہ بھی حسنِ سماعت کی ایک صورت ہے
میں واقعہ ہوں اگر، داستاں گزرتا ہوں

شبِ سیہ میں مجھے روشنی بھی ہے درکار
کہ بجلیاں کی طرف ناگہاں گزرتا ہوں

سفینہ اب مرے ہونے پہ منحصر ہے تمام
میں سیلِ موج ہوں اور بادباں گزرتا ہوں

نمازیوں کو بُلاتا ہوں پانچ وقت کہ میں
غبارِ دشتِ ہوا میں اذاں گزرتا ہوں

ہے جستجو کسی کھوئے ہُوئے کی شام و سحر
مِٹا ہُوا ہے جو اُس کا نشاں گزرتا ہوں

ہیں تازہ دَم کئی میرے لہو میں ناقہ سوار
میں اپنے آپ میں ہی کارواں گزرتا ہوں

مجھے کہ معنی و مضمون سے علاقہ نہیں
سخن سرائے ہے رنگِ بیاں گزرتا ہوں

ہوں شک و شبہ سے شاداب اپنے آپ، ظفر
جو سبزہ گاہِ یقیں سے گماں گزرتا ہوں

پڑاؤ پر ہوں نہ اب کے سفر گزرتا ہوں
ابھی تو اپنی کوئی رہ گزر گزرتا ہوں

اُبھرنے ڈوبنے لگتا ہے کیا سفینۂ گُل
جو باغ سے میں ہوا کا بھنور گزرتا ہوں

سمیٹتی ہے کوئی شام اپنے دامن میں
شجر شجر سے خزاں کی خبر گزرتا ہوں

وہاں بھی اپنی ہوا سے نکل نہیں سکتا
تری فضا میں اگر بال و پر گزرتا ہوں

میں چل چلاؤ میں ہوں، اور رُک نہیں سکتا
فسونِ خواب ہوں، دیوار و در گزرتا ہوں

یہ کاروبار منافع میں جا رہا ہے ابھی
ابھی میں اِس سے زیان و ضرر گزرتا ہوں

رواں دواں مری تفصیل ہے ابھی پیچھے
میں آگے آگے ہوں اور مختصر گزرتا ہوں

میں بچ بھی رہتا ہوں ہر راہ سے گزرتے ہُوئے
اگرچہ اپنے تئیں بیش پر گزرتا ہوں

اُڑا رہا ہوں میں عیب اپنے برگ برگ، ظفرؔ
جو تیز و تند ہوائے ہنر گزرتا ہوں

اُجالے کو سراسر تیرگی ہوتے نہیں دیکھا
ہُوا ہے جو یہاں پہلے کبھی ہوتے نہیں دیکھا

ہمیں ملتے کبھی وہ جس طرح سے چاہتے تھے ہم
ہُوا ہے اور تو سب کچھ، یہی ہوتے نہیں دیکھا

گزر جانے کو، اور تبدیل ہونے کو ہے یہ موسم
ابھی کہتے تو ہیں سارے، ابھی ہوتے نہیں دیکھا

تمھارا بات کرتے کرتے یوں خاموش ہو جانا
کسی نے پھول کو شاید کلی ہوتے نہیں دیکھا

ابھی تک، ماسوائے ذات اپنی کے کسی کو بھی
خوشی کی بات پر میں نے دُکھی ہوتے نہیں دیکھا

ابھی دیکھا ہی کیا ہے اِس بیانِ خواب و خواہش میں
اگر ناگفتنی کو گفتنی ہوتے نہیں دیکھا

رُتیں بدلیں، بہاریں آئیں، پانی بھی بہت برسا
مگر، شاخِ تماشا کو ہری ہوتے نہیں دیکھا

بہت دن ہوگئے ہیں، اب تو پہلے کی طرح میں نے
کچھ اپنے آپ کو خود سے تہی ہوتے نہیں دیکھا

ابھی تو وقت ہے کافی، ابھی کیا جلدبازی ہے
ظفرؔ، ایسے تو کوئی کام بھی ہوتے نہیں دیکھا

جگہ مِل جائے اوروں کو بھی، یہ ہوتے نہیں دیکھا
جو تیرے ساتھ لگ بیٹھا، پَرے ہوتے نہیں دیکھا

محبت چاند ہے، چڑھتا ہے تو سب دیکھ لیتے ہیں
یہ کام ایسا ہے جو چوری چُھپے ہوتے نہیں دیکھا

یہ کیسی چھینا جھپٹی ہے، یہ کیا بد انتظامی ہے
کہ پہلے تو کبھی یہ کچھ ترے ہوتے نہیں دیکھا

اندھیرا ایسی ایسی اپنی تصویریں دِکھاتا ہے
تماشا رات بھر کا دن چڑھے ہوتے نہیں دیکھا

تمھاری بے رُخی کی دُھوپ کے چاٹے ہُوئے سارے
ہیں وہ یہ پیڑ جن کو پھر ہَرے ہوتے نہیں دیکھا

وقوعہ وصل کا اپنے یہاں مذکور ہو کیسے
بیاں کرتا ہی کیا اُس کا جسے ہوتے نہیں دیکھا

جو ہنگامے ہُوا کرتے ہیں میرے سامنے دن بھر
کسی نے اُن کو میری آنکھ سے ہوتے نہیں دیکھا

کسی کے ساتھ کیوں ہو جو ہمارے ساتھ ہونا تھا
وہ لہو و لعب ہم نے اِس لیے ہوتے نہیں دیکھا

میں وہ منحوس برگد ہوں، ظفرؔ جس کے تلے اب تک
کوئی پودا کسی نے پُھولتے پھلتے نہیں دیکھا

دلوں کا مسئلہ کوئی بھی حل ہوتے نہیں دیکھا
سُنی ہے گفتگو کافی، عمل ہوتے نہیں دیکھا

جو بات اک بار کوئی آپ دل میں ٹھان لیتے ہیں
تو پھر اِس میں کبھی ردّ و بدل نہیں ہوتے دیکھا

خوشامد سب کو ہی مطلوب ہے اُس جانِ محفل کی
مگر خود کو کبھی یوں سر کے بَل ہوتے نہیں دیکھا

پھرا تو پھر گیا ہر بات سے، ورنہ یہاں ہم نے
ترے کس قول کو ضرب المثل ہوتے نہیں دیکھا

تھکاوٹ شاخسانہ ہی سہی کارِ محبت کا
مگر، اعصاب کو اِس درجہ شَل ہوتے نہیں دیکھا

بہت کوشش تھی کر کے بات بے موقع ہی رہتی ہے
ابھی تک شعر، اپنا محل ہوتے نہیں دیکھا

بہت بے احتیاطی میں بھی اپنے شیشۂ دل کو
ضرر پہنچا نہیں کوئی، خلل ہوتے نہیں دیکھا

بہت سی شاعری بھی اپنے ہاتھوں ہو چکی، لیکن
غزل کو اِس طرح نذرِ غزل ہوتے نہیں دیکھا

ظفرؔ، اوروں کے بہکاوے میں آجاتے ہو تم اکثر
تمھاری بات کو ہم نے اٹل ہوتے نہیں دیکھا

کسی فریاد کا کوئی اثر ہوتے نہیں دیکھا
کم از کم سُن تو رکھا ہے، مگر ہوتے نہیں دیکھا

وہ جن کو جیل میں ہونا تھا اب ہیں کوتوال اپنے
بہت دیکھا ہے، لیکن یہ ہنر ہوتے نہیں دیکھا

نمٹ جاتا ہے سارا مدّعا دو چار لفظوں میں
بیانِ شوق لیکن مختصر ہوتے نہیں دیکھا

اُبھرتے ڈوبتے ہم بھی اگر کُھلتی کسی صورت
یہی دل کی گرہ جس کو بھنور ہوتے نہیں دیکھا

کوئی پر لگ گئے تھے جیسے برسوں اور مہینوں کو
وہ حصہ عمر کا ہم نے بسر ہوتے نہیں دیکھا

ہمارا راستہ ہی تھا نہ اپنی سمت ہی کوئی
کیا تو ہے، مگر ایسا سفر ہوتے نہیں دیکھا

یہ کیا یکتائی ہے جس نے ہمیں تنہائی میں رکھا
جدھر ہم ہیں کسی کو بھی اُدھر ہوتے نہیں دیکھا

پرندوں اور پتوں سے بھلا کیا واسطہ اُس کو
ہماری شام کو جس نے شجر ہوتے نہیں دیکھا

ظفرؔ، گھر ہے نہ کوئی گھاٹ ہے اُس کا، مگر ہم نے
ہوا کو اِس قدر بھی دربدر ہوتے نہیں دیکھا

کسی نے برف کو آبِ رواں ہوتے نہیں دیکھا
جو اُس نامہرباں کو مہرباں ہوتے نہیں دیکھا

یہ لگتا ہے کہ مجھ میں بات کوئی تھی ضرور آخر
کسی کو بھی جو اپنا ہم زباں ہوتے نہیں دیکھا

وہ منظر اور ہی تھا جب روانہ ہو رہے تھے ہم
ہمیں تم نے غبارِ کارواں ہوتے نہیں دیکھا

یہ اہلِ شہر کی مرضی ہے ورنہ اِس طرح ہم نے
ذرا سے واقعے کو داستاں ہوتے نہیں دیکھا

یہاں دیکھا ہی کیا ہے شہرِ ہستی میں اگر تم نے
چمن کو دُھول، چہروں کو دُھواں ہوتے نہیں دیکھا

کوئی کیا جانے بود و باش کی صورت ہے اب کیسی
کسی نے بھی مکینوں کو مکاں ہوتے نہیں دیکھا

یہاں کے ظلم و زور اپنی جگہ، جیسے بھی تھے، لیکن
کبھی ہم نے زمیں کو آسماں ہوتے نہیں دیکھا

یہاں اپنے پرائے کا ہدف کیوں کر نہ ہوتے ہم
بیاں کرتے ہیں وہ بھی جو بیاں ہوتے نہیں دیکھا

کسی حد تک ہی رکھنا تھا، ظفرؔ یہ شیوۂ شیون
کہیں اتنا بھی فرصت کو فغاں ہوتے نہیں دیکھا

کوئی بھی رنگ بے صوت و صدا ہوتے نہیں دیکھا
کسی نے اپنی ہستی کو ہوا ہوتے نہیں دیکھا

وہی ہے طرفہ طغیانی کنارے سے کنارے تک
یہ وہ دریا ہے جس میں راستہ ہوتے نہیں دیکھا

محبت ہے کہاں محتاج کہنے اور سننے کی
کہ یہ اک لفظ ہے جس کو ادا ہوتے نہیں دیکھا

نظر اُس کی بدلتے ہی کنارہ کر لیا ہم نے
یہی کیا کم ہے اُس کو بے وفا ہوتے نہیں دیکھا

ترستے ہی رہے، ملنے کی نوبت ہی نہیں آئی
وہی خوش بخت ہیں جن کو جدا ہوتے نہیں دیکھا

بس اک بار آ گئے تھے جو محبت کی اسیری میں
یہاں اُن قیدیوں کو پھر رہا ہوتے نہیں دیکھا

بہت دیکھے ہیں یوں تو انقلاب اس خاک پر ہم نے
مگر، اِس طرح خلقت کو خدا ہوتے نہیں دیکھا

بالآخر فیصلہ ہونا ہے اُس کی ہی گواہی پر
یہاں جس نے سرے سے واقعہ ہوتے نہیں دیکھا

ظفرؔ یہ معجزہ ہونا ہو شاید آپ کے ہاتھوں
کہ اب تک تو پرانے کو نیا ہوتے نہیں دیکھا

مِلا نہیں جو، اُسی کو سمجھ لیا سب کچھ
یہاں تھا اور تو اللہ کا دیا سب کچھ

نہ ہو سکی وہی مذکور اصل بات جو تھی
وگرنہ ہم نے یہاں پر کہا تو تھا سب کچھ

قریب ہو کے وہ آنکھوں سے اور ہے اوجھل
جو دُور رہتا میں اُس سے تو دیکھتا سب کچھ

اُسی کے سارے کرشمے تھے ہر جگہ، ہر سُو
مرے لیے مری دُنیا میں تھی ہوا سب کچھ

کمال یہ ہے کہ سودائے عشق میں اُس نے
دیا تو کچھ بھی نہیں، اور لے لیا سب کچھ

پڑے رہو تو مِلے کیا سراغ منزل کا
جو چل پڑو تو بتائے گا راستہ سب کچھ

نہ جانے کون سی شے کس گھڑی ہو کار آمد
نظر پڑے تو اُٹھا لو گرا پڑا سب کچھ

کمی نہیں کوئی آوارۂ تماشا کو
کُھلی ہو آنکھ تو مِلتا ہے جا بہ جا سب کچھ

ظفرؔ، اگرچہ میں اندھا نہیں ہوں ساون کا
مگر، مجھے نظر آتا ہے کیوں ہرا سب کچھ

جس آب و تاب نے روشن کیا یہاں سب کچھ
اُسی کے زور سے ہو جائے گا دُھواں سب کچھ

کچھ اب تو اپنی زمیں سے بھی آشنائی ہے
کبھی ہمارے لیے تھا یہ آسماں سب کچھ

شکوہ و شانِ عماراتِ حسن پر مت جا
یہ شہر وہ ہے کہ بِلتا نہیں یہاں سب کچھ

بھری ہُوئی تھی ہوا کوئی اور کشتی میں
سمجھ رہے تھے کہ ہے اپنا بادباں سب کچھ

فقط وہ مال ہے ارزاں جو دستیاب نہیں
ہے ورنہ اور تو بازار میں گراں سب کچھ

سبھی کہاں سے یہ آتا ہے، کون جانتا ہے
کسے خبر ہے کہ جائے گا یہ کہاں سب کچھ

کوئی محافظ اِن آثار کا نہیں باقی
کہ آج سے ہے لگاتار بے اماں سب کچھ

یہ لازمی ہے کہ آخر کچھ اَن کہا رہ جائے
تو کیا رہے گا اگر کر دیا بیاں سب کچھ

مکیں بھی ہے در و دیوار ہی کا حصّہ، ظفرؔ
کہ پائیدار بھی ہو کر نہیں مکاں سب کچھ

بہم کیے گئے جو خواب اور خبر سب کچھ
وہ سلسلہ بھی نہ تھا اتنا معتبر سب کچھ

خبر بھی ہے کہ زمانہ خراب ہے کتنا
جو ساتھ ہی لیے پھرتے ہو مال و زر سب کچھ

رہیں گے چلتے اَٹکتے ابھی یہ کَل پُرزے
کہ جانتا ہوں پرانا ہے اِس قدر سب کچھ

پڑا رہے جو کسی اور کا بھلا ہو جائے
یہاں نہیں ہے مرے کام کا اگر سب کچھ

میں اور کچھ بھی نہیں چاہتا کہ میرے لیے
ہے تیری ایک اُچٹتی ہُوئی نظر سب کچھ

زمانہ اُن کے لیے فکرمند ہو نہ بہت
ابھی ہے جن کے لیے شاخ اور شجر سب کچھ

ہم آسماں کی طرف دیکھتے نہیں سرِدست
ابھی تو ہم کو میسر ہے خاک پر سب کچھ

بہت کچھ اُس کی عنایت سے مِل رہا مجھے
میں خوش تو ہوں یہ بہت کچھ نہیں، مگر سب کچھ

ہے ایک بے ہُنری کی مثال یہ بھی ظفرؔ
کیا ہے جمع تو اتنا ہی تھا ہنر سب کچھ

قرار پائے تو شاید یہ گفتگو سب کچھ
وگرنہ اصل میں سب کچھ ہوں میں نہ تُو سب کچھ

اُٹھا رکھا ہے کسی اور وقت پر شاید
کہا تو جا نہ سکا اُس کے رو بہ رو سب کچھ

در و دریچہ و دیوار تھے یہاں جو مرے
بہا کے لے گیا طغیانِ آرزو سب کچھ

ہمارا دونوں پہ اب اختیار ہی نہ رہا
جو تھے ہمارے لیے لفظ اور لہو سب کچھ

ہم اور آپ بھی تبدیل ہو گئے کیا کیا
رہا نہیں ہے کسی طور ہُو بہ ہُو سب کچھ

وہ ابتری ہے کہ دشمن ہُوئی ہوائے چمن
اُڑا ہے ایک ہی جھونکے سے رنگ و بو سب کچھ

نہیں رہے وہ تقاضے ہی، کچھ ملے نہ ملے
سو ہونی چاہیے اب تو یہ جستجو سب کچھ

مرا وجود ہی اطراف میں نہیں موجود
وگرنہ اور تو باقی ہے چار سُو سب کچھ

بس ایک خوابِ خموشی کے منتظر ہیں، ظفرؔ
یہ شب، یہ شور، یہ شیون، یہ ہاؤ ہُو سب کچھ

شبِ سفر بھی ہے، طغیان، ابر و باد بھی ہے
چلے چلو کہ یہیں منزلِ مُراد بھی ہے

وہ تم نہیں ہو تو پھر اور کون ہے وہ، بتا
جو تم سے پہلے بھی ہے اور تمھارے بعد بھی ہے

یہ رات دن کا تماشا تو ہے لگایا ہُوا
مگر کہیں کوئی چیز اِس پہ مستزاد بھی ہے

یہ کشمکش ہمیں اب دیکھیے کہاں لے جائے
لہو میں شور بھی ہے، اور انجماد بھی ہے

نتیجہ اِس کا نکلنا تو ہے کسی صورت
ہمارا امن کہ جو اصل میں فساد بھی ہے

چھپائے پھرتے ہیں ظاہر کیے ہُوئے سب کچھ
وہ ایک راز جو دراصل روئیداد بھی ہے

زیادہ فرق نہیں کر سکے ہیں دونوں میں
کسی کے ساتھ جو ہے عشق بھی، عناد بھی ہے

کشید کرنا پڑی زندگی اُسی سے یہاں
لہو میں پھیلتا جاتا جو زہرباد بھی ہے

اب اُس کو کون سے کھاتے میں ڈالیے کہ ظفرؔ
کسی کے ہجر میں ناشاد بھی ہے، شاد بھی ہے

خواہشوں کو ہِلا نہیں دینا
کام پھر گڑبڑا نہیں دینا

ہم میں ایسے بھی ہیں جنھیں کل کو
نائی نے اُسترا نہیں دینا

شور کرتے رہیں عقب والے
آپ نے راستہ نہیں دینا

غور کرنا لطیفۂ غم پر
اور ہنسی میں اُڑا نہیں دینا

بوڑھے ایسے ہی آج کل کے ہیں
گھر میں جا کر بتا نہیں دینا

کام کی چیز ہے چراغِ ہوس
روشنی کو بُجھا نہیں دینا

اُس پہ مرنا تو ٹھیک ہے، لیکن
کبھی اُس کو بتا نہیں دینا

ایک پردہ جو رہ گیا ہے ابھی
اب اُسے بھی گِرا نہیں دینا

شہر والوں کا یہ سلوک، ظفرؔ
یاد رکھنا، بُھلا نہیں دینا

کہیں میرے ترے سِوا کوئی ہے
باغِ دُنیا میں تیسرا کوئی ہے

خیر، باہر تو ہے ہی بادِ مُراد
اندر اندر بھی اک ہوا کوئی ہے

دل کا دروازہ کھول کر اُس نے
ایک دن پوچھ ہی لیا، کوئی ہے؟

چومتا بھی ہوں، ڈھونڈتا بھی اُسے
یہاں موجود اور جدا کوئی ہے

اتنی بے رونقی نہیں تھی کبھی
شہر خالی پڑا ہے، یا کوئی ہے

اِس خرابے میں پہلے کیا کوئی تھا
اِس محلّے میں آج کیا کوئی ہے

سوچتا ہوں کہ دیکھتا ہے کون
دیکھتا ہوں کہ سوچتا کوئی ہے

یہ مضافات ہوں گے پھر آباد
اِن مکانات میں رہا کوئی ہے

بے سبب تو نہیں یہ سارا فساد
لگ رہا ہے ظفرؔ، خدا کوئی ہے

کسے معلوم ہے اب کیا نہیں اور کیا غنیمت ہے
کہ جیسی بھی ہے، اور جو بھی ہے یہ دُنیا غنیمت ہے

بُجھائی ہو کبھی پیاس اور کبھی مٹی اُڑائی ہو
کہیں دریا غنیمت ہے، کہیں صحرا غنیمت ہے

وداع و وصل کے ہیں اپنے اپنے ذائقے یک سر
کوئی جاتا غنیمت ہے، کوئی آتا غنیمت ہے

بہت مضبوط ہے اتنا تعلق بھی، اگر سمجھو
کئی دن سے کسی کی رنجشِ بے جا غنیمت ہے

چلو رُکنا ٹھہرنا تو نہیں تیرے لیے ممکن
ترا اِس راستے سے یوں گزر جانا غنیمت ہے

ہوائے ہجر میں جھونکے اُمید و بیم کے بھی ہیں
یہ موسم اصل میں سارے کا ہی سارا غنیمت ہے

سفر درپیش اور رختِ سفر بھی کچھ نہ تھا، لیکن
مِلا ہے جو خدا کا اک یہاں ٹکڑا غنیمت ہے

کرم فرمائیاں ہیں اپنی اپنی خاص دونوں کی
کبھی بازو غنیمت ہیں، کبھی چہرہ غنیمت ہے

ظفرؔ، سب اپنی اپنی شامتِ اعمال ہے ورنہ
کہ یہ منزل غنیمت ہے نہ یہ رستہ غنیمت ہے

اُتنا ہی دردِ سر ہے کہ جتنا ہی کام ہے
یہ کاروبارِ عشق انوکھا ہی کام ہے

کرتے ہیں ذوق و شوق سے اور کیوں نہیں کریں
آخر تمھارا کام بھی اپنا ہی کام ہے

اِس پر بھی اعتراض تمھیں ہے، وگرنہ ہم
جو کچھ بھی کر رہے ہیں، تمھارا ہی کام ہے

ہر دَم ہمارا آدمیوں سے معاملہ
یہ بھی تو ہر لحاظ سے کُتّا ہی کام ہے

اپنی تو بات بھی نہیں سنتا یہاں کوئی
اور آپ کا تو شہر میں چلتا ہی کام ہے

آنکھوں میں گرد اُڑتی ہُوئی، اور خشک ہونٹ
یہ پیاس ہے تو پھر دریا ہی کام ہے

آنکھوں پہ کیوں آ پڑے سارے بدن کا بوجھ
اپنا جو صبح و شام تماشا ہی کام ہے

سیدھے سبھاؤ بات جو کرنی پڑے ہمیں
اپنے لیے تو یہ بھی اک اُلٹا ہی کام ہے

جھگڑے فساد کا کوئی امکاں نہیں، ظفرؔ
یعنی یہ کچھ نہ کرنا بھی اچھا ہی کام ہے

اندر اندر چلنے والا ٹھہرا ٹھہرا کام تھا
گھپ اندھیرے میں کوئی ایسا سنہرا کام تھا

بات بھی کوئی نہ تھی، آواز بھی مشکوک سی
ورنہ تو دراصل وہ گونگا نہ بہرا کام تھا

روشنی تھی اور شعلے تھے لہو اندر لہو
کوئی دیوالی تھی اور کوئی دسہرا کام تھا

رات میرے سامنے تھا ایک دریائے رواں
لیکن اس سے اور آگے مجھ کو صحرا کام تھا

کھڑکیوں نے روک رکھے تھے ہوا کے راستے
فرش پر دُہرے بدن تھے اور اکہرا کام تھا

کوئی اندازہ نہیں تھا کس قدر ہے اور چھور
کچھ پتا چلتا نہیں تھا، اتنا گہرا کام تھا

کوئی ہونی تھی کہ جس کو روکنے والے تھے سب
ایک دربانی تھی گویا، اور پہرہ کام تھا

دائرے سے بن رہے تھے خاک وخوشبو کے تمام
گفتگو کے آگے پیچھے کوئی لہرا کام تھا

میرا اقبالی بیاں جاری تھا مدّت سے، ظفرؔ
وہ بھی تھا موجود، بے شک یہ کٹہرا کام تھا

اُتنا ہی دردِ سر ہے کہ جتنا ہی کام ہے
یہ کاروبارِ عشق انوکھا ہی کام ہے

کرتے ہیں ذوق و شوق سے اور کیوں نہیں کریں
آخر تمھارا کام بھی اپنا ہی کام ہے

اِس پر بھی اعتراض تمھیں ہے، وگرنہ ہم
جو کچھ بھی کر رہے ہیں، تمھارا ہی کام ہے

ہر دَم ہمارا آدمیوں سے معاملہ
یہ بھی تو ہر لحاظ سے کُتّا ہی کام ہے

اپنی تو بات بھی نہیں سنتا یہاں کوئی
اور آپ کا تو شہر میں چلتا ہی کام ہے

آنکھوں میں گرد اُڑتی ہُوئی، اور خشک ہونٹ
یہ پیاس ہے تو پھر دریا ہی کام ہے

آنکھوں پہ کیوں آ پڑے سارے بدن کا بوجھ
اپنا جو صبح و شام تماشا ہی کام ہے

سیدھے سبھاؤ بات جو کرنی پڑے ہمیں
اپنے لیے تو یہ بھی اک اُلٹا ہی کام ہے

جھگڑے فساد کا کوئی امکاں نہیں، ظفرؔ
یعنی یہ کچھ نہ کرنا بھی اچھا ہی کام ہے

سانولے پَن ہی کو سب سمجھے ہیں کالا رنگ تھا
اور اگر تھا بھی تو وہ کتنا اُجالا رنگ تھا

کچھ سفیدی اور سیاہی سے الگ سی دھوپ چھاؤں
کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، نرالا رنگ تھا

شام تھا اور صبح سی ہر دَم کیے رکھتا تھا وہ
سب کو حیران و پریشاں کرنے والا رنگ تھا

ناز نخرے میں تو تھی پہچان اُس کی اک وہی
حیل و حجت میں بھی ایک اُس کا حوالہ رنگ تھا

بجلیاں سی اُس کی آنکھوں میں چمکتی تھیں کوئی
کن گھٹاؤں سے کہیں اُس نے نکالا رنگ تھا

اور، سب طرفیں تھیں اُس کی قابلِ دید ایک دم
ایک تھا وہ اور کئی رنگوں میں ڈھالا رنگ تھا

روشنی سی پھوٹتی تھی اِن اندھیروں میں کوئی
رات میں دن کر رہا تھا، ایسا اعلیٰ رنگ تھا

یوں تو دیکھا تھا اُسے پہلی دفعہ ہم نے، مگر
ایسے لگتا تھا کہ اپنا دیکھا بھالا رنگ تھا

جسم کی ڈالی تھی برگ و بار سے بوجھل، ظفرؔ
حُسن تھا کوئی غضب، اُس پر دوبالا رنگ تھا

کسی کاغذ کی طرح آگ میں جلنے لگا ہوں
دیکھتے دیکھتے کیا رنگ بدلنے لگا ہوں

کل کسی اور ہی قالب میں سمایا کیوں تھا
آج ایک اور ہی سانچے میں جو ڈھلنے لگا ہوں

جانے کس دم کوئی آواز ڈرا جائے مجھے
کسی موہوم سی آہٹ پہ دہلنے لگا ہوں

پھول پھل بھی کبھی لے آؤں گا رفتہ رفتہ
ایک پودا سا ترے باغ میں پلنے لگا ہوں

ریت اک پیاس کی صورت ہے مرے چاروں طرف
دشتِ دل سے کوئی چشمہ سا اُبلنے لگا ہوں

میرے ساتھی تو ہیں پہنچے ہوئے منزل پہ، مگر
اور، میں شاید ابھی گھر سے نکلنے لگا ہوں

کام تو بھول چکا جس کے لیے آیا تھا
یہاں آ کر تری باتوں سے بہلنے لگا ہوں

ایسے لگتا ہے کہ ہے پھر کوئی جینے کا جواز
گاہے گاہے جو کسی شے کو مچلنے لگا ہوں

باقی ماندہ تو سفر یوں ہی کٹے گا کہ ظفرؔ
کبھی رُکنے لگا ہوں اور کبھی چلنے لگا ہوں

کہیں آنے لگا ہوں اور نہ ہی جانے لگا ہوں
گھر میں بے کار پڑا یونہی ٹھکانے لگا ہوں

تجھ میں اور مجھ میں کوئی فاصلہ ہے یہ دریا
اِس لیے اِس کے کناروں کو ملانے لگا ہوں

اِس کا مفہوم تو مجھ کو بھی نہیں ہے معلوم
آخری مرتبہ جو بات بتانے لگا ہوں

گھر میں ہوں گھات لگائے ہُوئے بیٹھا کب سے
جیسے اپنی ہی کوئی چیز چُرانے لگا ہوں

خود ہوں مصروف کسی نیند کی تیاری میں
اور، سوتے ہُوئے لوگوں کو جگانے لگا ہوں

تاکہ آثار ہی اِس کے نہ رہیں دنیا میں
جو لکھا ہی نہیں اب تک وہ مٹانے لگا ہوں

روکنے کے لیے اک بھولی ہوئی یاد کو میں
اپنے اندر کوئی دیوار اُٹھانے لگا ہوں

میری کچھ بھی نہیں لگتی ہے یہ دنیا، لیکن
ساتھ اِس کے بھی تو میں تیرے بہانے لگا ہوں

آخری سین ہے یہ خوابِ تماشا کا، ظفؔر
کھیل تھا، ختم ہُوا، پردہ گرانے لگا ہوں

اپنے ہی آپ کو جب دود سے تکنے لگا ہوں
فاصلہ سا کوئی اتنا ہے کہ تھکنے لگا ہوں

جس روانی سے سبق یاد کیا تھا میں نے
اب سناتے ہُوئے اُتنا ہی اَٹکنے لگا ہوں

یہ سفر کوئی نیا بھی نہیں، لیکن پھر بھی
جانے بُوجھے ہُوئے رستوں پہ بھٹکنے لگا ہوں

در و دیوار جنھیں چھوڑ کے آیا تھا کبھی
اب سُنا ہے کہ وہاں صاف جھلکنے لگا ہوں

میرا اپنا ہی اندھیرا تھا مرے چاروں طرف
اب کوئی عکس پڑا ہے تو چمکنے لگا ہوں

یوں سمجھ لو کہ رُکا میں رہا اب تک، لیکن
اب کسی لمسِ مبارک سے دھڑکنے لگا ہوں

یہ بلندی بھی مجھے راس نہیں ہے ہرگز
اپنی چوٹی پہ پہنچ کر جو لُڑھکنے لگا ہوں

شعر میں ذائقہ پیدا کوئی شاید ہو جائے
اب کوئی اور بھی چیز اس پہ چھڑکنے لگا ہوں

دیر کے بعد ملے ہیں تو کچھ ایسا ہے، ظفرؔ
وہ بھی بدلا ہُوا ہے، میں بھی جھجکنے لگا ہوں

تفریق

ڈاکٹر سعادت سعید کے نام

میں روز اپنے کناروں سے دیکھتا ہوں ظفرؔ
کہاں سے دُور ہے دنیا، کہاں سے دُور نہیں

ظفؔر اقبال (ایک عہد، ایک اُسلوب)

علی اکبر ناطق

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اِس دشت میں جھنکار مری

ظفؔر اقبال ایک عہد، ایک اُسلوب اور ادبی عبقریت کا نام ہے۔ وہ غزل کے شاعر ہیں، ابھی تک اُن کے (اب تک) کے نام سے چار کلیات چھپ چکے ہیں اور پانچواں زیرِ طبع ہے۔ ظفؔر اقبال کی غزل کا معاملہ بہت ٹیڑھا، اُلجھا ہوا اور متنازع ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کو تجربات، زبان کی تخریب وتشکیلات اور موضوعات کی رنگارنگی کے لیے ایک تجربہ گاہ بنا رکھا ہے۔ اِس تجربہ گاہ کو وہ مختلف بیانات اور احکامات سے مزید پیچیدہ بنا چکے ہیں۔ میں اُن کی اِن تمام کاوشوں، جن میں اُن کے شاعرانہ مزاج کی شوریدگی اور خودسری بہ تمام وکمال عمل پذیر ہوتی ہے، نہایت سنجیدگی سے جانچنے اور غور وفکر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے ظفؔر اقبال اُس شعری نظریے کے حامل ہیں جس کے تحت اشیا کا مطالعہ انسان کے جذبوں کی بجائے اُن کے اعمال سے لیا جاتا ہے۔ اوّل دن سے ہی (آبِ رواں، غبار آلود سمتوں کا سُراغ) اُن کی شعری دنیا مقامِ آہ وفغاں، بلبل وشراب وکباب اور فکرِ معاش وفریبِ حسن جیسی روایتی اور کچلی ہوئی شاعری سے دور، انسانی رویوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور کیفیتوں کا بیانیہ تھی۔ جس کے لیے اُنھوں نے اپنے شعر میں استعمال ہونے والی لفظیات کو مقامی، سماجی اور معاشرتی کلچر کی مٹی سے تیار کیا، پھر اُسے پنجاب کے نہری پانی سے گوندھا۔ اِس کے بعد اُس شاعری کا بُت تیار کیا جس کا نمونہ پہلے ہمارے پورے شعری بُت کدوں میں نہیں تھا۔ پھر اُس بُتِ شعر میں نئے خدا کی پوجا کرنے والوں کے

احساسات کی روح پھونک دی، جسے آپ گنگا، جمنا اور گومتی کی بجائے پنجاب اور اُس میں بھی خاص طور پر لاہور سے پرے پرے وسطی مضافات کے ادبی پانیوں کا خدا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر ظفر اقبال اپنے اولین شعری اثاثے پر قناعت کر لیتے اور قلم کی باگ روک لیتے تو اُن کی فکری پرواز پہلا آسمان بھی عبور نہ کر پاتی اور ادبی جغادری اُنھیں مضافات کا ایک منفرد شاعر کہہ کر تھوڑی بہت شاباش دے کر ایک برخوردار کی طرح دوسری طرف بٹھا دیتے۔ لوگ (چاہے وہ کتنے بڑے حساسیت کے استھان پر کیوں نہ بیٹھے ہوں) کبھی تھوڑے واویلے پر نہیں چونکتے۔ اُن کو ہنگامہ پیدا کر کے متوجہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ وہ ظفر اقبال نے پوری طاقت سے کیا۔ اُس کے لیے اُنھوں نے زبان توڑی، اچھی اور بُری دونوں روایات کو روندا، لفظیات کی پھِرکیاں بنائیں اور اُنھیں بیچ مجمعے کے گھمایا، حتیٰ کہ اُن کی پھِرکی ایک ایسا رنگین لٹو بن گیا جس کی کیل نے چھوٹی چھوٹی لٹونیوں کے سر اپنی ضربوں سے زخمی کر دیے۔ لوگ متوجہ ہوئے کہ یہ نیا شعبدہ گر، جسے ہم محض ایک درمیانے درجے کا مداری سمجھ رہے تھے، یہ تو خلاؤں میں باندھی گئی رسیوں پر کھیلنے والا بازی گر نکلا۔ تعجب کی بات ہے کہ اِس عمل میں اُن کی ستائش بھی پُرانے شعری بُت خانوں کے بڑے پجاری شمس الرحمٰن فاروقی کی طرف سے ہوئی۔ اُنھوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا کہ یہ شاعر کسی دوسرے کے یا چھوٹے منطقے کا نہیں ہے۔ اِس کی اپنی جاگیر ہے، اپنے بت کدے ہیں اور اپنے پجاری ہیں۔ فاروقی صاحب نے شعرِ شور انگیز لکھتے وقت جگہ جگہ ظفر اقبال کے اشعار کے حوالے رکھ کر یہ بھی ثابت کیا کہ وہ محض بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ایسے اُسلوب کا بادشاہ ہے جس کی ریاست کسی ایک منطقے اور کسی ایک زمانے تک محدود نہیں رہے گی۔ اب یہاں ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ظفر اقبال کی کس شاعری پر فاروقی کے بیان کا اطلاق ہوتا ہے؟ وہ شاعری جو اُس کی فطرت اور زمینی جمالیات کے خمیر سے اُٹھی ہے یا وہ، جس میں ظفر اقبال نے شاعری کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا اور ایک سے بڑھ کر ایک شعوری تجربہ کرنے کی کوشش میں شاعری کا کچومر نکال دیا۔ میری فاروقی صاحب سے ملاقاتوں کے دوران اور ظفر اقبال پر اُن کے لکھے گئے مضامین کے مطالعے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ظفر اقبال کے زبردستی کے شعوری تجربات کو اس میں سے خارج کر کے اُن کی ''آبِ رواں اور غبار آلود سمتوں کا سُراغ'' والی شاعری کو درج بالا اہمیت کا حامل

قرار دیتے ہیں جو غالبؔ کے بعد بڑے درجے کی اہمیت اختیار کرنے والی ہے۔ اگر فاروقی صاحب کے بیان کو ہم ایک طرف کر دیں تو سخن فہموں کی رائے بھی یہی ہے مگر پاکستان اور ہندوستان میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھیں ظفرؔ اقبال کی اُس شاعری سے کوئی تعلق نہیں جو "آبِ رواں اور غبار آلود سمتوں" کے سراغ میں یا اُن کی دوسری کتابوں میں اسی اُسلوب کی حامل شاعری ہے۔ وہ لوگ ظفرؔ اقبال کے زبردستی کے شعوری تجربات والی شاعری پر جان چھڑکنے کی کوشش میں ہیں اور یہ بات ظفرؔ اقبال بھی جانتا ہے۔ چنانچہ ظفرؔ اقبال اُن لوگوں کو اِس کھیل میں لگائے ہوئے ہے اور اپنے فن اور طبیعت کی روانی سے خود اچھی شاعری بھی کر رہا ہے۔ یعنی غبار آلود سمتوں کے سراغ والی۔ کیونکہ وہ آنے والے دور کی کہانی کو خوب سمجھتا ہے۔ نہیں سمجھتے تو اِس نقطے کو اُس کے نام نہاد نقال شاعر، جن کی شاعری پر اکثر اُس نے کالم بھی چڑھائے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِسی شوق میں لوگوں کی اکثریت بہک گئی اور وہی کچھ کہنے لگی جو ظفرؔ اقبال کہلوانا چاہتے تھے اور وہ اُس میں کامیاب بھی ہوئے۔ اِس میں ظفرؔ اقبال کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن وہ تمام طبقہ جو شعر کہہ سکتا تھا، وہ اپنے لٹنے کی خبر بھی نہیں رکھتا۔ یہ طبقۂ شعرا اِس نقالی میں یہی سمجھ رہا ہے کہ اپنا شعر کہہ رہے ہیں حالانکہ وہ ظفرؔ اقبال کو ہی دہرا رہے ہیں۔ یہ بات میں پچھلے دنوں اُن کے منہ پر بھی کہہ چکا ہوں۔

ظفرؔ اقبال جس دور میں اُردو غزل کے منظر پر اُبھرے، اُس وقت بہت اہم شاعر پورے برِ صغیر میں موجود تھے اور زمانے کی ہوا نے اُن کی خوشبو ظفرؔ اقبال سے کہیں زیادہ قرب و دور کے علاقوں میں پھیلائی اور اُن کو شہرت کی اُڑن طشتریوں پر اُڑایا۔ اُن سب میں ناصرؔ کاظمی اور اور فیض احمد فیضؔ تو بہت ہی خوش قسمت واقع ہوئے۔ ناصرؔ کاظمی کے متعلق تو کم و بیش سبھی کی رائے ہے کہ وہ میرؔ سے مستفیض ہونے کے ساتھ اُسلوب میں بھی اُن کے تابع ہیں (اگر چہ میرا اِس معاملے میں اختلاف ہے، میرؔ رعایتوں کے شاعر ہیں جب کہ ناصرؔ لفظی رعایتوں کو اہمیت دیتے ہیں یا اُن سے وہ رعایتیں بن نہیں پاتیں) اور فیضؔ صاحب ایک جمالیاتی منطقے کی شیریں نظموں کا مرقع سامنے لاتے ہیں، جن میں روایت کی متغزلانہ دلدوزی گھلی ہوتی ہے جو اُن کو ایک واقعی منفرد اور دلکش اُسلوب سے ہمکنار کر گئی ہے۔ ان کے علاوہ جتنے شاعر ہیں، وہ اِس پائے کے نہیں کہ اُن کا نام ظفرؔ

اقبال کے ساتھ لیا جائے مگر وہ مشہور ضرور ہوئے اور کسی حد تک ظفر سے زیادہ ہوئے مگر اب جب کہ ہواؤں کی اُچھالی ہوئی گرد بیٹھ رہی ہے تو ظفر اقبال کا چہرہ اُبھر کر سامنے اُٹھ رہا ہے۔ اس کی وجہ وہی کہ یہی وہ شاعر ہے جسے آپ جدید ٹیکسٹ کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ بات کا اُلٹ پھیر، استعاروں کو مصرعے میں بیچ دینا اور لفظ اور خیال کی آمیزش سے شعر کو ہلکے طنز، ہنسی اور سنجیدگی کی ملی جلی بناوٹ سے ایسے برتنا کہ انسان اُس شعر پر نہ ہنس سکتا ہے، نہ رو سکتا ہے اور نہ چُپ بیٹھ سکتا ہے۔

یہ جو میں نے اُن کو ٹیکسٹ یعنی متن کا شاعر کہا ہے، اُس کے معنی کچھ وسیع اور پیچیدہ ہیں، جن تک پہنچنے کے لیے ہمیں ظفر اقبال کی ذاتی اور علاقائی تنہائیوں کو کریدنا پڑے گا۔ ان تنہائیوں کو اصل میں دیکھا جائے تو اُنھی لوگوں نے پیدا کیا جو ادب کی جاگیر میں کسی خاص علاقے کی زبان اور محاورے حتیٰ کہ سکونت تک، کے علاوہ باقی تمام علاقوں کے افراد اور شعرا کی شعری اور ادبی حیثیت یا اتھارٹی پر سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ یہ وہی اسرائیلی یا یہودی نسلی برتری کی مثال ہے جن کے مذہب اور ادب میں کسی اور نسل کا انسان داخل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ادب اور شعر میں ایک خاص طبقۂ اشرافیہ نے جنم لیا، جن کے الفاظ و محاورہ و تراکیب کی رٹ ادبی کورٹوں یا ثقہ بند نقاد قاضیوں کی عدالت میں چلتی رہی، ایک خاص طرح کے آدابِ مجلس اور متکلف زبان نے مضافاتی زبان و محاورے کو اچھوت قرار دے دیا۔ یوں مضافاتی شاعر بھی اچھوت بن کے رہ گیا، جسے میں نے تنہائی کی اصطلاح قرار دیا ہے۔ اس رویے نے شاعری کی نسبت علاقے اور محاورے کو برتری دی۔ جسے دُور کرنے کے لیے ظفر اقبال نے اپنے آپ کو اور انتقام کی خاطر دوسروں کو بھی رُسوا کرنے کے لیے کہانیاں بنائیں، ذاتی محاورے بنائے، زبان کی کایا کلپ کی، وسطی پنجاب کے کرداروں، اور اشیا کے ضمیروں کو گھیر گھیر کر اُن میں داخل کیا۔ یہ غزلیہ کہانیاں پہلے ایسی نہ تھیں، اُن کے اندر تکلف اور شرافت تھی، پہلے کی غزل کا شاعر گویا یوپی کا چوڑی دار پاجامہ اور باریک لٹھے کا کُرتا پہننے والا ایسا مالی تھا، جس کے باغ میں سرو و سمن تھے، سیدھی قطاروں میں کلیوں اور پھولوں کے پودے تھے، نازک برگ و بار کی بیلیں تھیں اور بلبل و مینا کی آوازیں۔ مگر ظفر اقبال کی شاعری ایک ایسے پنجابی دہقان کی کھیتی ہے، جس میں جیتے جاگتے بیلوں کی گھنٹیاں، گندم اور کماد کی دور تک پھیلی

ہوئی فصلیں، دوابے کی نہروں کی روانی اور چوڑے کولھوں والی عورتیں ہیں۔ ان کہانیوں میں بے شمار کردار کبھی اُلٹے کام کرتے ہیں، کبھی سیدھے۔ ظفر اقبال نے ان غزلوں کے پردے میں اپنے اندرونی خلا کو خارج کی ڈرامائی اور بانسری دار آواز کے طلسم سے پُر کرنے کی کوشش کی۔ جس کا سحر خیمے کی چاروں طنابوں کی طرح خیمے کو بلند کیے ہوئے ہے۔ جن چوبوں سے ظفر اقبال نے یہ طنابیں باندھی ہیں، اُن کو اُس نے اپنی زمین پر بلند ہونے والے درخت کی لکڑی سے خود تیار کیا ہے۔ یہ ڈرامائی طلسماتی آواز اُن فنکاروں سے بالکل جدا تھی، جو علاقائی تنہائی کا شکار نہیں تھے اور جن کے پاس بتانے کو اور یاد رکھنے کو یا رہنے کو بڑے بڑے ثقافتی شہروں اور زبانوں کے نسب نامے تھے۔ وہ شاعر اُن نسب ناموں کے طلسم میں اتنے گرفتار تھے کہ اُن کے پاس ٹیکسٹ کی بجائے فخر اور کہنہ الفاظ کی ہیئت رہ گئی۔ مضمون، الفاظ کی نئی ساخت، نئی ہواؤں کی خوشبو، خوشبو کا لمس اور کچی سڑکوں پر چلتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیوں کے نغمے اُن کے ہاتھ نہ آسکے۔ یوں ظفر اقبال اُن سے بازی لے گیا۔ اُس کی آواز اور کہانی میں ہر آنے والے نئے شاعر نے نئی جمالیات دیکھی، اپنے اردگرد کے الفاظ دیکھے اور عام قاری نے اپنی محرومی کو دیکھا، اس لیے اُنھوں نے ظفر اقبال کے شعروں کو آسانی سے گلے لگالیا۔ یہ بات ہمیشہ سے مصدقہ ہے کہ ایک بڑا شاعر تتبع سے نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا ظفر اقبال کی ان اُلٹی اور سیدھی، رنگ برنگی، اور نازک شعری تتلیوں اور شعری کہانیوں کے طلسم میں کم وبیش ہندوستان اور پاکستان کے تمام نوجوان شاعر پھنس گئے اور جو نہ پھنسا، اُس کے اپنے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ ویسے ہی اپنی روایتی زبان میں دب کر مر گیا۔

درج بالا توجیہ ایسی کھلی واردات تھی جو ظفر اقبال کو دوسرے تمام شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی میں اُن کے جرأت اور بے نیازی کے باب چھپے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اکثر چوڑی دار روایت کے شعرا اپنے حلقہ اثر میں بلاوجہ کی عزت وتوقیر اور کھوکھلی انا برقرار رکھنے کے لیے بندھے ٹکے اُصولوں سے انحراف کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اُن کا مسئلہ شعر سے زیادہ اپنی بڑائی اور علمی برتری کا احساس پیدا کرنا ہوتا ہے، جو اُنھیں روایت پسندی کا خوگر بنا دیتا ہے۔ یہ رویہ خود اُن شاعروں کے لیے بھی ایسی دیوار ثابت ہوتا ہے جس کو نہ وہ پھلانگ سکتے ہیں اور نہ گرا کر آگے گزر سکتے ہیں۔ البتہ اپنے خشک لفظوں کے پتھروں سے اُسے مزید بلند اور مضبوط کر لیتے ہیں، اُن کے اس عمل میں

وقت کے نام نہاد درسی نقاد بھی کشادہ دلی سے اُن کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ نتیجتاً اس تعمیر میں تمام مواد کہنہ ادبی دیواروں اور ملبے سے جمع کیا جاتا ہے اور پُرانی شکل پر اُسے تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ شاعر اپنی زندگی میں ایک آدھ ترکیب یا ایک دو شعر کے علاوہ کچھ نہیں دے پاتے۔ اِس مثال کے لیے میں یہاں کچھ نام بھی دہرا دیتا ہوں تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے، چھوٹے موٹے شاعروں کا تو خیر کیا مذکور، مشہور شاعروں میں بھی میرؔ کے دور میں سوداؔ کے علاوہ کم و بیش تمام شاعر اسی صف میں آتے ہیں۔ دردؔ، جو بعض لوگوں کی نظر میں کوئی بڑی توپ چیز ہے، وہ بھی ایک تیسرے درجے کا شاعر تھا۔ غالبؔ کے دور میں، مومنؔ کا بڑا ذکر کرنے والے، اُس کی شاعری میں دو تین غزلوں کے علاوہ کچھ نہیں نکال سکیں گے، اور اُن میں بھی مصرعے کی بندش کے سوا کچھ نہیں نکل سکے گا۔ اسی طرح ناصرؔ کاظمی، فیض احمد فیضؔ اور منیرؔ نیازی کے استثنیٰ کے ساتھ (ان تین شاعروں کو بھی ایک طرح سے اجتہاد کا درجہ حاصل ہے۔ کیسے ہے؟ یہ گفتگو بعد میں کبھی ہوگی) نیچے آتے جائیں تو روایتوں میں بندھے اور جکڑے ہوئے اکثر بس تمیس مار خاں، حفیظؔ جالندھری، احمد مشتاقؔ، احمد فرازؔ، احسان دانش وغیرہ یہی کچھ ہیں، مجتہد شاعر نظر نہیں آئیں گے۔

ظفرؔ اقبال نے ایسا نہیں کیا۔ اُنھوں نے سامنے قدما کی کوئی دیوار کھڑی نہیں ہونے دی اور نہ اُس کا لحاظ کیا ہے۔ ایسا نہیں کہ اُنھوں نے قدیم شعری ادب کو رد کر دیا ہو، اور اُس کی عزت و توقیر پر ضرب لگائی ہو۔ اِس طرح کچھ نہیں ہوا مگر یہ ضرور ہوا کہ میرؔ، غالبؔ کی طرح ایسا جدید شعری اجتہاد کیا جسے نئے دبستان کا نام بھی دیا جا سکتا ہے جو دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے دبستان سے مکمل الگ اور نیا ہے۔ آپ اِسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں، دبستانِ اوکاڑہ یا دبستانِ ظفر اقبال۔ ظفرؔ اقبال نے سوچا، اگر جمنا اور گومتی کے پانیوں میں اجتہاد کی تاثیر پائی جاتی ہے تو اوکاڑہ میں بہتی دوابہ کو یہ قدرت حاصل کیوں نہیں ہو سکتی۔ سو یہی اُن کی جرأت اُنھیں ایسے ادبی اور شعری استھان پر لے آئی جہاں سے نئے چاند اور سورج نکلنے لگے۔ اِن کے ہاں شعر میں الفاظ کی آمد محض لفظ نہیں رہتے، وسطی پنجاب کے میدان یا نہر کنارے برسن کے کھیت میں بھینی بھینی خوشبو بکھیرنے والے پھول بن جاتے ہیں۔ جسے آپ دیکھ بھی لیتے ہیں، چھو بھی لیتے ہیں اور خوشبو کی مہک بھی اُڑا لیتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ظفرؔ اقبال کے بعض رویوں سے خوش نہیں ہوں اور بہت

سے اختلاف رکھتا ہوں۔ بہت سے احباب مجھ پر طعنہ بھی رکھیں گے کہ اس وقت ظفؔر اقبال کی اتھارٹی کو ماننے کے کیا معنی؟ مجھے اُن کو جواب دینے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ مَیں نے اُنھیں پہلے بھی کبھی رد نہیں کیا تھا، نہ ظفؔر اقبال کے بڑا شاعر ہونے کا انکار کیا تھا۔ میرا اُن سے جھگڑا کسی اور سطح کا تھا جس کے یہاں بیان کرنے کا وقت نہیں۔ اِن باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مجھے اُن کی شاعری کے اثبات پر اتفاق ہے اور اُن کے اپنے اور نجی اُسلوب پر اصرار کرنا ہے۔ کیونکہ سورج سے انکار کرنے پر مجھے اپنے آپ کو اندھا کہلوانے کی فی الحال کوئی جلدی نہیں ہے۔

مجھے اس معاملے میں دُور تک جانے کی ضرورت نہیں، کہ یہ کام نقادوں کا ہے۔ البتہ ظفؔر اقبال کے لیے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اپنی ذات کی طرف اُنھوں نے اتنے دروازے کھول دیے ہیں کہ زمانہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن دروازوں سے ضرور گزرے گا اور اُن کے شہرِ شعر سے کچھ نہ کچھ سامان کی خریداری ضرور کرے گا اور دوسروں کو بھی اس خریداری میں شریک ہونے کی دعوت دے گا۔ بہرحال میں ظفؔر اقبال کو اُردو زبان کا ایسا شاعر سمجھتا ہوں جس کا اثر آئندہ نسلیں ضرور قبول کریں گی۔ وہ نسلیں شاید میرؔ اور غالبؔ کی طرح کا بڑا شعر نہ کہہ سکیں لیکن ظفؔر اقبال کی طرح کا ضرور کہنے کی کوشش کریں گی جو اُن کی زبان اور معاشرت کے قریب بھی ہے اور نئی جمالیات کا آئینہ دار بھی ہے۔

◆◆◆

ظفر اقبال ...... ایک مُوذی شاعر

حُسین مجروح

خیال و خواب کو خمیرتی جوانی کی طرح، غزل کی شاعری بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک چلمن سے لگی نیک پروین...... دل ہی دل میں معاملہ کرنے والی اور چپکے سے کلیجہ مٹھی میں بھر لینے والی، دوسری میلہ گھومنی، حیرت کو حاشیہ کر دینے والی۔ ایک ہی مندر کی داسیاں ہونے کے باوصف، دونوں میں کم کم بنی اور وہ مدتوں ایک دوسری کی جانب پشت کیے رہیں۔ آتوں جاتوں کو دُوبھر ہوتا...... کسے بوسہ دیں، کسے گلے لگائیں۔ سوکنوں کی یہ عداوت، تین ساڑھے تین سو برسوں کا تخلیقی جوہر، انجذاب کرنے پر بھی رفع نہ ہوئی تا آنکہ ظفر اقبال نامی ایک مضافاتی اس شعری قبیلے کا "شریک" بنا۔ رہ و رسم کا آغاز تو بڑی بیگم کے تعارف سے ہوا، لیکن جلد ہی اُس کی چالاک نظر نے غازے کے عقب میں کارفرما جبریوں کا اندازہ لگا لیا اور اگلی ملاقات میں وہ میلہ گھومنی کی انگلی پکڑ، اِن افلاک کی سیر کو نکل گیا جہاں تنقیدی فرشتوں کے پر جلتے ہیں اور بے توفیق قرأت کی آنکھیں "موتیاتی" ہیں۔

ابتدا بہت ہاہا کار مچی۔ نیک پروین کے لواحقین نے حقہ پانی بند کرنا چاہا اور ٹھہرے پانی میں سیلاب اُٹھانے کی تدبیر اُٹھائی، لیکن مآلِ کار منہ کی کھائی۔ وہ عفیفہ تو خود، ایوانِ شعر کی بے نکاحی تھی، سوکن پر لگے، بے راہروی کے الزامات کی داد اُسے کیونکر ملتی۔ سو اپنی سوکن اور اپنے جفا جو سے صلح کرتے ہی بنی۔ اِدھر ظفر اقبال کی آنکھ میں بھی ایک قصباتی کا نمک تھا۔ لہٰذا انا میاتی بیزاری کے باوصف، وہ متروکہ کو مطلقہ کہنے کا روادار نہ ہوا۔ فرہاد ہوتے ہوئے بھی اُس نے (جزوی طور پر) سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود رہنا پسند کیا۔ چنانچہ بھیڑ میں تانگہ اُلٹانے، شعر کی چھابڑی لگانے اور بیوی بچوں کی موجودگی میں، عشق کو جھوٹا تصور کرنے کی "علتوں" کے پہلو بہ پہلو اُس نے "عشرتِ آغازِ

خواب'' اور ''خواہشِ پایانِ کار'' سے بھی علاقہ رکھا۔ یُوں اِس قصباتی نے ایک ٹکٹ میں دو مزوں کو استحقاق کیا۔

آیئے اِس ''موذی'' کی بے پناہ و بے مثال حرفت کا صنعتِ معکوس (Reverse Engineering) کے قاعدے سے تدارک کریں (اگرچہ ہوگا نہیں)۔

آبِ رواں کی نجیب الطرفینی سے گلافتاب کی عجیب الطرفینی تک مراجعت ہی روایتی غزل کے ''نصف بہتروں'' کو پوری طرح ہضم نہ ہو پائی تھی کہ موصوف نے ''ہے ہنومان'' کا جھنڈا اُٹھا لیا۔ لیجیے! غزل کی توحید، تشکیلات کی بت پرستی کے ہاتھوں خطرے میں پڑ گئی، لیکن ظفؔر اقبال پرلے درجے کا ''میسنا'' ہے (اُردو کے چالاک، ہوشیار تو اس لفظ کی گرد کو نہیں پہنچتے۔) اِس نے بندر کے ہاتھوں میں استرا دے کر، خود داڑھی بڑھالی اور وہ بھی فرنچ کٹ۔ چنانچہ غبار آلود سمتوں کا سراغ پانے، وہم و گماں سے استفادہ کرنے اور عیب و ہنر کو عزیز رکھنے کے باعث، ظفؔر اقبال نے اپنے تئیں مولوی اور سائنس دان میں دوستی کا اہتمام کیا۔ (یہ الگ بات کہ معاملہ ''ہتھ جوڑی'' سے آگے نہیں بڑھ سکا۔)

اِس ''تضادِ بحرین'' کے باعث، اب ہمارے سامنے، غزل کے حجلۂ عروسی میں، ظفؔر اقبال نامی ایسا دولھا متنقر ہے جس کی گالیں تشکیلات اور جدت طرازی کے بلیڈ سے صفا چٹ ہیں، لیکن ٹھوڑی روایت اور کلاسیک کی داڑھی سے آباد۔ باور آیا کہ یہ قصباتی بنا مضافاتی شاعر ہی نہیں کاریگر بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس کی تازہ شیو کی ہوئی گالوں سے جا بجا قدیم کی لپک دیتا ہوا شعری سبزۂ خط اُمڈ اپڑتا ہے تو کہیں نورانی ٹھوڑی سے گنجِ تشکیلِ نو:

کس کا یقین کیجیے کس کا نہ کیجیے

غزل کی شاعری کے ساتھ تو جو ہوا، سو ہوا۔ ظفؔر اقبال نے سب سے بڑا ہاتھ، بیچارے قاری کے ساتھ کیا۔ غزل کا قاری، صدیوں سے ایک نوع کی ''دل پشوری'' میں منہمک تھا۔ گویا فلم کی کہانی کمزور ہو (یا سرے سے مفقود) تو بھی ہیروئن کے دو چار ٹھمکوں سے ٹکٹ کے پیسے پورے ہو جائیں۔ ظفؔر اقبال نے غزل کے رانجھے کو چوری سے ہٹا کر، کنجڑے سے سبزی خریدنے، رکشے والے سے بھید بھاؤ کرنے اور زوجہ سے ''علی الاعلان'' ڈرنے پر لگا دیا۔ ہم اِس اندیشے کے پیشِ نظر کہ اِن عمومی کارروائیوں ہی کو مستقبل کی غزل کا نصاب نہ سمجھ لیا جائے۔ ظفؔر اقبال نے فلم کے

بیچوں بیچ، اوّل و آخر، جہاں تہاں، سخن طرازی کے ایسے ایسے دلکش نمونے بھی مصور کردیئے کہ آنکھیں موندتے بنے نہ کان بھینچتے۔ اس دوطرفہ چاند ماری میں قاری بے طرح مارا گیا۔ روایتی غزل میں اُس کا دل اٹکا تھا اور تشکیلاتی غزل اُس کا دماغ کھینچتی تھی۔ کسے رکھے کسے چھوڑے، لیکن قاری تو ظفر اقبال کا مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ صحیح تر لفظوں میں تو خود غزل بھی اُس کا مسئلہ نہیں تھی۔ کم از کم اس طرح تو بالکل نہیں جیسے اُس کے بیش تر ہم عصر اور پیش رو، غزل کی عفت مآبی کے وعدہ معاف گواہ بن کر غزل شعار کیے ہوئے تھے۔ ظفر اقبال تو دراصل ایک وکھری ٹائپ کا راج مستری ہے، جو غزل کی پرانی عمارت کو باہر سے مرمت کرنا اور اندر سے تبدیل کردینا چاہتا ہے (صرف چاہنے ہی پر کیا موقوف، اُس نے غزل کو اسی طرح تبدیل بھی کیا ہے)۔ یوں بھی نہیں کہ اس شعری اجتہاد کے نتیجے میں پوری کی پوری نئی غزل، ظفر اقبال کے تتبع میں ہی لکھی جارہی ہے۔ شعروادب میں اس طرح ہوتا بھی نہیں۔ اس صرافے میں نیا، پرانا، کھرا کھوٹا ہر قسم کا زیور دستیاب ہوتا ہے اور اس کے خریدار بھی۔ ظفر اقبال کا شعری کارنامہ تو یہ ہے کہ اُس نے سونے، چاندی سے ہی نہیں پیتل، تانبے حتیٰ کہ زنگ آلود لوہے سے بھی زیور بنا کر — اُردو غزل کو کم خرچ، بالانشیں جھمکی بنا دیا ہے، جو امیر غریب، عقل پیشہ، کم عقل سبھی کی دسترس میں ہے، سبھوں کے جی لبھاتی ہے۔ ظفر اقبال کی اِس سخاوت کے باعث، بازارِ سخن کی رونق دیدنی ہے۔ اگرچہ قبولِ عام کی آکاس بیل تلے، اُس کا اپنا تانگہ ہنوز اُلٹا پڑا ہے۔

حیرت انگیز طور پر، ظفر اقبال ایسے "جہادی" نے غزل کے بیرون سے، بہت کم چھیڑ چھاڑ کی ہے جبکہ لسانی تشکیلات اور اظہاری تصرفات کے تیشے سے اُس نے اندرونی، چھت، فرش، درو دیوار سبھی کو اُدھیڑ کھدیڑ دیا ہے، لیکن یہ اُدھیڑ کھدیڑ بوسیدہ مکان کو ڈھا کر، خالی زمین پر، تجارتی پلازہ بنانے والی نہیں کہ ظفر اقبال بوسیدگی کے خلاف ہے، قدامت کے نہیں اور اُس کا ہدف روایت کی اندھی پرستش ہے، خود روایت نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غزل کی اندرونی توڑ پھوڑ اور بیرونی روغنائی کی مہم میں، اُس کے بیشتر مقامات پر، کیل قبضوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ غالباً اس لیے کہ وہ ایک مجتہد ہے، پیغمبر نہیں اور مجتہد بھی ایسا کہ اجماع کی الف گر جائے تو خوشی کے مارے تالی بجائے اور قافیے کی تنگی سے ردیف کو کشادہ کردے۔

اِس مضمون کو عنوان کرتے ہوئے میں نے ظفر اقبال کے لیے مُوذی کا لفظ انتخاب کیا تو اس

کا سبب یہ نہیں کہ وہ حد درجہ مہارت اور چکر بازی کے ساتھ، لاشعر بلکہ عدم شعر تک کو سخن کر دیتا ہے بلکہ یہ کہ اُردو غزل کا یہ مضافاتی چوتھی کھونٹ کا ایسا مسافر ہے جو ہجوم کو اپنے پیچھے لگا کر، رستے کے کبھی آثار مٹا دیتا ہے اور اگر کوئی سر پھرا، اس کا تعاقب کرنے پر تل جائے تو اپنی صناعی کی دھندلاہٹ سے اِس طرح کی صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے کہ ''تعاقبی'' پیچھے کو پلٹ سکے نہ آگے نکل سکے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ہمسری سے ڈرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو غزل بلکہ پوری اُردو شاعری کی روایت میں ظفرؔ اقبال ایک اِستثنائی مثال ہے جو نہ صرف اپنی شاعری کو بھی مسترد کرنے، اور اس پر عقیدت کے غلاف چڑھانے کے خلاف ہمہ وقت آمادہ رہتا ہے بلکہ اپنے ہم عصروں اور بعید والوں کو راستے کے بھید بھاؤ بتانے میں بھی خِسّت سے کام نہیں لیتا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ظفرؔ اقبال کا راستہ اوپر سے قالینی، اندر سے دلدلی ہے۔ ظفرؔ اقبال کے پاؤں تو ملامت کی مٹی سے بنے ہیں، اسی لاسے اُسے قالین سے رغبت ہوئی نہ دلدل سے وحشت۔ کوئی دوسرا یہ کشت کاٹنا بھی چاہے تو خود کو پتھر مارنے کا حوصلہ کہاں سے لائے۔ اب اِس مُوذی کا توڑ کیا ہو جو شیش محل کی دیواریں ''کھنگریالی'' اینٹ سے تعمیر کرنے بلکہ کیے چلے جانے پر اصرار کرتا ہے اور شیشوں کو سہارنے کے لیے چونے گارے کی بجائے سرکنڈوں کے حصار، اُسارتا ہے۔ ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اُسے اور اُس کی تشکیلاتی کارستانیوں کو بے توجہی کی مار ماردی جاتی اور غزل سے اُس کی فلرٹیشن (معاف کیجیے، کوئی مناسب اُردو مترادف نہیں سُوجھ رہا) کو حدود و قوانین کی خلاف ورزی قرار دے کر کیفرِ کردار تک پہنچایا جاتا۔ ابتدائی برسوں میں اُس کے معترفین نے یہ حربہ بھی آزما دیکھا، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا وہ ایک خطرناک درجے کا طباع ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی چالاک ''وارداتیا'' بھی ہے سو، اُس نے لِسانی تشکیلات کی مسلسل بدعت افزائی کے دوران میں چٹکیلے اور پہلو دار شعروں کی پرداخت سے بھی ہاتھ نہیں کھینچا اور مضحکہ خیز حد تک تجرباتی اشعار کی چاند ماری میں، پھلجھڑی کی طرح روشنائی کو روشنی کرتے ہوئے اشعار بھی انھیں غزلوں کو دان کیے جن کا اوّل و آخر، میانہ اظہار، غیر شعری در و بست اور بظاہر بے رس مصرع بازی سے اَٹا پڑا تھا۔ یہاں قاری اور نقاد دونوں پھنس گئے۔ چٹکیلے، رسیلے اور انوکھے شعروں والے ظفرؔ اقبال سے صرفِ نظر کریں، تو خود بے اعتبار ٹھہریں۔ اَن گھڑ، نیم پختہ اور ناقابلِ قبول شعری تجربوں کو اپنائیں تو اپنے تربیت یافتہ اور بند کمرے ایسے شعری مزاج کا کیا کریں۔ ردّ و قبول کی اس کشاکش

کو ظفر اقبال نے ایک محفوظ فاصلے سے دیکھا اور نیم استہزائی مسکراہٹ کی سلامی دے کر، اپنے کام میں جُت گیا۔

نامانوس اور اجنبی راستے کو اختیار کرنے میں جہاں کئی دُشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ وہاں مسافر کے لیے یہ دلکشی بھی ہوتی ہے کہ بہت سے اَن دیکھے، کنوارے مناظر بھی اپنی بکل میں اُتارنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ مسافر کی آبلہ پائی کا اَجر جلووں اور تلووں کا یہی کنوار پن ہوتا ہے، لیکن زبان و بیان اور اظہار و اُسلوب کے نت نئے تجربوں کی ملک میں ظفر اقبال نے عزتِ سادات تو آغاز ہی میں کھونٹی پر لٹکا دی تھی۔ بعد کے شعری سفر میں تو اُس نے کچے پکے، ناکام، کامیاب ہر طرح کے تجربوں کی بکرا منڈی لگا دی۔ سُود و زیاں کے اندیشے تو اُس نے بہت پہلے اپنی لغت سے کھرچ دیئے تھے۔ ادھر کچھ عرصے سے تو ظفر اقبال نے اپنے ناکام تجربوں اور نیم پختہ شعروں کا علی الترتیب عُرس اور جشن منانا شروع کر دیا ہے۔ اِس باب میں اُس کا تنقیدی مسلک یہ ہے کہ کچھ نہ کرنے سے کوئی ناکام تجربہ کرنا بہر حال افضل ہے، لیکن یہ کہتے ہوئے وہ اِس بدیہی حقیقت سے احتراز کرتا ہے کہ ادب کی قدر پیمائی اُس کے بہترین تخلیقی اظہار سے ہوتی ہے۔ ناکام اور نیم پُختہ بھرتی سے نہیں، لیکن ظفر اقبال ایک ایسا تخلیقی انجن ہے جو اپنے تحرک کا ثبوت دینے کے لیے، کوئلے کی عدم موجودگی میں بھی دُھواں چھوڑتا رہتا ہے۔

ظفر اقبال کے شر سے زبان، روایت، اظہار، احساس حتیٰ کہ خود ظفر اقبالیات تک محفوظ نہیں۔ اُسے کئی طرح کے عوارض ہیں مثلاً زباں کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں گاہے، پتھر، گاہے تازہ پانی ڈالتے رہنے کا ہوکا، اپنے سابقہ شعری تجربوں کو جواز عطا کرنے کے ساتھ ساتھ، مسترد کیے جانے کا ہڑاک اور غزل کے ظاہر و باطن کو تبدیل کر دینے کا سواد۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی تنقیدی تحسین پر مبنی تحریروں کے ذریعے، اپنے شعری کمالات میں تنافر کی صورتِ حال پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مسلمات سے انحراف اُس کا پیشہ ہے تو انحراف کی سالمیت اُس کا ایمان — تحسین و ذم کی لذت سے بے نیاز، اوکاڑہ اور لاہور کی مشترک ذمہ داری — ظفر اقبال — اپنی چال ڈھال، اپنے ارادوں اور اپنے ہتھیاروں کی چابت پھرت کے باعث ایک سفاک مُوذی ہے جو کسی کو اپنے پیچھے لگاتا ہے نہ کسی کو خود سے آگے نکلنے دیتا ہے۔ خدا اس مُوذی سے اچھی طرح سمجھے۔

◆◆◆

گزر گیا تھا جہاں سے غبار کا موسم
چھپا ہُوا تھا وہیں آشکار کا موسم

سدا بہار ہے اُلجھی ہُوئی اُمید کی رُت
بدل سکا نہ کبھی انتظار کا موسم

خبر کسی کو نہ ہو گی کہاں سے اُترا ہے
یہ خار و خس ہے کسی لالہ زار کا موسم

بُھلا سکا نہیں میں، خوب یاد ہے مجھ کو
وہ آسمان سے اپنے اُتار کا موسم

پتا مجھے بھی نہیں کب ہوا اُڑا لے جائے
یہ دل پہ چھایا ہُوا اعتبار کا موسم

کہانیاں ہی سنایا نہ کر مجھے اُس کی
کبھی دِکھا بھی مجھے اپنے پار کا موسم

کچھ اہلِ قافلہ بھی درمیاں میں چھوڑ گئے
مجھے بھی راس نہ تھا رہ گزار کا موسم

رُکا رہا تھا بہت دیر سامنے سب کے
جو رہ گزار پہ تھا کوہسار کا موسم

میں ایک شاخِ برہنہ کی طرح سے ہوں، ظفرؔ
نصیب تھا نہ جسے برگ و بار کا موسم

ہوا میں دھند کی صورت بکھرنے لگتے ہیں
ہم اپنے آپ سے اِس طرح ڈرنے لگتے ہیں

اُڑان ہوتی ہے اپنی فلک سے بھی آگے
کہیں زمیں سے بھی نیچے اُترنے لگتے ہیں

ہمیشہ کے لیے پانی کو بھی قبول نہیں
کبھی جو ڈوب گئے تھے، اُبھرنے لگتے ہیں

کبھی اُٹھائی تھی شرمندگی بہت جس پر
پھر ایک بار وہی کام کرنے لگتے ہیں

یہ آ پڑا ہے سفر کس سے دُور ہونے کا
ابھی چلے بھی نہیں، اور ٹھہرنے لگتے ہیں

کچھ اب تو صبر بھی اِس عمر میں نہیں پڑتا
وہ پاس جب کبھی ہوتا ہے، مرنے لگتے ہیں

جو دیکھتا ہوں کبھی اُس کو بند آنکھوں سے
تو رات کے یہ اندھیرے نکھرنے لگتے ہیں

بھٹک گئے تھے کہیں دشتِ خواب میں جو کبھی
وہ قافلے مرے دل سے گزرنے لگتے ہیں

جب اہلِ شہر کو پڑ جائے شک ہمارا، ظفر
تو پھر نیا ہی کوئی سوانگ بھرنے لگتے ہیں

یہ بہ ظاہر جو سیدھے سادے ہیں
جان لو اِن کے کیا اِرادے ہیں

دے بھی سکتے ہیں آپ کو شہ مات
یہ جو بے حیثیت پیادے ہیں

بھوکی ننگی ہے قوم اور اِن کے
کیا تن و توش، کیا لبادے ہیں

کتنے ہم درد ہیں غریبوں کے
یہ جو دس بیس خانوادے ہیں

یہ جو مشکل کُشا ہمارے تھے
بوجھ اپنا بھی ہم پہ لادے ہیں

کھا رہے ہیں حرام کی روزی
اور سارے حلال زادے ہیں

تنگ بھی پڑتی جا رہی ہے زمین
اور کچھ لوگ بھی زیادے ہیں

تن پہ خوابوں کے چیتھڑے ہیں اور
وہ بھی پُورے نہیں ہیں، آدھے ہیں

ہو رہی ہے ظفرؔ، گزر جن پر
کچھ اُمیدیں ہیں، چند وعدے ہیں

خوشی اگر نہیں کی ہے، ملال کیا کرتا
جواب تھا مرے اندر، سوال کیا کرتا

ہر ایک شے جو کہیں ٹوٹ پھوٹ جاتی تھی
تو میں فضول یہاں دیکھ بھال کیا کرتا

میں اپنے کھوج کی خاطر نکل سکا نہ کبھی
ہوں آپ گُم شُدہ، اُس کی سنبھال کیا کرتا

مری نظر نہ گئی اپنے آپ سے آگے
میں خود مثال تھا، اُس کو مثال کیا کرتا

جو عمر اور کسی کی گزار دی ہے تو میں
حسابِ سلسلۂ ماہ و سال کیا کرتا

بگاڑ تھا مری عادات میں ازل سے ہی
تو ایسے حال میں وہ خوش خصال کیا کرتا

مری جب ایسے ہی لوگوں میں بُود و باش رہی
تو پھر کچھ اور طرح کا کمال کیا کرتا

مری نظر تھی تمھارے زر و جواہر پر
میں اور خواہشِ مال و منال کیا کرتا

پھنسا ہوا تھا میں اپنے ہی جال میں تو ظفرؔ
بہانہ بازیاں اور قیل و قال کیا کرتا

سِوائے تحفۂ دشنامِ عام کیا رکھتا
میں اور اِس کے علاوہ مقام کیا رکھتا

یہاں پہ شام ہی پڑتی نہیں تو نظروں میں
کوئی ستارۂ بالائے بام کیا رکھتا

عجب تو یہ ہے کہ اِس داستان میں میرا
شروع بھی نہیں تھا، اختتام کیا رکھتا

رکاوٹ اب کے بھی یہ پختگی ہی تھی میری
میں چاہتا بھی تو سَودائے خام کیا رکھتا

تمام راستے ہی بند ہو چکے تھے اگر
تو میں کسی کا کوئی انتظام کیا رکھتا

معاملات ہی دل چسپ تھے جہاں اتنے
وہاں پہ کام سے میں اپنے کام کیا رکھتا

لبادہ پھر سے شرافت کا جس نے اوڑھ لیا
میں اُس کے ساتھ سلام و کلام کیا رکھتا

کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہُوا تھا ابھی
تو پھر بتایئے، میں اُس کا نام کیا رکھتا

کرایہ دار تھا، اور تنگ دست بھی تھا ظفؔر
سو اُس کے خانۂ دل میں قیام کیا رکھتا

ہُوا نہیں ہے تو امکان ہو بھی سکتا ہے
وہ معجزہ جو کسی آن ہو بھی سکتا ہے

ہمارے پاس وسائل ہی کچھ نہیں، ورنہ
یہ انتظام، یہ سامان ہو بھی سکتا ہے

درشت خُو تو نہیں، تھوڑا لالچی ہے یہ دل
جو تیرے تابعِ فرمان ہو بھی سکتا ہے

تمھاری طبع سخاوت پسند اگرچہ نہیں
کسی غریب پہ احسان ہو بھی سکتا ہے

وہ مرحلہ جسے مشکل سمجھ رہا ہوں بہت
جو آپ چاہیں تو آسان ہو بھی سکتا ہے

بہت بچائے بھی رکھتا ہوں شیشۂ دل کو
مگر کبھی تو یہ نقصان ہو بھی سکتا ہے

وہ ہو چکا ہے جو کافر تری پرستش سے
کبھی دوبارہ مسلمان ہو بھی سکتا ہے

جو اُس کو اور بھی مُہمل بنا کے رکھ دیتا
وہ داستان کا عنوان ہو بھی سکتا ہے

میں ڈرتا رہتا ہوں موسم کی مار سے، کہ ظفرؔ
یہ باغ ہے تو بیابان ہو بھی سکتا ہے

چھپا ہُوا ہے، نمودار ہو بھی سکتا ہے
یہ شہرِ خواب سے بیدار ہو بھی سکتا ہے

دلِ خراب کے پلّے تو کچھ نہیں، ممکن
یہ اُس پری کا خریدار ہو بھی سکتا ہے

جو تم سے رہتا ہے ظاہر میں بے نیاز بہت
وہی تمھارا طلب گار ہو بھی سکتا ہے

محبت اپنی جگہ، احترام اپنی جگہ
سو، فکر مند ہوں، انکار ہو بھی سکتا ہے

پلٹ بھی سکتی ہے بازی ہماری جیتی ہوئی
یہ در دوبارہ سے دیوار ہو بھی سکتا ہے

ہزار میں نظر آتا ہوں اتنا صحت مند
مگر، مجھے کوئی آزار ہو بھی سکتا ہے

ہوائے شوق ابھی تک تو کاروبار نہیں
یہ راستہ ہے تو بازار ہو بھی سکتا ہے

جو ہم نے شعر میں طے کر دیا تھا اپنے لیے
زمانے بھر کا وہ معیار ہو بھی سکتا ہے

ظفؔر جو کارِ محبت میں ہے بہت مصروف
کسی سبب سے یہ بے کار ہو بھی سکتا ہے

وہ سخت کوش کبھی رام ہو بھی سکتا ہے
کہ یہ فسانہ خوش انجام ہو بھی سکتا ہے

وہ تُرش روئی سے بولے تو تھے، مگر اِس میں
چُھپا ہُوا کوئی پیغام ہو بھی سکتا ہے

تمھارے ساتھ بہ ظاہر تو کوئی کام نہیں
تمھارے ساتھ کوئی کام ہو بھی سکتا ہے

یہ دُھوپ ڈھلنے ہی والی ہے اِس محبت سے
اگر یہ دن ہے تو پھر شام ہو بھی سکتا ہے

صفائیاں تو دیئے جا رہا ہوں میں اُس کی
مگر درست یہ الزام ہو بھی سکتا ہے

غلط دوا ہے جو میں کر رہا ہوں استعمال
مجھے اِسی سے کچھ آرام ہو بھی سکتا ہے

تغیّرات کی زد پر مکاں ہے اپنا بھی
کچھ اور عکسِ در و بام ہو بھی سکتا ہے

لگا رہوں کہ ہے دُنیا اُمید پر قائم
یہ طرزِ خاص، کبھی عام ہو بھی سکتا ہے

زیادہ اِس کی فتوحات پر نہ جاؤ، ظفرؔ
کہ دل ہے اور یہ ناکام ہو بھی سکتا ہے

تنہائی کی تصویر ہَوا اور ستارے
لگتا ہے کہ ہے صرف خدا اور ستارے

افلاک منوّر ہیں کوئی اور بھی شاید
ایسا ہے کہ ہیں اِن سے جُدا اور ستارے

اِن سے جو ابھی میری تسلی نہیں ہوتی
کچھ اپنے بھی اب اِن میں مِلا اور ستارے

اِس بھیڑ سے مشکل ہے ابھی میرا گزرنا
آکر مرے رستے سے ہٹا اور ستارے

ہر سمت دُھندلکا ہے مرے دل کے فلک پر
جس طرح بھی ہو، اِس میں لگا اور ستارے

موجود نہ ہوں گے کہیں ایسے تو کم از کم
جیسے مرے اندر ہیں خَلا اور ستارے

میں اور کسی رات میں آپہنچا ہوں، ورنہ
ایسی تو نہ تھی میری فضا اور ستارے

مدّت ہُوئی چپ ہوں اِن اندھیروں کے برابر
رہتے ہیں کہیں میری صدا اور ستارے

گہری ہُوئی شام اور ظفؔر اِس کے علاوہ
میں ہوں یہاں اور میری دعا اور ستارے

نزدیک ہوں جتنا بھی سفر اور ستارے
ہیں دُور ابھی تک مرا گھر اور ستارے

جھلمل ہے فقط اور پتا کچھ نہیں چلتا
اُڑاتے ہیں فضاؤں میں شرر اور ستارے

دن سا نکل آتا ہے وہاں رات کے اندر
ہوتے ہیں کسی وقت جدھر اور ستارے

نکلا تھا مری نیند سے باہر جو کسی رات
اُس خواب کی لائیں گے خبر اور ستارے

دونوں میں کوئی ایک ہی رہ سکتا ہے موجود
ملتے نہیں آپس میں سحر اور ستارے

رونق مجھے مطلوب ہے کچھ اور زیادہ
بھجواؤ کسی شام اِدھر اور ستارے

یہ طرزِ ادا بھی ہے تمھاری ہی طرح کی
کچھ اور ہیں، آتے ہیں نظر اور ستارے

اب قافلے والوں کا گزارہ ہے اِسی پر
تاریک ہوا، راہ گزر اور ستارے

گردش میں ہی رہتے ظفرؔ اس طرح فلک پر
ہوتے مری قسمت کے اگر اور ستارے

چمکا ہُوا تھا سارا جہاں اور ستارے
آئے ہُوئے تھے جیسے وہاں اور ستارے

ظاہر کی تب و تاب ہی کچھ کم نہیں، ورنہ
ہوتے ہیں ستاروں میں نہاں اور ستارے

سوئی ہُوئی ہر چیز ہے، اور میرے علاوہ
یہ شہر ہے اور اِس کے مکاں، اور ستارے

ہو جاتا ہے تاریک فلک چشم زدن میں
مٹتے ہیں ستاروں کے نشاں اور ستارے

روشن ہیں اندھیرے میں کسی خواب کی صورت
جنگل کی ہَوا، آبِ رواں اور ستارے

پلٹا ہوں سفر سے تو ہے بدلی ہُوئی یہ رات
ورنہ کبھی ہوتے تھے یہاں اور ستارے

اِک حبس کی صورت ہی رہی، اور سرِ شام
گھُل مِل گئے آپس میں دُھواں اور ستارے

اک صبح کی ہاری ہوئی اُمید میں ہر رات
بجھتا ہے مرا رنگِ بیاں، اور ستارے

ہر وقت ظفر ٹُوٹتے رہتے ہیں جو مجھ میں
ہو سکتے ہیں ایسے بھی کہاں اور ستارے

آخر اک روز بُجھنا ہے جلتے ہُوئے خاک پر
یہ نہ سوچا تھا میں نے نکلتے ہُوئے خاک پر

دیر تک آسمانی صفت مجھ میں باقی رہی
وقت لگتا تھا آخر بدلتے ہُوئے خاک پر

یہ لطیفہ بھی اپنی جگہ ہے کہ آخر کو ہم
خاک کا رزق ہو جائیں پلتے ہُوئے خاک پر

یہ ہے دہشت اِنھی خاکیوں کی کہ ہم ایک دم
بھاگنے لگ گئے ہیں ٹہلتے ہُوئے خاک پر

کیا خبر ہے کہ وہ کوئی مٹی تھی یا برف تھی
آ گئے ہیں کہاں تک پِھسلتے ہُوئے خاک پر

جیسے یہ آسماں سے بھی مِلتی ہو جا کر کہیں
جا رہا ہوں خوشی سے اُچھلتے ہُوئے خاک پر

دُھوپ تھی رات دن اور ہم دل کے مارے ہُوئے
ہیں اُسی طرح سے سڑتے گلتے ہُوئے خاک پر

لوگ اِسے میری کوئی بڑائی نہ سمجھیں، کہ میں
یوں ہی پھیلا ہُوا ہوں پِگھلتے ہُوئے خاک پر

اس سے آگے تھا گہرے سمندر کا پانی، ظفرؔ
اور رُکنا پڑا مجھ کو چلتے ہُوئے خاک پر

خوش نہیں ہوں کچھ اِتنا اُترتے ہُوئے خاک پر
جانے کیوں پاؤں رکھے ہیں ڈرتے ہُوئے خاک پر

مجھ کو جو کچھ بھی سمجھو، مری اصلیت ہے یہی
خاک ہوجاؤں گا میں گزرتے ہُوئے خاک پر

اِس لیے اِس سے چمٹا ہُوا ہوں کہ شاید کہیں
جی اُٹھوں میں کسی روز مرتے ہُوئے خاک پر

دیکھنا، ایک دن لوٹ جاؤں گا اپنی طرف
میں لہو کا کوئی پھول دھرتے ہُوئے خاک پر

شام تھی اور میرے سِوا بھی کہیں اک طرف
کوئی تھا خاک ہی سے اُبھرتے ہُوئے خاک پر

روشنی کی چمک مجھ کو آئی نظر دُور تک
پانچ رنگوں میں دو رنگ بھرتے ہُوئے خاک پر

میری تقدیر ہی آسماں پر بنائی گئی
ورنہ میں جیت سکتا تھا ہرتے ہُوئے خاک پر

کچھ بنانا پڑے گی نئی کوئی اپنی لُغت
چھوڑ بیٹھا ہوں میں لفظ برتے ہُوئے خاک پر

یہ ہَوا ساتھ لاتی ہے کیا کیا کرشمے، ظفر
دیکھتا ہوں تماشے بکھرتے ہُوئے خاک پر

کچھ کام اس زمین پہ کرنے تو دے مجھے
اپنی بلندیوں سے اُترنے تو دے مجھے

جاتا نہیں ہے جانبِ منزل تو کیا ہُوا
تو اپنے راستے سے گزرنے تو دے مجھے

یہ خوب صورتی کسی دہشت سے کم نہیں
کچھ روز دُور دُور سے ڈرنے تو دے مجھے

اپنی جگہ یہ ایک رکاوٹ ہے آپ بھی
دیوارِ دوستی ہوں، اُسرنے تو دے مجھے

جینا یہ میرا تیرے لیے تھا بھلا بُرا
تجھ کو جو ناپسند ہے، مرنے تو دے مجھے

کیا کیا سمندروں کا سفر کر کے آیا ہوں
اس خاک پر قدم کہیں دھرنے تو دے مجھے

کہتے ہیں لوگ میں کسی خوشبو کا خواب ہوں
کچھ دیر اس ہوا میں بکھرنے تو دے مجھے

پانی کی تہہ جو اب مجھے کرتی نہیں قبول
میں ڈوب ہی چکا ہوں، اُبھرنے تو دے مجھے

دریا بھی مہربان ہے، موقع بھی ہے ظفرؔ
خالی ہوں ایک عمر سے، بھرنے تو دے مجھے

ہمارے ہو گئے ہیں، اور تمھارے ہو گئے ہیں
یہاں جو کام تھے، سارے کے سارے ہو گئے ہیں

تمھاری جستجو میں پھر رہے تھے دَر بہ دَر جو
یہاں سے بھی وہی قسمت کے مارے ہو گئے ہیں

کبھی یک بارگی بھی ہو نہیں پائے تھے جو کام
وہی ہونے پہ آئے تو دوبارے ہو گئے ہیں

فقط اک ریت کی تصویر باقی رہ گئی ہے
یہاں دریاؤں کے پانی کنارے ہو گئے ہیں

بچی ہے اہلِ ساحل کے لیے جھلمل ذرا سی
اگر اپنے سفینے بھی ستارے ہو گئے ہیں

تمھاری دست گیری کا اثر کیسا ہُوا ہے
کہ پہلے سے زیادہ ہی بچارے ہو گئے ہیں

لرزتا ہے مرے اندر خسِ خوابِ محبت
کہ میری شام کے ٹکڑے شرارے ہو گئے ہیں

سہولت سے تمھارا وقت جیسا کٹ گیا ہے
اُسی صورت ہمارے بھی گزارے ہو گئے ہیں

ظفرؔ خود پر بھلا کرتے کہاں تک ہم بھروسہ
کہ ہمت ہار دی ہے بے سہارے ہو گئے ہیں

مکان پھر متلاشی ہُوئے مکینوں کے
چلے گئے ہیں کہیں سانپ آستینوں کے

وہ کوئی اور بھی تھا میرے اور تمھارے سوا
کیے گئے تھے یہاں انتظام تینوں کے

کہیں بھی چین سے دم بھر کو بیٹھنے نہ دیا
ہمیشہ ساتھ رہے آسماں زمینوں کے

شکستگی کے علاوہ بھی تھے تقاضے کچھ
دلوں سے بڑھ کے بھی نازک اُن آبگینوں کے

ہمیں بھی کچھ ادب آداب سے نہ تھی رغبت
زیادہ آپ بھی قائل نہ تھے قرینوں کے

نہ جانے کون سی جلدی میں تھے کہ اُس دوران
دنوں میں کام نمٹتے رہے مہینوں کے

عجب تو یہ ہے کہ اِس بے قرار پانی پر
نشان ہیں ابھی ڈوبے ہُوئے سفینوں کے

چُھپا سکے ہی نہیں اہلِ دہر سے کچھ بھی
کہ جتنے راز تھے، باہر تھے اپنے سینوں کے

رُکا ہُوا ہے یہاں سارا کاروبار، ظفؔر
خراب رہتے ہیں پُرزے مری مشینوں کے

جیسے تیسے رہ جاتا ہے
سب کچھ ایسے رہ جاتا ہے

لاش اُبھر آتی ہے اوپر
پانی نیچے رہ جاتا ہے

میں ہی نکل جاتا ہوں آگے
قاری پیچھے رہ جاتا ہے

کام جو وقت پہ کیا نہ جائے
رہتے رہتے رہ جاتا ہے

رہنے پر آ جائے تو وہ
کسی بہانے رہ جاتا ہے

سوچ سمجھ بھی نہ رہے تو
بھُولے بھٹکے رہ جاتا ہے

جاتے جاتے بھی وہ دُھواں سا
اندر خانے رہ جاتا ہے

تیز بہت چلنے والا بھی
آدھے رستے رہ جاتا ہے

بات وہ کیا ہے جسے ظفرؔ تو
کہتے کہتے رہ جاتا ہے

اس قدر بے خبر نہیں جاتا
جانے والا جدھر نہیں جاتا

چھاؤں بھی ہو تو یہ مسافرِ دل
راستے میں ٹھہر نہیں جاتا

راستہ ڈھونڈتا ہے دائیں بائیں
درمیاں سے گزر نہیں جاتا

لاکھ وہ مہرباں بھی ہو، لیکن
میرے اندر کا ڈر نہیں جاتا

بات آئی گئی بھی ہو جائے
لیکن، اِس کا اثر نہیں جاتا

جائے گا یک دَم اعتبار کہ یہ
مختصر مختصر نہیں جاتا

لاپتا ہی رہوں گا جب تک میں
اپنے اندر بکھر نہیں جاتا

لوگ کترا رہے تھے پہلے ہی
اب تو میں بھی اُدھر نہیں جاتا

کوئی آخر مذاق میں تو، ظفرؔ
اِس قدر کام کر نہیں جاتا

مفت کا میہماں نہیں جاتا
دل سے اُس کا دُھواں نہیں جاتا

جانتا ہوں، یہاں نہ آئے گا
تُو، وگرنہ کہاں نہیں جاتا

اُس سے کہتا ہوں، جارہا ہوں ابھی
اور پھر بعد ازاں نہیں جاتا

جس میں رہنے کو ہم ترستے رہے
یاد سے وہ مکاں نہیں جاتا

وہ نہیں ہے، یقین ہے، لیکن
دل سے اُس کا گماں نہیں جاتا

وہیں ڈھونڈو مجھے کہیں نہ کہیں
آج کل میں جہاں نہیں جاتا

چھوڑتی جارہی ہے پاؤں زمیں
سر سے یہ آسماں نہیں جاتا

زخم ہوتا ہے مُندمل آخر
لیکن اِس کا نشاں نہیں جاتا

ظفرؔ اہلِ زباں بُلاتے ہیں
اور، میں بے زباں نہیں جاتا

تھک گیا ہوں، چلا نہیں جاتا
راہ سے بھی ہٹا نہیں جاتا

شہر تو ہے وہ، لیکن اُس کی طرف
اب کوئی راستہ نہیں جاتا

آسماں تک ہے خواہشِ پرواز
اور، زمیں سے اُٹھا نہیں جاتا

حق تو وہ ہے جو چھین لو بڑھ کر
ہاتھ سے یہ دیا نہیں جاتا

دوسرے کس لیے ہیں، جانِ عزیز
کام خود تو کِیا نہیں جاتا

بسترِ ناز تک تو پہنچا ہوں
اِس سے آگے بڑھا نہیں جاتا

پھر رہا ہے جو اِرد گرد ابھی
اَبر کیوں سر پہ چھا نہیں جاتا

توڑتا جا رہا ہوں سب چیزیں
ایک بھی جوڑتا نہیں جاتا

یہ تماشا لگا رہے گا، ظفرؔ
یعنی، جب تک وہ آ نہیں جاتا

مرے گھر تو کیا، سرِ رہ گزر نہیں آ رہا
بڑی دیر سے کوئی بھی اِدھر نہیں آ رہا

میں اِس انتظار کی اُلجھنوں سے نکل سکوں
وہ بتا تو دے کسی طور اگر نہیں آ رہا

وہی دُھوپ ہے مرے سر پہ چھاؤں کیے ہُوئے
مرے راستے میں کہیں شجر نہیں آ رہا

کوئی نیند ہے مری چشمِ تر میں رُکی ہُوئی
کوئی خواب ہے جو مجھے نظر نہیں آ رہا

تری آرزو میں کوئی کمی ہے، اسی لیے
مری گفتگو میں ابھی اثر نہیں آ رہا

کئی کام ہیں یونہی درمیاں میں پڑے ہُوئے
اُسے آنا چاہیے تھا، مگر نہیں آ رہا

کئی روز سے مری دھڑکنیں ہیں رُکی ہُوئی
کئی روز سے کوئی بام پر نہیں آ رہا

مجھے بھیجتے تو ہیں، لیکن اپنے حساب سے
کہ جو آ رہا ہے وہ اِس قدر نہیں آ رہا

جو ملے تو خود ہی بتاؤ، کیسے ملے ظفرؔ
تم اُدھر ہی جاؤ گے وہ جدھر نہیں آ رہا

اِس اندھیرے دل میں جو روشنی نہیں کر رہا
کروں گا ضرور مگر ابھی نہیں کر رہا

کسی طرح سے بھی یہ دشمنی نہیں کر رہا
کہ جو تیرے ساتھ میں دوستی نہیں کر رہا

مرا کچھ نہ کرنا بھی خوب سوچ سمجھ کے ہے
کہ میں کوئی کام بھی سرسری نہیں کر رہا

مجھے پاؤں پڑنے سے اتفاق نہیں ابھی
مگر، اِس طرح سے میں سرکشی نہیں کر رہا

جو ہمیشہ رہتا ہوں ایک اشارے کا منتظر
یہی کہہ رہا ہوں کہ نوکری نہیں کر رہا

تبھی آسماں کو مِلا رہا ہوں زمین سے
کہ یہ کام اور یہاں کوئی نہیں کر رہا

یہ خلافِ طبع ہی کرتا رہتا ہوں رات دن
میں جو کرنا چاہتا ہوں وہی نہیں کر رہا

مجھے اِتفاق ہے آپ سے کہ دراصل میں
یہ کچھ اور کرتا ہوں، شاعری نہیں کر رہا

مری عاجزی ہی بہت ہے میرے لیے، ظفرؔ
میں یہاں کسی کی برابری نہیں کر رہا

جو یہ تیرے بارے میں گفتگو نہیں کر رہا
یہ نہیں کہ میں تری آرزو نہیں کر رہا

میں بکھیر بیٹھا ہوں خود ہی اپنے وجود کو
مگر، آپ ہی اِسے ایک سُو نہیں کر رہا

کوئی لہر ہے جو مری خبر نہیں لے رہی
کوئی لفظ ہے جسے میں لہو نہیں کر رہا

سو گلے لگا کے ہی پاک ہو گیا ہوں اُسے
جو نماز کے لیے میں وضو نہیں کر رہا

فقط ایک بار تری گلی میں لگائی ہے
وہ صدا جو میں ابھی کُو بہ کُو نہیں کر رہا

کئی بار میں نے زمانے بھر کو سُنائی ہے
وہی بات جو ترے رُو بہ رُو نہیں کر رہا

کوئی اختلاف ہے اور مجھ کو ہے سر بہ سر
کوئی اِتفاق ہے، اور تُو نہیں کر رہا

مرے حال سے اُسے آشنائی ہو کس طرح
میں بیان ہی اِسے ہُو بہ ہُو نہیں کر رہا

کبھی مِل ہی جاؤں گا اپنے آپ کو اے ظفرؔ
میں اِسی لیے کوئی جستجو نہیں کر رہا

کوئی چیز بھی میں یہاں وہاں نہیں کر رہا
جو زمین کو ابھی آسماں نہیں کر رہا

مری واردات سے باخبر ہیں سبھی، کہ میں
کوئی کام بھی یہاں ناگہاں نہیں کر رہا

جو نہیں ہے اُس کا یقین ہے مجھے سر بہ سر
جو ہے سامنے، میں اُسے گماں نہیں کر رہا

ترا دل کہ تیری ہی برقِ ناز کی زد پہ ہے
میں اِسی لیے اُسے آشیاں نہیں کر رہا

میں وہاں بھی کام سے بھاگتا رہا رات دن
سو، بجا ہے کچھ بھی اگر یہاں نہیں کر رہا

مری محنتوں کا معاوضہ مجھے چاہیے
کہ میں عشق بھی کوئی رائگاں نہیں کر رہا

مرا خواب زادِ سفر ہے جس کے مدار میں
کوئی ہے کہ میں جسے کارواں نہیں کر رہا

جو رواں ہے میں اُسے روکتا نہیں اور پھر
جو رُکا ہُوا ہے اُسے رواں نہیں کر رہا

مجھے خود کو غور سے دیکھنا ہے کبھی، ظفرؔ
جو میں اپنا آپ دُھواں دُھواں نہیں کر رہا

ترے راستوں سے جبھی گزر نہیں کر رہا
کہ میں اپنی عمر ابھی بسر نہیں کر رہا

کوئی بات ہے کہیں درمیاں میں رُکی ہوئی
کوئی کام ہے جو میں رات بھر نہیں کر رہا

ہے کوئی خبر جو چھپائے بیٹھا ہوں خلق سے
کوئی خواب ہے جسے در بہ در نہیں کر رہا

تری بات کوئی جو مانتا نہیں شہر میں
تو مرا کہا بھی کہیں اثر نہیں کر رہا

کہیں میرے گرد و نواح میں کوئی شے نہیں
میں کسی طرف بھی ابھی نظر نہیں کر رہا

کوئی شاخ ہے جسے برگ و بار نہیں ملے
کوئی شام ہے جسے میں شجر نہیں کر رہا

کوئی اس پہ غور اگر کرے بھی تو کس لیے
یہ سخن میں آپ بھی سوچ کر نہیں کر رہا

ابھی میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی
میں جبھی تو بات کو مختصر نہیں کر رہا

یہ میں اپنے عیب جو کر رہا ہوں بیاں ظفرؔ
تو دراصل یہ بھی کوئی ہنر نہیں کر رہا

جب تمھارے اور اپنے درمیاں ہوتا ہوں میں
کون مجھ کو ڈھونڈ سکتا ہے کہاں ہوتا ہوں

ٹکڑوں ٹکڑوں میں نکل پڑتا ہوں منزل کی طرف
اور آخر رفتہ رفتہ کارواں ہوتا ہوں میں

اک زمینِ عاجزی ہوں اہلِ دُنیا کے لیے
اُس سے مِلتا ہوں تو کچھ دن آسماں ہوتا ہوں میں

اک زمانے سے لیے پھرتا ہوں لہروں پر اُسے
کوئی کشتی ہے کہ جس کا باد باں ہوتا ہوں میں

مخمصہ ہوں اپنے ہونے اور نہ ہونے کا یہاں
میں وہاں بھی ہو نہیں سکتا جہاں ہوتا ہوں میں

اپنے ہی رحم و کرم پر ہوں کوئی سمجھے اگر
برق سے رشتہ ہے میرا، آشیاں ہوتا ہوں میں

شوق سے سنتے بھی ہیں، تسلیم بھی کرتے نہیں
آنے والے دَور کی اک داستاں ہوتا ہوں میں

ڈھونڈنے والوں کی خاطر ایک اشارہ ہی سہی
ہے یہی میری نشانی، بے نشاں ہوتا ہوں میں

میرے اندر ہے ستاروں کا کوئی جھرمٹ، ظفرؔ
رات کو دیکھو تو اپنی کہکشاں ہوتا ہوں میں

جو کِیا ہے، اِس انتظام کو دیکھ
نام کو چھوڑ، میرے کام کو دیکھ

کیا اندھیرا ہے، کیا اُجالا ہے
رات پر خاک ڈال، شام کو دیکھ

کتنا بے رنگ ہے یہ آبِ حلال
اک نظر بادۂ احرام کو دیکھ

اور تو کچھ نہیں مجھے دعوے
روز کی اِس دعا سلام کو دیکھ

پختہ کاری مری بجا، لیکن
آج اِن خواہشاتِ خام کو دیکھ

سر بہ سر یہ بھی جامِ شیریں ہے
پیڑ گننے سے پہلے آم کو دیکھ

پھنس بھی سکتا ہوں میں کبھی، لیکن
ڈھیلے ڈھالے سے اپنے دام کو دیکھ

خاص باتیں سُنا چکا ہوں بہت
آج میری صدائے عام کو دیکھ

یہی اُستاد کی عطا تھی، ظفرؔ
مُقتدی کو نہیں، امام کو دیکھ

لگ رہا ہے یہ کوئی جیسے ہوائی شور ہے
کچھ علاج اِس کا نہیں، ایسا خدائی شور ہے

ایسا ہنگامہ کہاں دیکھا سُنا تھا آج تک
یہ تو کوئی اجنبی اور ماورائی شور ہے

کوئی ضد ہے ایک دوجے کی عجب یہ بھی کہ یہ
وصل خاموشی ہے یک سر اور جُدائی شور ہے

صاف دُنیا کو سُنائی دے، دِکھائی دے نہ دے
چُھپ نہیں سکتا کہ رنگِ آشنائی شور ہے

آپ اِسے محسوس کر سکتے ہیں تھوڑا سا کہ جو
خالی ہو کر بھی نہیں دیتا سُنائی شور ہے

نرم لفظوں میں شکایت کیوں پسند آئے گی جب
آپ کے نزدیک یہ بھی اِنتہائی شور ہے

دل میں آغازِ محبت ہی کا واویلا ہے یہ
اِنتہائی شور ہے اور اِبتدائی شور ہے

یہ تو میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ابھی
دل میں برپا ہونے والا جو خَلائی شور ہے

اِس طرح جانچا نہیں کرتے ہیں چیزوں کو، ظفرؔ
شام تم سمجھے ہو جس کو میرے بھائی، شور ہے

مستقل کہرام ہے اور غیر فانی شور ہے
میں تو سمجھا تھا یہ کوئی آنی جانی شور ہے

خاک اُڑانے کو بھی تھی درکار خاموشی، مگر
ریت ہے صحرا میں اور اُس کی روانی شور ہے

سُن سکو تو میرے دل کی پوٹلی میں آج بھی
کچھ تو ہے لکھا ہُوا، اور کچھ زبانی شور ہے

کون اس پر کان دھرنے کے لیے تیار ہو
جب کہ سب کے سامنے یہ رائگانی شور ہے

یہ تو پہلے ہی سے ہم نے سُن رکھا ہے بار بار
جانا پہچانا یہ کوئی آسمانی شور ہے

ساری آوازیں ہیں اس میں، اصلیت کچھ بھی نہیں
کچھ حقیقت شور ہے اور کچھ کہانی شور ہے

اور ہو سکتا ہے کیا اس سے بڑا کوئی مذاق
موت خاموشی سراسر، زندگانی شور ہے

جس میں ہم نے شعر کا پودا لگانا تھا یہاں
یہ زمیں کیا کیجیے، اے یارِ جانی، شور ہے

کیسے کانوں کے پھٹے جاتے تھے پردے، اے ظفرؔ
اس قدر منہ زور یہ جوشِ جوانی شور ہے

آتا جاتا خواب ہے یا گھٹتا بڑھتا شور ہے
ایک ساتھ آباد ہوتا اور اُجڑتا شور ہے

اندر اندر ہی پگھلتا ہوں تو کچھ کہتے نہیں
اور اُسے آواز دیتا ہوں تو پڑتا شور ہے

شکل کوئی آخری اِس کی نکلتی ہی نہیں
یہ جو میرے سامنے بنتا بگڑتا شور ہے

بیٹھے بیٹھے ہوتا جاتا ہوں شرابور اِس قدر
چھت کھڑی ہے دَم بہ خود اور اِس سے جھڑتا شور ہے

کوئی اندر کا تماشا بھی دِکھائے گا کبھی
اپنی ہی کچّی سِلائی سے اُدھڑتا شور ہے

روز سنتا اور ٹھکانے بھی لگاتا ہوں اِسے
ساتھ ہی پیدا بھی ہوتا اور بڑھتا شور ہے

اِس کے چنگل سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں
یہ جو سب کچھ اپنے پنجوں میں جکڑتا شور ہے

دیکھ لینا پھر ابھی دُھومیں مچاتا آئے گا
یہ بہ ظاہر جو سماعت سے بچھڑتا شور ہے

یہ زمینی ہے تو پھر کیوں آسمانی ہے، ظفرؔ
دیکھتا ہوں کون سی سیڑھی سے چڑھتا شور ہے

ہے نئی طرزِ فغاں اور شور کرتا شور ہے
یہ بھی گویا میرے اندر سے گزرتا شور ہے

گرد اتنی ہے، کسی کو کچھ نظر آتا نہیں
کون سی طرفیں ہیں یہ جن میں بکھرتا شور ہے

پھیلتا جاتا ہے کچھ اپنے تئیں بھی چار سُو
کچھ مری اپنی بلندی سے اُترتا شور ہے

ہر کمی ہوتی ہے پوری طرح سے ہی اپنے آپ
جسم خالی ہو رہا ہے اور بھرتا شور ہے

جنگ ہے جیسے کوئی لہروں کے نیچے لگ رہی
زور کرتے سبز پانی سے اُبھرتا شور ہے

کیا تلاطم ساتھ لاتا ہے فلک سے ایک دَم
کس خموشی سے زمیں پر پاؤں دَھرتا شور ہے

کون ہے جس کی نظر ہے رات دن ہر چیز پر
کس کے ڈر کے شور کے اندر ہی مرتا شور ہے

آئی پر آیا تو سب کچھ ساتھ اُڑا لے جائے گا
دیکھنے میں کس قدر یہ ڈرتا ڈرتا شور ہے

پیڑ ہے، اور پیڑ سے اُترے ہُوئے پتّے، ظفرؔ
اور پھر اِن خشک پتّوں میں ٹھہرتا شور ہے

۵

رُک رہا ہے اور نہ رستوں میں اٹکتا شور ہے
یہ جو میرے شور کی جانب لپکتا شور ہے

آتے جاتے راہیوں کو راستہ دیتا ہُوا
شام کے گہرے اندھیروں میں چمکتا شور ہے

سوچتا ہوں تیرے کانوں تک پہنچ بھی پائے گا
میری جانب سے جو یہ ڈرتا جھجکتا شور ہے

آپ اُس نے روک رکھا ہے نکلنے سے اِسے
دل نہیں ہے، میرے سینے میں دھڑکتا شور ہے

رات بھر کرتا ہُوا جیسے کسی گھر کا پتا
شہر کی بے خواب گلیوں میں بھٹکتا شور ہے

شور و شر کی میں کبھی پروا نہ رکھتا تھا، مگر
اور ہی کچھ یہ کسی چپ سے جھلکتا شور ہے

سُن سکو تو یہ کوئی شبنم نہ ہو گی صبح دَم
پیڑ کے خاموش پتّوں سے ٹپکتا شور ہے

آسماں پر تو کوئی، بادل نہیں ہے دُور دُور
کس طرف سے پھر یہ بجلی سا کڑکتا شور ہے

جیسے میں کچھ کہتے کہتے رہ گیا ہوں، اے ظفرؔ
آج کیسا میری آنکھوں سے جھلکتا شور ہے

منزلوں تک جا و بے جا ہنستا بستا شور ہے
یہ مسافر شور ہے یا پھر یہ رستہ شور ہے

اِس میں آوازیں نہیں اہلِ زمیں کی دُور دُور
یہ تو جیسے آسمانوں سے برستا شور ہے

کچھ ابھی آثار سے اُٹھے گا غوغائے بلند
رفتہ رفتہ شام ہے اور جستہ جستہ شور ہے

کیفیت شاید نہ کُھلنے پائے گی اِس کی ابھی
یہ جو کوئی شور کے اندر ہی دھنستا شور ہے

یہ بھی ہوسکتا ہے دونوں مِل ہی پائیں ایک دن
اک پُرانے شور کو جو یہ ترستا شور ہے

چشم تر کے ساتھ اِسے صُحبت رہی ہے ایک عمر
ٹوٹ بھی سکتا ہے ایسا آب خستہ شور ہے

اِس کے اپنے رنج ہیں اور اِس کی اپنی راحتیں
یہ ہماری طرح کا روتا نہ ہنستا شور ہے

کچھ بھی کر لو سطح سے اوپر نہیں اُٹھنے کا یہ
شاعری کچھ اِس طرح کا خاک بستہ شور ہے

شہر میں اب کھول رکھی ہے ظفرؔ نے بھی دکاں
آپ بھی لے جایئے گا، اتنا سستا شور ہے

یہ زمیں کہرام ہے ساری، زمانہ شور ہے
خود کو میں نے روک رکھا ہے، روزانہ شور ہے

ہم نے دفتر کھول رکھا ہے اسی خاطر یہاں
نام لکھوا جائے جس جس نے مچانا شور ہے

ایک گہری رمز ہے اس کو اگر سمجھے کوئی
کام خاموشی سے کرنا ہے، بہانہ شور ہے

جا رہا ہوں اک سکونِ بے نشاں کی کھوج میں
چل رہا ہوں اور مرے شانہ بہ شانہ شور ہے

ایک اودھم سا مچا رکھا ہے دونوں نے یہاں
کچھ حقیقت شور ہے اور کچھ فسانہ شور ہے

بس اسی پر ہے گزر اوقات اپنی آج کل
یعنی اس بستی میں اپنا آب و دانہ شور ہے

ایک سناٹا پڑا ہے اور اس کے ارد گرد
دور تک پھیلا ہوا اک والہانہ شور ہے

اس سے پڑ سکتا نہیں آرام میں کوئی خلل
اندر اندر ہی یہ اپنا شاعرانہ شور ہے

کام کا آغاز کرتے ہیں اسی سے، اے ظفرؔ
اپنی بسم اللہ اور اپنا ترانہ شور ہے

میرے اندر شور ہے یا میرے باہر شور ہے
رات ہو یا دن ہو ایسا شور پرور شور ہے

ایک دو راتیں ہی کاٹی تھیں ابھی آرام سے
پھر سکوں کے آئنہ خانے میں پتھر شور ہے

دن کا دریا پار کرتے ہی یہ میرے سامنے
تھوڑی تھوڑی شام ہے اور اکثر شور ہے

اِس پریشانی کا بھی دُنیا میں ہے کوئی علاج
کوئی اپنا گھر نہیں اور گھر کے اندر شور ہے

جس کا جتنا مسئلہ ہو، اُتنی ہی فریاد بھی
آسماں خاموش ہیں لیکن زمیں پر شور ہے

اِن ہواؤں نے ہی یہ اُودھم مچا رکھا ہے کیا
شہر خالی ہو چکا ہے اور شب بھر شور ہے

گرم خُو گرمیاں ہیں دُور تک پھیلی ہوئی
اک سکونِ خواب ہے اور اوپر اوپر شور ہے

بھاگنے ہی میں تھی اپنی عافیت جیسے کوئی
چور ہے اور چور کے پیچھے سراسر شور ہے

ایک شیون ہی مری پہچان تھی ورنہ، ظفرؔ
میں اگر چپ ہوں تو دُنیا میں یہ کیوں کر شور ہے

رات گہری ہے، مگر کیسا اُجالا شور ہے
شور کے اندر سے یہ ہم نے نکالا شور ہے

میں تو دَم سادھے پڑا رہتا تھا اِن انواح میں
کس لیے میری طرف اُس نے اُچھالا شور ہے

تہ نشیں کیا ہے، کسی کو کچھ پتا چلتا نہیں
اوپر اوپر روشنی ہے، بالا بالا شور ہے

پاس آتے ہی یہ آنکھیں جیسے روشن ہو گئیں
شور ایسا ہے کہ اپنا دیکھا بھالا شور ہے

کام کرتا جا رہا ہے اندر اندر ہی کہیں
خامشی کی طرح کا کوئی نرالا شور ہے

کام کرتا ہوں جو میرے کرنے والا ہی نہیں
آج بھی گرتا ہُوا میں نے سنبھالا شور ہے

دُور ہے اپنی سماعت سے یہاں وہ بھی بہت
سامنے ہی جو ہمارے ہونے والا شور ہے

عالمِ اسباب ہے سامانِ حیرت بھی کوئی
ایک چُپ ایسی بھی ہے جس کا حوالہ شور ہے

تھے یہی مُہرِ خموشی توڑنے والے، ظفرؔ
یعنی سب پکڑے گئے جس جس نے ڈالا شور ہے

♦

زندگی کچھ نہیں، مرے بھائی
موت بھی کچھ نہیں، مرے بھائی

ہے توجہ کی دوسری صورت
بے رُخی کچھ نہیں، مرے بھائی

رَنج بھی ایک عارضی شے ہے
اور، خوشی کچھ نہیں مرے بھائی

ظلم توڑے گا اور بھی وہ بہت
یہ ابھی کچھ نہیں، مرے بھائی

یہ اندھیرے کی آخری حد ہے
روشنی کچھ نہیں، مرے بھائی

ایک درپردہ دشمنی کے سوا
دوستی کچھ نہیں، مرے بھائی

جس کی لاٹھی ہو بھینس اُسی کی ہے
منصفی کچھ نہیں، مرے بھائی

قافیہ قافیے سے جوڑتے ہیں
شاعری کچھ نہیں، مرے بھائی

ایک ہی بار بار ہے وہ، ظفرؔ
دوسری کچھ نہیں، مرے بھائی

آن و ایں کچھ نہیں، مرے بھائی
اب کہیں کچھ نہیں، مرے بھائی

آسمانوں ہی کا تسلّط ہے
یہ زمیں کچھ نہیں، مرے بھائی

اُوپر اُوپر ہی جو بھی کچھ ہے یہاں
تہ نشیں کچھ نہیں، مرے بھائی

اصل شے ہے یہ لمحۂ موجود
بعد ازیں کچھ نہیں، مرے بھائی

سب گماں ہی گماں ہیں چاروں طرف
اور، یقیں کچھ نہیں، مرے بھائی

کچھ تو ہے، وہ مکان ہے غائب
یا مکیں، کچھ نہیں، مرے بھائی

اِس طرح مارے مارے پھرنا کیا
جب نہیں، کچھ نہیں مرے بھائی

اور تو سب جگہ سبھی کچھ ہے
کیوں یہیں کچھ نہیں، مرے بھائی

ڈھونڈ امکان و انتظار، ظفرؔ
جاگزیں کچھ نہیں، مرے بھائی

روز و شب کچھ نہیں، مرے بھائی
اور، طلب کچھ نہیں مرے بھائی

رونقیں تھیں یہاں پہ کیا کیا کچھ
لیکن اب کچھ نہیں، مرے بھائی

غور سے دیکھ عالمِ اسباب
بے سبب کچھ نہیں، مرے بھائی

کچھ اگر ہے تو ہے فسادِ نظر
رنگِ لب کچھ نہیں، مرے بھائی

کبھی کچھ تھا تو میرے چاروں طرف
آج سب کچھ نہیں، مرے بھائی

نیستی ہی کا عہد ہے آغاز
ورنہ سب کچھ نہیں، مرے بھائی

اپنی محنت سے ہے یہ لُوٹ کھسوٹ
فضلِ رب کچھ نہیں، مرے بھائی

خواب دیکھا ہے کوئی ورنہ یہاں
اب نہ تب کچھ نہیں، مرے بھائی

کس کی موجودگی ہے پھر بھی، ظفرؔ
یعنی جب کچھ نہیں مرے بھائی

ہُو بہ ہُو کچھ نہیں مرے بھائی
چار سُو کچھ نہیں، مرے بھائی

میری ہستی سراب ہے سارا
اور، تُو کچھ نہیں، مرے بھائی

غیبتِ دوستاں ہے شام و سحر
گفتگو کچھ نہیں، مرے بھائی

ہے خیالی بہار کا موسم
رنگ و بو کچھ نہیں، مرے بھائی

پسِ پردہ ہی ربط ہے ممکن
دُو بہ دُو کچھ نہیں، مرے بھائی

دیکھنا بھی ہُوا ہے لاحاصل
رُو بہ رُو کچھ نہیں، مرے بھائی

ماسوائے خیال و خوابِ ہوس
آرزو کچھ نہیں، مرے بھائی

دشمنِ جاں ہیں آپ ہی اپنے
اب عدو کچھ نہیں، مرے بھائی

شہر سنسان ہو چکا ہے، ظفرؔ
کُو بہ کُو کچھ نہیں، مرے بھائی

سر بہ سر کچھ نہیں، مرے بھائی
اب اِدھر کچھ نہیں، مرے بھائی

دیکھ تفصیل سے اُسے، ورنہ
اک نظر کچھ نہیں، مرے بھائی

کام نکلے گا خامشی سے یہاں
شور و شر کچھ نہیں، مرے بھائی

ایک ہی بارگاہ کا ہو جا
در بہ در کچھ نہیں، مرے بھائی

بات کو اور طول دے بے شک
مختصر کچھ نہیں، مرے بھائی

یہ اُڑاتا ہے زور اندر کا
بال و پر کچھ نہیں، مرے بھائی

راستہ خود تراش اپنے لیے
رہ گزر کچھ نہیں، مرے بھائی

شاعری میں بھی کر چکا ہوں بہت
یہ ہُنر کچھ نہیں، مرے بھائی

اے ظفرؔ چھوڑ یہ دوا دارُو
کارگر کچھ نہیں، مرے بھائی

جا بہ جا کچھ نہیں، مرے بھائی
یہ خلا کچھ نہیں، مرے بھائی

روشنی ہے فقط نظر کا فریب
اور، ہوا کچھ نہیں، مرے بھائی

پسِ پردہ جو ہو تو ہو شاید
رُونما کچھ نہیں، مرے بھائی

بات اشاروں میں ہے یہاں درکار
بَرملا کچھ نہیں، مرے بھائی

جو بھی کہہ جایئے روا ہے یہاں
ناروا کچھ نہیں، مرے بھائی

مفت میں ہی اُدھڑ رہے ہیں بدن
خوں بہا کچھ نہیں، مرے بھائی

اِدھر آنے کا فائدہ اب کیا
جب رہا کچھ نہیں، مرے بھائی

میری فردِ عمل میں تیرے لیے
اے خدا، کچھ نہیں، مرے بھائی

نظر آتا ہے اپنا آپ، ظفرؔ
ماسوا کچھ نہیں، مرے بھائی

عزت وہ کیا کرائیں گے عزت کیے بغیر
پھل کھانا چاہتے ہیں جو محنت کیے بغیر

اُس نے بھی کوئی خاص توجہ نہ کی وہاں
ہم آپ بھی اُٹھ آئے شکایت کیے بغیر

دامن پہ ہاتھ اگر نہیں ڈالا تو میرے بھائی
رکھتے ہو کیا اُمید جسارت کیے بغیر

اب تک نمازِ عشق بہت ہو چکی قضا
جنت کہاں ملے گی عبادت کیے بغیر

آخر ہمارا داخلہ ہی بند ہے وہاں
رہتے نہیں تھے ہم بھی شرارت کیے بغیر

سیدھے سبھاؤ تو کبھی مانی نہ اُس نے بات
نکلے گا کیسے کام سیاست کیے بغیر

اُس پر فریب ہی نہیں چلنا تھا اِس دفعہ
جاتے اگر وہاں نہ یہ حالت کیے بغیر

ہوتا ہے کوئی لفظ کے اندر بھی ایک لفظ
معنی نہ ہاتھ آئے گا غارت کیے بغیر

آدھی گزر گئی محبت میں، اے ظفر
آدھی گزارنی ہے محبت کیے بغیر

مدّھم ہونا چاہتا ہوں
سرگم ہونا چاہتا ہوں

کبھی خزاں تو کبھی بہار
موسم ہونا چاہتا ہوں

کروں سامنا سورج کا
شبنم ہونا چاہتا ہوں

جاؤں اور چپک جائے
وہ گم ہونا چاہتا ہوں

کر جاؤں اپنی تصدیق
خاتم ہونا چاہتا ہوں

ڈولتا پھرتا ہوں کب سے
مُحکم ہونا چاہتا ہوں

زخم لگا بیٹھا ہوں، اب
مرہم ہونا چاہتا ہوں

ڈٹ کے رہا ہوں دُنیا میں
اب خَم ہونا چاہتا ہوں

پھیل گیا ہوں بہت، ظفرؔ
کچھ کم ہونا چاہتا ہوں

دن بھر ہونا چاہتا ہوں
اکثر ہونا چاہتا ہوں

ماتحتی کر لی ہے بہت
افسر ہونا چاہتا ہوں

تجھے نکالنا ہے، باہر
اندر ہونا چاہتا ہوں

بُروں میں ہے آنا جانا
بہتر ہونا چاہتا ہوں

شیشہ چھوڑ کے دیکھ لیا
پتھر ہونا چاہتا ہوں

ٹھوکر ہے اُس کی مطلوب
کنکر ہونا چاہتا ہوں

نیچے لگا ہُوا ہوں میں
اوپر ہونا چاہتا ہوں

اُکتایا پھرتا ہوں بہت
بے گھر ہونا چاہتا ہوں

قرأت کافی نہیں، ظفرؔ
اَزبر ہونا چاہتا ہوں

ٹکڑے ہونا چاہتا ہوں
ایسے ہونا چاہتا ہوں

آگے تو ہوں لگا ہُوا
پیچھے ہونا چاہتا ہوں

کہتا ہوں پیچھے پیچھے
آگے ہونا چاہتا ہوں

ہونا چاہتا ہوں، لیکن
کیسے ہونا چاہتا ہوں

وہ ہونا کیا ہونا تھا
پھر سے ہونا چاہتا ہوں

آخر میں کیا ہونا ہے
پہلے ہونا چاہتا ہوں

ہونے سے ہوں انکاری
ویسے، ہونا چاہتا ہوں

بائیں طرف ہونا تھا مجھے
دہنے ہونا چاہتا ہوں

سبھی تکلُّف چھوڑ ظفرؔ
کہہ دے، ہونا چاہتا ہوں

انددھیرے میں آ اور تابانیاں کر
کسی دن مرے ساتھ من مانیاں کر

بہت آج کل مطمئن پھر رہا ہوں
کسی روز آ اور پریشانیاں کر

ہے خود کو تو مشکل میں ڈالا ہُوا
دوسروں کے لیے تو کچھ آسانیاں کر

ہمارا بھی دُنیا میں کوئی نہیں ہے
ہماری بھی کچھ دن نگہ بانیاں کر

اگر میزبانی کی ہمت نہیں ہے
تو پھر میرے جیسوں کی مہمانیاں کر

یہ مہلت ہمیشہ تو ملتی نہیں ہے
ملاقات ہے، اس میں طولانیاں کر

اگر شعر بے کیف ہے تو نہ گھبرا
ترنم سے پڑھ اور خوش اَلحانیاں کر

مجھے بھی ہے درکار تیرا تعارف
مرے ساتھ بھی جان پہچانیاں کر

مِلا کر ظفرؔ اُن سے، ہیں لوگ اچھے
کہیں شہر میں آنیاں جانیاں کر

جیسا اب ہے، آپ کا یہ کرّوفر رہنا نہیں
اور، اِدھر ہم نے بھی اتنا معتبر رہنا نہیں

فیصلہ کر ہی نہیں کر پائے ہیں اِس کا آج تک
یا اِدھر رہنا نہیں ہے، یا اُدھر رہنا نہیں

دیکھ لیجے گا، محبت کا سفر اِس عمر میں
مختصر لگتا ہے، لیکن مختصر رہنا نہیں

رنج ایک ایسا ہے جس کا عمر بھر کا ساتھ ہے
اک محبت ہے کہ جس نے سر بہ سر رہنا نہیں

ایک بار اپنے ہی سنگِ آستاں کے ہو رہیں
شہر میں اب اور ہم نے در بہ در رہنا نہیں

اک ملال آنکھوں میں آیا ہے بڑی مدّت کے بعد
وہ بھی ایسا لگ رہا ہے رات بھر رہنا نہیں

ایک بار آخر نکل آئیں کسی صورت اگر
ہم نے اِس ماحول میں بارِ دگر رہنا نہیں

دل کی درویشی الگ اک وضع ہے، لیکن ہمیں
اپنے گرد و پیش سے یوں بے خبر رہنا نہیں

شاعری جیسی بھی ہے، اُس کی عطا ہے، اے ظفرؔ
بیچنے لگ جاؤ گے تو یہ ہُنر رہنا نہیں

جسم فانی نظر آتا ہے برابر میرا
یعنی باقی نہیں کچھ بھی مرے اندر میرا

وہ بہادر ہُوں کہ حسرت سے مجھے دیکھتا ہے
عرصۂ جنگ میں ہارا ہُوا لشکر میرا

میرا اس حال میں منزل پہ پہنچنا معلوم
راستہ پوچھتا ہے مجھ سے ہی رَہ بَر میرا

دیکھ پاتے ہیں کہاں جم کے تماشائی مجھے
ایک لمحے میں بدل جاتا ہے منظر میرا

جا بہ جا گھومتا رہتا ہوں، اگر مِل جائے
اُنھی اَطراف میں کھویا ہُوا محور میرا

نہیں معلوم کِن الفاظ میں کرتے ہیں وہاں
ذکر ویسے تو ہُوا کرتا ہے اکثر میرا

رزق دروازہ مرا توڑ کے آتا ہے ابھی
میری دیوار پہ لکھا ہے مقدّر میرا

کوئی ہل چل نظر آتی نہیں مجھ میں شب بھر
اور، میلہ سا لگا رہتا ہے، باہر میرا

اس سے ہر صبح بنا لیتا ہوں مسواک، ظفرؔ
رہ گیا ہے اب اِسی کام کو خنجر میرا

قیام پر ہے خدائی، خدا مسافر ہے
دِکھائی بھی نہیں دیتا ہے، کیا مسافر ہے

ابھی مجھے کوئی اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہ
خیال و خواب کی صورت ہے، یا مسافر ہے

ترے پڑاؤ پہ رُکنا بھی چاہتا ہے یہ دل
گزر بھی جائے گا، ایسا ترا مسافر ہے

مسافرانِ محبت کی فکر مت کیجے
کہ اِن کے سامنے خود راستا مسافر ہے

طویل رات کا ہے سامنا ابھی اِس کو
جو بے خبر بھی ہے، اور شام کا مسافر ہے

سفر بھی اور طرح کا ہے، دوسروں سے الگ
اور، اپنی طرز کا سب سے جُدا مسافر ہے

یہ چاہتا بھی ہوں میں اُس کے ساتھ ہو جاؤں
کہیں تو جا کے رُکے گی، ہَوا مسافر ہے

کبھی کرے گا نیا راستا کوئی دریافت
یہی جو راہ سے بھٹکا ہُوا مسافر ہے

بکھر رہی ہے اندھیروں میں جانے کب سے، ظفرؔ
جو میں نہیں ہوں تو میری صدا مسافر ہے

چراغ بجھ گئے سارے، دُھواں مسافر ہے
زمیں رُکی ہُوئی ہے، آسماں مسافر ہے

کوئی قرار کسی چیز کو نہیں ہے یہاں
ہَوا کے ساتھ ہی آبِ رواں مسافر ہے

کسی مقام پہ ٹکتا ہی اب نہیں ہے یہ دل
مکیں بھی خیر منائیں مکاں مسافر ہے

کہاں سے چل کے کہاں تک پہنچ گئی، دیکھو
عجیب طرح کی یہ داستاں مسافر ہے

لیے پھرے گی سمندر کی لہر لہر اِسے
سفینہ ڈوب چکا، بادباں مسافر ہے

ہُوا ہے گُم کہیں اپنے غبار میں ہی کہ میں
سمجھ رہا تھا کہ یہ کارواں مسافر ہے

وہ شور و شر ہے کہ یہ بھی پتا نہیں چلتا
کہ رہ گزار ہے کہاں، کہاں مسافر ہے

بیاں ہے ٹھہرا ہُوا ایک ہی جگہ پہ، مگر
جو ہے تو یہ مرا طرزِ بیاں مسافر ہے

ظفرؔ ہمارے سفر کی ہے اب یہ صورتِ حال
کہ راستا ہی نہیں ہے جہاں مسافر ہے

تجھے بھی رنج مرے حال سے نہیں آیا
نکل کے میں بھی ترے جال سے نہیں آیا

ہے خواب بھی ترے باغوں سے دُور دُور بہت
خیال تیرے زر و مال سے نہیں آیا

اگرچہ اپنی بھی رہتی نہیں خبر مجھ کو
پتا کبھی ترے احوال سے نہیں آیا

کبھی کبھی کوئی خوشبو سی آتی رہتی ہے
سُراغ تیرے خد و خال سے نہیں آیا

مجھے اُمیدِ ملاقات اُڑائے پھرتی ہے
یہ زور میرے پر و بال سے نہیں آیا

یہ روشنی سی ہے کیسی ہوا کے جھونکے میں
اگر یہ چُھو کے ترے گال سے نہیں آیا

براہِ راست ہی رہتی ہے گفتگو اب تو
یہ معجزہ کسی تمثال سے نہیں آیا

ہے شاخسانہ کسی اور بات کا شاید
جو میری شامتِ اعمال سے نہیں آیا

مجھے تو اُس کی توقع بھی اب نہیں ہے، ظفر
وہ مرحلہ جو کئی سال سے نہیں آیا

نہیں کہ یہ ہوسِ خام سے نہیں آیا
کہ تجربہ کسی الہام سے نہیں آیا

گزر رہا تھا اِدھر سے میں اتفاقاً ہی
تمھارے پاس کسی کام سے نہیں آیا

کوئی دریچہ کھُلا ہی نہیں کئی دن سے
کوئی پیام کسی بام سے نہیں آیا

گزر ہی جائے یونہی تیرے انتظار کی رات
میں اپنے آپ میں ہی شام سے نہیں آیا

زیادہ شور تو برپا نہیں کیا اُس نے
وہ دل میں اتنے بھی آرام سے نہیں آیا

اک اور شخص کی ہی معرفت مِلا ہے مجھے
تمھارا نامہ مرے نام سے نہیں آیا

مجھے خود اپنی بھی عزت بہت عزیز نہ تھی
یہ فرق آپ کے الزام سے نہیں آیا

یقین جانیے، مِنت سے بھی نہ آئے گا اب
اگر وہ طعنہ و دُشنام سے نہیں آیا

کیا ہے بے اثری پر ہی انحصار، ظفؔر
اثر جو شعر میں اِبہام سے نہیں آیا

یہ لگتا ہے سرِ عرشِ بریں جاگے ہُوئے ہیں
اگرچہ ہم کہیں زیرِ زمیں جاگے ہُوئے ہیں

جگہ تبدیل کرنے کا تکلُّف کون کرتا
جہاں پر سو رہے تھے ہم، وہیں جاگے ہُوئے ہیں

اِسی میں سوئے تھے اور اب وہی غائب ہُوا ہے
مکاں کی جستجو میں سب مکیں جاگے ہُوئے ہیں

سبھی کا دھیان رکھنا ہم پہ واجب ہو گیا ہے
کہ سارے سونے والوں میں ہمیں جاگے ہُوئے ہیں

ہمارے جاگنے کی بات اَوروں سے بھی پوچھو
کہ ہم صرف اور صرف اپنے تئیں جاگے ہُوئے ہیں

ہمیں خود بھی بہت معلوم ہے ساری حقیقت
کہ ہم جاگے ہُوئے ہیں یا نہیں جاگے ہُوئے ہیں

سمجھتے ہیں کہ پہرا دے رہے ہیں یہ ہمارا
ہمارے سارے مارِ آستیں جاگے ہُوئے ہیں

ہمیں اس شہر سے باہر نہ جا کر ڈھونڈیئے، ہم
نظر آتے نہیں ورنہ یہیں جاگے ہُوئے ہیں

ظفرؔ، پھیلے ہُوئے ہیں خاک پر اس رات کے ساتھ
کہیں سوئے ہُوئے ہیں اور کہیں جاگے ہُوئے ہیں

ہوائیں شور پر ہیں اور چمن جاگے ہُوئے ہیں
گھروں میں جابہ جا گُل پیرہن جاگے ہُوئے ہیں

یہ کس تصویر نے چمکا دیا ہے سارا موسم
یہ کس آواز سے کوہ و دَمن جاگے ہُوئے ہیں

لہو کی موج ہے کوئی رواں، اندر ہی اندر
ہے کوئی خواب جس میں تن بدن جاگے ہُوئے ہیں

زمیں کروٹ بدلتی لگ رہی ہے اِس گھڑی میں
جناور سو رہے ہیں اور بَن جاگے ہُوئے ہیں

سُنائے جا رہے ہیں داستاں اپنی ہی دُھن میں
سمجھتے ہیں کہ اہلِ انجمن جاگے ہُوئے ہیں

اب اتنی بھیڑ میں دوبارہ سو جائیں تو بہتر
وگرنہ دیر ہی کے مرد و زن جاگے ہُوئے ہیں

ہیں شاید پھر کسی سونے کی تیاری میں مصروف
بہت عرصے کے بعد اہلِ وطن جاگے ہُوئے ہیں

یہ ساری نیند میں ہی گفتگو جاری ہے اُن کی
بہ ظاہر تو سبھی اربابِ فن جاگے ہُوئے ہیں

ہُوئے ہیں لفظ فریادی معانی کی طلب میں
اسی خاطر ظفرؔ ساز و سخن جاگے ہُوئے ہیں

تمھارے سب گمانوں سے پرے جاگے ہُوئے ہیں
اب اور آواز مت دینا، ارے جاگے ہُوئے ہیں

صبا اٹھکھیلیاں کرتی ہے کیا اندر ہی اندر
تمھارے بام کے دو سنگترے جاگے ہُوئے ہیں

ہمارے پاؤں ہی ٹکتے نہیں جیسے زمیں پر
کہ پہلی بار اُمیدوں سے بھرے جاگے ہُوئے ہیں

یہاں سونا بھی ہے اور باری باری جاگنا بھی
سو ہم سوئے ہُوئے اور دوسرے جاگے ہُوئے ہیں

خزاں دونوں ہی رنگ اِس خاک پر بکھرا گئی ہے
سنہری گر گئے پتے، ہرے جاگے ہُوئے ہیں

جگا ڈالی ہے جیسے صبحِ روشن نے ہر اک چیز
سو ہم بھی ہاتھ آنکھوں پر دھرے جاگے ہُوئے ہیں

یہ کیا ہلچل ہے پچھلی رات میں جو مچ گئی ہے
یہ کیا ڈر ہے کہ سب کھوٹے کھرے جاگے ہُوئے ہیں

کوئی اندازہ ہو ہی جائے اب سعیٔ سخن کا
کہ سب پیرائے، سارے پینترے جاگے ہُوئے ہیں

ظفرؔ، یہ سلسلہ پیری مریدی کا ہے کیسا
یہاں سوئے تھے، جا کر سنگھرے جاگے ہُوئے ہیں

اگر اصلی نہیں تو ہُو بہ ہُو جاگے ہُوئے ہیں
غنیمت ہے کہ تیرے رُو بہ رُو جاگے ہُوئے ہیں

ہمیں بتلاؤ کیا کس نے کہا اور کیا سُنا ہے
کہ ہم تو درمیانِ گفتگو جاگے ہُوئے ہیں

یہاں بھی اُٹھ رہے ہیں لوگ آنکھیں مَلتے مَلتے
وہاں بھی کچھ کنارِ آب جُو جاگے ہُوئے ہیں

ہَوا نے ایک ہلچل سی مچا رکھی ہے ہر سُو
چمن کے ساتھ اُس کے رنگ و بُو جاگے ہُوئے ہیں

تلاش اچھے دنوں کی تو جگاتی ہے سبھی کو
نہیں بھی کوئی جن کو جستجو، جاگے ہُوئے ہیں

زمانہ کب کا میٹھی نیند میں گُم ہو چکا ہے
کِسے معلوم ہے میں اور تُو جاگے ہُوئے ہیں

محبت کی نماز ایسے میں واجب ہو چکی ہے
کہ اتنی دیر سے ہم باوضو جاگے ہُوئے ہیں

یہ کیوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی ہیں سبھی نے
سو، کس خطرے میں ہیں اور دُو بہ دُو جاگے ہُوئے ہیں

ظفر اُمّید اُنھی سے ہے کہ وہ کچھ کر دِکھائیں
بدن بے چین ہیں جن کے لہو جاگے ہُوئے ہیں

خدا ہی جاگتا رکھے جہاں جاگے ہُوئے ہیں
یہاں سوئے ہُوئے تھے جو وہاں جاگے ہُوئے ہیں

سُنائی دے رہی ہے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ
دُھواں اُٹھنے لگا ہے اور مکاں جاگے ہُوئے ہیں

ابھی گہری ہے شاید نیند میرِ کارواں کی
جو خرّاٹوں سے اہلِ کارواں جاگے ہُوئے ہیں

قیامت ٹوٹنے والی ہے خلقت کے سروں پر
زمیں سے دُور سارے آسماں جاگے ہُوئے ہیں

ہَوا رہ رہ کے سر ٹکرا رہی ہے لمحہ لمحہ
سمندر سَو رہا ہے، بادباں جاگے ہُوئے ہیں

اُنھیں تو نیند میں چلنے کی عادت ہے ازل سے
سَو، مت سمجھو کہ یہ پیر و جواں جاگے ہُوئے ہیں

اندھیرا رفتہ رفتہ ہو رہا ہے پارہ پارہ
جو بجلی کی چمک سے آشیاں جاگے ہُوئے ہیں

ہمارے جاگنے والوں کے چرچے تو ہیں، لیکن
ہمیں بھی کوئی بتلاؤ کہاں جاگے ہُوئے ہیں

معانی اُونگھنے لگتے ہیں بیٹھے بیٹھے اب بھی
ظفرؔ کہنے کو ہی لفظ و بیاں جاگے ہُوئے ہیں

پرندے شور کرتے ہیں، شجر جاگے ہُوئے ہیں
زمیں سوئی ہُوئی ہے، رہ گزر جاگے ہُوئے ہیں

یہ کوئی مصلحت ہے موند رکھی ہیں جو آنکھیں
اِنھی سوئے ہُوؤں میں بیش تر جاگے ہُوئے ہیں

ہمارا کچھ پتا چلتا نہیں، ہیں کس طرف ہم
کدھر سوئے ہُوئے ہیں اور کدھر جاگے ہُوئے ہیں

نہیں ہے جاگنے والوں کی خصلت کوئی باقی
سَو، کہنے کو تو ہم بھی سر بہ سر جاگے ہُوئے ہیں

ہمارے خواب میں پھرتے ہیں سارے لوگ اب تک
اِدھر آتا نہیں کوئی جدھر جاگے ہُوئے ہیں

کسی بھی وقت مجھ کو چھوڑ کر چل دیں گے آگے
میں خود سویا ہُوا ہوں، ہم سفر جاگے ہُوئے ہیں

پڑے ہیں اک جگہ پتھر کی صورت کس لیے ہم
کہ ہِل جُل کیوں نہیں کرتے اگر جاگے ہُوئے ہیں

یہی بہتر تھا اِس سے آنکھ ہی کُھلتی نہ اپنی
کہ ہم جاگے ہُوئے بھی بے خبر جاگے ہُوئے ہیں

ابھی پھر نیند غلبہ پانے والی ہے ظفرؔ پر
کہ بھر سوئے نہیں اور مختصر جاگے ہُوئے ہیں

۵

جو چیز ملی اُس کو تباہ اُس نے کیا ہے
مجھ کو تو مگر خواہ مخواہ اُس نے کیا ہے

ممکن ہے اسی میں برکت ڈال دے آخر
جو رابطہ مجھ سے سرِ راہ اُس نے کیا ہے

لکھ لیجیے لگ جائے گا نام اور کسی کے
دانستہ جو ہر ایک گناہ اُس نے کیا ہے

دُنیا تو نہیں جانتی لیکن میں بتاؤں
اِس باغ کو بے آب و گیاہ اُس نے کیا ہے

اِس کا بھی وہ احسان جتائے گا شب و روز
جو لطف و کرم گاہ بہ گاہ اُس نے کیا ہے

جو روز کی خوراک مقرّر تھی ہماری
اُس کو بھی کہیں ماہ بہ ماہ اُس نے کیا ہے

نیکی جو کبھی بھول کے کر دی ہے مرے ساتھ
کیا جانیے کس کس کو گواہ اُس نے کیا ہے

تھا دوسروں جیسا ہی وہ خود بھی، اِسی خاطر
یہ کام بھی اَوروں کی طرح اُس نے کیا ہے

بخشش کی ظفرؔ کو بھی ہے اُمّید، اگرچہ
خود نامۂ اعمال سیاہ اُس نے کیا ہے

روکے ہُوئے پانی کو رواں اُس نے کیا ہے
بوڑھی تھی، محبت کو جواں اُس نے کیا ہے

رونق بھی لگائے رکھی اِس خاک پہ اُس نے
پھر سارے تماشے کو دُھواں اُس نے کیا ہے

دیکھیں تو کہاں کام نہیں اُس کا نمایاں
سب پوچھتے پھرتے ہیں کہاں اُس نے کیا ہے

ممکن ہو تو اُس کو بھی ذرا دیکھتے رہنا
ہر چیز کا جو حشر یہاں اُس نے کیا ہے

ظالم کا کوئی ظلم چھپائے نہیں چھپتا
خود بولتا ہے منہ سے جہاں اُس نے کیا ہے

اپنی ہی وہ شہرت کو بچاتا رہا اب کے
ہر شخص کو بے نام و نشاں اُس نے کیا ہے

خود بھی اُسی ٹولے سے تعلق ہے جو اُس کا
ہے چور وہی جس پہ گماں اُس نے کیا ہے

سب مطمئن ایسے ہیں، پتا ہی نہیں چلتا
کس کے دلِ تنہا کو مکاں اُس نے کیا ہے

سُنتے ہو ظفرؔ سے جو محبت کا وقوعہ
گزرا ہے کہیں اور، بیاں اُس نے کیا ہے

مجھ کو مرے ہونے سے جدا اُس نے کیا ہے
کیا کیجیے، ہر شے کو ہوا اُس نے کیا ہے

رہنے ہی نہیں دی کوئی چیز اپنی جگہ پر
وسعت تھی جسے تنگیٔ جا اُس نے کیا ہے

وہ کار کشا تھا کہ محبت کے علاوہ
جو کچھ یہاں پیدا ہی نہ تھا، اُس نے کیا ہے

اب صورتِ حالات پہ خوش بھی نہیں، لیکن
خود ہی یہاں بندے کو خدا اُس نے کیا ہے

وہ اَبر کی صورت کہیں برسا نہیں، پھر بھی
سُوکھے ہُوئے جنگل کو ہَرا اُس نے کیا ہے

جو کہہ دیا اُس نے وہی ہونے لگا ہر سُو
پہلے جو کبھی ہو نہ سکا، اُس نے کیا ہے

جو اتنا بڑا تھا اُسے چھوٹا کیا اُس نے
چھوٹے کو اشارے سے بڑا اُس نے کیا ہے

اپنوں پہ ہی کچھ اس کی توجہ نہیں کوئی
اَوروں کو تو جو کام پڑا، اُس نے کیا ہے

سکہ جو چلا ہی نہیں بازار میں اب تک
کھوٹے کو ظفرؔ آج کھرا اُس نے کیا ہے

پڑے ہیں در بہ در اور جا بہ جا سوئے ہُوئے ہیں
کہ بستر ہے نہ کوئی کھاٹ، کیا سوئے ہُوئے ہیں

کریں کیا، نیند تو پھر آ ہی جاتی ہے یہاں بھی
کہ سُولی پر چڑھے ہیں اور ذرا سوئے ہُوئے ہیں

جہاں شورِ قیامت نے جگا رکھا ہے سب کو
وہاں پر بھی تمھارے بے نوا سوئے ہُوئے ہیں

جب اُٹھیں گے تو دے دیں گے حسابِ عمر بھی سب
کہ ہم فی الحال تو پیشِ خدا سوئے ہُوئے ہیں

کسی کے ساتھ بنتی ہی نہیں اپنی کسی طور
الگ بیٹھے ہُوئے ہیں اور جُدا سوئے ہُوئے ہیں

یہ سونا کچھ نیا بھی تو نہیں اپنے لیے اب
کہ ہم پہلے بھی سب اچھا بُرا سوئے ہُوئے ہیں

بڑی مدّت کے بعد آئی ہے یہ ساعت پلٹ کر
جو ہم خود کو ہی چھاتی سے لگا سوئے ہُوئے ہیں

کوئی یہ فیصلہ مشکل سے ہی کر پائے گا اب
کہ ہم جاگے ہُوئے ہیں یا بھلا سوئے ہُوئے ہیں

کسی کا ڈر نہیں، مرضی کے مالک ہیں ظفرؔ، ہم
کہ ہیں سوئے ہُوئے اور برملا سوئے ہُوئے ہیں

نہیں ہے پوچھنے والا کوئی سوئے ہوئے ہیں
اسی خاطر پڑے ہیں اور تبھی سوئے ہوئے ہیں

کبھی بیدار ہوں گے تو بھگت لیں گے سبھی کچھ
ابھی مت چھیڑنا ہم کو، ابھی سوئے ہوئے ہیں

سزا میں اور جزا میں فرق ہی باقی نہیں کچھ
برابر ہیں ابھی نیکی بدی، سوئے ہوئے ہیں

خمارِ خواب میں ہیں رُوبہ رُو کیا کیا نظارے
لیے پھرتی ہے کب سے اک پری سوئے ہوئے ہیں

بہت پیچھے ہیں یا آگے نکل آئے ہیں سب سے
زمانہ جاگتا ہے اور ہم سوئے ہوئے ہیں

کسر تھی کوئی شاید اپنی ہی آواز میں کچھ
جگایا تھا جنھیں ہم نے وہی سوئے ہوئے ہیں

عجب ناکردہ کاری شام سے ہے برسرِ کار
ہوا بھی رُک گئی ہے، لوگ بھی سوئے ہوئے ہیں

ہمیں آ کر کہیں دیکھو تو دیکھو نیند میں ہی
کبھی جاگے ہوئے ہیں اور کبھی سوئے ہوئے ہیں

ہے دُنیا اپنے اپنے کام میں مصروف کب سے
ظفر صاحب یہاں پر آپ ہی سوئے ہوئے ہیں

زمیں غائب ہے، زیرِ آسماں سوئے ہُوئے ہیں
پتا کچھ بھی نہیں چلتا کہاں سوئے ہُوئے ہیں

اُٹھیں گے تو ہمیں یہ گرد شاید راستا دے
ابھی تک تو ہمارے کارواں سوئے ہُوئے ہیں

چمن میں پھول خود ہی کھِلتے مُرجھاتے ہیں اب تو
زمانوں سے ہمارے باغباں سوئے ہُوئے ہیں

کسی کی نیند غلبہ پا چکی ہے شہر بھر پر
یہاں سوئے ہُوئے ہیں کچھ وہاں سوئے ہُوئے ہیں

کچھ اب تو غیر ممکن ہے ہمارا مِلنا جُلنا
وہیں سے اُٹھ نہیں سکتے جہاں سوئے ہُوئے ہیں

جگانے کے لیے ڈھونڈو ہمیں اِس دشت و در میں
کہ ہم شاید کہیں پر بے نشاں سوئے ہُوئے ہیں

کچھ اُن کے ساتھ ہی قسمت بھی اُن کی سو گئی ہے
جگایا تھا جنھیں وہ بعد ازاں سوئے ہُوئے ہیں

اُنھیں کیوں کر جگائیں خود ہی چپ ہو جائیں گے ہم
وہ اب جو درمیانِ داستاں سوئے ہُوئے ہیں

ظفرؔ جو خواب میں ہی بولتا رہتا ہے اتنا
اُسے جا کر کہو ہم بھی یہاں سوئے ہُوئے ہیں

بہ ظاہر جو بڑے آرام سے سوئے ہُوئے ہیں
جگا دے کوئی ہم کو، دیر کے سوئے ہُوئے ہیں

نہیں ہے کام کوئی پینے کھانے کے علاوہ
فراغت ہے سراسر اِس لیے سوئے ہُوئے ہیں

ہوا کا گھر میں بندوبست ہی باقی نہیں اب
گلی میں آ کے سب چھوٹے بڑے سوئے ہُوئے ہیں

پڑے رہتے ہیں لمبی تان کر شاید جبھی ہم
کہ جو ہم کو جگانے آئیں گے، سوئے ہُوئے ہیں

دھماکوں پر دھماکے ہو رہے چاروں جانب
مگر، پروا نہیں ہم کو پڑے سوئے ہُوئے ہیں

ہماری باری آئے گی تو سو جائیں گے ہم بھی
ابھی تو اُس کے در پر دوسرے سوئے ہُوئے ہیں

زمانہ ہو گیا، گزرا نہیں اُن پر سے کوئی
وہ جو دُشوار تھے سب راستے، سوئے ہُوئے ہیں

جگائے جو کبھی رکھتے تھے ساری رات ہم کو
محبت کے وہ سارے سلسلے سوئے ہُوئے ہیں

ہمارے بس سے باہر ہے، ظفرؔ یہ خوابِ خرگوش
ہم اپنے آپ سے بھی کچھ پَرے سوئے ہُوئے ہیں

خدا کی مار دیکھو، دَم بہ دَم سوئے ہُوئے ہیں
قیامت آچکی ہے اور ہم سوئے ہُوئے ہیں

جبھی تو فاصلہ طے ہو نہیں پایا کسی طور
کہ ہم جاگے ہُوئے ہیں اور قدم سوئے ہُوئے ہیں

ہمیں اِس حال میں بے کار ہے بیدار کرنا
ہم اُٹھنے کی اگر کھا کر قسم سوئے ہُوئے ہیں

ابھی تو نیند پوری کر رہے ہیں مُدّتوں کی
جگانا مت کہ ہم پہلے ہی کم سوئے ہُوئے ہیں

اُنھیں بہتر ہے اُن کے حال پر ہی چھوڑ دیں ہم
جو گھوڑے بیچ کر اہلِ کرم سوئے ہُوئے ہیں

یہ خود ہی جاگ اُٹھیں گے ابھی مجبور ہو کر
جو اتنی دیر سے خالی شکم سوئے ہُوئے ہیں

اسی حالت کو اِس لمحے غنیمت جانیے گا
خوشی جاگی نہیں ہے اور غم سوئے ہُوئے ہیں

زبانی ہی چلاتے جا رہے ہیں کام سارا
لکھا کچھ بھی نہیں جاتا، قلم سوئے ہُوئے ہیں

ظفرؔ کے منہ سے اب یہ مکھیاں بھی مت اُڑاؤ
کہ بے آرام ہوں گے محترم، سوئے ہُوئے ہیں

خلا ہے اِس طرح کا ہر طرف حالات سے حالات خالی ہیں
کہیں ختم ہو گیا ہے وقت ہی، دن رات خالی ہیں

کوئی موسم رُکا ہے اِس طرح آ کر سروں پر آسماں جیسا
کہ مدّت ہوگئی پھولوں پھلوں سے خواب کے باغات خالی ہیں

اندھرا، اور اندھیرا اور اندھیرا ہے لہو میں جس طرف دیکھو
کوئی سورج ہے جس سے آج کل ہر دم مرے ذرّات خالی ہیں

ہماری وضع ہی ویسی کی ویسی ہے کہ بس لبریز ہیں آنکھیں
وگرنہ اندر اور باہر ہمارے سارے موجودات خالی ہیں

ہمی ہم ہیں جو سڑکوں پر اُنڈیلے جا رہے تھے روزِ اوّل سے
کسی سے دُور خالی تھے ہی لیکن اب کسی کے ساتھ خالی ہیں

دُھواں غائب ہُوا اِس طرح شہروں سے کہ بے آباد ہوں جیسے
مویشی آتے جاتے ہی نہیں اور گرد سے دیہات خالی ہیں

محبت بے اثر یوں ہی نہیں ہے اور کہیں کچھ فرق ہے، لیکن
صحیفہ جس رُخِ روشن کا ہے اُس کی سبھی آیات خالی ہیں

جدھر کو رُخ کرے گا مجمعِ معنی وہیں سے کام نکلے گا
یہاں فرصت ہی فرصت ہے کہ اپنے لفظ کے لمحات خالی ہیں

سکندر نے ظفرؔ کی تھی تہی دستی کی جتنی بھی نمائش تب
یہاں لاکھوں کروڑوں زندہ انسانوں کے دونوں ہاتھ خالی ہیں

بہت خوف رکھتے ہیں سونے سے ہم
کسی خواب کا بیج بونے سے ہم

اگر تُو نہ ہوتا تو جاتے کہاں
تسلّی میں ہیں تیرے ہونے سے ہم

کبھی خوش ہُوئے دُھوپ میں بیٹھ کر
کبھی مینہ میں کپڑے بھگونے سے ہم

لطیفہ نہ کوئی سناؤ ابھی
کہ فارغ نہیں رونے دُھونے سے ہم

پریشان ہیں، خود پہ حیران ہیں
کنارے پہ کشتی ڈبونے سے ہم

رہے دُور ہی اُس عمارت سے جب
تو واقف ہوئے کونے کونے سے ہم

یہ حالت ہُوئی ہے کہ ہیں مطمئن
نہ پانے سے کچھ اور نہ کھونے سے ہم

یہیں تھا بہت، اور کیا کھیلتے
محبت کے مہنگے کھلونے سے ہم

گزارہ کیے جا رہے ہیں، ظفرؔ
محبت کے میلے بچھونے سے ہم

پڑے تنگ جب ناز اُٹھانے سے ہم
نکل آئے تیرے زمانے سے ہم

بس اب منزلِ شوق نزدیک ہے
یہ سمجھے ترے مسکرانے سے ہم

بہت دُور ہونا پڑے گا کبھی
سو، ڈرتے رہے پاس آنے سے ہم

ذرا دُور آگے تو پہنچے کہیں
رکاوٹ تمھاری ہٹانے سے ہم

عجب آپ سے آپ گُم ہو گئے
سُراغ اُس کا تھوڑا سا پانے سے ہم

کچھ اِس طرح کے نقشِ دیوار تھے
نمایاں ہُوئے ہیں مٹانے سے ہم

وہاں پر گئے تھے مگر اپنا کام
بگاڑ آئے سارا بنانے سے ہم

عبث ایک دُنیا سے لی دشمنی
سو، باز آئے دُھومیں مچانے سے ہم

بھرم کھول بیٹھے ہیں سارا، ظفرؔ
یہ اُلٹا تماشا لگانے سے ہم

ہیں مجبور باہر نکلنے سے ہم
سو، معذور ہیں ساتھ چلنے سے ہم

سنبھل سے گئے گرتے گرتے کبھی
کبھی گر پڑے ہیں سنبھلنے سے ہم

کسی طور تجھ سے ہوئے سُرخ رُو
لہو منہ پہ اپنا ہی مَلنے سے ہم

تر و تازہ کرتی ہے پھر آ کے شام
اُبھرتے ہیں سورج کے ڈھلنے سے ہم

نہ تھا دُور یہ آسماں بھی بہت
کوئی کام لیتے اُچھلنے سے ہم

رہی دوسروں کو بدلنے کی دُھن
کہ منکر تھے خود کو بدلنے سے ہم

جمی تھی بہت برف اندر کہیں
سو، بچ ہی گئے ہیں پگھلنے سے ہم

کہ یہ راکھ ہی اپنی اکسیر ہے
بچاتے نہیں خود کو جلنے سے ہم

زمیں دیکھ کر باز آئے، ظفرؔ
یہاں پھولنے اور پھلنے سے ہم

صدا کا سلسلہ میری نوا کے اوپر ہے
کہ اب چراغِ ہوا خود ہوا کے اوپر ہے

کہاں سے آئی ہے اور یہ کدھر کو جائے گی
یہ روشنی جو ترے نقشِ پا کے اوپر ہے

میں اُس کو اور کوئی نام دے نہیں سکتا
وہ قیل و قال جو تیری رضا کے اوپر ہے

ہم اہلِ شہر کو الزام کوئی کیا دیتے
گِلہ جو ہے بھی تو اُس بے وفا کے اوپر ہے

یہ روشنی، یہ اندھیرے بہت زیادہ سہی
زمانہ اور بھی صُبح و مسا کے اوپر ہے

خدا سے دُور ہی رکھتا ہے رات دن ہم کو
جو اعتقاد ہمارا دُعا کے اوپر ہے

جیو مَرو مگر اُس کو بھی دھیان میں رکھنا
کہ جو گرفت سزا و جزا کے اوپر ہے

نہیں ضرور کہ پانی گھٹا کے اندر ہو
ابھی تو آگ کا سورج گھٹا کے اوپر ہے

ہم اپنے آپ سے مایوس ہو چکے ہیں، ظفرؔ
اب انحصار کسی دل رُبا کے اوپر ہے

یہ ابر ہے کہ دھواں میرے گھر کے اوپر ہے
کہ جو بھی کچھ ہے یہاں در بہ در کے اوپر ہے

میں اُس کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں بے خبر، ورنہ
شجر کی ساری کہانی شجر کے اوپر ہے

ہزار کہیے محبت ہے بے غرض، لیکن
مدار اِس کا بھی نفع و ضرر کے اوپر ہے

دل اتنا مفلس و نادار تو کبھی نہیں تھا
جو آنکھ اپنی ترے مال و زر کے اوپر ہے

لگا سکے کوئی اندازہ کیا کہ یہ سب کچھ
نظر کے تھا کبھی نیچے، نظر کے اوپر ہے

کرے تو یہ بھی کنارے کا کام کر جائے
کہ اب تو ناؤ کی قسمت بھنور کے اوپر ہے

خدا بھی ہو گا کہیں کائنات پر حاوی
مگر یہاں تو بشر ہی بشر کے اوپر ہے

ہمیں یہ منزلِ مقصود تک بھی لے جائے
کہ اِنحصار ابھی رہ گزر کے اوپر ہے

یہ زندگی بھی مرے پاؤں میں پڑی ہے، ظفرؔ
اگرچہ موت کھڑی میرے سر کے اوپر ہے

اگر بچ رہے پاؤں دھرنے سے ہم
تو ڈوبے ترے پار اُترنے سے ہم

محبت کی محنت گئی رائگاں
جو کچھ اور خالی ہیں بھرنے سے ہم

کوئی بات اِس طرح کی ہو گئی
کہ پیاسے ہی لوٹ آئے جھرنے سے ہم

ہمارے لیے راستہ جب کُھلا
تو منکر تھے خود ہی گزرنے سے ہم

زیادہ ہی تکلیف میں رہ گئے
اِدھرنے کی نسبت اُدھرنے سے ہم

سفر میں تو خود ہی رواں تھے، مگر
بہت تھک گئے ہیں ٹھہرنے سے ہم

طبیعت ہی اس طرح کی پائی ہے
جو یک سُو ہُوئے ہیں بکھرنے سے ہم

بڑے شوق سے آج کی خودکُشی
بہت ڈرتے آئے تھے مرنے سے ہم

ظفرؔ، کر ہی لیتے کوئی واردات
کہ پکڑے گئے ہیں نہ کرنے سے ہم

وہ ایک سمت کہ جو چار سُو کے نیچے ہے
تمھارا ذکر ابھی گفتگو کے نیچے ہے

ابھی تو میری شناسائی بھی نہیں اُس سے
سوالِ وصل کہیں آرزو کے نیچے ہے

ابھی مجھے بھی زیادہ خبر نہیں اُس کی
وہ رنگ و بو جو ترے رنگ و بو کے نیچے ہے

میں اپنے آپ کو بھی ڈھونڈنے میں ہوں مصروف
کہ یہ تلاش تری جستجو کے نیچے ہے

اُسے بھی کان لگا کر اگر سنو کسی دن
اک اور شور کہ جو ہاؤ ہُو کے نیچے ہے

ابھی کہیں مری پہچان میں نہیں آتا
کہ آپ بھی وہ بہت ہُوبہ ہُو کے نیچے ہے

وہی بہت ہے خس و خارِ آشیاں کے لیے
وہ برقِ ناز جو میرے لہو کے نیچے ہے

کسے خبر ہے کہ سیلابِ خواب کا پانی
پڑا ہُوا بھی اُسی کُو بہ کُو کے نیچے ہے

مرے حساب میں ہے وہ بھی کچھ دنوں سے، ظفرؔ
جو ایک فتنہ کہیں رُو بہ رُو کے نیچے ہے

غبار سا کوئی گردِ سفر کے نیچے ہے
کہ ایک اور بھی گھر میرے گھر کے نیچے ہے

زمانہ ہو گیا پرواز کو مری اب تک
وہ دشتِ خواب ابھی میرے پَر کے نیچے ہے

پتا چلے گا اُس افواہ کا بھی آخرِکار
کہیں جو اُس کی خبر معتبر کے نیچے ہے

کسی بھی لمحے میں ہونا ہے منہدم یہ مکاں
کہ زلزلہ مرے دیوار و در کے نیچے ہے

وہ اپنی بات سے قائل نہ ہو سکا کہ دراصل
ہماری بے اثری بھی اثر کے نیچے ہے

بہت سکون سے سویا ہُوا ہوں مدّت کا
یہ زندگی کا سرہانہ جو سر کے نیچے ہے

نتیجہ ایک ہی نکلے گا، ہم چلیں نہ چلیں
ہماری منزل اگر رہ گزر کے نیچے ہے

ابھی نہیں ہے پرندوں سے گفتگو ممکن
کھڑا ہُوا کوئی کب سے شجر کے نیچے ہے

مجھے کہیں سے اک آواز آرہی ہے، ظفرؔ
کوئی تو شے ہے جو اِس خشک و تر کے نیچے ہے

اندر رُکا رہا کبھی باہر رُکا رہا
کچھ دیر کو چلا ہُوا منظر رُکا ہوا

موسم کا رنگ ڈھنگ تو کچھ اور تھا، مگر
روکا تھا جس کو تُو نے، برابر رُکا رہا

وہ میرے آس پاس ہی پھرتا تھا رات دن
حیراں ہوں اتنی دیر سے کیوں کر رُکا رہا

پانی تھا اور اپنی جگہ سے ہلا نہیں
دریا بھرا ہُوا متواتر رُکا رہا

آتے تھے آسماں سے بُلاوے مجھے بہت
لیکن میں ایک عمر زمیں پر رُکا رہا

باہر معاملات موافق نہ تھے بہت
میں اتنی دیر اپنے ہی اندر رُکا رہا

منزل سے کچھ مسافرِ دل کو غرض نہ تھی
بے شک سفر میں بھی رہا، اکثر رُکا رہا

میرے علاوہ چاند کو بھی دیجیے گا داد
جو ایک ہی مقام پہ شب بھر رُکا رہا

میں ایک عمر خانہ بدر ہی رہا، ظفر
مہماں سرائے ہو کے مرا گھر، رُکا رہا

کونے میں آسماں کے ستارہ رُکا رہا
رُکنے سے اُس کے سارا نظارا رُکا رہا

سر پر تھی ایک چھاؤں کی چھتری تنی ہُوئی
بادل کی طرح خواب تمھارا رُکا رہا

محفل تو چل چلاؤ پہ تھی شام سے، مگر
اتنی ہی دیر کام ہی ہمارا رُکا رہا

دیوار ایک اور بھی تو سدِ راہ تھی
پہلے جو رُک گیا تھا، دوبارہ رُکا رہا

وہ کون تھا کہ گاڑیوں کی بھیڑ لگ گئی
جب تک گزر گیا نہ، اشارہ رُکا رہا

پانی کے ساتھ چلتا رہا کافی دیر تک
پھر اُس کے بعد سے یہ کنارہ رُکا رہا

لکڑی تو اپنے آپ ہی کٹتی چلی گئی
حالاں کہ ساتھ ساتھ ہی آرا رُکا رہا

روکا ہُوا تھا خود خس و خاشاک نے اُسے
اُڑ کر بھی تھوڑی دیر شرارہ رُکا رہا

سیلِ سخن کہ رُک نہ سکا تھا کبھی، ظفرؔ
رُکنے پہ آگیا تو وہ سارا رُکا رہا

دُنیا رُکی رہی نہ زمانہ رُکا رہا
اپنا جو قافلہ تھا روانہ، رُکا رہا

ڈھونڈی تھی سیرگاہ کوئی اور آپ نے
اِس باغِ دل میں آپ کا آنا رُکا رہا

روکا ہُوا تھا جیسے کسی انتظار نے
کچھ دن ہمارا جان سے جانا رُکا رہا

دونوں کے درمیاں میں ہی لٹکے رہے تھے ہم
کھونا رُکا رہا کبھی پانا رُکا رہا

تا دیر اُمید و بیم کا موسم تھا رُو بہ رُو
پتھر کے پاس آئنہ خانہ رُکا رہا

آغاز اپنی اپنی کہانی سے تھا وہاں
محفل میں رات اپنا فسانہ رُکا رہا

خوشبوئے گفتگو تری جب تک رواں رہی
تب تک ہجوم شانہ بہ شانہ رُکا رہا

لفظوں کی مار دھاڑ رہی اگلے چوک تک
لوگوں کو راستے سے ہٹانا رُکا رہا

جب تک مرا جلوس گزرتا رہا، ظفرؔ
سب میرے دشمنوں کا ترانہ رُکا رہا

اُس نے جو وعدہ کیا تھا، جوں کا توں رکھ لیا تھا
اب پشیمانی میں ہیں اِس طرح کیوں رکھ لیا تھا

یہ بھی اُس نے آن کر ساری اُلٹ دی ہے بِساط
بے سکونی چھوڑ دی تھی اور سکوں رکھ لیا تھا

پیش کر دی گئی تھی دُنیا کی ہر نعمت ہمیں
اور ہم نے یہ دلِ خوار و زبوں رکھ لیا تھا

رکھ لیا تھا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر ہم نے کبھی
سب سے کہتے پھر رہے ہیں اب کہ یوں رکھ لیا تھا

تھا سو دل اپنا بھی مہمل سا یہ گھر اپنا جو اب
تم نے بھی نیمے دروں، نیمے بروں رکھ لیا تھا

ایسے پیاسے ہی گزر جانا تھا دُنیا سے ہمیں
جامِ ہستی کو جو ہم نے واژگوں رکھ لیا تھا

آنے والے فتنہ کے پیشِ نظر دل کا عَلَم
ہم نے پہلے روز سے ہی سرنگوں رکھ لیا تھا

تھے وہ دیوانے بزعمِ خویش جو ہشیار تھے
نام ہم نے ہوش مندی کا جنوں رکھ لیا تھا

زندگی اپنی گزرنی تھی اِسی ڈھب سے، ظفؔر
سر میں تھوڑا شور سا اور دل میں خوں رکھ لیا تھا

اصل کو چھوڑا تھا ہم نے، ہُو بہ ہُو رکھ لیا تھا
ایک ہی مضموں برائے گفتگو رکھ لیا تھا

قسمتوں پر اپنی شاکر ہوگئے ہوں گے ضرور
جس نے میں رکھ لیا تھا اور جس نے تُو رکھ لیا تھا

شاید آجائے نظر اُس کو کبھی اپنا ہی عکس
خود کو آئینہ سا اُس کے رُو بہ رُو رکھ لیا تھا

اُس سے مِلنا ہی نہیں تھا، کُھل کے مِلنا تھا ہمیں
اُس کی خاطر اِس لیے ہم نے وضو رکھ لیا تھا

دشمنی کے واسطے مامور تھے سارے ہی دوست
دوستی کرنے کو ہم نے اک عدو رکھ لیا تھا

رات بھر آبِ رواں کو دیکھنا بھی تھا ضرور
چاند کو ہم نے کنارِ آب جُو رکھ لیا تھا

اِس چمن کی اور تو خدمت نہ کوئی کر سکے
خواب سا ہم نے برائے رنگ و بو رکھ لیا تھا

جان رکھ لی تھی گنوانے کے لیے پایانِ کار
اور، سڑکوں پر بہانے کو لہو رکھ لیا تھا

دیکھتے تھے اُس کو اور خوش وقت رہتے تھے، ظفرؔ
منظر ایک ایسا تھا جس کو چار سُو رکھ لیا تھا

اِس مرض میں جانے کیا چھوڑا تھا، کیا رکھ لیا تھا
روک دی تھی ہر دوا، دستِ دُعا رکھ لیا تھا

کچھ محبت کی اُٹھائی بھی نہ تھی اُونچی فصیل
کچھ نکل جانے کو ہم نے راستہ رکھ لیا تھا

کر نہیں سکتے تھے جب اک دوسرے کا اعتبار
مشورے کے ساتھ کوئی تیسرا رکھ لیا تھا

ساتھ کیا لے کر پھرا کرتے ہم اتنے حُسن کو
اُس کے ٹکڑے کر کے آخر جا بہ جا رکھ لیا تھا

واپسی کا بھی کبھی شاید خیال آئے اُسے
جس کی خاطر ہم نے دروازہ کُھلا رکھ لیا تھا

بھول جانے کو کئی تھے آپ جیسے درد مند
یاد کرنے کے لیے وہ بے وفا رکھ لیا تھا

دیکھنے کو ایک منظر پر ٹکی رہتی تھی آنکھ
سانس لینے کو ہَوا کا سلسلہ رکھ لیا تھا

پہلے گھر کا آپ ہی پہرا دیا کرتے تھے ہم
پھر حفاظت کے لیے ہم نے خدا رکھ لیا تھا

اس سے آگے ہم نکل پائے ہی کب تھے، اے ظفؔر
اس میں جو خود ہی کوئی سنگِ صدا رکھ لیا تھا

کبھی باہر کی دُنیا کو جو پاکستان سے دیکھا
یہی پہچان کافی تھی، اِسی پہچان سے دیکھا

عجب ہی واہمے تھے جن میں رہنا پڑ گیا آخر
وہ باہر تھا نہیں جو ہم نے روشن دان سے دیکھا

مکاں تھے چھوٹے چھوٹے، تنگ تر تھیں شہر کی گلیاں
یہ سب کچھ ایک دن ہم نے کُھلے میدان سے دیکھا

ہمارا مسئلہ نفع و ضرر کب تھا کہ ہم نے تو
تمھارا فائدہ اپنے کسی نقصان میں دیکھا

ہمارا تو تعارف ہی نہیں اس سے کوئی اب تک
سو، تیری مہربانی سے ترے مہمان کو دیکھا

یہاں ترتیب ہی بدلی ہُوئی تھی اِس دفعہ ساری
کہ آنکھوں سے سُنا ہم نے تو اُس نے کان سے دیکھا

ملاقات اُس سے ہوسکتی ہے اور کب ہونے والی ہے
یہ ہونا اور نہ ہونا دُور کے امکان سے دیکھا

بہت خوش تھے کبھی اُس دم کہ یہ تو ہوتا رہتا ہے
یہ منظر ہم نے اپنی موت کے اعلان سے دیکھا

غلط الفاظ کا اک ڈھیر تھا خالی، ظفؔر ہم نے
جو عبرت ناک منظر آپ کے دیوان سے دیکھا

کڑکتی دھوپ کی غارت گری کو شام سے دیکھا
کوئی آغاز تھا ہم نے جسے انجام سے دیکھا

ہماری پختگی تو آڑے آتی ہی رہی، لیکن
بہت ہم نے بھی خواب اپنا خمارِ خام سے دیکھا

غلط فہمی ہمیں بھی ہوتے ہوتے رہ گئی، اُس نے
وہ کوئی اور تھا جس کو کنارِ بام سے دیکھا

حقیقت میں تو وہ اک دعوتِ مستور تھی کوئی
کہیں جب غور سے ہم نے ترے الزام سے دیکھا

اثر ہوتا بھی کیا ہم پر کہ اُس کی نرم خوئی کو
اگر دیکھا تو اپنی سختیٔ ایّام سے دیکھا

نظر آئی نہیں خوبی کچھ اتنی خاص بھی اُس میں
اگرچہ ہم نے ہٹ کر اجتماعِ عام سے دیکھا

بڑی تشویش سے ہم دیکھتے رہتے تھے دُنیا کو
جب آنکھیں ہوگئیں رُخصت، بڑے آرام سے دیکھا

ہُوئی حیرت کہ اب بھی ایسے ایسے لوگ باقی ہیں
سُنیں باتیں جب اُس کی، اور اُس کے کام سے دیکھا

اِسی بے جا تعصب سے، ظفرؔ گڑبڑ ہُوئی ساری
بجائے کام کے سب نے ہمارے نام سے دیکھا

عجب کوئی زورِ بیاں ہو گیا ہوں
رُکا ہوں تو پھر سے رواں ہو گیا ہوں

بہت گرد اُڑنے لگی میرے پیچھے
اکیلا ہی میں کارواں ہو گیا ہوں

سبھی میرے ہونے پہ خوش ہو رہے ہیں
مجھے بھی بتاؤ کہاں ہو گیا ہوں

کنارے نکل آتے ہیں میرے اندر
بہ ظاہر تو میں بے کراں ہو گیا ہوں

کسی کام سے شادماں ہوتے ہوتے
کسی بات سے سرگراں ہو گیا ہوں

کسی کے لیے واقعہ ہوں یہاں پر
کسی کے لیے داستاں ہو گیا ہوں

میں باہر تو محفوظ تھا ہر طرح سے
گھر آیا ہوں اور بے اماں ہو گیا ہوں

جو پڑنے لگی تھی بہت میری قیمت
ہوں شرمندہ، اور رائگاں ہو گیا ہوں

ظفرؔ، کام لوں اب اشاروں سے کب تک
زباں توڑ کر بے زباں ہو گیا ہوں

میں اپنی ہی اب جستجو ہو گیا ہوں
زمانے کے بھر دُو بہ دُو ہو گیا ہوں

کہاں ہیں مرے منتشر کرنے والے
بڑی دیر بعد ایک سُو ہو گیا ہوں

مجھے اپنی ہمّت پہ حیرت نہ ہو کیوں
اچانک ترے رُو بہ رُو ہو گیا ہوں

کہیں رہنے والی مصیبت ہوں یک سر
کہیں بہنے والا لہو ہو گیا ہوں

مرے زخم رہتے ہیں تازہ جو ہر دم
کسی باغ کے رنگ و بو ہو گیا ہوں

ملاقات پر اب اِجارہ ہے میرا
کہ جب میں نے چاہا ہے تُو ہو گیا ہوں

یہاں یہ بھی فی الحال کافی ہے مجھ کو
اگر تکمۂ گفتگو ہو گیا ہوں

یہیں بھیڑ میں کھو گیا تھا کسی دن
میں اپنی ہی اب جستجو ہو گیا ہوں

ظفرؔ، کوئی پانی تھا سیلاب کا میں
جو یوں دَر بہ دَر، کُو بہ کُو ہو گیا ہوں

میں وہ ہو گیا ہوں کہ یہ ہو گیا ہوں
سَو، جو کچھ ہوں، تیرے لیے ہو گیا ہوں

مجھے آپ تو کوئی دعویٰ نہیں ہے
اُسے جا کے پوچھو جسے ہو گیا ہوں

چلا تھا سو کچھ ہو گیا تھا اُسی دم
تو کچھ راستے راستے ہو گیا ہوں

وہی ایک ہوں اور نہیں ہوں گوارا
بھلا میں کوئی چار چھ ہو گیا ہوں

کوئی خاص کر تو نہ تھا میرا ہونا
جہاں اور بھی لوگ تھے، ہو گیا ہوں

بہت میرے ہونے کے بھی منتظر تھے
کوئی مجھ کو آواز دے، ہو گیا ہوں

مجھے اب جہاں بھی کہیں بھیج دے تُو
کہ اب میں تو حاضر ترے ہو گیا ہوں

ترے پاس ہونے کی ہی آرزو ہے
میں اتنا جو تجھ سے پرے ہو گیا ہوں

ظفرؔ میرا انجام ہونا ہی تھا یہ
کہ پہلے بہت وقت سے ہو گیا ہوں

بہت پوچھ بیٹھے ہو کیوں ہو گیا ہوں
میں اب آپ سے کیا کہوں، ہو گیا ہوں

جگہ کوئی خالی ہُوئی تھی کہیں پر
کسی نے تو ہونا تھا، یوں ہو گیا ہوں

مجھے کوئی اعزاز بھی چاہیے ہے
بہت اب تو خوار و زبوں ہو گیا ہوں

کوئی آج ہی منہدم ہونے والی
عمارت ہے جس کا ستوں ہو گیا ہوں

وہ جس دن سے روز آ کے ملنے لگا ہے
میں تب سے بہت بے سکوں ہو گیا ہوں

مَرا ہوں کہ اب تک بہت جی چکا تھا
بہت گھَٹ گیا تھا، فزوں ہو گیا ہوں

زباں ایک چلتی ہُوئی تھی کبھی جو
رگوں میں رُکا کوئی خوں ہو گیا ہوں

کہیں درمیاں میں نہیں ہو سکا میں
دَروں ہو گیا ہوں، بَروں ہو گیا ہوں

ظفرؔ کوئی مانے نہ مانے مجھے اب
کہ مجبور ہوں، کیا کروں، ہو گیا ہوں

میں سُوکھا ہُوا تھا، ہَرا ہو گیا ہوں
ذرا دیکھنا، کیا سے کیا ہو گیا ہوں

کسی بھی طرف جو نکلتا نہیں ہے
کچھ اِس طرح کا راستا ہو گیا ہوں

میں کل تک جو اِس عالمِ آرزو میں
کہیں بھی نہ تھا، جا بہ جا ہو گیا ہوں

جو ٹلتی دِکھائی نہیں دے رہی ہے
سروں پر اک ایسی بَلا ہو گیا ہوں

کہیں پر اٹکتی ہُوئی روشنی سے
کہیں سے گزرتی ہَوا ہو گیا ہوں

کسی بات کی اِنتہا ہوتے ہوتے
اُسی بات کی اِبتدا ہو گیا ہوں

کوئی بندوبست اب تو کرنا پڑے گا
بہت آج کل سرپھرا ہو گیا ہوں

مرے چار سُو تھی جو دیوارِ دُنیا
گرا دی ہے اور اب کُھلا ہو گیا ہوں

بہت شور میں نے مچایا ہُوا تھا
بالآخر، ظَفر بے صدا ہو گیا ہوں

سفر میں ہوں، گردِ سفر ہو گیا ہوں
مبارک ہو سب کو اگر ہو گیا ہوں

نکالا ہے اخبار میں نے بھی اپنا
اور اپنی ہی کوئی خبر ہو گیا ہوں

ہَوا میرے اوپر، ہَوا میرے نیچے
بہت آج زیر و زبر ہو گیا ہوں

اضافہ ہُوا میری مقبولیت میں
کہ جب سے بہت بے اثر ہو گیا ہوں

مجھے کوئی گولائی درکار تھی، اور
اِسی جستجو میں صفر ہو گیا ہوں

بہت سامنے سب کے آتا ہُوا تھا
جبھی آ کے صرفِ نظر ہو گیا ہوں

محبت کوئی روشنی تھی کسی کی
جسے اوڑھ کر دَر بہ دَر ہو گیا ہوں

جو ہوتا تو خود کو دِکھائی بھی دیتا
کہاں ہو گیا ہوں، کدھر ہو گیا ہوں

نکلتا نہیں ہوں، ظفرؔ اس سے باہر
کوئی مستقل اپنا گھر ہو گیا ہوں

ترے آسماں کی زمیں ہو گیا ہوں
ہُوا ہوں تو اپنے تئیں ہو گیا ہوں

ملی ہے جگہ دل میں تھوڑی سی اُس کے
سمجھ لو کہ گوشہ نشیں ہو گیا ہوں

یہاں پر میں ہونا نہیں چاہتا تھا
مگر، ہوتے ہوتے یہیں ہو گیا ہوں

ترے پاؤں پڑنے سے انکار کر دُوں
میں اتنا تو خودسر نہیں ہو گیا ہوں

جہاں مجھ کو ہونے سے روکا تھا اُس نے
نہیں باز آیا، وہیں ہو گیا ہوں

مکاں جس کا نقشہ ابھی بن رہا ہے
میں فی الحال اُس کا مکیں ہو گیا ہوں

توجہ کا طالب ہوں اِس طرح سے بھی
اگر آپ کا نکتہ چیں ہو گیا ہوں

بڑھاپے سے اگلی یہ منزل ہے کوئی
جواں ہو گیا ہوں، حسیں ہو گیا ہوں

اُسے بھی ظفرؔ میری ہمّت ہی سمجھو
کہیں ہو نہ پایا، کہیں ہو گیا ہوں

جو لگ رہا ہے کچھ اِس کے سِوا بھی شامل ہے
مری ہواؤں میں تیری ہوا بھی شامل ہے

ہم آپ تو یہ تباہی مچا نہیں سکتے
ہمارے ساتھ کوئی تیسرا بھی شامل ہے

ہمارے خوابِ طلب میں رواں دواں اکثر
وہ کون ہے جو تمھارے سِوا بھی شامل ہے

لہو میں اب جو وہ گرمی نہیں رہی باقی
کچھ اِس میں تیرا مرا فاصلہ بھی شامل ہے

جو ہے تو اتنا ہی مذکور ہے محبت کا
کہ داستان میں یہ ماجرا بھی شامل ہے

جلوس میں جو یہ پیدا ہے زور شور اتنا
ہجومِ خلق میں شاید خدا بھی شامل ہے

کچھ آپ میں سر و ساماں تھا شاید اپنے تئیں
جو قافلے میں کوئی بے نوا بھی شامل تھا

ہم اہلِ وضع تھے، یہ بھی نہ کر سکے ہیں بیاں
کہ واردات میں تیری رضا بھی شامل ہے

سِوائے اِس کے نہیں اور کوئی بات، ظفرؔ
کہ اتنے شور میں اپنی صدا بھی شامل ہے

●

یہ اُونچ نیچ سبھی زندگی میں شامل ہے
کسی سے دُور ہے دُنیا، کسی میں شامل ہے

وہی تھا سب سے نمایاں تمام لوگوں میں
جو ایک رنگ تری سادگی میں شامل ہے

چُھپی رہے گی ابھی اور سات پردوں میں
وہ دل بری جو تری بے رُخی میں شامل ہے

اسی لیے نکل آتے ہیں اکثر آنسو بھی
اک اور چیز بھی ہے جو خوشی میں شامل ہے

اُسی پہ ہے بسر اوقات آج کل اپنی
جو ایک فائدہ لاحاصلی میں شامل ہے

میں ڈر رہا ہوں کہ آخر مجھے نہ لے ڈوبے
یہ طنطنہ جو مری عاجزی میں شامل ہے

یہ اشتراک تو میری سمجھ سے ہے باہر
کسی کا بھی نہیں وہ اور سبھی میں شامل ہے

کوئی لگائے سُراغ آ کے اِس اندھیرے کا
جو چمچماتی ہوئی روشنی میں شامل ہے

دراصل وہ کہیں موجود ہی نہیں تھی، ظفرؔ
وہ ایک شے جو مری شاعری میں شامل ہے

جو سلسلہ سا تری آرزو میں شامل ہے
وہ پیچ و تاب اِسی رنگ و بو میں شامل ہے

خبر نہیں ہے وہ انکار تھا کہ تھا اقرار
جو لفظ ابھی تک لہو میں شامل ہے

سُراغ اور کسی کا نہ ہو دراصل کہیں
جو صبح و شام تری جستجو میں شامل ہے

ہے ایک ٹوٹا ہُوا ربط ایک مدّت کا
جو غائبانہ ہے اور رُو بہ رُو میں شامل ہے

تمھارا بھیجا ہُوا تازہ اور خنک جھونکا
کچھ ایسے لگتا ہے جس طرح تُو میں شامل ہے

گزر کے آتی ہُوئی جھونپڑوں سے شام و سحر
ہَوا وہی ہے جو اُس کاخ و کُو میں شامل ہے

جو بے کنار ہے اپنے وجود میں اتنا
وہ بحر شاید اِسی آب جُو میں شامل ہے

وہ رنگ اور ہے جو ہے بیان سے باہر
وہ بات اور ہے جو گفتگو میں شامل ہے

کہاں سے اتنا بڑا فرق آ گیا ہے، ظفر
مرا وجود اگر ہُو بہ ہُو میں شامل ہے

فتور سا کوئی جس طرح سر میں شامل ہے
گلی کا تھوڑا سا حصّہ بھی گھر میں شامل ہے

تبھی سے رونقِ دریا ہے زور پر اتنی
کہ جب سے میرا سفینہ بھنور میں شامل ہے

یہ میرے دل کا پرندہ ہے نغمہ خواں جس پر
اک اور شاخ بھی ہے جو شجر میں شامل ہے

مرے بھی سامنے شاید نہیں کوئی منزل
برائے نام سا وہ بھی سفر میں شامل ہے

کہیں نہیں جو نظر آ رہا ہے ظاہر میں
کچھ اور بھی یہاں اِس خشک و تر میں شامل ہے

میں آج بھی اُسے تسلیم کر نہیں سکتا
جو بات خواب سے باہر خبر میں شامل ہے

کسے پتا کہ مری ذات بھی کہیں نہ کہیں
ہوا کی طرح یونہی دربہ در میں شامل ہے

اسی لیے ہوں سزاوار کچھ توجہ کا
جو اتنی بے ہنری بھی ہنر میں شامل ہے

یہ روشنی میں اندھیرے بتا رہے ہیں، ظفرؔ
کہ رات بھی کوئی اپنی سحر میں شامل ہے

دریاؤں کا پانی جو روانی سے نکلتا
کچھ تو ترا کردار کہانی سے نکلتا

کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور نتیجہ
بازارِ تماشا کی گرانی سے نکلتا

مٹّی میں گیا ہے، ہُوا مٹّی سے برآمد
ہوتا ہی جو پانی میں تو پانی سے نکلتا

جاتا میں ترے ایک اشارے ہی سے واپس
گھر سے بھی اگر یاد دہانی سے نکلتا

میں آپ بھی اچھا نہیں سمجھا ہوں، وگرنہ
زندہ ہی ترے عالمِ فانی سے نکلتا

ہوتے کوئی مجھ پر بھی بڑھاپے کے نشانات
میں بھی جو کبھی خوابِ جوانی سے نکلتا

بے نام ہی مرنا تھا مجھے ورنہ کہیں پر
کوئی تو نشاں میری نشانی سے نکلتا

اے کاش وہ ڈوبا ہُوا لفظوں کا سفینہ
اک دن تو کبھی موجِ معانی سے نکلتا

کچھ غور تو کرتے، ظفؔر احباب کسی طور
کچھ تو مری آشفتہ بیانی سے نکلتا

ممکن نہیں آدھے سے تو سارے سے نکلتا
مطلب کوئی پیغام تمھارے سے نکلتا

کہنے سے ترے خلق اگر گھر سے نکلتی
پھر میں بھی ترے ایک اشارے سے نکلتا

میں نے جسے دیکھا ہی نہیں ٹھیک سے اس شام
وہ چاند سرِ بام، دوبارے سے نکلتا

بے کار دُھواں چھوڑتی رہتی ہے محبت
شعلہ بھی کسی روز ہمارے سے نکلتا

پتھر سے شرارے تو نکلتے رہے اکثر
اب کے کوئی پتھر بھی شرارے سے نکلتا

افلاک ہیں اتنے پسِ افلاک تو آخر
ایک اور ستارہ بھی ستارے سے نکلتا

میں ڈُوبتا رہتا تھا بہت بیچ سمندر
لیکن جو نکلتا تو کنارے سے نکلتا

گُم ہو گیا ہوتا کہیں موجوں ہی کے اندر
میں خود نہ اگر خواب کے دھارے سے نکلتا

دھویا گیا ہوتا ظفرؔ ایسا اُسی لمحے
وہ لفظ اگر شرم کے مارے سے نکلتا

جو میرے خانۂ دل میں کبھی مکیں تھا وہ
نہیں بھی تھا تو کم از کم یہیں کہیں تھا وہ

اب آسمان ہُوا ہے تو دُور ہے مجھ سے
کہ اُس سے رابطہ رہتا تھا جب زمیں تھا وہ

رہے یہاں پہ تو سب لوگ ہیں تہی پہلو
کوئی پتا نہ چلا کس کا ہم نشیں تھا وہ

کچھ اتنی بھیڑ میں مجھ کو نظر نہیں آیا
اگرچہ میں جہاں موجود تھا، وہیں تھا وہ

اب اُس کا ذکر بھی کرتا نہیں کوئی مجھ سے
اگرچہ میں ہی تھا موجود اور یہیں تھا وہ

ہے اُس کے ہونے نہ ہونے کا شک مجھے بھی بہت
اگر وہ تھا بھی کہیں، اِس قدر نہیں تھا وہ

کسی نے مان کے ہی شہر میں دیا نہ اُسے
اگر وہ تھا بھی تو بس اپنے ہی تئیں تھا وہ

کہ درمیاں میں ہی ممکن تھا اُس کا ہونا بھی
نہ پیش ازیں تھا یہاں پر نہ بعد ازیں تھا وہ

جسے پلائے رکھا میں نے دل کا دُودھ، ظفرؔ
میں جانتا تھا کوئی مارِ آستیں تھا وہ

انداز اپنے غم کا لگانے تو دے مجھے
خود سے حسابِ خواب چکانے تو دے مجھے

مجھ کو بھی ناپسند ہے اِس دل کی روشنی
یہ آخری چراغ بجھانے تو دے مجھے

شاید ہمیں بھی آن پڑے اِس سے کوئی کام
دُنیا سے رسم و راہ بڑھانے تو دے مجھے

سونا نہیں تو یہ تری مرضی کی بات ہے
بستر پہ اپنا آپ بچھانے تو دے مجھے

اِس عمر میں بھی ساتھ جو دیتی ہے یہ ہَوا
جیسی بھی ہے پتنگ اُڑانے تو دے مجھے

جو ہوگیا ہے میں بھی چھپانے کے حق میں ہوں
جو ہو نہیں سکا ہے بتانے تو دے مجھے

شاید نکل ہی آئے نئی کوئی رہ گزر
دیوار راستے سے اُٹھانے تو دے مجھے

ہیں زندگی کے ساتھ ہی سارے معاملات
دشمن کو ڈوبنے سے بچانے تو دے مجھے

تھک ہار کر اُتار ہی دوں گا اِسے، ظفؔر
بوجھ اپنی دوستی کا اُٹھانے تو دے مجھے

گرتا ہوں بار بار، سنبھلنے تو دے مجھے
جیسا ہوں، اپنی چال سے چلنے تو دے مجھے

میں اور ہی طرف کو چلا جاؤں گا کہیں
کچھ اپنے راستوں سے نکلنے تو دے مجھے

ہوتے ہیں، دیکھ لینا اندھیرے کے اپنے رنگ
ہوں شام شام، رات میں ڈھلنے تو دے مجھے

آ ہی گیا سہی تری آب و ہوا میں جب
موسم کے ساتھ پھولنے پھلنے تو دے مجھے

امکان کوئی مجھ میں ہے کچھ بہتری کا بھی
میں یہ نہیں رہوں گا، بدلنے تو دے مجھے

اس شہر کا بُرا نہیں تکتا ہوں میں کبھی
آئی ہُوئی بلا سہی، ٹلنے تو دے مجھے

مجھ پر سے اپنا پاؤں اُٹھا تو سہی کہیں
چشمہ رُکا ہُوا ہوں، اُبلنے تو دے مجھے

اس گرمیٔ سخن کا تقاضا ہے یہ بھی ایک
اندر کی تھوڑی آگ اُگلنے تو دے مجھے

پروانے بھی کہیں سے چلے آئیں گے ظفرؔ
وہ شمع وار بزم میں جلنے تو دے مجھے

خوش رنگ بادلوں سے گزرتا ہُوا ہوں میں
کیسی بلندیوں سے اُترتا ہُوا ہوں میں

مجھ کو کسی بھی طرح یہ حالت نہیں قبول
جُڑتا ہُوا ہوں اور نہ بکھرتا ہُوا ہوں میں

بے کار بیٹھنا بھی فراغت نہیں کوئی
خوش ہوں جو کوئی کام تو کرتا ہُوا ہوں میں

جھلکی سی اک دِکھاؤں گا اور ڈوب جاؤں گا
اپنے نشیب ہی سے اُبھرتا ہُوا ہوں میں

شاید جڑیں ہی چھوڑ رہا ہوں زمین میں
آخر تو اتنی دیر کا ڈرتا ہُوا ہوں میں

وہ لفظ ہوں کہ میرے معانی ہُوئے ہیں گُم
حالاں کہ بار بار کا برتا ہُوا ہوں میں

کچھ خاص بات بھی نہیں، اور اُس کے رُو بہ رُو
ڈرتا ہوں اور صاف مکرتا ہُوا ہوں میں

دروازہ عام سا ہے کوئی جس کے سامنے
دم بھر کو آتے جاتے ٹھہرتا ہُوا ہوں میں

آتے بھی ہیں خیال تو جاتے بھی ہیں، ظفرؔ
خالی بھی ہو رہا ہوں جو بھرتا ہُوا ہوں میں

آتا ہُوا ہوں یا کہیں جاتا ہُوا ہوں میں
اچھے دنوں کے خواب دِکھاتا ہُوا ہوں میں

جس طرح کا بھی ہوں، مرے دونوں ہی رنگ ہیں
بُھولا ہُوا ہوں، یاد بھی آتا ہُوا ہوں میں

اپنے بھی کھولتا ہُوا پردے دماغ کے
کچھ کچھ اُسے بھی یاد دِلاتا ہُوا ہوں میں

اس واسطے کہ کچھ بھی دِکھائی تو دے مجھے
دُنیا کو سامنے سے ہٹاتا ہُوا ہوں میں

خالص تو میرے ہوتے ہُوئے کچھ رہے گا کیا
چیزوں میں کوئی چیز مِلاتا ہُوا ہوں میں

سب کچھ تو ہوں چھپائے ہُوئے اہلِ شہر سے
اک بات وہ بھی ہے جو بتاتا ہُوا ہوں میں

بارود ہے کوئی مرے اندر بھرا ہوا
ڈرتا ہوں اور سب کو ڈراتا ہُوا ہوں میں

اَوروں کے واقعات کی صورت میں رات دن
اپنی ہی داستان سُناتا ہُوا ہوں میں

گرتا ہُوا ہوں، اور سنبھلتا ہُوا، ظفرؔ
کرتب اسی طرح کے دِکھاتا ہُوا ہوں میں

دُنیا کو چھوڑتا نہ پکڑتا ہُوا ہوں میں
آگے جو اپنے آپ سے بڑھتا ہُوا ہوں میں

اب شکل ہی نہیں مری پہچانتا کوئی
بَن بَن کے اس طرح سے بگڑتا ہُوا ہوں میں

دونوں میں فیصلہ کوئی ہوتا نہیں کہیں
دن رات اپنے آپ سے لڑتا ہُوا ہوں میں

شاید اِس طرح کوئی صورت نکل ہی آئے
مٹّی سا اپنے آپ سے جھڑتا ہُوا ہوں میں

رونق بچی کھچی ہی کوئی آ کے دیکھ جائے
ہوں ایک شہر اور اُجڑتا ہُوا ہوں میں

مجھ میں کمی تو ہوتی ہُوئی کچھ دِکھائی دے
حالاں کہ صبح و شام بِنڑتا ہُوا ہوں میں

اب تو وہ آتے جاتے بھی مِلتا نہیں کبھی
حالاں کہ درمیاں میں ہی پڑتا ہُوا ہوں میں

دیکھو تو ایک یہ بھی تماشا ہے سر بہ سر
اپنی ہوا ہوں، اور اُکھڑتا ہُوا ہوں میں

مجھ پر کوئی اب اِس کا اثر ہی نہیں، ظفرؔ
مِلتا ہُوا ہوں یا کہ بچھڑتا ہُوا ہوں میں

اپنا ہُوا کبھی نہ تمھارا ہُوا ہوں میں
یہ کیسے راستوں سے گزارا ہُوا ہوں میں

کس آسمان کا مجھے دھوکا دیا گیا
یہ کون سی زمیں پہ اُتارا ہُوا ہوں میں

پھرتا تھا موج موج بڑی دُور دُور تک
پانی نہیں رہا تو کنارا ہُوا ہوں میں

بے دخل ہو چکا ترے دل کے مکان سے
یوں بھی نہیں کہ سارے کا سارا ہُوا ہوں میں

چمکا گئی ہیں مجھ کو محبت کی آندھیاں
گردِ گناہ سے ہی سنوارا ہُوا ہوں میں

بھٹکے بہت ہیں رات کے راہی مرے طفیل
اِس طرح کا فلک پہ ستارہ ہُوا ہوں میں

سمجھے نہ دوسروں کو ہی سمجھا سکے کوئی
دُنیا کی خاطر ایسا اشارہ ہُوا ہوں میں

خود ہی نکال دوں گا ہوا اس کی ایک دن
شہرت سے پھول کر جو غبارہ ہُوا ہوں میں

ہے منتظر اک اور زمانہ مرا، ظفرؔ
ایک اور ہی طرف کا پکارا ہُوا ہوں میں

ڈالا ہُوا کہیں نہ نکالا ہُوا ہوں میں
پھر بھی یہاں کِس کا حوالہ ہُوا ہوں میں

مجھ کو کسی سُرنگ میں یوں کر رکھا ہے بند
گویا کہ ہر طرح سے سنبھالا ہُوا ہوں میں

آخر رکھیں گے وصل سے محروم کتنی دیر
کچھ دے دِلا کے آج تو ٹالا ہُوا ہوں میں

چلنا بھی مشکل اور ٹھہرنا بھی ہے محال
اِس طرح اپنے پاؤں کا چھالا ہُوا ہوں میں

کب سے ہے بند مجھ میں در آنے کا راستہ
خود پر لگا ہُوا کوئی تالہ ہُوا ہوں میں

قائم تھا جو پہاڑ کی صورت کبھی یہاں
اُڑنے لگا تو رُوئی کا گالا ہُوا ہوں میں

باقی نہیں ہیں شہر کی آلائشیں کہیں
اہلِ ہنر کا خوب کھنگالا ہُوا ہوں میں

جو کچھ لکھا تھا آج اُسے شوخ کر دیا
عہدِ زیاں کا اپنے ازالہ ہُوا ہوں میں

تعریف اب کریں بھی تو کس منہ سے، اے ظفرؔ
جن کی مخالفت سے دوبالا ہُوا ہوں میں

ہر چند راستے سے ہٹایا ہُوا ہوں میں
کچھ اور طرح سامنے آیا ہُوا ہوں میں

بے شک نکال دے کوئی اِس بزم سے مجھے
آیا نہیں ہوں خود سے، بُلایا ہُوا ہوں میں

وہ راستا ہوں، مجھ سے بھٹکتے بھی ہیں بہت
حالاں کہ بار بار بتایا ہُوا ہوں میں

وہ خرچ کرتا رہتا ہے مجھ کو شبانہ روز
جو کچھ بھی ہوں اُسی کا بچایا ہُوا ہوں میں

اِس خوابِ خامشی کے کنارے پہ آج بھی
ہوں ایک شور، اور مچایا ہُوا ہوں میں

اندر اگرچہ کوئی بُلا ہی نہیں رہا
باہر بڑے اَدب سے بٹھایا ہُوا ہوں میں

اُس کا اَتا پتا ہی بتا دے کوئی مجھے
پیچھے اگر کسی کے لگایا ہُوا ہوں میں

دل پر کسی کے نقش تو رہنا تھا کیا مجھے
دیوارِ شہر سے بھی مٹایا ہُوا ہوں میں

کیوں کر نہ اونے پونے ہی بِک جاؤں، اے ظفرؔ
ہوں مالِ مُفت اور چُرایا ہُوا ہوں میں

جفا و جبر سے ہٹ کر، ستم گری کے بغیر
کچھ اور بھی مجھے دِکھلاؤ اِس ابتری کے بغیر

کبھی کہیں کوئی فرصت ملے تو دیکھ آ کر
یہ اتنے لوگ جو زندہ ہیں زندگی کے بغیر

نہیں ہے پیٹ میں بھوک اور کھائے جاتے ہیں
لنڈھائے جاتے ہیں کیا جام تشنگی کے بغیر

اُس انجمن میں کوئی بیٹھتا نہیں فارغ
کہ ہو رہے ہیں سبھی کام راستی کے بغیر

میں ڈرتا رہتا ہوں اُس وقت سے کہ آخرِ کار
یہ خلق جب نظر آئے گی بے بسی کے بغیر

ابھی یہ ساری تب و تاب اپنے پاس رکھو
ابھی مجھے نظر آتا ہے روشنی کے بغیر

عبث تھی اس میں مِلاوٹ کوئی محبت کی
کہ چل رہے تھے سبھی کام دوستی کے بغیر

یہ حال ہے کہ شب و روز پائے جاتے ہو
کبھی کسی کے بغیر اور کبھی کسی کے بغیر

بہت ہجوم وہاں جمع ہو گیا تھا، ظفرؔ
اور اُس نواح میں رونق تھی آپ ہی کے بغیر

بشر ہوں اور کبھی رہتا نہیں خطا کے بغیر
کچھ آپ نے بھی ہے چھوڑا ہُوا سزا کے بغیر

شفا تو کچھ مری قسمت میں ہی نہیں کب سے
مگر، میں رہ نہیں سکتا ہوں اب دوا کے بغیر

اگرچہ دیر سے خالی پڑا ہُوا ہے یہ دل
میں اُس گلی سے گزرتا نہیں صدا کے بغیر

میں اس لیے کہیں آغاز ہونے والا ہوں
کہ انتہا کہاں ممکن ہے اِبتدا کے بغیر

سفر میں گُم کیے بیٹھے ہیں راستا پھر بھی
گھروں سے نکلے تھے حالاں کہ رہ نما کے بغیر

اسی لیے تو کبھی ڈوب ہی نہیں سکتی
رواں دواں جو یہ کشتی ہے ناخدا کے بغیر

یہ اپنے حال پہ چھوڑی ہُوئی ہے خلقِ خدا
جو مَر رہی ہے یہاں ہر طرف قضا کے بغیر

اسی لیے تو یہ پکڑے بھی جا نہیں سکتے
کہ چور بھی ہوئے اور ہیں بھی نقشِ پا کے بغیر

رُکی تو ساتھ ہی بُجھتا گیا دماغ، ظفرؔ
عجب چراغ ہے، جلتا نہیں ہَوا کے بغیر

یہی ہوا ہوسِ دار و گیر ہو گئی ہے
کچھ اب تو بس کرو، اب تو اخیر ہو گئی ہے

یہ کیفیت کہیں دل دوز ہو نہ جائے کہیں
جو اب تمھارے لیے دل پذیر ہو گئی ہے

یہ ڈال سکتے ہیں دامن پہ ہاتھ بھی کسی وقت
کہ طبعِ خاک نشیناں شریر ہو گئی ہے

نکالنے سے بھی نفرت نکل نہیں سکتی
کچھ اِس طرح جو دلوں میں اسیر ہو گئی ہے

رُکی رُکی سی جو مہلت ہے سانس لینے کی
یہی متاعِ صغیر و کبیر ہو گئی ہے

اب اِس سے کوئی توقع نہ باندھنا جو یہ خلق
تمھارے عیش کی خاطر فقیر ہو گئی ہے

فضول ٹالتے آئے ہو آج تک جس کو
عذاب کی وہ گھڑی ناگزیر ہو گئی ہے

پلٹ کے آ نہیں سکتی کبھی وہ صورتِ حال
نکل چکی ہے کماں سے، جو تیر ہو گئی ہے

جو لوحِ خواب پہ تحریر آرزو تھی، ظفرؔ
پڑے پڑے ہی لہو کی لکیر ہو گئی ہے

پامال یہ جو اپنی لکھائی کا باغ ہے
شاید ہماری عُقدہ کُشائی کا باغ ہے

وہ خاک عرشِ پاک سے کم تر نہیں کہیں
جس پر تمھاری جلوہ نمائی کا باغ ہے

اعداد ہیں سب اُس کے ہی اندر چُھپے ہُوئے
پھیلا ہُوا جو اُس کی اِکائی کا باغ ہے

بے منظری بھی دعوتِ نظارہ ہے تمام
فرقِ نگاہ اُس کی ادائی کا باغ ہے

اُمید و انتظار کے گُل ہیں کِھلے ہُوئے
مہکا ہُوا کسی کی جدائی کا باغ ہے

ایسے ہے جیسے اُس میں خدا کا گزر نہیں
جس حالِ زار میں یہ خدائی کا باغ ہے

اچھائی اِس کے سامنے پھرتی ہے منہ چھپائے
شاداب کس قدر یہ بُرائی کا باغ ہے

کرتا ہوں خود ہی اِس میں مٹرگشت رات دن
فرضی سا ہے جو میری بڑائی کا باغ ہے

اُتنا ہی غم میں سُوکھتا جاتا ہوں اے ظفرؔ
جتنا ہرا بھرا مرے بھائی کا باغ ہے

ہے یوں کہ یہ جو خواب تمہارے کا باغ ہے
قسمت کے تاب ناک ستارے کا باغ ہے

کلیاں کِھلی ہُوئی مرے شیون کی ہیں یہاں
اِس سے زیادہ شور تمہارے کا باغ ہے

دل میں کِھلا بھی ہے، ابھی مُرجھا بھی جائے گا
کیا کیجیے، یہ اُس کے اشارے کا باغ ہے

اندر بھی ہیں بھنور کے مہکتے ہُوئے گلاب
اِس کے علاوہ میرے کنارے کا باغ ہے

ملنے لگی اِسی سے تر و تازگی مجھے
دیوار ہے اور اُس کے سہارے کا باغ ہے

دیکھو یہ رنگ و نور کی اُڑتی ہُوئی جھلک
جتنی بھی دیر کو یہ شرارے کا باغ ہے

معلوم ہے پھل اِس کا کوئی اور کھائے گا
میں جو لگا رہا ہوں خسارے کا باغ ہے

اُڑتی ہے جس میں خاک شب و روز، یہ کسی
اُمید و انتظار کے مارے کا باغ ہے

غارت کیا ہُوا تھا یہ میرا ہی، اے ظفرؔ
اب جو یہ دیکھتا ہوں دوبارے کا باغ ہے

اُس سے بھی تازہ تر یہ برابر کا باغ ہے
یعنی جو میرے باغ کے باہر کا باغ ہے

ہیں زیرِ سطح بھی کئی گلشن کھلے ہُوئے
یہ تو فقط زمین کے اوپر کا باغ ہے

تصویرِ دل میں اور ہی کوئی تھی جاگزیں
کچھ یہ تو اور ہی کسی منظر کا باغ ہے

ایماں کے خارزار ہیں پھیلے ہُوئے بہت
جن سے جُڑا ہُوا بُتِ کافر کا باغ ہے

صحرائے پارسائی سے گزریں تو پھر کہیں
آگے ترے وجودِ معطّر کا باغ ہے

اب تو اِسی میں شام و سحر گشت کیجیے
جس طرح کا بھی یہ جو میسّر کا باغ ہے

گُل پھول، گھاس، پیڑ، پرندے ہیں دم بہ خود
لگتا ہے جیسے یہ کوئی پتھر کا باغ ہے

ہیں دستیاب گرد کی خوشبو، دُھوئیں کے پھول
یعنی یہ عارضی نہیں، دن بھر کا باغ ہے

ہے بند اِس میں داخلہ میرا ہی، اے ظفرؔ
ورنہ کُھلا ہُوا مرے اندر کا باغ ہے

کیا بلبلے ہیں اور روانی کا باغ ہے
کیسا یہ میرے سامنے پانی کا باغ ہے

موجِ صبا جہاں سے رواں ہے تری طرف
سارا یہ مری یاد دہانی کا باغ ہے

جیسے یہ جاوداں ہی رہے گا اسی طرح
کیا دل فریب عالمِ فانی کا باغ ہے

چلتے رہو کہ یہ تو نشانی ہے باغ کی
آگے، بہت ہی آگے نشانی کا باغ ہے

شاید مگر بھی سکتے ہیں اس رنگ و بو سے آپ
لکھا ہوا نہیں جو زبانی کا باغ ہے

آثارِ سبزہ ہیں کہیں پھولوں کے مقبرے
یہ میری یادگار جوانی کا باغ ہے

پھرتی ہے خلق ٹھوکریں کھاتی ہوئی جدھر
کیا سیرگاہ یہ بھی گرانی کا باغ ہے

مُرجھا چکا ہوں کھلنے سے پہلے ہی میں جہاں
دیکھو، یہ میری عجز بیانی کا باغ ہے

ایسی چلی ہے صرصرِ الفاظ، اے ظفر
اُجڑا ہوا رموزِ معانی کا باغ ہے

اپنے ہی آپ سے رہتا ہوں جھگڑتا ہُوا میں
مارنے مرنے کو ہر سمت سے بڑھتا ہُوا میں

چاک سے خود کو اُترنے بھی نہیں دیتا ہوں
وہی بنتا ہُوا ہوں اور بگڑتا ہُوا میں

تُو کسی اور طرف سے جو نکل جاتا ہے
بیٹھا رہتا ہوں تری راہ میں پڑتا ہُوا میں

سر کے بل اتنی ہی اُونچائی سے گرنا ہے مجھے
آج کل جتنی بلندی پہ ہوں چڑھتا ہُوا میں

ڈٹ گیا ہوں کسی ان دیکھے عدو کے آگے
ٹوٹ ہی جاؤں بھلے ایسے اکڑتا ہُوا میں

رونے دھونے میں ہی کٹتے ہُوئے دن رات مرے
اسی پانی میں ہوں گلتا ہُوا، سڑتا ہُوا میں

جانتا تھا مرا انجام یہی ہونا ہے
صلح کے بعد جو مارا گیا لڑتا ہُوا میں

آسماں تک مجھے پرواز کا سودا ہے، مگر
رفتہ رفتہ اسی مٹّی میں ہوں گڑتا ہُوا میں

شہر ہوں اور ظفرؔ، کثرتِ آبادی سے
تھوڑے عرصے میں ہی لگتا ہوں اُجڑتا ہُوا میں

زاہد کو شراب دے رہا ہوں
اَندھے کو کتاب دے رہا ہوں

جو رَنج اُٹھا نہیں چکا ہوں
اُس کا بھی حساب دے رہا ہوں

بڑھتا گیا اور بھی اندھیرا
ایسی تب و تاب دے رہا ہوں

مجھ سے جو سوال ہی نہیں تھا
میں اُس کا جواب دے رہا ہوں

باندھی ہے اُمیدِ وصل پھر سے
خود کو یہ عذاب دے رہا ہوں

خود ننگ دھڑنگ ہوں سرِ راہ
اور، درسِ حجاب دے رہا ہوں

ہر روز چلاؤں گا ہوا میں
تلوار کو آب دے رہا ہوں

اچھا تو خراب کر دیا ہے
اچھے کو خراب دے رہا ہوں

دے کر، ظفرؔ آندھیوں کو دعوت
خیمے کو طناب دے رہا ہوں

کیا خوف ہے اِس کو کہ جھجکتا ہے اندھیرا
کیا کیا مرے رستے میں اٹکتا ہے اندھیرا

یہ صبح سے پہلے کی ہے بس آخری کروٹ
بجھنے پہ جب آئے تو بھڑکتا ہے اندھیرا

آثار ہی جب روشنیوں کے نہیں باقی
پھر کس لیے ہر سمت لپکتا ہے اندھیرا

باہر کے اندھیرے کی مجھے پوچھتے کیا ہو
اب تو مرے اندر بھی دھڑکتا ہے اندھیرا

پھولوں سے لدی نیند میں لے جاتا ہے مجھ کو
کانٹا سا مرے دل میں کھٹکتا ہے اندھیرا

جس وقت کبھی موج میں ہو اِس کی روانی
کچھ رات سے باہر بھی چھلکتا ہے اندھیرا

گزرے ہوئے لمحوں میں بدلتا ہُوا ملبوس
دیکھی ہوئی راہوں میں بھٹکتا ہے اندھیرا

یہ کون سفر کرنے لگا ہے مری جانب
کیوں اتنا اندھیرے میں چمکتا ہے اندھیرا

ہوتے ہیں ستارے بھی، ظفرؔ، کُوچ کو تیار
جب صبح کی جالی سے جھلکتا ہے اندھیرا

ہر شام جہاں شہر میں پڑتا ہے اندھیرا
لگتا ہے مری سمت ہی بڑھتا ہے اندھیرا

شکلیں سی بدلتا ہے جو شب بھر مرے آگے
دراصل تو بنتا نہ بگڑتا ہے اندھیرا

دیکھو تو کسی خواب کی خاموش ہَوا میں
پتّوں کی طرح پیڑ سے جھڑتا ہے اندھیرا

کس طرح بھگو دیتا ہے ساری مری ہستی
ہر لحظہ فلک سے جو نچڑتا ہے اندھیرا

وہ صورتِ احوال ہے، کچھ کہہ نہیں سکتے
سیڑھی سے اُترتا ہے کہ چڑھتا ہے اندھیرا

میں اِس سے نکلنے کے لیے زور کروں تو
کچھ دیر مرے ساتھ اُدھڑتا ہے اندھیرا

لگتا ہے کہ بے دست و گریباں ہی کسی سے
ہر روز لڑائی کوئی لڑتا ہے اندھیرا

میں آپ ہی معدوم سا ہو جاتا ہوں تا صبح
حالاں کہ سمجھتا ہوں نبڑتا ہے اندھیرا

جب ٹوٹ رہے ہوں مرے اندر کے ستارے
اُس وقت، ظفرؔ، زور پکڑتا ہے اندھیرا

دن بھر مرے اندر جو اُترتا ہے اندھیرا
ایک اور اندھیرے سے گزرتا ہے اندھیرا

میں چاہتا ہوں اُس سے کوئی بوسۂ روشن
اور، میری ہتھیلی پہ وہ دھرتا ہے اندھیرا

اِس طرح سے اُلجھی ہے سیاہی میں سفیدی
مجبور ہے، جیتا ہے نہ مرتا ہے اندھیرا

رُکتی ہوئی راہوں پہ رواں رہتا ہے یک سر
چلتے ہوئے پانی پہ ٹھہرتا ہے اندھیرا

ہے دوسری جانب بھی وہی رات کی رنگت
میں نے جو کئی مرتبہ پرتا ہے اندھیرا

تاثیر ہے ویسی ہی، وہی تازگی اِس کی
میں نے بھی کئی بار تو برتا ہے اندھیرا

دیکھو تو اشارے بھی ہیں کچھ اُس کی ادا میں
سمجھو تو کوئی بات بھی کرتا ہے اندھیرا

خود سے جو کسی وقت میں ہو جاتا ہوں خالی
تب مجھ کو ترے خواب سے بھرتا ہے اندھیرا

پھیلے ہوئے اطراف میں رُکتی ہے، ظفرؔ، شام
سمٹی ہوئی دنیا میں بکھرتا ہے اندھیرا

چل دوں تو مرے ساتھ ہی چلتا ہے اندھیرا
کیسا یہ اندھیرے سے نکلتا ہے اندھیرا

باہر بھی بکھر جاتی ہے اک چادرِ تاریک
جس دم مرے اندر سے اُچھلتا ہے اندھیرا

اپنی ہی کوئی آگ ہے اِس کے کہیں اندر
اور، اُس میں شب و روز پگھلتا ہے اندھیرا

مٹنے بھی لگیں رات کے آثار تو اپنی
اُس وقت ہی پوشاک بدلتا ہے اندھیرا

جب سوچ سیاہی میں بدل جائے سراسر
ایسے میں ہی کچھ پھولتا پھلتا ہے اندھیرا

اکثر مرے اندر اُتر آتی ہے کوئی دُھند
اکثر مری آنکھوں میں اُبلتا ہے اندھیرا

نکلا ہُوا ہوں گھر سے کسی دن کی طلب میں
تنہا مرے آنگن میں ٹہلتا ہے اندھیرا

اِس شامِ جدائی میں تری صبح کی خاطر
میں اور مرے ساتھ مچلتا ہے اندھیرا

حیرت سے، ظفرؔ، دیکھتا ہوں شہر کو اکثر
کیا روشنیاں ہیں جہاں پلتا ہے اندھیرا

اندر ہے اندھیرا، مرے باہر ہے اندھیرا
اتنا کہ مری سوچ سے بڑھ کر ہے اندھیرا

اِس بوجھ سے آزاد کرے گا کوئی آ کر
سینے پہ سلگتا ہے جو پتھر ہے اندھیرا

سمجھے کوئی کیا، کچھ نہیں دیتا ہے سُجھائی
دیکھے کوئی کیا، سامنے منظر ہے اندھیرا

ایسا تو کرشمہ کبھی تھا ہی نہیں پہلے
نیچے کوئی جھلمل ہے تو اُوپر ہے اندھیرا

کچھ دور سے بھی دیکھنا ممکن نہیں اب تو
چھٹتی نہیں یہ دُھند، سو دن بھر ہے اندھیرا

ہیں چہرے کے پہلو میں ہی گیسوئے شب آثار
کیسا یہ اُجالے کے برابر ہے اندھیرا

کرتے ہیں وہ کیوں دن میں جو ہو سکتے نہیں کام
موجود ہے جب رات، میسّر ہے اندھیرا

جیسے کہ فلک چھوڑ کے آیا ہُوا ہو چاند
کمرہ ہے منوّر، مری چھت پر ہے اندھیرا

دیکھیں تو، ظفرؔ، بات عقیدت کی ہے ساری
کب سے مرا ایماں یہی کافر ہے اندھیرا

کوئی بھی شے کسی شے سے نکال سکتا ہوں
کسی بھی شے میں کوئی چیز ڈال سکتا ہوں

ہیں دوسرے شرفاء میری دستبرد سے دُور
ابھی تو اپنی ہی پگڑی اُچھال سکتا ہوں

تمھاری یاد کہیں پر پڑی نہ رہ گئی ہو
میں اپنا آپ کسی دن کھنگال سکتا ہوں

ہمیشہ تو نہیں محتاج میں اِن آنکھوں کا
ٹٹول سکتا ہوں اور دیکھ بھال سکتا ہوں

نشے میں ہوں مگر اتنا بھی ناتواں نہیں میں
سو گرتے گرتے تجھے بھی سنبھال سکتا ہوں

اگر پسند نہیں ہے یہ کاروبار تو میں
تجھے اک اور بھی سانچے میں ڈھال سکتا ہوں

یہ دل کی آگ ترے کام کی نہیں ہے اگر
میں اِس سے اپنا لہو تو اُبال سکتا ہوں

لگی ہوئیں سبھی بیماریاں بہت مجھ کو
میں تیرا روگ بھی کچھ روز پال سکتا ہوں

جمے ہوئے ہیں مرے پاؤں اِس زمیں پہ، ظفرؔ
میں سر پہ آئی مصیبت بھی ٹال سکتا ہوں

ترمیم

حُسین مجروح کے نام

میں اگر اُس کی طرف دیکھ رہا ہوں تو ظفرؔ
اپنے حصّے کی محبت کے لیے دیکھتا ہوں

ظفؔر اقبال صاحب

سلیم کوثر

جنوری ۱ 2016ء

ظفر اقبال صاحب اُردو شاعری میں غزل آشنائی کی روایت کا بانکپن ہی نہیں، ایک وقار آفریں موسم بھی ہیں۔ لسانی تشکیلات کی پیچیدہ راہداریوں سے لے کر نئی غزل کے ظاہری اور باطنی حسن کو آئینہ دار بنانے میں اُن کی لگن دیدنی ہے۔ یہ بات بہت سے غزل لکھنے والوں کے بارے میں کسی اور طرح سے کہی جا سکتی ہے مگر غزل سے ہمکناری کی رُتوں میں غزل کے دو مصرعوں یا پوری غزل سے اتفاقاً ملاقات ہو جانے اور غزل کو اپنے حصار میں لیے رہنے کا فرق ایک اور طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہونے کا ادراک ہے۔ ظفؔر اقبال صاحب غزل کو اپنے حصار میں لیے ہوتے ہیں۔ ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب غزل مختلف الزامات کی زد پر رہی مگر یہ زندہ رہی، اس کے ختم ہونے کی نوید سنا دی گئی مگر یہ قائم رہی، ایسی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ صدائیں ایسی سخن ساز فیکٹریوں سے بلند ہو رہی تھیں یا ہیں، جن میں کام کرنے والے اپنے اندر پھیلی ہوئی بوسیدگی پر نگاہ کرنے کو تیار ہی نہیں، اس کا اندازہ اُن کا مجموعۂ کلام پڑھنے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ایسے تمام زمانوں میں ان غیر تخلیقی آوازوں کی سازشوں کو محسوس کرتے ہوئے جن شعراء نے اُردو غزل کو آبرومندانہ اعزاز کے ساتھ مسلسل اعتبار فراہم کیا۔ ظفؔر اقبال صاحب اُن میں شامل اور اپنے تجرباتی حوالے سے اُن سے الگ صفِ اوّل کے غزل گو شاعر ہیں۔ اُنھوں نے غزل کے وسیع اور اس کے ممکنہ تخلیقی زاویوں کو جمالیاتی رویوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نہ صرف اس کا شعری اظہار کیا بلکہ اپنی نثری تحریروں میں جو دُنیا دریافت کی اور اُس کا حال احوال

بیان کیا، اس اہم دستاویز پر صرف انھیں کے دستخط موجود ہیں۔ ہر دہائی کے لکھنے والوں نے انھیں اپنے قریب جانا، یا وہ اُن کے قریب رہے اور یوں اُن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اور گراف بڑھتا چلا گیا۔

جدید غزل کی لامحدود وسعتوں میں ایسے علاقے بھی ہیں جو بہت سے لکھنے والوں کے لیے ممنوعہ رہے ہیں یا تو اُنھوں نے جاننا ہی نہیں چاہا یا وہ ہمت ہی نہیں کر پائے یا پھر اُن علاقوں کی آب و ہوا، اُن کے مزاج کے خلاف رہی وجہ جو بھی ہو، وہ اُدھر نہیں گئے۔ ظفر اقبال صاحب غزل کے ایسے تمام علاقوں میں ایک مستقل رہائشی کی طرح آتے جاتے ہیں اور اپنے تجربات، نئی لفظیات، نئے فکری در و بست کے ساتھ اُردو شاعری کے صفحات پر غزل کے باب میں درج کرتے رہتے ہیں۔ اُن کا انفرادیت کا ایک دریچہ اُن ممنوعہ علاقوں کی سیر گاہیں بھی ہیں، وہ ایک حیرت انگیز غزل لکھنے والے ہیں جو عمر کے اس حصے میں بھی ہر طرح کی اعلیٰ غزل لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُن کے آس پاس دوسرا اُن کا ہمعصر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے ظفر اقبال صاحب کی وہ شاعری اچھی لگتی ہے، پیار کرتا ہوں میں اُن کی شاعری سے جو زندگی کی ماورائی حقیقتوں کا بھید کھولتی ہوئی، جذبوں کی تلاطم خیز لہروں میں والہانہ رقص کرتی ہوئی، دلوں کو سیراب کرتی ہے، حیرت کے نئے دریچوں کو وا کرتی ہے اور دیدہ و نادیدہ موسموں کی جمالیات کا کہیں واضح، کہیں چھپا ہوا منظرنامہ ہے جو آپ کو محسوساتی سطح پر ایک مختلف تجربے سے آشنا کرتا ہے۔

ظفر اقبال صاحب اُردو غزل کے ایسے فاتح ہیں جن کے قبضے میں سب سے زیادہ زرخیز، لہلہاتی زمینیں ہیں جس پر وہ حکمرانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے اُردو غزل کو جس طرح سنورا، باوقار بنایا (اور جس طرح اُسے بگاڑا، کہ یہ بھی سنوارنے کا حسن ہے) اس عمل نے اُنھیں غزل آشنائی کی مرکزی شخصیت کے طور پر اُبھارا ہے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کے اتنے بہت سے پہلودار رویوں کی خبر فراہم کی ہے۔ جس نے اُردو شاعری کے دامن کو بہاریہ رُتوں سے بھر دیا ہے۔

بہت سے نقادوں نے اُن کی ایسی شاعری (جو مجھے بھی بھلی نہ لگتی ہو مگر مجھے یاد بہت ہے) کی حمایت میں بہت کچھ لکھا ہے مگر اس سلسلے میں سب سے جاندار اور مضبوط تحریریں وہی ہیں جو فکری اور عملی دلائل کے ساتھ خود ظفر اقبال صاحب کے قلم سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ویسے

شاعری میں کوئی علاقہ بھی ممنوعہ نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس فضا میں آپ کی اُفتادِ طبع کیا گل کھلاتی ہے اور آپ ایک نئے تجرباتی نظام کا حصہ کیسے بنتے ہیں اور دوسرے کس طرح اس میں شریک ہوتے ہیں یا آپ کی تخلیقی گرفت اُنھیں کس طرح اپنے قریب کرتی ہے۔

ہر عہد کے لکھنے والوں نے اپنے عہد میں اُٹھنے والے سوالات کے جوابات (جیسا اُنھوں نے جانا سمجھا) تحریری اور مکالماتی دونوں سطح پر دیئے ہیں۔ خواہ وہ اُن کے اپنے خلاف ہوں یا کسی بڑے یا چھوٹے ادبی مسئلے پر بحث کے طور پر سامنے آتے ہوں۔ ظفؔر اقبال صاحب ایسے ہی سچے، کھرے اور زیرک اور ذہین شاعر ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں اُٹھنے والے بے شمار اختلافی سوالوں کے جواب شاعری کے اعلیٰ نقاد کے طور پر ہمیں فراہم کیے ہیں۔ اُن کی انفرادیت کا ایک رخ یہ بھی ہے۔

وہ زندگی سے لبریز اور غزل شناسی سے بھرپور شاعر ہیں۔ تقریباً ستر برس سے غزل لکھنا، اچھا لکھنا، بہت اچھا لکھنا اور ''اب تک'' لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اِس کے لیے ظفؔر اقبال ہونا پڑتا ہے۔ میں نے ایک بار اُن کے بارے میں منعقدہ تقریب میں کہا تھا، اُردو غزل ظفر اقبال صاحب کے رحم و کرم پر آ گئی ہے۔ اُنھوں نے سلوک اُس کے ساتھ بڑی بے رحمی کا روا رکھا ہے، شاید اُسے سدھارنے، نکھارنے، بنانے اور تازہ دم رکھنے کا یہی راستہ ہو، تاکہ یہ سخت جان ہرجائی صنفِ سخن کسی کی تو ہو کر رہے لیکن اب سوچتا ہوں، کیا اُردو غزل کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ آپ اُن کے نئے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کیجیے اور غور کیجیے کیا یہ ممکن ہے اور اگر ہے تو کیسے؟

◆◆◆

ظفر اقبال کی شاعری

اختر عثمان

بڑی شاعری اپنی نہاد میں تہذیب خوانی اور تہذیبی مکالمہ ہے، تہذیبوں کے درمیان بھی اور ایک تہذیب میں بھی۔ یہ شاعری ہمیشہ ایک Outlook World رکھتی ہے۔ نظریہ سازی سے اس کی جمالیات متاثر نہیں ہوتی بلکہ یہ جمالیاتی شعور کی توسیع کرتی ہے اور پہلے سے موجود حد بندیوں کو توڑتی ہے۔ یوں کہیے کہ بڑی شاعری مشکل وقتوں میں اپنے قاری کے لیے زندگی کی ڈھارس ہے جو ڈھب سے جینے اور زندگی کرنے پر اُکساتی ہے۔ جوں جوں اس پر وقت گزرتا ہے، یہ اور نکھرتی ہے۔

ظفر اقبال عمدہ شاعر ہیں اور جرأت مند فنکار بھی۔ انھوں نے ''آبِ رواں'' جیسی اچھوتی کتاب لکھنے کے بعد لسانی بنیادوں پر شاعری کو توسیع دینے کی کوشش کی۔ اس سعی میں وہ بار بار لڑکھڑائے لیکن انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، نہ شاعری میں نظریہ سازی کی طرف توجہ دی۔ وہ بس شعر کہتے ہیں اور اچھے شعر کہتے ہیں۔ صرف شعر ہی نہیں، انھوں نے نثر کے بھی انبار لگا دیے اور اپنی رائے میں لگی لپٹی نہیں رکھی۔ آج کتنے شاعر ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ یہی ظفر اقبال کی منزل بھی ہے اور راستہ بھی:

جہاں جہاں مرے عیبوں کی آندھیاں ہیں ظفر
وہیں میں لے کے چراغِ ہنر بھی آتا ہوں

◆◆◆

غبارِ غربت میں بھی وطن سے مِلے ہُوئے ہیں
کہ یہ بیاباں کسی چمن سے مِلے ہُوئے ہیں

کوئی بھی موسم ہو، تازہ تر ہے مہک ہماری
کہ ہم کبھی ایک گُل بدن سے مِلے ہُوئے ہیں

ہمارا مِل بیٹھنا یہی ہے کہ ہم کسی سے
اگر مِلے ہیں تو سوئے ظن سے مِلے ہُوئے ہیں

کبھی جو بیٹھے تو ہے خبر ایک دوسرے سے
جو سچ کہیں تو اِسی مِلن سے مِلے ہُوئے ہیں

ہمارے اندر ہی اب ہیں موجود بھیڑیئے بھی
کہ شہر پھیلے تو جا کے بَن سے مِلے ہُوئے ہیں

یہ ہم جو اک دوسرے سے بدظن ہیں، او رشا کی
ہمیں یہ تحفے اُس انجمن سے مِلے ہُوئے ہیں

اب اور محفوظ کیا ہو یہ جان و مال اپنا
کہ جو محافظ ہیں راہ زن سے مِلے ہُوئے ہیں

سفید پوشی ہماری اتنی سی ہے کہ اپنے
لباس جیسے بھی ہیں، کفن سے مِلے ہُوئے ہیں

ہُنر کوئی تھا تو ہاتھ اِس سے بھی دُھو چکے ہم
ظفرؔ یہاں شاید اہلِ فن سے مِلے ہُوئے ہیں

گُل و سمن سے نہ رنگ و بو سے لگے ہُوئے ہیں
ابھی تو ہم صرف گفتگو سے لگے ہُوئے ہیں

نہیں لگے تھے تو ہم نہیں تھے کسی بھی جانب
جو لگ گئے ہیں تو چار سُو سے لگے ہُوئے ہیں

کبھی کوئی موج اُچھل بھی سکتی ہے اپنی جانب
اِسی لیے تو کنارِ جُو سے لگے ہُوئے ہیں

یہیں کہیں اپنے آپ کو گُم کیا ہُوا ہے
سَو، آج اپنی ہی جستجو میں لگے ہُوئے ہیں

چلو، ہمارا نہیں، کسی کا تو ہے جو اب تک
سڑک پہ بکھرے ہُوئے لہو سے لگے ہُوئے ہیں

یہ نرم کوشی ہماری حد سے بڑھی ہُوئی تھی
اِسی لیے ایک تُند خُو سے لگے ہُوئے ہیں

یہ ناتوانی ہماری جیسی بھی تھی، مگر ہم
یہ دیکھیے، کیسے دُو بہ دُو سے لگے ہُوئے ہیں

ہر آن ذلت ہے اور رُسوائی ہے شب و روز
سَو، کام ہے جس پہ آبرو سے لگے ہُوئے ہیں

ظفرؔ، ابھی ٹھیک سے ہمیں بھی خبر نہیں ہے
کہ آج کل کس کی آرزو سے لگے ہُوئے ہیں

الگ الگ اور جا بہ جا میں پڑے ہُوئے تھے
ہَوا کے ٹکڑے ابھی ہَوا میں پڑے ہُوئے تھے

کوئی ملاقات کی سہولت، کوئی محبت
یہ مرحلے سب مری دعا میں پڑے ہُوئے تھے

پہنچ گئی ہے کہاں سے دُنیا کہاں، مگر ہم
یہاں اُسی وعدۂ وفا میں پڑے ہُوئے ہیں

نہ جانے کیوں وہ بھی اپنی ضد پر اَڑا ہُوا تھا
سَو، ہم بھی اپنی کسی اَنا میں پڑے ہُوئے تھے

ہمیں خبر تھی کہ اُس کی تعبیر کیا ہے. پھر بھی
ابھی اُسی خوابِ خوش نما میں پڑے ہُوئے تھے

زمین پر تھا اِسی طرح قصۂ زمیں بھی
خلا کے احوال بھی خلا میں پڑے ہُوئے تھے

ہمیں عبث ڈھونڈتی تھی دُنیا، وگرنہ ہم بھی
یہیں کہیں خیمۂ خدا میں پڑے ہُوئے تھے

جنھیں کبھی کوئی آنکھ بھر کر نہ دیکھ پایا
کچھ ایسے منظر ابھی فضا میں پڑے ہُوئے تھے

ظفرؔ، اِنھیں کھولنے کو بھی وقت چاہیے تھا
کہ پیچ ایسے مری نوا میں پڑے ہُوئے تھے

ظفرؔ، یہ کس طرح کے سفر میں پڑے ہُوئے ہیں
کہ ایسے لگتا ہے جیسے گھر میں پڑے ہُوئے ہیں

نکل تو آئے ہیں شہر سے ہم کسی بہانے
یہی بہت ہے کہ رہ گزر میں پڑے ہُوئے ہیں

چُھپا ہُوا ہے جہاں پہ اعلان مختصر سا
ہم اپنے مرنے کی اُس خبر میں پڑے ہُوئے ہیں

سمجھ سکو تو نہاد میری بھی ہے انھی پر
وہ خاک پارے جو دشت و در میں پڑے ہُوئے ہیں

وہیں پہ ہر چیز ہے جہاں ہونا چاہیے تھی
فساد خوں میں، فتور سر میں پڑے ہُوئے ہیں

کسی کو پروا نہیں کسی کی، مگر ہم ایسے
جو ڈر رہے تھے یہاں خطر میں پڑے ہُوئے ہیں

یہ خاک ہے اور زور کرتی ہُوئی روانی
کئی سفینے ابھی بھنور میں پڑے ہُوئے تھے

میں آج تک بھی الگ نہیں کر سکا ہوں اُن کو
جو عیب ہیں اور مرے ہنر میں پڑے ہُوئے ہیں

جو بجلیوں کے رہے، ظفرؔ، منتظر ہمیشہ
وہ آشیانے ابھی شجر میں پڑے ہُوئے ہیں

جہاں پہ ہونا نہیں، وہیں سے لگے ہُوئے ہیں
کہ آسماں پر ہیں اور زمیں سے لگے ہُوئے ہیں

یہ پھول ہم نے چُنے ہُوئے ہیں کسی چمن سے
یہ زخم شاید ہمیں یہیں سے لگے ہُوئے ہیں

میں خود تو پندار اپنا قائم رکھے ہُوئے تھا
ہزار سجدے مری جبیں سے لگے ہُوئے ہیں

تمھارا چہرہ کہ دیدنی اب ہُوا ہے جا کر
تمھارے پیچھے تو قبل ازیں سے لگے ہُوئے ہیں

جو ایک پل میں جھلک دِکھا کر پلٹ گیا تھا
سَو، ہم کسی خوابِ واپسیں سے لگے ہُوئے ہیں

سمجھ رہے ہیں کہ رابط ہے اُستوار، یعنی
مکاں سے باہر ہیں، اور مکیں سے لگے ہُوئے ہیں

جہاں بھی ہو اب ہمارا ٹوٹا ہُوا سفینہ
ہم اپنے اسبابِ تہ نشیں سے لگے ہُوئے ہیں

یہ کام اپنا ہے، جس قدر بھی ہے، اور جس میں
لگے ہُوئے ہیں جہاں کہیں سے لگے ہُوئے ہیں

ظفرؔ، اگر کوئی خار و خس ہیں تو کس لیے ہم
ہم اپنی آوازِ آتشیں سے لگے ہُوئے ہیں

چراغ تھے جس قدر ہوا سے مِلے ہُوئے تھے
یہاں تو کُفّار بھی خدا سے مِلے ہُوئے تھے

ابھی وہی فاصلہ تھا شہروں سے جنگلوں کا
مگر، یہ پھر بھی جگہ جگہ سے مِلے ہُوئے تھے

ندی کے ہم ایسے دو کنارے تو تھے، مگر یہ
کہیں کہیں پر ذرا ذرا سے مِلے ہُوئے تھے

اِسی میں شامل تھا میری جانب نہ دیکھنا بھی
یہ سارے حیلے تری حیا سے مِلے ہُوئے تھے

مرے ستارے سے دُور کب تھا ترا ستارہ
ترے خلا بھی مرے خلا سے مِلے ہُوئے تھے

میں اندر اندر ہی اپنے تجھ کو پکارتا تھا
ترے سلیقے مری صدا سے مِلے ہُوئے تھے

دلوں میں ویسے تو ایک فرق آ گیا تھا، لیکن
الگ الگ بھی جدا جدا سے مِلے ہُوئے تھے

کسی بھی کوشش سے تیرے دریا کا رُخ نہ بدلا
اگرچہ آپس میں سارے پیاسے مِلے ہُوئے تھے

ظفرؔ، ارادے ہمارے اُس کے کہیں کہیں پر
کسی اجازت، کسی رضا سے مِلے ہُوئے تھے

یہ موت ہے یا کہ زندگی میں پڑے ہوئے ہیں
کسی سے باہر ہیں اور کسی میں پڑے ہوئے ہیں

ہمارے سر سے گزرنے والا ہے رنگ پانی
جو ہم یہاں اپنی سادگی میں پڑے ہوئے ہیں

سو، لطف یہ ہے وہی کسی کو نظر نہ آئے
کہ جو یہاں تیز روشنی میں پڑے ہوئے ہیں

ابھی سے گزرے گا کوئی تازہ ہوا کا جھونکا
یہ اتنے رَخنے جو دوستی میں پڑے ہوئے ہیں

لباس کی طرح سے ارادہ بدل لیا ہے
کہ جو ابھی میں تھے، اب کبھی میں پڑے ہوئے ہیں

یہی محبت ہے آئے دن کی کوئی مصیبت
نکل کے پہلی سے دوسری میں پڑے ہوئے ہیں

وہ آپ نے ہمیں جس گڑھے سے نکالنا تھا
کئی زمانوں سے ہم اُسی میں پڑے ہوئے ہیں

پنپ رہی ہے کوئی ابتری سی ہے اندر اندر
کہ ہم بہ ظاہر تو بہتری میں پڑے ہوئے ہیں

ظفر، ہر اک شے سے جیسے برکت ہی اُٹھ گئی ہو
بہت زیادہ کسی کمی میں پڑے ہوئے ہیں

اگرچہ ہم لوگ داستاں میں پڑے ہُوئے ہیں
مگر ابھی معرضِ بیاں میں پڑے ہُوئے ہیں

زمین پر ہیں نہ آسماں میں پڑے ہُوئے ہیں
نہیں بھی ہیں اور ترے جہاں میں پڑے ہُوئے ہیں

گریں، مگر واپس آسماں کو پلٹ گئی تھیں
جو بجلیوں کے پر آشیاں میں پڑے ہُوئے ہیں

ابھی کسی راہ زن کا ہے انتظار ہم کو
ابھی جو کچھ دن تری اماں میں پڑے ہُوئے ہیں

ہماری ہستی بھی عکس ہے تیری نیستی کا
کہ وہم ہیں، اور ترے گماں میں پڑے ہُوئے ہیں

کچھ اِس نہ ہونے ہی میں تھا جیسے ہمارا ہونا
ہمارے نقشے اِسی نشاں میں پڑے ہُوئے ہیں

نظر ہی پڑتی نہیں خریدار کی تو ہم پر
کچھ اس طرح سے کسی دُکاں میں پڑے ہُوئے ہیں

ابھی جو تعمیر ہونے والا ہے اپنی خاطر
سو، ہم ازل سے اُسی مکاں میں پڑے ہُوئے ہیں

زمین سے بھی ظفرؔ، نظر آنا چاہییں تھے
مرے ستارے جو کہکشاں میں پڑے ہُوئے ہیں

♦

مولی سے مونگرے نکل آئے
سو بھی سب سے ہرے نکل آئے

تھی نہ دیوار تو کہیں، لیکن
پھر بھی کچھ آسرے نکل آئے

اُدھڑی ہے شعر کی سڑک ایسی
نیچے سے کنکرے نکل آئے

آتا ہے شور یہ کہاں سے اب
زندہ تو سب مَرے نکل آئے

ہمتیں تو کھو چکی تھیں ہی ساری
کیسے وہ بھی ورے نکل آئے

ڈوبے تھے ساتھ ہی مرے، لیکن
مجھ سے اتنا پَرے نکل آئے

گندم بوئی تھی ہم نے لیکن
مکئی اور باجرے نکل آئے

دُنیا تو عقل مند تھی ہی ساری
عاشق ہی باورے نکل آئے

رستے تو بند تھے، ظفر سارے
کس سمت سے ہم، ارے نکل آئے

گھر سے جو ڈری ڈری نکل آئی
میں تو سمجھا پری نکل آئی

بوسہ سمجھا تھا میں بھی جس کو
آخر ہم بستری نکل آئی

باہر سے مستقل لگی تھی، لیکن
اندر سے سرسری نکل آئی

ظاہر کو تیرے اصل سمجھے آخر
جازم کھینچا، دری نکل آئی

آنکھوں نے کھا لیا ہے پھر سے دھوکا
خشکی جو تھی تری نکل آئی

دیکھیں گے آر پار ہم سب کچھ
دیوار میں ہی جھری نکل آئی

جامد تھی زندگی بہ ظاہر کتنی
لیکن کیا تھرتھری نکل آئی

چوما تھا پھول ہی سمجھ کر ہم نے
اندر سے تیتری نکل آئی

بلوا بھیجا ظفر، کسی نے ہم کو
اپنی بھی لاٹری نکل آئی

موسم کا پینترہ نکل آیا
بادل جو ہٹے، گھرا نکل آیا

اُوپر سے سیب لگ رہا تھا جو
اندر سے سنگترہ نکل آیا

پت جھڑ کے بعد کیا بہار آئی
پیلے سے کیا ہرا نکل آیا

کٹوا کر ناک جونہی دیکھا میں نے
نیچے سے نرخرہ نکل آیا

تشدید ہٹا کے دیکھتے تھے سب
چھرّہ جو تھا چھرا نکل آیا

واپس پھر جا نہیں سکا ہرگز
گھر سے جو میں ذرا نکل آیا

میں خود تو بند ہی رہا لیکن
کچھ مجھ سے ماورا نکل آیا

آگے جانا نہیں پڑا ہم کو
شیخو ہی سنگھرہ نکل آیا

حیران ہی کر گیا ظفرؔ، وہ سب کو
خالی تھا، بھرا بھرا نکل آیا

انکار ہمارا ہے نہ اقرار ہمارا
ہونا ہی یہاں اب تو ہے بے کار ہمارا

لیتا ہے کوئی چیز نہ دیتا ہے کوئی دام
ٹھنڈا ہے لگایا ہُوا بازار ہمارا

ہم دوسروں کے کام بھلا آئیں گے کیوں کر
خود سے ہی نہیں کوئی سروکار ہمارا

لاچار سے بیٹھے ہیں اِس اُمید پہ کب سے
ہو جائے کوئی آ کے مددگار ہمارا

ٹھہرائے ہُوئے قافلے کو دُھوپ میں، اور خود
سوتا ہے کہیں سائے میں سالار ہمارا

اب پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں باقی
احوال ہے ایسا ہی لگاتار ہمارا

زخموں سے گزرتے ہُوئے جھونکے سحر و شام
رکھتے ہیں یہ گھر خوب ہَوا دار ہمارا

فرمان ہی اپنے کی نہیں ہے کوئی توقیر
اُونچا تو بہت ہے یہاں دربار ہمارا

دشمن کے ظفرؔ، دوست ہیں اور دوست کے دشمن
اب آن کے پختہ ہُوا کردار ہمارا

چلتی نہیں اب کوئی بھی تدبیر ہماری
آتی ہے کہیں اور سے تقدیر ہماری

پیتل ہُوا جاتا ہے بنایا ہُوا سونا
اور، راکھ ہُوئی جاتی ہے اکسیر ہماری

سیدھا تھا اگر راستہ پانا تو بھلا کیوں
اُلٹی ہُوئی ہر خواب کی تعبیر ہماری

کچھ ہم بھی خموشی سے بُھگت لیتے ہیں تعزیر
کچھ وہ بھی بتاتے نہیں تقصیر ہماری

رَخنہ جو کبھی اِس میں پڑا تھا کہیں پہلے
ایسی ہی رُکی رہ گئی تعمیر ہماری

دیوانہ پن اگلا سا وہ باقی ہی نہیں ہے
اب کھول بھی رکھتے ہیں وہ زنجیر ہماری

جلسے جو ہیں سُونے تو جلوس اپنے ہیں ویران
آتا نہیں سُننے کوئی تقریر ہماری

دشمن کے مقابل تو صف آرا تھے بہت ہم
پر نیام سے نکلی نہیں شمشیر ہماری

بولا ہے، ظفرؔ جھوٹ ہی لوگوں سے کچھ اتنا
اب آئے گی کیا بات میں تاثیر ہماری

یوں ہو گئے تھے جمع ہی ارمان ہمارے
سارے جو ہُوئے خواب پریشان ہمارے

خوش فہم تھے اتنے کہ سمجھے رہے خود ہی
اچھے کبھی ہو جائیں گے سرطان ہمارے

شب جنگ عدو سے رہی، جاگے تو یہ دیکھا
ہاتھوں میں تھے اپنے ہی گریبان ہمارے

آبادیاں گنجان تھیں باہر سے ہی اتنی
اندر سے یہی شہر تھے سنسان ہمارے

بادل کو ہوا لے گئی ہر بار اُڑا کر
ساون میں بھی سُوکھے ہی رہے دھان ہمارے

مضبوط نہ تھا ہم سے کبھی کفر تو اتنا
لیکن ذرا کم زور تھے ایمان ہمارے

اشیائے خورد و نوش کی قلت ہُوئی جب سے
بچوں ہی سے بھرپور ہیں دالان ہمارے

جس بات پہ یہ فخر کیا کرتے تھے اتنا
ہیں اُسی پہ ہی اب لوگ پشیمان ہمارے

ہوتا رہا اندر تو، ظفرؔ گھر کا صفایا
سویا کیے باہر کہیں دربان ہمارے

تھا جو بھی اِرادہ ہُوا ناکام ہمارا
اب دُور نہ سمجھے کوئی انجام ہمارا

اَوروں کو تو دیتا کہاں پہ شور سُنائی
خود تک بھی نہ پہنچا کبھی کُہرام ہمارا

اب جس کی جگہ دُھند ہُوا کرتی ہے اور دُھول
اک چاند نکلتا تھا سرِ شام ہمارا

اب کام تمام اپنا ہی سمجھ کسی لمحے
ہونا جو نہیں ہے کہیں کچھ کام ہمارا

بارش ہی کچھ ایسی ہے کہ دُھو جائے گی سب کچھ
دیوار سے مِٹنے کو ہے اب نام ہمارا

اصلی جو نکلتی نظر آتی ہے یہ صورت
کچھ دُور تو ہونا ہی تھا ابہام ہمارا

اِس خواب میں ہم خود تو نکل آئے ہیں آگے
رستے میں کہیں رہ گیا پیغام ہمارا

اپنا نہیں احساسِ ندامت بھی کسی طور
مانگے کا ہے جو جامۂ احرام ہمارا

گھوڑے تو ظفرؔ، بیچ کے سوئے ہوئے ہم
پھر بھی خلل آمیز ہے آرام ہمارا

بیٹھے رہے اور بن نہ سکی بات ہماری
کیا کیجیے، اتنی ہی تھی اوقات ہماری

کچھ اپنے سوا ہم کو دکھائی نہیں دیتا
رہتی ہے فقط پیشِ نظر ذات ہماری

دشنام ہے رسوائی ہے اور طعنۂ اغیار
ہوتی ہے تواضع یہی دن رات ہماری

ممکن ہی نہیں اپنے مقدر کا بدلنا
جب تک کہ بدلتی نہیں عادات ہماری

اب اُن کے اشارات کی تکمیل ہے لازم
جن کے لیے ہونا تھیں ہدایات ہماری

سَو جوتے بھی کھانا پڑے، سو پیاز بھی ہم کو
اکثر رہی ایسی ہی مدارات ہماری

دشمن کو یہ مژدہ ہو کہ زحمت نہ اُٹھائے
خود اپنے مخالف ہیں مہمات ہماری

باہر سے کسی کو نظر آتی بھی تو کیوں کر
اندر جو گرا کرتی ہے برسات ہماری

اَوروں سے چلن کوئی الگ ہے، ظفر اپنا
مشہور ہیں عالم میں حکایات ہماری

ربط تھا جب معاملات سے کم
دُکھ پہنچتا تھا تیری بات سے کم

خواب آسانیوں کا دیکھتے ہیں
ابھی نکلیں گے مشکلات سے کم

بند ہیں سارے راستے اپنے
خبر آتی ہے شش جہات سے کم

سب سے پہلے مگر گئے پکڑے
تھا تعلق تو واردات سے کم

دوسروں سے ہی کام ہم نے رکھا
تھا سروکار اپنی ذات سے کم

کام ہونا ہی تھا خراب اتنا
کام لیتے تھے احتیاط سے کم

کھیل ہی سے غرض رکھی ہم نے
واسطہ تھا تو جیت مات سے کم

صبر کا پھل ہی چاہیے اب تو
جی بہلتا ہے پھول پات سے کم

اپنا سورج نکالتا ہوں، ظفرؔ
رات کو کر رہا ہوں رات سے کم

اِس طرح محبت کا ہُوا جال مکمل
پہلے ہی مہینے میں ہُوا سال مکمل

تصویرِ تماشا کہیں آغاز تو کرتے
ہو رہتے کبھی خود ہی خد و خال مکمل

اک مولویوں کی سی عبا پہنے ہُوئے وہ
اور اِس میں چُھپائے ہُوئے تھے بال مکمل

لڑکی نہیں، لکڑی تھی وہ اندر سے کم و بیش
تھی اصل میں ویسے تو وہ چونچال مکمل

مارے گئے پرواز میں عُجلت کے سبب سے
ہونا تھے ابھی اور پر و بال مکمل

جلد ہی بہت ہاتھ کھڑے کر لیے ہم نے
پیغام جب اُس کا ہُوا ارسال مکمل

اُس کا بھی طریقہ کہیں انجام کو پہنچا
اپنے بھی ہُوئے ساتھ ہی احوال مکمل

تنہا نہیں رہنے کا عقوبت کے سفر میں
جائیں گے مرے ساتھ ہی اعمال مکمل

ایسے میں ظفرؔ آپ ہی اندازہ لگائیں
ہو سکتے ہیں کیا آپ کے جنجال مکمل

پڑ جاتی ہے اس میں کوئی، تاخیر مکمل
جب ہونے پہ آتی ہے یہ تصویر مکمل

تیرا بھی کوئی دخل نہیں رکھنا ہے اس میں
کرنی ہے ترے وصل کی تدبیر مکمل

دے کر گیا کل رات سزا وہ بھی اُدھوری
ہو پائی نہیں مجھ سے بھی تقصیر مکمل

ہم بھی تو بہت خاطر و خدمت نہیں کرتے
اور اپنی بھی ہوتی نہیں توقیر مکمل

کچھ اپنا ستارہ بھی کہیں رہ گیا آدھا
کچھ یوں بھی ہماری نہیں تقدیر مکمل

حالات ہمارے بھی بدلتے کسی صورت
ہوتی جو کسی خواب کی تعبیر مکمل

چلتی رہی جس عہد میں آندھی سی ہوس کی
سر میں تھی ہوا، پیٹ میں تبخیر مکمل

وحشت کا بھی یہ اور ہی انداز ہے شاید
دیوانہ مکمل ہے نہ زنجیر مکمل

کوشش تو ہمیشہ ہی ظفرؔ کرتا ہوں، لیکن
آئی نہ کبھی شعر میں تاثیر مکمل

اِنکار مکمل ہے نہ اقرار مکمل
ہوتا نہیں کچھ بھی ترا اے یار مکمل

بے کار ہی پھرتا ہوں شب و روز اور اُس سے
کرتا ہوں کوئی کام تو ہر بار مکمل

دریا مرے اندر سے گزرتا ہُوا دن رات
میں آر مکمل ہوں نہ ہوں پار مکمل

ہے ٹال مٹول آج کل اُس کا بھی طریقہ
میں آپ بھی کرتا نہیں اصرار مکمل

اب اس کے گرانے کی بھی تدبیر کوئی ہو
دیوار تو یہ ہو گئی تیار مکمل

اے کاش کبھی قتل پہ میرے بھی اسی طرح
ہڑتال ہو اور بند ہو بازار مکمل

منزل پہ پہنچنے کی ضمانت ہے یہی کچھ
رستہ ہی مکمل ہے نہ رفتار مکمل

پھر یوں بھی کوئی بات ہی باقی نہیں رہتی
جب شعر میں ہو جاتا ہے اظہار مکمل

دشمن سے نبڑنے کو ظفرؔ وقت نہیں ہے
ہوں خود سے ابھی برسرِ پیکار مکمل

مِلتا ہے تو سُنتا ہی نہیں بات مکمل
اُس شوخ سے کیا ہو گی ملاقات مکمل

کس طرح سے کرتے ہو اندھیرے میں اُجالا
دیکھیں کبھی ہم بھی وہ کرامات مکمل

گِرنا ہے کبھی تیرے سمندر میں یہ دریا
ہونی ہے کہیں جا کے مری ذات مکمل

اِس طرح کہ باقی نہ بچے کچھ بھی ترے پاس
ہو سکتی ہے تب ہی تری خیرات مکمل

رہ جاتی ہے دونوں میں کوئی کسر ہمیشہ
یہ دن ہے مکمل نہ مری رات مکمل

ہر بار کمی سی کوئی موجود رہے گی
اِس خواب نے ہونا ہے ترے ساتھ مکمل

ویران ہیں کس طرح لق و دق مرے صحرا
شاداب ہیں کیسے ترے باغات مکمل

یوں ہے کہ ابھی کچھ بھی کہا جا نہیں سکتا
قابو میں نہیں ہیں ابھی حالات مکمل

گھر میں تو ظفر رہتی ہے رونق ہی اَدھوری
جس رات اُترتیں نہیں آفات مکمل

کیوں کر نہ اضافے پہ ہوں جنجال ہمارے
ایسے ہی اگر رہ گئے اعمال ہمارے

پہچان میں اپنی بھی نہیں آ رہے اب تو
ہیں اَور کے ہی اور خد و خال ہمارے

تیزی سے ہمیں خود ہی گزرتا ہُوا سمجھو
جس طرح گزرتے ہیں مہ و سال ہمارے

باہر سے تو بہتر نظر آتے ہیں شب و روز
اندر سے ہی ابتر ہُوئے احوال ہمارے

پرواز کی تیاریاں ہی کرتے رہے ہم
اور جھڑ گئے باقی بھی پر و بال ہمارے

اُوپر سے ہی اب گھر نظر آتے ہیں سلامت
نیچے کہیں محفوظ ہیں بھونچال ہمارے

شمشیر ہر اک ٹوٹی ہُوئی نیام سے نکلی
میدان میں گھوڑے ہُوئے بے حال ہمارے

پہلے تھا جہاں، اور ہُوا فضل خدا کا
کنگال ہُوئے اور بھی کنگال ہمارے

باجا ہی بجائے ہُوئے تھے ہم ظفرؔ اُلٹا
سُرتال سے باہر جو ہیں سُرتال ہمارے

درپیش رہو کیوں سحر و شام ہمارے
جب آ نہیں سکتے ہو کسی کام ہمارے

اِس باغ سے اب کوچ ہی بہتر ہے کہ جس کے
شہتوت ہی اپنے ہیں نہ بادام ہمارے

اب سوچتے ہیں وہ کہیں تھا بھی کہ نہیں تھا
جس چاند نے چمکائے در و بام ہمارے

تھے بیچ میں ہی گُم کہیں اِس خواب کے، ورنہ
آغاز ہمارے تھے نہ انجام ہمارے

ہم مفت میں بِکنے کو بھی تیار تھے اُس دن
بے کار لگاتا رہا وہ دام ہمارے

کچھ وہ بھی سمجھتا نہیں تھا بات ہماری
کچھ عرضِ ہوس میں رہے ابہام ہمارے

یا اُس کی توجہ ہی کسی اور طرف تھی
یا پھر وہاں پہنچے نہیں پیغام ہمارے

آئے تھے کبھی تیر نشانے سے پلٹ کر
ہم پر ہی لگے آن کے الزام ہمارے

پکّا رہا کچھ وہ بھی ظفر بات پہ اپنی
کچھ اپنے خیالات بھی تھے خام ہمارے

کم ہوتے گئے آپ ہی امکان ہمارے
مشکل ہُوئے جو کام تھے آسان ہمارے

بکھرے ہو کہاں اے خس و خاشاکِ تماشا
غائب ہو کدھر اے سر و سامان ہمارے

دریاؤں سے اب سُوکھتا ہی جائے گا پانی
اور پھیلتے جائیں گے بیابان ہمارے

موجود نہ ہو گا جو تواضع کے لیے کچھ
رُک جائیں گے پھر آپ ہی مہمان ہمارے

بازار ہیں اب اُن کی جگہ رونق ہر شہر
یوں ختم ہُوئے خود ہی گلستان ہمارے

بندے بھی درآمد کیے جائیں گے کہ سارے
شیطان ہُوئے جاتے ہیں انسان ہمارے

معصوم ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ اب تک
دشمن ہیں اِن احوال سے اَن جان ہمارے

باہر سے ہی مضبوط نظر آتے ہیں، لیکن
اندر سے یہی جسم ہیں بے جان ہمارے

چوروں کی ظفرؔ کوئی ضرورت ہی نہیں ہے
مامور ہیں اب خود ہی نگہبان ہمارے

٥

سمجھا ہے مہندر سے نہ محمود سے ہم نے
موجود کو ثابت کیا مفقود سے ہم نے

پھیلاؤ تھا خوشبو کا ہر اطراف میں ایسا
رونق تھی لگائی ہُوئی اَمرود سے ہم نے

گُم راہ جو ہوتے گئے ہیں دل ہی کے ہاتھوں
رکھا ہے کوئی فاصلہ مُردود سے ہم نے

دینا ہے پتا پیچ و خم راہ کا ہرگز
لینا ہے نہ کچھ منزلِ مقصود سے ہم نے

ممکن ہو تو کچھ واسطہ رکھنا ہے کوئی دن
بے کار سے ہوتے ہُوئے بے سُود سے ہم نے

کرنا ہے لبِ خشک سے اُس کو بھی کبھی یاد
اور ساتھ ہی اِس چشمِ نم آلود سے ہم نے

ہو اُس سے ملاقات کسی اور کے ہم راہ
بچنا بھی ہے ایک ایسی غتربُود سے ہم نے

آیا بھی وہ اور فائدہ کچھ بھی نہ اُٹھایا
افسوس کہ اِس موقعِ مسعود سے ہم نے

اک چیز بنائی ہے ظفرؔ مطبخِ دل میں
آج اُس کے لیے شہد سے اور دُودھ سے ہم نے

ملنا تھا جو اک دخترِ انگور سے ہم نے
امرود منگائے تھے شرق پور سے ہم نے

اپنا ہی کرانا پڑا دوبارہ تعارف
پہچان لیا تھا اُسے تو دُور سے ہم نے

نشہ وہ محبت کا ہرن آج کیا ہے
ناچار کسی وصل کے اچُور سے ہم نے

ہمسائی سے مانگا ہُوا تھا پیاز کا ٹکڑا
روٹی تھی منگائی ہُوئی تندور سے ہم نے

جابر پہ تو کچھ بس نہیں چلتا تھا ہمارا
مجبور کو لڑوا دیا مجبور سے ہم نے

آدم سے کسی رنج میں توڑا ہُوا ناتا
رشتہ کوئی جوڑا ہُوا لنگور سے ہم نے

ہے اب بھی شب و روز محبت کی مشقّت
کرنی تھی ترقی کوئی مزدور سے ہم نے

بھگدڑ میں بھی خاص ایک طریقہ تھا ہمارا
دنگا بھی کیا ہے کسی دستور سے ہم نے

خوش باش تھا معشوق ہمارا، ظفرؔ اتنا
رکھا نہ تعلق دلِ رنجور سے ہم نے

ٹکرا دیا بھرپور کو پایاب سے ہم نے
بدلا ہے کوئی خواب کسی خواب سے ہم نے

اک اور طرح کی چمک اس میں نظر آئی
دیکھا جو اندھیرے کو تب و تاب سے ہم نے

اک راز جھلکتا ہُوا دشمن کی زباں سے
اک بات چھپائی ہُوئی احباب سے ہم نے

رشتہ کوئی جوڑا ہُوا شناور سے شب و روز
ناتا کوئی توڑا ہُوا تالاب سے ہم نے

اُوکاڑہ سے لاہور ہی پہنچی ہے بہ مشکل
آواز اُٹھائی تھی جو پنجاب سے ہم نے

سرگرمیاں اپنی رہیں مُلتان کی حد تک
اُمید لگا رکھی ہے خوشاب سے ہم نے

دُشنام طرازی پہ بھی مجبور ہُوئے جب
کی ہے یہاں وہ بھی ادب و آداب سے ہم نے

ظاہر ہے سُکڑتی ہُوئی شہرت میں اضافہ
ناچار کیا ہے پرِ سُرخاب سے ہم نے

دیوار ہی پھاندی ہے، ظفرؔ ہم نے ہمیشہ
زحمت نہیں کی کُھلتے ہُوئے باب سے ہم نے

کرنا تھا جو آغاز ترے نام سے ہم نے
جوڑا ہے کسی اور ہی انجام سے ہم نے

مصروفیت اپنے لیے گھر سے ہی نکل آئی
جانا تھا وہاں پر بھی کسی کام سے ہم نے

رکھتی ہے پریشاں بھی وہی حد سے زیادہ
جو بات سُنی تھی بڑے آرام سے ہم نے

یہ شامتِ اعمال تھی اپنی کوئی، ورنہ
اک فاصلہ رکھا ہُوا تھا دام سے ہم نے

اک چیز منگائی تھی بہت دُور سے اُس رات
اک چاند اُتارا تھا لبِ بام سے ہم نے

جس شور سے قائم ہُوئی پہچان ہماری
منہ موڑ لیا تھا اُسی کہرام سے ہم نے

تا دیر ہی رہنا تھا یہاں ذکر تمھارا
کچھ لوگ بُلائے ہُوئے تھے شام سے ہم نے

رسمی تھا سلام اُس کا ظفؔر اِس کے علاوہ
مطلب لیا کچھ اور ہی پیغام سے ہم نے

تھا باعثِ رُسوائی ظفؔر، اپنا وہی کام
ہٹ کر جو کیا ہے روشِ عام سے ہم نے

بدلہ یہ لیا حسرتِ اظہار سے ہم نے
آغاز کیا اپنے ہی انکار سے ہم نے

دروازہ نہیں اپنے سروکار میں شامل
ہے رابطہ رکھا ہُوا دیوار سے ہم نے

امکان سا رکھا ہُوا ساحل کی ہَوا پر
اُمید سی باندھی ہُوئی اُس پار سے ہم نے

اپنی ہی بگاڑی ہُوئی صورت کے علاوہ
کچھ اور نکالا نہیں طومار سے ہم نے

اِس کا بھی کوئی فائدہ پہنچا نہ کسی کو
آساں تو برآمد کیا دُشوار سے ہم نے

منزل جو ہماری تھی کہیں رہ گئی پیچھے
یہ کام لیا تُندیٔ رفتار سے ہم نے

یہ دُھوپ ہی تھی اپنی گزرگاہ سَو رکھا
اک فاصلہ بھی سایۂ اشجار سے ہم نے

جانچا ہے کسی اور طریقے سے یہ سب کچھ
پرکھا ہے کسی اور ہی معیار سے ہم نے

اُس کی بھی ادا کی ہے ظفؔر آج تو قیمت
جو چیز خریدی نہیں بازار سے ہم نے

رہ رہ کے زبانی، کبھی تحریر سے ہم نے
قائل کیا اُس کو اِسی تدبیر سے ہم نے

کس سمت لیے جاتے ہو، اور کیا ہے اِرادہ
پوچھا نہ کبھی اپنے عناں گیر سے ہم نے

دل پر کوئی قابو نہ رہا جب تو کسی طور
جکڑا ہے یہ وحشی تری زنجیر سے ہم نے

ہر بار مدد کے لیے اَوروں کو پکارا
یا کام لیا نعرۂ تکبیر سے ہم نے

بہتر ہے کہ اب کام کوئی اور کیا کر
یہ بھی نہ کہا کاتبِ تقدیر سے ہم نے

اپنی ہی کرامات دِکھاتے رہے سب کو
سَرقہ نہ کیا معجزۂ میؔر سے ہم نے

تخریب تو کرتے رہے سَو طرح کی، لیکن
یہ کام کیا جذبۂ تعمیر سے ہم نے

اب دیکھیے کیا اِس کا نکلتا ہے نتیجہ
ماتھا ہے لگایا ہُوا تاثیر سے ہم نے

وہ بامِ تماشا ہُوا غائب تو ظفؔر آج
لٹکا لیا خود کو کسی شہتیر سے ہم نے

میسر ہے کہیں تو کام سب کرنے کی آزادی
کسی کے پاس کرنے کی جگہ بھرنے کی آزادی

چراگاہِ تماشا میں کہاں چرنے کی آزادی
جو مِل سکتی ہمیں بس پاؤں ہی دھرنے کی آزادی

سبب اُس کا بھلے مہنگائی یا بے روزگاری ہو
کہ اب تو ساتھ ہی جینے کے ہے مرنے کی آزادی

عطا کر دی ہے خاص و عام کو جو استطاعت ہو
کہیں پگڑی کی گنجائش، کہیں پرنے کی آزادی

ثمر اب اور بھی کیا چاہیے آزاد ہونے کا
ہے اپنی دسترس میں آپ سے ڈرنے کی آزادی

مزے سے درمیاں میں غرق ہوں یا پار اُتر جائیں
ودیعت ہے سبھی کو ڈوبنے، ترنے کی آزادی

غبارِ عاشقی میں جس طرف سے بھی نکل جاؤ
کہ آپس میں جُڑی ہے جیتنے ہرنے کی آزادی

وہیں پر پیاس نے بے حال کر رکھا ہے دُنیا کو
جہاں چشمے کی آسائش ہے اور جھرنے کی آزادی

ہماری فکر مت کرنا، ظفر ہم کو تو حاصل ہے
کچھ اِن چھوٹے بڑے صدمات کو جَرنے کی آزادی

ڈر رہے ہیں دن نکلنے پر ہی کیوں انجام سے
کام جو آغاز ہونا ہے ہمارا شام سے

رائگاں کارِ محبت ہی میں گزری ہے یہ عمر
ورنہ آئے تھے یہاں ہم بھی کچھ اپنے کام سے

شام تھی اور شہر تھا گدلے، اندھیرے میں نڈھال
دفعتہً اک چاند سا چمکا کنارِ بام سے

صبح و شام آنا تمھاری یاد کا، اور بار بار
دل کو بے آرام کر جانا بڑے آرام سے

خاص لوگوں کی نظر میں آ بھی سکتا تھا کہاں
کام بھی تھا عام سا، بندے بھی تھے ہم عام سے

رات ہے، اور چلنے ہی آئے ہیں دن کے ساتھ ہم
دُھوپ سی لپٹی ہُوئی ہے کچھ ابھی ہر گام سے

کر لیا تھا مستقل اپنا یہی ہم نے لباس
خود ہی پھر نکلے ہیں باہر جامۂ احرام سے

پوچھیے اب اور کیا کرنی تھی ہم نے پیش رفت
ہم جو پیچھے تھے خود اپنے ہی خیالِ خام سے

راستہ دیتی ہیں دیواریں ہمیں اب بھی ظفرؔ
دَر کُھلا کرتے تھے پہلے بھی ہمارے نام سے

اصل تھا یا کسی ہونے کا اشارہ ہُوا میں
صورتِ حال تھی ایسی کہ دوبارہ ہُوا میں

خود کو پہچان سکوں گا کبھی رفتہ رفتہ
کسی اپنی ہی بلندی سے اُتارا ہُوا میں

چین سے بیٹھنے دیتی نہیں آواز کوئی
ہوں کسی دوسری دُنیا کا پکارا ہُوا میں

کہیں تیرا تو وہاں نام و نشاں تک نہیں تھا
جہاں پہنچا ترے رستے سے گزارا ہُوا میں

ناپسندیدہ ہی جیتا رہا اِس دنیا میں
آخری عمر میں اب جا کے گوارا ہُوا میں

موج در موج سمندر مرے اُوپر نیچے
نہ ڈبویا ہُوا ہوں، اور نہ اُبھارا ہُوا میں

زندگی بھر کبھی یکساں میری تقدیر نہ تھی
کبھی آدھا ہُوا ہوں اور کبھی سارا ہُوا میں

کس طرح آئی ہے یہ اتنی بڑی تبدیلی
کبھی اپنا بھی نہیں تھا جو تمھارا ہُوا میں

ریت ہی تھا کسی سُوکھے ہُوئے دریا کی، ظفؔر
اب جو پانی نظر آیا تو کنارہ ہُوا میں

خرچ ہوتا ہُوا اِس چال سے چلتا ہُوا میں
جا بہ جا اپنے کناروں سے اُچھلتا ہُوا میں

بیٹھنا ایک جگہ پر مری قسمت میں نہیں
آتا جاتا رہوں گا رنگ بدلتا ہُوا میں

فیض چاہوں بھی تو پہنچا ہی کہاں سکتا ہوں
لبِ دریا کوئی چشمہ سا اُبلتا ہُوا میں

بے اثر رہتا ہے بیٹھا کوئی موسم مجھ پر
اپنے ہی زہر سے ہوں پھولتا پھلتا ہُوا میں

بھاگ کر جاتا ہُوا اجنبیوں کی جانب
اور اپنی طرف آتا ہوں ٹہلتا ہُوا میں

کوئی پانی کا پتا مجھ کو بتا سکتا ہو
پوچھتا پھرتا ہوں ایک ایک سے جلتا ہُوا میں

اتنا باہر سے یہ مضبوط نظر آتا ہُوا
اندر اندر ہوں شب و روز دہلتا ہُوا میں

ایسے حالات میں اتنا بھی غنیمت سمجھو
کہ بُرا وقت ہوں، اور شہر سے ٹلتا ہُوا میں

اپنے ہی آپ میں ہر وقت مگن بھی ہوں، ظفرؔ
اور خود سے کہیں باہر بھی نکلتا ہُوا میں

یہ بھی کیا ہوں کسی جانب سے جھجکتا ہُوا میں
اور اِسی لمحے کسی سمت لپکتا ہُوا میں

کوئی اطراف کا اندازہ ہی رکھتا نہیں اب
اپنے ہی شہر کی گلیوں میں بھٹکتا ہُوا میں

کبھی لیتا ہی نہیں شور شرابے کا اثر
خامشی کی کسی آہٹ پہ ٹھٹکتا ہُوا میں

چور ہوں، اور کہیں آنکھ بچا کر خود سے
اپنے ہی خواب کی گٹھڑی کو اُچکتا ہُوا میں

تیر کھایا تھا کسی اور طرف سے، لیکن
گر رہا ہوں ترے پہلو میں پھڑکتا ہُوا میں

اور تھا رنگِ تماشا مری خاطر جس کو
دیکھنا چاہتا اور دیکھ نہ سکتا ہُوا میں

بُجھنے ہی والا ہوں چھوڑے ہُوئے گھر میں آخر
در و دیوار سے بے سُود جھلکتا ہُوا میں

خاک ہو جاؤں گا، احباب تسلّی رکھیں
اور کچھ دیر اندھیرے میں چمکتا ہُوا میں

کر رہا ہوں اُسے ظاہر جو چھپانا ہے ظفرؔ
جو دِکھانا ہے، سراسر اُسے ڈھکتا ہُوا میں

جیسے ہوں شہر بدر شہر میں آیا ہُوا میں
یاد آؤں گا کسی روز بُھلایا ہُوا میں

کسی شیشے کی مِلاوٹ بھی ہو جیسے مجھ میں
ٹوٹ جاؤں گا کسی روز بنایا ہُوا میں

در و دیوار سے ہونا ہے نمودار مجھے
اسی تعمیر کے اندر ہوں کُھپایا ہُوا میں

اتنے پردے ہیں مری ذات کے آگے پیچھے
کہیں ظاہر نہیں ہوتا ہوں چھپایا ہُوا میں

کھوج پھر بھی نہیں مِلتا ہے کسی کو میرا
لاپتا ہوں یہاں سَو بار بتایا ہُوا میں

میرے ہوتے ہُوئے کچھ اور نظر آئے گا کیا
سامنے ہوں وہی آگے سے ہٹایا ہُوا میں

دن نکلتے ہی کسی اپنی کمی کے ہاتھوں
خرچ ہو جاؤں گا شب بھر کا بچایا ہُوا میں

ایک جھونکے سے جل اُٹھوں گا دوبارہ سے، ظفرؔ
رات کی بند ہواؤں کا بُجھایا ہُوا میں

گھر پہنچ کر مجھے کھولے جو خریدار، ظفرؔ
اور ہی کچھ نکل آؤں گا دِکھایا ہُوا میں

راکھ ہوتا ہُوا، ہر لحظہ بِگڑتا ہُوا میں
رفتہ رفتہ یہ کوئی آگ پکڑتا ہُوا میں

نہیں دیتا ہوں کسی طور ہَوا کو زحمت
ایک پتا سا کہیں آپ ہی جھڑتا ہُوا میں

پھر کسی کے لیے آغوش کُشا ہوں گویا
اپنی کم زور سِلائی سے اُدھڑتا ہُوا میں

مجھ میں رہتی ہے جو ہر آن کی بیشی سی
کہیں گھٹتا ہُوا ہوں اور کہیں بڑھتا ہُوا میں

یہ ہَوا ہے جو ہمیشہ مرے کام آتی ہے
سُوکھ جاؤں گا اِسی طرح نِچڑتا ہُوا میں

کبھی ایسا تو لگا ہی نہیں پہلے شاید
جیسا لگتا ہوں ترے خواب میں جڑتا ہُوا میں

مِلنے آؤں گا اِنھیں پھر کسی موسم میں کبھی
جو پریشاں نہیں لوگوں سے بچھڑتا ہُوا میں

روک دے کوئی اگر آ کے یہاں پر مجھ کو
پھیلتا جاتا ہوں کچھ اور سُکڑتا ہُوا میں

کیے رکھتا ہوں، ظفرؔ، صلح کا جھنڈا بھی بلند
مار کرتے ہُوئے دشمن سے پچھڑتا ہُوا میں

کس نئے خواب میں رہتا ہوں ڈبویا ہُوا میں
ایک مدّت ہُوئی جاگا نہیں سویا ہُوا میں

میری سورج سے ملاقات بھی ہو سکتی ہے
سُوکھنے ڈال دیا جاؤں جو دھویا ہُوا میں

مجھے باہر نہیں، سامان کے اندر ڈھونڈو!
مِل بھی سکتا ہوں کسی شے میں سمویا ہُوا میں

بازیابی کی توقع ہی کسی کو نہیں اب
اپنے سامان میں اِس طرح سے کھویا ہُوا میں

پھول سا کوئی کِھلایا ہُوا اِس خاک پہ تھا
آسماں میں کوئی کانٹا سا چبھویا ہُوا میں

شام کی آخری آہٹ سے دَہلتا ہُوا دل
صبح کی پہلی ہواؤں میں بھگویا ہُوا میں

ہوگیا ہوں تو پھر اب جا بھی کہاں سکتا ہوں
چھوڑ کر سارے تماشے کو یہ ہویا ہُوا میں

میرے نقاد کو یہ فیصلہ کرنا ہے ابھی
شعر کہتے ہُوئے زندہ ہوں کہ مویا ہُوا میں

مسکراتے ہُوئے مِلتا ہوں کسی سے جو، ظفرؔ
صاف پہچان لیا جاتا ہوں رویا ہُوا میں

گر نہ جاؤں کہیں، اِس بات سے ڈرتا ہُوا میں
اپنی اُونچائی سے ہر روز اُترتا ہُوا میں

میرے احباب پریشاں ہیں کنارے پہ بہت
ڈوبتا کیوں نہیں رہ رہ کے اُبھرتا ہُوا میں

مجھ پہ اصلاح کا ہوتا ہے اثر اُلٹا ہی
یعنی کچھ اور بگڑتا ہوں سنورتا ہُوا میں

خوش جو ہوتا ہوں تو افسوس بھی رہتا ہے مجھے
ساتھ خالی بھی ہُوا جاتا ہوں بھرتا ہُوا میں

لوگ پہچان نہیں پائیں گے اپنے بھی مرے
کیا سے کیا ہوگیا ہوں دیر سے بَرتا ہُوا میں

جانتا بھی ہوں یہ بے سُود سفر ہے، لیکن
چل بھی پڑتا ہوں سرِ راہ ٹھہرتا ہُوا میں

سوچتا ہوں کہ ہے یہ بھی مرا دیکھا ہُوا کچھ
اک نئے راستے سے آج گزرتا ہُوا میں

یہ عجب شامتِ اعمال ہے کوئی کہ یہاں
وہی بھرتا ہُوا ہوں جو نہیں کرتا ہُوا میں

جا رہا ہوں تو کچھ ایسا مجھے لگتا ہے، ظفر
زندہ کر جاؤں گا ہر چیز کو مرتا ہُوا میں

اک نئی طرح کے ہیجان میں رکھنے کے لیے
رونقیں چاہییں سنسان میں رکھنے کے لیے

اک نوا سی مرے ہونٹوں سے اُلجھتی ہُوئی ہو
اک ہوا سی مرے دالان میں رکھنے کے لیے

ایک چہرہ سا بناتا ہوں شب و روز کوئی
کارنس پر پڑے گُل دان میں رکھنے کے لیے

بھیج رکھی ہے مرے ساتھ کوئی آبادی
آتے جاتے ہُوئے، ویران میں رکھنے کے لیے

ہر طرف ایک نہ ہونے کی فضا ہے طاری
کوئی مشکل نہیں آسان میں رکھنے کے لیے

روشنی پر ہے کوئی لہر اندھیرے کی رواں
بھول جاتا ہوں اُسے دھیان میں رکھنے کے لیے

دے رکھا ہے مجھے اُس نے بھی منافع کا فریب
مستقل ہی کسی نقصان میں رکھنے کے لیے

میں تو سمجھا تھا کہ لایا گیا ہے مجھ کو یہاں
اک نئے ہی کسی امکان میں رکھنے کے لیے

کیا بتاؤں کہ مجھے کب سے ہے درکار، ظفرؔ
ایک حیران، پریشان میں رکھنے کے لیے

روکا ہے مجھے آج تو کل جانے دیا جائے
سانچہ ہے تمھارا، یہیں ڈھل جانے دیا جائے

آنکھوں میں پڑا رہنے دیا جائے مرا خواب
اور ساتھ ہی سر سے نہ خلل جانے دیا جائے

چڑھتی ہوئی موجوں میں نہیں اس کا گزارہ
پانی مرے ساحل سے اُچھل جانے دیا جائے

آیا ہے تو پابند نہیں ہے وہ ہمارا
اُس کو کسی رستے سے نکل جانے دیا جائے

آیا تھا کہیں سے وہ بدل کر ہی مرے پاس
اک بار اُسے اور بدل جانے دیا جائے

موجود ہیں پہلے ہی یہاں پر مرے ذرّے
یہ خاک ہے، اس میں مجھے رَل جانے دیا جائے

گرنے کے جو شوقین ہیں، گر جائیں تو اچھا
جو آپ سنبھلتا ہے، سنبھل جانے دیا جائے

یہ شاعری اک پارۂ کاغذ تھی، سو اس کی
میعاد یہی تھی، اسے گل جانے دیا جائے

بے کار، ظفرؔ اتنا رُکے رہنے سے اب تو
بہتر ہے، دماغ آپ کا چل جانے دیا جائے

یہ شام اگرچہ نہیں ہے بہت اثر بنیاد
پڑی ہے اس پہ مرے خواب کی، مگر بنیاد

عمارت اور کسی سے ہو کس طرح منسوب
رکھی گئی تھی اگر اس کے نام پر بنیاد

کوئی اسے متزلزل نہ کر سکے گا کبھی
رہیں گے اس کے وہی خاک و خشت اگر بنیاد

اسی حساب سے ہوتی ہے دیرپا تعمیر
کہ ابتدا سے ہو مضبوط جس قدر بنیاد

قدم اُٹھے تو ہُوئے جا کے باریاب، کہ ہے
ہر ایک منزلِ مقصود کی سفر بنیاد

یہ دو گھڑی کا دُھندلکا تو کوئی بات نہیں
میں جانتا ہوں کہ یہ رات ہے سحر بنیاد

عدو کو ہے خس و خاشاک پر غرور اگر
تو سُن رکھے کہ اِدھر میں بھی ہوں شرر بنیاد

شکوہِ قصرِ وفا سر اُٹھا کے دیکھتا ہوں
سبب جو ہے کوئی اِس کا تو سر بہ سر بنیاد

گلا کٹا کے ہُوا تھا میں سرخ رُو، کہ ظفرؔ
خراج مانگتی ہے خوں کا ایسی ہر بنیاد

آگے جو نکلتا ہے، گزر جانے دیا جائے
کیا اپنا بگڑتا ہے اگر جانے دیا جائے

چڑھتے ہُوئے دریا کو بھی ہم نے نہیں روکا
اب اِس کو بہرطور اُتر جانے دیا جائے

ہو جاؤں گا میں بعد میں خود آپ بھی شامل
پہلے مرا سامانِ سفر جانے دیا جائے

آیا ہے تو واجب ہے بہت اِس کی حفاظت
جاتا ہے تو بے خوف و خطر جانے دیا جائے

دُشوار بھی آساں بھی، کُھلی ہیں سبھی راہیں
اے طبعِ رواں تجھ کو کدھر جانے دیا جائے

تھی عمر ہی اِس بار محبت کی بس اتنی
مرتی ہے تو ناچار اِسے مر جانے دیا جائے

لَوٹ آؤں گا خود ہی اِسے ضد ہی مری سمجھو
لیکن، مجھے اک بار اُدھر جانے دیا جائے

اچھے نہیں لگتے مجھے آسائش و آرام
میں تنگ بہت ہوں، مجھے گھر جانے دیا جائے

روکے ہُوئے بیٹھے ہو، ظفر سیلِ تماشا
آگے بھی کہیں خوابِ ہُنر جانے دیا جائے

وہی اقرار ہے انکار میں رکھنے کے لیے
آپ کو اپنے سروکار میں رکھنے کے لیے

اب چھتیں پھاندنے کی عمر نہیں ہے شاید
در کوئی چاہیے دیوار میں رکھنے کے لیے

ایک دریا کی ضرورت مجھے درپیش ہے اب
خود کو اِس پار سے اُس پار میں رکھنے کے لیے

ایک آزار سے ناچار نکالا ہے ابھی
دل کو ایک اور ہی آزار میں رکھنے کے لیے

ہم نے اُجرت کا اُٹھایا ہی نہیں کوئی سوال
لے چلیں ساتھ جو بیگار میں رکھنے کے لیے

دل کا یہ سلسلۂ سنگ ہے سُونا سُونا
ہو پَری بھی کوئی کہسار میں رکھنے کے لیے

آشیانے بھی کیا کرتے ہیں تعمیر وہ آپ
بجلیاں ابرِ گہر بار میں رکھنے کے لیے

سخن تازہ جہاں چاہے پہنچے کہ نہیں
اور گنجائش اس انبار میں رکھنے کے لیے

لوگ میری ہی طرف رُخ نہیں کرتے ہیں، ظفرؔ
میں ہی اک جنس تھا بازار میں رکھنے کے لیے

روز سرِ راہ اُس کا مِلنا ممکن ہے مجبوری ہو
لیکن، اب تو یوں لگتا ہے جیسے بہت ضروری ہو

دل پر بادل سا برسا ہے اُس کی سانولی رنگت کا
موسم کے کھُلنے پر دیکھیں، دُوری ہو کہ حضوری ہو

اُسے ضرورت ہی کیا تھی خوشبوئیں خریدتے پھرنے کی
جس کے اپنے پاس مہکتے سانسوں کی کستوری ہو

وصل کی عرضی پر وہ غور اب کر ہی لیں تو بہتر ہے
کیا معلوم کہاں ہوں گے ہم جب اُس کی منظوری ہو

گُم نامی کے جینے سے اس پر مر جانا اچھا ہے
ہم بھی کسی شمار میں آئیں، اپنی بھی مشہوری ہو

اُسے بھی کوشش کرنی چاہیے جلد کہیں آئے وہ نظر
اپنی طرف سے ہم بھی کریں گے جو کچھ صبر صبوری ہو

کام نہ جس دن ملے ہمارا چولہا ٹھنڈا رہتا ہے
روزگار ہی اپنا اگر محبت کی مزدوری ہو

سارے شہر سے بدگماں تو ہو نہیں سکتا وہ لیکن
کچھ کوشش تو کرنی چاہیے، پوری ہو کہ اَدھوری ہو

اک دن سو کر اُٹھیں تو نقشہ ہی کچھ ایسا ہو ظفرؔ
نیلو نیل زمیں کی رنگت، آسماں کی بھوری ہو

اپنے ہی دائرۂ ذات میں رکھنے کے لیے
دن ہے مطلوب ہمیں رات میں رکھنے کے لیے

یہ بھی کیا کم ہے کہ یوں شہر بدر اُس نے کیا
مجھے میرے ہی مضافات میں رکھنے کے لیے

دستیاب ہم کو نہیں کوئی ابھی خطۂ دل
اپنی فہرستِ فتوحات میں رکھنے کے لیے

بے ضرر سی یہ ہدایات ہمارے لیے ہیں
اک درستی سی خیالات میں رکھنے کے لیے

حق تو یہ ہے کہ اِس انبوہِ سگاں میں ہر وقت
اک عصا چاہیے تھا ہاتھ میں رکھنے کے لیے

اور ہی طرح کے حالات کی دیتا ہے نوید
مجھے اِس طرح کے حالات میں رکھنے کے لیے

روشنی کو کسی موسم سے نہیں ہے سروکار
اک دیا چاہیے برسات میں رکھنے کے لیے

ایک سے کرتے ہیں اظہارِ مروّت اکثر
دوسروں کو ذرا اوقات میں رکھنے کے لیے

اک ہوا اُس کے تصرف میں ہے دن رات، ظفرؔ
یہ خزاں سی مرے باغات میں رکھنے کے لیے

اُتھلا ہی سا ہے بہتر، بھرپور نہیں اچھا
نزدیک نہ تھا اچھا، اب دُور نہیں اچھا

اُجرت کی طلب دل کو ہے کام سے پہلے ہی
ہے رائے یہ اُن کی بھی، مزدور نہیں اچھا

لپٹا ہُوا تھا سب کچھ اُس شوخ کے کپڑوں میں
اچھا ہے، پر اتنا بھی مستور نہیں اچھا

بس بات ہی کر لیجے، تھوڑے کو بہت سمجھیں
یہ اُس کی جماعت کا منشور نہیں اچھا

کوشش تو بہت کی تھی، اور اب یہ سمجھتے ہیں
کھٹّا ہو کہ پھیکا ہو، انگور نہیں اچھا

پیغام رسانی تک محدود نہیں شاید
اِس کام پہ بندہ وہ مامور نہیں اچھا

موقع بھی میسر تھا، کچھ کر کے دِکھاتے ہم
انساں کوئی اتنا بھی معذور نہیں اچھا

خود تو بہت اچھا ہے، اَور اِس سے سِوا ہم بھی
اچھے ہیں، مگر اُس کو منظور نہیں اچھا

بدنام زمانہ بھی ایسا ہے ظفؔر، یعنی
مشہور تو ہے، لیکن مشہور نہیں اچھا

اِس میں کیا فرق ہے، کم ہو کہ زیادہ کی خبر
جو ہویدا کی خبر ہے وہی پیدا کی خبر

میں نے اُس شوخ پہ ہی چھوڑ رکھا ہے سب کچھ
مجھے عقبیٰ کی ہے کچھ فکر نہ دُنیا کی خبر

میں نے خوشبو کی طرح سینت کے رکھی ہُوئی ہے
کیسۂ جاں میں ہے کچھ اُس گلِ تازہ کی خبر

اب کہ اپنا بھی کوئی ہوش نہیں ہے مجھ کو
کبھی ہوتی تھی مجھے خوابِ زلیخا کی خبر

میں نے گھر میں ہی جو اِس طرح پڑے رہنا ہے
دینے آجاتے ہیں کیوں سیر و تماشا کی خبر

جس قدر بے خبری چھائی ہُوئی ہے، اِس میں
یہی کیا کم ہے کہ طوطے کو ہے مینا کی خبر

فرق دونوں کا ذرا دیکھنا ہو گا، کیا ہے
لے کے آتے ہیں جو کچھ لوگ دوبارہ کی خبر

بات میری بھی اگر غور سے سُن سکتے ہو
میں بھی لایا ہوں کسی مجمعِ تنہا کی خبر

کل تو موجود تھے اِس شہرِ خرابی میں ظفرؔ
آج ملتی نہیں کچھ حضرتِ والا کی خبر

٥

سر پر ہے سوار اب تک، اسباب نہیں اچھا
اوڑھا ہُوا ماتھے پر محراب نہیں اچھا

پانی کی کمی اس میں رہتی ہے کہ ہیں اپنے
مینڈک تو بہت اچھے، تالاب نہیں اچھا

کشتی کو بچانا بھی ہے ڈوبنے سے مجھ کو
دریا، مگر اتنا بھی پایاب نہیں اچھا

تعبیر تو ہوتی ہے اُلٹی ہی یہاں اکثر
اور یوں ترے ملنے کا یہ خواب نہیں اچھا

در پردہ اشارے تو کچھ اور ہی کہتے ہیں
مکتوب ہو جیسا بھی، القاب نہیں اچھا

محنت کوئی پڑتی ہو، کچھ زور بھی لگتا ہو
جو آپ ہی کُھل جائے وہ باب نہیں اچھا

نزدیک تو ہیں میرے، یہ پھول ہی اچھے ہیں
دُوری میں دمکتا وہ مہتاب نہیں اچھا

مل جائے تو اُس جیسا اچھا بھی نہیں کوئی
جتنا بھی وہ اچھا ہو، نایاب نہیں اچھا

یہ شعر، ظفرؔ صاحب گر ہوں بھی الگ سب سے
جنگل کے ہرے پن میں سُرخاب نہیں اچھا

انکار ہی بہتر تھا، اقرار نہیں اچھا
اب جس کے نتیجے میں بیمار نہیں اچھا

اچھا بھی وہ لگتا ہے اور، ٹھیک ہی لگتا ہے
کیا جانیے کیوں اب وہ ہر بار نہیں اچھا

دریا ہی عبور اب تو کرنا ہے کہ یہ اتنا
اُس پار تو اچھا ہے، اِس پار نہیں اچھا

کچھ اور طلب ہو گی دیدار سے آگے کی
اِس شکل میں بھی اُس کا دیدار نہیں اچھا

جو پیاس تو پی سکتے ہیں مانگ کے بھی پانی
اتنا بھی طبیعت میں پندار نہیں اچھا

بیماریٔ دل سے ہے پرہیز بہت لازم
ہونے کو تو کوئی بھی آزار نہیں اچھا

حیران و پریشاں سا پھرنا یہ محبت میں
اچھا ہے، مگر اِس کا اظہار نہیں اچھا

ہے فاصلہ بھی کافی، اور سمت بھی نامعلوم
کچھ اس لیے بھی رستہ پُرخار نہیں اچھا

شاعر ہوں ظفرؔ، میرا یوں جم کے غزل کہنا
جائز ہے اگر، اتنا طومار نہیں اچھا

گھیرے میں ہیں سب جس کے، جنجال نہیں اچھا
یہ سال نہیں اچھا، یہ سال نہیں اچھا

کچھ جیب میں پیسے بھی کم ہوتے ہیں، اور اِس پر
بازار سے ملتا ہے جو مال، نہیں اچھا

ڈاکوں کا جو عالم ہے، چوری کی جو صورت ہے
کنگال ہی اچھا ہے، خوش حال نہیں اچھا

دراصل تو یہ ساری موسم کی شرارت ہے
ماضی کے تو کیا کہنے، بس حال نہیں اچھا

رونق بھی اسی سے ہے، برکت بھی اِسی سے ہے
اچھا نہیں وہ جس کا سُسرال نہیں اچھا

کچھ شکل ہماری بھی ویسی نہ رہی ہو گی
کچھ آپ کے شیشے میں یہ بال نہیں اچھا

دروازے، دریچے تو لرزائے رکھے، لیکن
دل کے لیے اتنا بھی بھونچال نہیں اچھا

مضمون پرانا بھی آخر تو پرانا ہے
جیسا بھی ہو، یہ سبزہ پامال نہیں اچھا

اب اور ہوا چلتی کیا تیرہ نصیبی کی
دیکھو تو ظفرؔ کا بھی اقبال نہیں اچھا

یک طرفہ محبت کا ہنگام نہیں اچھا
دل چسپ تو ہے، لیکن یہ کام نہیں اچھا

بہتر ہے اگر گڑبڑ رہتی ہو مناسب سی
اس طرح کا یہ دل میں کہرام نہیں اچھا

شک اس میں نہیں کوئی، اچھے ہو بہت، لیکن
مجھ پر جو لگاتے ہو الزام نہیں اچھا

آغاز تو ہوتا ہے اچھا ہی بہت، لیکن
اس طرح کے کاموں کا انجام نہیں اچھا

مہنگا بھی ہے اور پکڑے جانے کا بھی امکاں ہے
یہ شغل کسی صورت ہر شام نہیں اچھا

کرنا ہے یہ کام آخر جب قبر میں جا کر بھی
اس عمر میں اتنا بھی آرام نہیں اچھا

اس میں بھی سبھی مل کر ننگے ہی نہاتے ہیں
اپنی بھی سیاست کا حمام نہیں اچھا

مشہور ہُوا ہے جو شیطان سے بھی بڑھ کر
شاید کہ بدل ڈالوں، یہ نام نہیں اچھا

یہ شاعری جیسی بھی کرتے ہو، ظفرؔ صاحب
پوشاک تو ہے خاصی، پیغام نہیں اچھا

جب تک میں کسی ردّ و بدل سے نہیں گزرا
اس پھیلے ہوئے دشتِ غزل سے نہیں گزرا

اَوروں کی تو کیا مجھ کو خبر ہو، مگر اے دوست
تیرے بھی جو میں رنگ محل سے نہیں گزرا

آگے ہے وہی مجھ سے تگ و تازِ ہوس میں
اک بار بھی جو میری بغل سے نہیں گزرا

میں جیت کے بھی ہار ہی جاؤں گا سراسر
میں اِس لیے بھی جنگ و جدل سے نہیں گزرا

ہو جائیں پریشاں نہ مرے ہی خس و خاشاک
کچھ اِس لیے بکھرے ہُوئے پَل سے نہیں گزرا

معلوم بھی تھے کچھ مجھے مرنے کے قرینے
ویسے بھی کچھ اسباب و علل سے نہیں گزرا

اَوروں کی ہو کیا راہ نمائی کہ اگر میں
اپنی ہی کسی راہِ عمل سے نہیں گزرا

ہونا ہے ابھی کام بہت سا مرے ہاتھوں
سویا تھا اگر، خوابِ اَجل سے نہیں گزرا

کچھ میں بھی، ظفرؔ اتنے مسائل کے علاوہ
اک مسئلہ ہوں جو ابھی حل سے نہیں گزرا

میں مرحلۂ تشنہ لبی سے نہیں گزرا
کچھ ویسے بھی نہر اور ندی سے نہیں گزرا

کچھ زندہ دلی کا بھی تقاضا تھا یہی کچھ
کچھ میں بھی تری مُردہ دِلی سے نہیں گزرا

کچھ منتظر اپنا نہیں تھا وہ بھی زیادہ
کچھ آپ بھی میں اُس کی گلی سے نہیں گزرا

ویسے بھی رکاوٹ سی کوئی تھی مرے آگے
اِس راہ سے کچھ اپنی کمی سے نہیں گزرا

اسباب تو پیدا تھے گزرنے کے وہاں سے
میں اپنی ہی آشفتہ سری سے نہیں گزرا

بھیجا بھی گیا مجھ کو یہاں وقت سے پہلے
دُنیا سے بھی آہستہ روی سے نہیں گزرا

نیکی مری توفیق نہیں تھی، سو نہیں کی
کچھ خود میں کمی تھی کہ بدی سے نہیں گزرا

پہنچا نہیں منزل پہ تو حیراں نہ ہو کوئی
رستہ تھا جو معلوم، اسی سے نہیں گزرا

جیسی بھی ظفرؔ تھی یہ گزرگاہِ محبت
اک عمر تو میں اپنے ہی جی سے نہیں گزرا

دیکھا نہیں میں نے کہ جدا سے نہیں گزرا
خوشبو کا تماشا جو ہوا سے نہیں گزرا

موجود ہے، دیکھ اِس میں بھی ملبوس کا ہر رنگ
جو جسم ابھی تیری قبا سے نہیں گزرا

دروازہ تو بن سکتا تھا اِس میں کسی صورت
میں خود تری دیوارِ حیا سے نہیں گزرا

کچھ اِس کا اشارہ بھی نہیں تھا مری خاطر
یا میں ہی وہاں تنگیٔ جا سے نہیں گزرا

آئی ہے مرے گھونسلے تک اُس کی چمک سی
بجلی کا کرشمہ جو گھٹا سے نہیں گزرا

اُس کو خبرِ خلق بھی ملتی تو کہاں سے
جو مرحلۂ خوفِ خدا سے نہیں گزرا

مایوس بھی ہوں اور مجھے اُمید بھی کچھ ہے
فارغ ہوں دوا سے کہ دعا سے نہیں گزرا

کچھ لفظ ہیں جو قید کیے رکھتے ہیں سب کو
اچھا رہا جو وہمِ وفا سے نہیں گزرا

لادوں گا، ظفرؔ اپنا ہی میں بوجھ کمر پر
کچھ اِس لیے بھی دشتِ اَنا سے نہیں گزرا

جو شور بیاباں میں ہے، بَن سے نہیں گزرا
دیوانہ ابھی اُس کے چمن سے نہیں گزرا

کیا راز ہے جو اُس کے بلاؤز میں ہے مستور
کیا رنگ ہے جو اُس کے بدن سے نہیں گزرا

اُس کے گُل و گلزار بھی بیگانہ ہیں اور میں
اپنے بھی ابھی دشت و دَمن سے نہیں گزرا

معلوم نہیں دل کے ہیں کس طرح کے احوال
مدّت ہُوئی میں اپنے وطن سے نہیں گزرا

یہ فرق مناسب نہیں دونوں میں، وگرنہ
سورج ہے تو کیوں اپنی کرن سے نہیں گزرا

اُس پھول پہ مجھ سے کبھی ڈالا نہ گیا ہاتھ
جب تک کہ میں کانٹے کی چبھن سے نہیں گزرا

پھر بھی یہاں اب میرا گزارہ نہیں، ورنہ
جاں سے نہیں گزرا ہوں کہ تن سے نہیں گزرا

چلتا ہوں ذرا سا تو بدلتی ہے مری چال
تادیر میں اپنے بھی چلن سے نہیں گزرا

پایا ہی نہیں طرحِ نئی کا کہیں کچھ بھید
جب تک میں ظفرؔ طرزِ کُہن سے نہیں گزرا

میں یوں بھی کبھی رنجِ گراں سے نہیں گزرا
شاید کہیں پہلے تو یہاں سے نہیں گزرا

پھرتا ہے کہیں میرے شب و روز کے نزدیک
اک ذائقہ جو میری زباں سے نہیں گزرا

کیا لفظ تھا جو رُک گیا تھا میرے لبوں پر
کیا وہم تھا جو میرے گماں سے نہیں گزرا

محفوظ ہو تو ہر طرح سے اِس دل میں رہا ہوں
میں پھر بھی اِس کنجِ اماں سے نہیں گزرا

اَزبر تھے مجھے اُس کے خد و خال پرانے
میں اِس لیے بھی خوابِ رواں سے نہیں نکلا

یہ راستے پھیلے ہوئے ہیں سب مرے اندر
گزرا ہوں وہاں سے بھی جہاں سے نہیں گزرا

کچھ لوگ مرے سامنے آئے نہیں اب تک
اک لفظ ابھی میرے بیاں سے نہیں گزرا

اندازہ لگائیں گے سفر کا مرے کچھ لوگ
گزرا ہوں کہاں سے تو کہاں سے نہیں گزرا

دھارا وہ ظفؔر روشنیوں کا ہے بہت یاد
پھر جو کسی شب میرے مکاں سے نہیں گزرا

کیوں موجہ ہوا کا، کبھی گھر سے نہیں گزرا
مدّت ہُوئی میں اپنی نظر سے نہیں گزرا

اپنا تو پتا پائے زمانہ ہوا مجھ کو
اِس بار تو اُس کی بھی خبر سے نہیں گزرا

اب بھی اُسی جھِلمِل سے دَمکتی ہے مری رات
وہ موجۂ مہتاب کہ سر سے نہیں گزرا

گھر میں بھی رہا جان کا دَھڑکا سحر و شام
بازار میں ہی خوف و خطر سے نہیں گزرا

اَوروں کو تو پیش آئے کئی سخت مقامات
اک میں ہی بہت زیر و زبر سے نہیں گزرا

دیوار پہ ہی میں یہاں دیتا رہا دستک
چوپٹ جو کُھلا تھا اُسی در سے نہیں گزرا

مشکل تو سفر میں مرے آتی رہی آگے
لیکن میں کسی راہ گزر سے نہیں گزرا

اِس بار مرے عیب ہی آخر مرے کام آئے
اچھا ہُوا میں دشتِ ہنر سے نہیں گزرا

مجھ کو ہی ظفرؔ، یاد نہیں ٹھیک ہے، ورنہ
گزرا ہوں اُدھر سے ہی جدھر سے نہیں گزرا

کبھی آئے تھے کہیں سے تو کہیں جانا تھا
آسماں زاد تھے، اور زیرِ زمیں جانا تھا

طبع سے اپنی ہیں مجبور، بُرا مت مانو
وہیں جائیں گے جہاں ہم نے نہیں جانا تھا

یہ سفر وہ ہے کہ حسرت ہے سفر کی دراصل
یہاں پہنچے ہی نہیں ہیں، سو یہیں جانا تھا

اِس علاقے میں ہی رہنے لگی شورش اب تو
ہم نے ہر طرح جسے زیرِ نگیں جانا تھا

شہر بھر کو وہی معلوم تھی پوری پوری
ہم نے جس بات کو صرف اپنے تئیں جانا تھا

پھر جو دیکھا تو مکاں ہی کہیں موجود نہیں
ہم نے کچھ روز سے خود جس میں مکیں جانا تھا

کچھ ہمیں بھی کوئی چیزوں سے شناسائی نہ تھی
پھول تھا اُس کا جسے زخمِ جبیں جانا تھا

پیش رفت آپ ہی ثابت ہُوئی آخر، ہم نے
کبھی جس کو سفرِ بازپسیں جانا تھا

میرے اندازے سے تھا اور بھی کچھ دُور، ظفرؔ
خوش خیالی میں جسے اپنے قریں جانا تھا

چھوڑ کر گھر کو بیابان میں کیا جانا تھا
اپنی اوقات پہ ہم نے اگر آ جانا تھا

یہ بھی تھی شامتِ اعمال ہی اپنی کہ جسے
کبھی دیکھا نہ تھا اُس نے ہمیں بھی جانا تھا

وہ جو اندر سے کوئی اور تھا، اُس نے آخر
راز یہ ہم سے بہرطور چھپا جانا تھا

شہر میں اپنی ضرورت کے لیے چھوڑتا ہوں
بات یہ اہلِ محلّہ کو بتا جانا تھا

کوئی مصروفیت اُس کے لیے بھی ڈھونڈتے ہم
اور کسی کام پہ خود کو بھی لگا جانا تھا

کوچۂ شوق سے خالی تو نکلتے نہ کہیں
سو، غلط ہی کوئی الزام اُٹھا جانا تھا

تعزیت کرتے سہولت سے ہماری یہی لوگ
فرش پر خود کو دری سا جو بچھانا جانا تھا

طبع ہی اپنی کچھ ایسی تھی کہ ناچار یہاں
ہم نے لوگوں کو رُلا اور ہنسا جانا تھا

اصلیت اپنی چھپائی نہ گئی مجھ سے، ظفرؔ
ایک پردہ تھا بچا، وہ بھی ہٹا جانا تھا

خاک نے پیاس میں جتنا بھی ترس جانا تھا
اب کے بادل نے کہیں اور برس جانا تھا

تیری آواز میں وہ لوچ نہ ہوتا بھی اگر
ہم نے ویسے بھی ترے جال میں پھنس جانا تھا

اپنی تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا یہاں
شہر میں ہم نے اُجڑنا تھا نہ بس جانا تھا

ہم نے چھوڑا ہُوا تھا نیند کے دھارے پہ اُسے
اور، بجا طور پہ یوں خواب کو خس جانا تھا

کچھ نہیں جانتے تھے، اور بہت آرام سے تھے
رائگاں خود کو، زمانے کو عبث جانا تھا

اپنا ہی بوجھ تھا اتنا کہ بالآخر ہم نے
اپنے اندر ہی اسی طرح سے دھنس جانا تھا

اپنی ہی شامتِ اعمال کے مارے ہم نے
آستیں کھولنی تھی، سانپ نے ڈس جانا تھا

شعلۂ شام نے کچھ دُور ہی رہنا تھا ابھی
اپنی آواز نے کچھ اور جھلس جانا تھا

روتے روتے اسی وقفے سے ہیں دل شاد، ظفرؔ
اپنے احوال پہ ہم نے جو یہ ہنس جانا تھا

●

خوف کو پھیلنا، خوابوں کو بکھر جانا تھا
دل میں ہر جیتی ہُوئی چیز نے مر جانا تھا

تھک گئے پاؤں تو پھر جا کے ہُوا یہ معلوم
خود سفر تھا وہ جسے خوابِ سفر جانا تھا

میں پریشاں عبث ہی میں رہا ہوں، ورنہ
سر پہ ٹھہرے ہُوئے موسم نے گزر جانا تھا

کبھی ڈٹ جانا تھا بدمست عدو کے آگے
اپنے ہی سائے سے میں نے کبھی ڈر جانا تھا

فاصلوں نے مجھے حیران بھی کرنا تھا بہت
اور پھر اپنے خلاؤں ہی سے بھر جانا تھا

راستے ہی میں پسند آ گئی کیوں منزلِ مرگ
اے مرے دل کے مسافر تجھے گھر جانا تھا

اصل سے مجھ کو بڑی لگتی تھیں اشیا اُس وقت
شاخ تھی کوئی جسے میں نے شجر جانا تھا

روکنے کے تو اشارے کی ضرورت نہیں تھی
دیکھ کر میں نے تجھے خود ہی ٹھہر جانا تھا

زخم آیا ہے جو ماتھے پہ تو پلٹا ہوں ظفرؔ
صاف دیوار تھی میں نے جسے در جانا تھا

کوئی سر پیر تھا اُس کا نہ حوالے کی خبر
نہ ہی موقع پہ کسی دیکھنے والے کی خبر

خود کو شاباش بھی مطلوب تھی دینا اُن کو
لائے ہیں آپ ہی گرتے کو سنبھالے کی خبر

قفسِ خواب میں ہیں، اتنا پتا ہے ہم کو
ہمیں چابی کا ہے معلوم نہ تالے کی خبر

میرا نقصان تو چپ چاپ کیا تھا اُس نے
اب وہ پھیلائے گا ہر سمت ازالے کی خبر

میری اور اُس کی ملاقات خبر تو ہے، مگر
سوچ لیں، ہے یہ ذرا تیز مسالے کی خبر

طبعِ نازک پہ گراں وہ بھی بہت گزری ہے
تھی کوئی چھِنے ہُوئے ایک نوالے کی خبر

رنگ سے واقعہ تبدیل نہیں ہو سکتا
وہی گورے کی بھی ہے اور وہی کالے کی خبر

غور کیجے تو نکلتی ہے ذرا شور کے ساتھ
تیرے نغمے کی خبر سے مرے نالے کی خبر

مر گیا، ٹھیک ہُوا کیا مرا لگتا تھا ظفرؔ
دینے آئے ہو مجھے کس لیے بہالے کی خبر

آئے کیا حال ہمارے کہ تمھارے کی خبر
آسماں کو نہیں معلوم ستارے کی خبر

ریت کا دشت پڑا ہے کوئی پانی کی جگہ
اور، دریا کو نہیں کوئی کنارے کی خبر

جس خبر سے ہُوئی بے زار بہت یہ دُنیا
دوسرے دن بھی چلی ہے وہ دوبارے کی خبر

اُٹھتے پانی میں ہمیں چھوڑ گیا تھا جو کبھی
نہ ملی پھر سے اُس اُترتے ہُوئے دھارے کی خبر

اُس نے تو اور شش و پنج میں ڈالا ہم کو
تھی اشارے میں کسی اور اشارے کی خبر

کیا جلوس اپنا گزرتا رہا خاموش اب کے
ختم ہونے پہ بھی آتی نہیں نعرے کی خبر

کچھ یہاں اور وہاں سے نہیں درکار اب کے
چاہیے ہے ہمیں اُس شوخ کی سارے کی خبر

پاؤں پر اپنے کھڑا ہوں، مگر اُس کے باوصف
چھاپ دیتے ہیں وہ ہر روز سہارے کی خبر

کام اپنا بھی چلاتے ظفرؔ اس سے کچھ دن
کوئی ہوتی کہیں اپنے بھی گزارے کی خبر

ایک سے ایک سہی بڑھ کے برابر کی خبر
لایئے آج تو جا کر کوئی اندر کی خبر

جب سے باہر کی طرف دھیان ہُوا ہے اپنا
تب سے ہم اور بھی رکھنے لگے ہیں گھر کی خبر

چل رہا ہے جو زمیں کا بھی ستاروں ہی سے کام
آسماں کو بھی نہیں ماہِ منوّر کی خبر

قفسِ خواب میں ہی قید پڑا ہوں کب سے
مجھ تک آتی ہی نہیں ہے مرے باہر کی خبر

چیر کر مجھ سے گزرتی ہے جو ہر شام کے ساتھ
اک ہوا رکھتی ہے خود میں کسی خنجر کی خبر

جو ہُوا ہے کہیں پیدا نہ ہویدا اب تک
کوئی دیتا نہیں ایسے کسی منظر کی خبر

گھومنے لگ گیا میں بھی جسے سُن کر یک دم
نشر ہوتی رہی ایسے کسی چکّر کی خبر

فکر دستار کی رہتی تھی شب و روز جنھیں
رکھتے تھوڑی بہت ایسے میں کوئی سر کی خبر

کس گھڑی آئے گا، اور کون سی جانب سے ظفرؔ
آج کل سر کو بھی درکار ہے پتھر کی خبر

تھی وہ دراصل مرے ہوش اُڑانے کی خبر
شہر میں اُڑتی ہُوئی سی ترے آنے کی خبر

اِس قدر بے خبری ہے کہ سراسر مرے پاس
کچھ بتانے کی خبر ہے نہ چھپانے کی خبر

گھر سے باہر میں قدم بھی نہیں رکھوں گا ابھی
پھیل جائے گی مجھے ڈھونڈ کے لانے کی خبر

تیرے آنے کا پتا بھی نہ چلا تھا مجھ کو
کہ مجھے آج مِلی ہے ترے جانے کی خبر

دُھن لگی ہے ترے احوال کی جب سے مجھ کو
رکھنی پڑتی ہے مجھے سارے گھرانے کی خبر

بوجھ اپنا بھی سنبھالا نہیں جاتا مجھ سے
کچھ اُٹھانے کی خبر ہے نہ گرانے کی خبر

اُس طرف سنگ اُچھالوں تو اِسی صورت میں
مجھے مِلتی ہے کہیں آئنہ خانے کی خبر

وہی معمول کے ڈاکے، وہی اِغوا، وہی قتل
نہیں اخبار میں کوئی بھی ٹھکانے کی خبر

بات جب تھی کہ لگاتے ظفرؔ اپنا بھی سُراغ
تم جو رکھتے تھے کبھی ایک زمانے کی خبر

اسی لیے تو ہم اتنا کہیں نہ سکتے تھے
کہ آسمانی سے پہلے زمیں نہ سکتے تھے

بدل گئی تھی یہاں خاصیت ہی پانی کی
جہاں سکے رہے اب تک، وہیں نہ سکتے تھے

کچھ اِس قدر ہمیں بے دست و پا کیا گیا تھا
یہاں کے لوگ تھے ہم اور کہیں نہ سکتے تھے

وہ آستانہ مِلا تھا بڑی تلاش کے بعد
مقامِ سجدہ جب آیا جبیں نہ سکتے تھے

پڑے جو تنگ، اندھیرے کے ہوگئے عادی
پکار کر کہیں ماہِ مبیں نہ سکتے تھے

اُٹھا سکے نہیں احسان ہم ترا، ورنہ
مکاں ہمارے لیے تھا، مکیں نہ سکتے تھے

تمھارے ظلم کا اثبات ہی کیا ہم نے
کہ اپنی وضع یہی تھی، نہیں نہ سکتے تھے

سنپولیا جو مِلا بھی کسی طرح ہم کو
تو اِس زمانے میں ہم آستیں نہ سکتے تھے

ہمارا کام بدلتا رہا، ظفؔر ہر دم
کیا ہے وہ بھی جو ہم قبل ازیں نہ سکتے تھے

کمی ہُوئی تھی کچھ ایسی، فزوں نہ سکتے تھے
نہ پوچھیے کہ ہم اِس بار کیوں نہ سکتے تھے

کھڑی ہُوئی تھی عمارت ہمارے دَم سے ابھی
اگرچہ ہم کسی صورت ستوں نہ سکتے تھے

ہمارے خواب میں سُرخی تھی اور ہی اب کے
جو خرچ ہو چکا تھا، اب وہ خوں نہ سکتے تھے

سکے نہ تھے تو کوئی اُس کی وجہ بھی ہو گی
مگر، بتا نہیں سکتے کہ یوں نہ سکتے تھے

ہمارا اِس لیے جادو نہیں چلا اُس پر
یہ کام چھوڑ چکے تھے، فسوں نہ سکتے تھے

اُڑا چکے تھے بہت خاک اپنے اندر ہی
پہنچ کے دشت میں بھی ہم جنوں نہ سکتے تھے

نئی نئی ہُوئی تھی صلح اپنی شہر کے ساتھ
سَو، چاہتے ہُوئے بھی ہم بَروں نہ سکتے تھے

ہماری طبع ہی اِس طرح کی تھی، اِس لیے ہم
کسی بھی حال میں صبر و سکوں نہ سکتے تھے

ہمارے حال میں پہلے ہی ابتری تھی بہت
ظفرؔ، ہم اِس سے زیادہ زبوں نہ سکتے تھے

زمیں سکتے تھے، اور آسماں نہ سکتے تھے
کہاں سکے ہُوئے تھے، اور کہاں نہ سکتے تھے

زمانہ گوش بر آواز ہی رہا، لیکن
ہم اہلِ خواب کوئی داستاں نہ سکتے تھے

کھُلی جب اصلیت اِس کی کسی طرح سے تو ہم
اُمیدوار نہ تھے اور گماں نہ سکتے تھے

کسی جگہ کا بھی ہوتا ہے ایک اپنا شرف
یہاں تو سکتے ہی تھے ہم، واں نہ سکتے تھے

ہماری وضع ہی ایسی تھی روزِ اوّل سے
کہ اہلِ گریہ بھی تھے اور فغاں نہ سکتے تھے

رہائش اپنی کہیں اور تھی، اِس لیے ہم
مکین ہوتے ہُوئے بھی مکاں نہ سکتے تھے

بہت مَرے ہُوئے لفظوں کا بوجھ تھا ہم پر
پڑے سِسکتے رہے اور زباں نہ سکتے تھے

ہماری بات رنگا رنگ ہی کچھ ایسی تھی
جسے ہم ایک طرح سے بیاں نہ سکتے تھے

ہوا گزرتی رہی درمیاں سے اپنے، ظفرؔ
بدن دریدہ تھے ہم، بادباں نہ سکتے تھے

زیادہ سوچتے تھے، اور عمل نہ سکتے تھے
ارادہ باندھتے رہتے تھے، چل نہ سکتے تھے

سکے تو ایسے کہ سکتے چلے گئے تھے ہم
یہ ہم ہی تھے جو کبھی ایک پل نہ سکتے تھے

بجا کہ خلق پہ رحم آ گیا تھا ہم کو، مگر
ہم اپنے سر سے کسی طور ٹل نہ سکتے تھے

جلی ہوئی تھی کوئی شمع اپنے اندر بھی
سو، اس قبیل کے پروانے جل نہ سکتے تھے

ہمیشہ پانی کے آداب کا خیال رکھا
جو ہم کناروں سے باہر اُچھل نہ سکتے تھے

جو سچ کہیں تو یہاں ہم ہی ایک تھے مشکل
جسے کسی بھی طریقے سے حل نہ سکتے تھے

کچھ آپ پر بھی تو چڑھتا ہمارا رنگ کوئی
نہیں کہ آپ کے سانچے میں ڈھل نہ سکتے تھے

یہ چاہتے تھے کہ دُنیا کہیں بدل جائے
ہم اپنے آپ کو، لیکن بدل نہ سکتے تھے

اُٹھا رکھی ہے کسی اور وقت پر ہی، ظفرؔ
وہ ایک بات جسے آج کل نہ سکتے تھے

وہ بھی اِس طرح سے کرتا نہ کنارہ ہرگز
دوسری بار نہ ہم نے ہی پکارا ہرگز

اُس کے ساتھ اپنا بھی اچھا نہیں تھا کوئی سلوک
اِس لیے بھی نہیں آیا وہ دوبارہ ہرگز

شہر میں اور بھی اَطراف ہیں اچھی خاصی
ہمیں منظور نہ تھا اُس کا اجارہ ہرگز

اپنی مرضی سے ہم اُچھلیں کہ چھلک جائیں کہیں
ساتھ لے جائے نہ ہم کو کوئی دھارا ہرگز

خود گزر جائیں تو بہتر ہے کہ اِس شہر میں اب
اور ہوتا نہیں اپنا تو گزارہ ہرگز

بیٹھے رہنے کا بھی تھا کوئی تقاضا نہ وہاں
نہ ہی اُٹھ جانے کا تھا کوئی اشارہ ہرگز

کبھی مِلتا ہے تو اُس کا ہمیں ٹکڑا ہی کوئی
کہ میسّر نہیں وہ سارے کا سارا ہرگز

یوں تو بدخُو بھی بہت ہے وہ مگر اُس کے بغیر
کچھ ہمارا بھی تو چلتا نہیں چارہ ہرگز

جس قدر بھی ظفؔر اک دوسرے کو چاہتے ہوں
نہیں آئے گا ستارے۔ پہ ستارہ ہرگز

کسی کے ساتھ فقط گفتگو نہ سکتے تھے
کہ اتنی سادہ بھی ہم آرزو نہ سکتے تھے

یہ باغ وہ ہے کہ تھا اپنے دَم قدم سے ہی سبز
سو، ہم بھی تھے جو یہاں رنگ و بو نہ سکتے تھے

تھا اُس کا مِلنا ہی ناممکنات میں شامل
نہیں یہ بات کہ ہم جستجو نہ سکتے تھے

معاملہ تھا ہماری شناخت کا ہی وہاں
کہ اور تھے کوئی، اور ہُو بہ ہُو نہ سکتے تھے

جو سچ کہیں تو ہمیں خود پہ اختیار تھا کم
ہم اس لیے بھی ترے دُو بہ دُو نہ سکتے تھے

ہم اور تھے کوئی یہ خاک بھی تھی اور کوئی
سو، ہم اِس آب و ہَوا میں نمو نہ سکتے تھے

دراصل اپنی توجہ تھی صرف ایک طرف
وگرنہ کہنے کو ہم سُو بہ سُو نہ سکتے تھے

ہمارے شعر کہ دل سے نہ آ سکے باہر
جو لفظ ہوتے ہُوئے بھی لہو نہ سکتے تھے

گڑے ہُوئے تھے ہمارے قدم زمیں میں ظفؔر
تو کیا عجب ہے جو ہم کُو بہ کُو نہ سکتے تھے

بکھر چکے تھے کچھ ایسے بہم نہ سکتے تھے
زیادہ ہو گئے تھے، اور کم نہ سکتے تھے

پھسلتے رہتے تھے کیا کیا مثالِ تودۂ برف
جَمے ہُوئے تھے اور اک جگہ جم نہ سکتے تھے

بُلا رہا تھا کوئی دُور سے ہمیں، لیکن
تھکے ہُوئے تھے بہت، دو قدم نہ سکتے تھے

ترے خیال سے خوش تھے بہت اِسی لیے ہم
ترے قریب نہ ہونے پہ غم نہ سکتے تھے

یہی معاملہ سارا تھا اپنے ہونے کا
کہ اتنا ہوتے ہُوئے دَم بہ دَم نہ سکتے تھے

کسی کو چاہتے بھی تھے، کسی سے ڈرتے بھی
خدا کی بندگی تھی، اور صنم نہ سکتے تھے

بس اتنا فرق تھا اِس بار اور عجیب کوئی
کہ وہ تو سکتا ہی تھا، صرف ہم نہ سکتے تھے

رواں رہے کسی کم زور سی روانی میں
کہ چاہتے بھی تو ہم زیر و بم نہ سکتے تھے

چلے ہُوئے کسی دھارے کے زور پر تھے، ظفرؔ
کہ رُکنا چاہتے بھی تھے تو تھم نہ سکتے تھے

روانہ ہو کے بھی گھر سے، سفر نہ سکتے تھے
قدم بڑھا بھی رہے تھے، مگر نہ سکتے تھے

زباں پہ قفل تھا اپنا ہی وہ لگایا ہُوا
کہ جانتے تھے سبھی کچھ، خبر نہ سکتے تھے

ہماری اپنی بھی مجبوریاں تھیں کچھ ایسی
کہ ڈوب جانے سے پہلے اُبھر نہ سکتے تھے

کبھی پہنچتے تھے پایانِ کار شام سے ہم
کبھی یہی تھے ہم، اور رات بھر نہ سکتے تھے

ستارہ وار جُڑے تھے تری فضا میں کہیں
جو آسمان سے نیچے اُتر نہ سکتے تھے

کسی کا تُو نے بھی ہم کو نہیں تھا رہنے دیا
اور ایک جگہ پہ ہم بھی ٹھہر نہ سکتے تھے

ہماری صبح بھی تھی، اور روشنی کے بغیر
ہمارا سایہ بھی تھا اور شجر نہ سکتے تھے

ہمارا سیلِ رواں تھا رُکا ہُوا ایسا
ہُوا تھے اور کہیں دَر بہ دَر نہ سکتے تھے

ہماری حد تھی ہمارے نہ ہونے تک ہی کہیں
اِسی قدر تھے، ظفرؔ جس قدر نہ سکتے تھے

بُھلا دیا اُسے جس کو بُھلا نہ سکتے تھے
گھر آ گئے جو کبھی واپس آ نہ سکتے تھے

گزارہ اُن کا بھی ہوتا رہا یہاں کسی طور
کہ خلق ہوتے ہُوئے جو خدا نہ سکتے تھے

وہی رہے ہیں پسینے میں تر بہ تر بھی یہاں
جو لوگ باغ ہوس کی ہوا نہ سکتے تھے

ترا خیال تو یہ تھا کہ ہم کسی صورت
ترے علاوہ کہیں اور جا نہ سکتے تھے

یہ کس طرح کے گداگر تھے ہم، کہ گلیوں میں
پھرا تو کرتے تھے، لیکن صدا نہ سکتے تھے

اِسی لیے تو ملاقات اپنی ہو نہ سکی
کہ ایک بار مِلے تو جدا نہ سکتے تھے

وہ ایک بات کہ جس کا تھا سر نہ پیر کوئی
وہ ہر کسی کو تو آخر بتا نہ سکتے تھے

بُھلا ہُوا کہ یہ گٹھڑی اُتار دی سر سے
کہ اتنا بارِ محبت اُٹھا نہ سکتے تھے

زباں بدل نہ سکے، خود بدل گئے ہیں، ظفرؔ
کہ اِس کے بعد کہیں منہ دِکھا نہ سکتے تھے

زور کم ہے نہ تگ و تاز روانی ہرگز
آگے بڑھتی نہیں پھر بھی یہ کہانی ہرگز

پیاس لوگوں کے رگ و پے سے نکلتی ہے کہاں
کھیتیوں کو جہاں مِلتا نہیں پانی ہرگز

لکھ کے بھی دیکھ لیا شوقِ ملاقات کا حال
بات بنتا نہیں حالاں کہ زبانی ہرگز

ہلکے پھُلکے بھی بہت دیکھ لیا ہے رہ کر
نہ گئی پھر بھی طبیعت کی گرانی ہرگز

اندر اندر ہی رہا ہے مرا آنا جانا
گھر سے باہر نہ ہُوئی نقل مکانی ہرگز

جرم اقبال کی توفیق ہمیں ہی تھی وہاں
اور کوئی نہ ہُوا جا کے بیانی ہرگز

وقتِ پیری بھی کوئی خواب جواں رکھتا ہے
جا کے بے شک نہیں آتی ہے جوانی ہرگز

لفظ گرداب کی صورت جو پڑے گھومتے تھے
پاس آئی نہ کہیں موجِ معانی ہرگز

کچھ سُراغ اب کے مِلے گا تو اندھیرے ہیں، ظفر
یوں نہ آئے گی نظر اُس کی نشانی ہرگز

رُک سکیں گے نہ یہ سیلاب کے دھارے ہرگز
اپنے دریا کے نہیں کوئی کنارے ہرگز

ملکیّت اور کسی کی ہیں یہ گلزار، یہ اَبر
یہ مناظر ہیں تمھارے نہ ہمارے ہرگز

شام ڈھلتی نظر آتی نہیں پہلے ایسی
جلتے بجھتے نہیں اِس طرح ستارے ہرگز

اپنے انجام سے محفوظ نہیں خانۂ خس
قید رہتے نہیں پتھر میں شرارے ہرگز

ہیں کسی اور کی خاطر یہ ادائیں مخصوص
نہیں اپنے لیے اب اُس کے اشارے ہرگز

چھوڑ بیٹھے ہو تم اپنوں کو یہاں جن کے لیے
وہ کبھی ہو نہیں سکتے ہیں تمھارے ہرگز

تبصرہ چاہتے ہو اہلِ ہوس پر اُن کا
بول سکتے نہیں جو شرم کے مارے ہرگز

جو بھی کہتا ہے وہ لوگوں سے کہے جائے کہ وہ
سوچ سکتا نہیں ایسا مرے بارے ہرگز

اِن میں اچھے بھی نظر آتے ہیں کچھ لوگ، ظفرؔ
مگر، ایسے بھی نہیں سارے کے سارے ہرگز

یوں تو دُنیا پہ نہیں اپنا اجارہ ہرگز
ہم نہ ہوتے تو نہ لگتا یہ تماشا ہرگز

اُس کی ایک اور بھی خصلت ہے جدا دوسروں سے
صرف یہ ریت نہیں صورتِ صحرا ہرگز

چاہیے اِس کے لیے آب و ہَوا ہی کچھ اور
خواب اِس خاک سے ہو گا نہیں پیدا ہرگز

چونچلے تھے۔ سبھی پانی کی فراوانی کے
آج کل راہ بدلتا نہیں دریا ہرگز

مہربانی یہ کسی اور کی لگتی ہے مجھے
کہ تمھارا تو نہیں ہے یہ طریقہ ہرگز

کیسے کہہ دو گے مرے جیسے بُرے کو اچھا
تم تو اچھوں کو بھی کہتے نہیں اچھا ہرگز

اپنا امکان کہیں اور ہی اب دیکھتا ہوں
اِس نہ ہونے میں نہیں ہے مرا ہونا ہرگز

شعر ہو گا وہی، کہے دُوں گا جسے شعر ہے یہ
کہہ دیا جس کو نہیں ہے، وہ نہ ہو گا ہرگز

دل کو سمجھا لیا ہے، جانِ ظفرؔ غم نہ کرو
اِس میں ہو گا نہیں اب شور شرابہ ہرگز

روانہ ہونے سے پہلے ہی تھکنے والے تھے
یہ ہم جو خواب سفر میں بھٹکنے والے تھے

زمیں پہ شام کا امکاں تھا دُور تک اِس بار
نہ آسماں پہ ستارے چمکنے والے تھے

سو، کیا عجب ہے کہ بے گانگی کے یہ شعلے
اگر ہماری طرف بھی لپکنے والے تھے

تمھارے نام کی تصویر کے مٹے ہُوئے نقش
ٹھہر ٹھہر کے دوبارہ بھڑکنے والے تھے

ہُوا تھا جب یہاں آغاز برف باری کا
تو وہ گلاب کہیں پر دہکنے والے تھے

کہیں ہماری ملاقات کا کچھ امکاں تھا
نہ ایک دوسرے کو بھول سکنے والے تھے

ہم اپنے آپ سے غائب تھے، اور کبھی نہ کبھی
ہوائے کوچہ و در سے جھلکنے والے تھے

کبھی ترس گئے پانی کی ایک بوند کو ہم
کبھی کناروں سے باہر چھلکنے والے تھے

ہماری بات ادا ہونے کے بجائے، ظفرؔ
ہمارے لفظ لبوں پر اَٹکنے والے تھے

وہ لوگ جاگنے والے کہ سونے والے تھے
کہیں پہ ہو گئے جو کام ہونے والے تھے

اُنھیں سپرد ہُوا تھا جو کام کر گئے ہیں
بچانے والے تھے یا وہ ڈبونے والے تھے

تمھارے شہر میں حیران ہی پھرا کیے ہم
کہ ہنسنے والوں میں شامل نہ رونے والے تھے

پھر اُس کو چھوڑ دیا شاخ پر مہکنے کو
ہم اپنے آپ میں جس کو پرونے والے تھے

جو کھیل کھیل میں ہی دل کو توڑ بیٹھے ہیں
وگرنہ اچھے بھلے ہم کھلونے والے تھے

کسی کے بسترِ سنجاب پر نظر نہ رکھی
ہم اپنے میلے کچیلے بچھونے والے تھے

گھٹا اُمڈ پڑی اور زور مینہ برسنے لگا
یہ ہم جو شہر کی دیوار دھونے والے تھے

زمیں میں چھوڑ دیا جو بھی دستیاب ہُوا
ہمیں ملے نہیں جو بیج بونے والے تھے

گنوا کے اُس کو جو سوتے ہیں اپنی نیند، ظفرؔ
سو پانے والوں سے بہتر تو کھونے والے تھے

کہاں گئے جو ترے دل میں بسنے والے تھے
کہ دُور دُور سے ہم تو ترسنے والے تھے

بکھر گئے تھے ہوا کے بغیر ہی کیا کیا
جو اپنے دشت پہ بادل برسنے والے تھے

سروں پہ دُھوپ تھی کیسی کہ شام تک جس سے
ہوا کے اپنے ہی جھونکے جھلسنے والے تھے

بھرا ہُوا تھا بہت زہر میرے اندر بھی
کچھ اپنے دشت کے کانٹے بھی ڈسنے والے تھے

گرا گئیں کسی عجلت کی آندھیاں آ کر
جو اپنے صبر کے پھل اور رسنے والے تھے

جو منہ اُٹھائے چلے جا رہے تھے خوش خوش ہم
خبر نہ تھی کسی دلدل میں دھنسنے والے تھے

بھلا ہُوا کہ وہ موسم تھا دُھند کا جب ہم
کسی کے دامِ تماشا میں پھنسنے والے تھے

وہ رونے والوں سے اچھے ہی رہ گئے شاید
جو اپنی ذات پہ ہی کُھل کے ہنسنے والے تھے

خود آ کے روک دیا پیش رونے، جب کہ ظفرؔ
کمر سفر کے لیے لوگ کسنے والے تھے

یہ شہر شام کے سانچے میں ڈھلنے والا تھا
کہ ایک اور ہی سورج نکلنے والا تھا

دہکنے والی تھی دریا کی ریت ساحل پر
تو دشت میں کوئی چشمہ اُبلنے والا تھا

کہ جس کی نشوونما میری آستیں سے ہُوئی
یہ سانپ اور طرح سے بھی پلنے والا تھا

رُکا ہُوا ہے سروں پر جو ایک مدّت سے
مرے گماں میں تو یہ وقت ٹلنے والا تھا

کنارے اپنی جگہ پر تھے، وجہ بھی یہی تھی
جو اپنے آپ ہی پانی اُچھلنے والا تھا

کئی دفعہ تو کچھ ایسا ہُوا کہ یہ منظر
بدل سکا نہیں، لیکن بدلنے والا تھا

ٹھہر گیا کہیں تو آپ راستہ دے کر
وگرنہ میں ترے پیچھے ہی چلنے والا تھا

کتابِ شعر میں اس بار جانے کیوں میں نے
لگا دیا ہے وہ کاغذ جو گلنے والا تھا

ہَوا نئی کوئی کروٹ بدل رہی تھی، ظفرؔ
بُجھا ہُوا یہ دیا پھر سے جلنے والا تھا

شریف آدمی ہی تھا جو بھرنے والا تھا
وگرنہ کام کوئی اور کرنے والا تھا

نکل گیا ہے وہی سب کو چھوڑ کر پیچھے
جو درمیان میں آکر ٹھہرنے والا تھا

اُسی نے اب کے دلیری دِکھائی ہے آخر
جو شہر بھر میں زیادہ ہی ڈرنے والا تھا

زمیں ہی مجھ کو دغا دے گئی ہے آخرِ وقت
کہ میں کہیں نہ کہیں پاؤں دھرنے والا تھا

جو ایک حرفِ تسلّی تھا اُس کے ہونٹوں پر
وہ اپنی بات سے شاید مُکرنے والا تھا

کسی سے میری ملاقات ہو چکی تھی کہیں
میں آسمان سے آخر اُترنے والا تھا

ہَوائے سبز نے ہی اُس کو روک رکھا تھا
خزاں کی موت یہ موسم جو مرنے والا تھا

غرض تھی اور کسی سے نہ تیز آندھی کو
مرا سمیٹا ہُوا ہی بکھرنے والا تھا

میں ایک اور طرف اُس کا منتظر تھا، ظفرؔ
وہ ایک اور طرف سے گزرنے والا تھا

وہی تو رونقِ منظر بڑھانے والا تھا
میں درمیاں سے جو پردہ ہٹانے والا تھا

بُلا رکھے تھے کئی اور لوگ تم نے جہاں
تمھارے پاس وہاں میں بھی آنے والا تھا

پلٹ دیا تھا رُخِ گفتگو ہی جب تم نے
میں کوئی اور فسانہ سُنانے والا تھا

نہ تھیں وہ اگلی سی مہماں نوازیاں بھی کہیں
نہ میں ہی اب وہاں بستر بچھانے والا تھا

اُسی نے مار دیا لا کے مجھ کو ساحل پر
بھنور کے منہ سے جو مجھ کو بچانے والا تھا

مجھے نکالنے آئے تھے شہر سے اُس وقت
کہ جب یہاں سے میں ازخود ہی جانے والا تھا

گری تھی برقِ بلا صرف ایک مجھ پر ہی
کہ جیسے میں ہی یہاں آشیانے والا تھا

زمین ہی نہیں غائب تھی ایک دم، جس پر
میں اپنے نام کا جھنڈا لگانے والا تھا

اک آنے والے زمانے کا ترجماں تھا ظفرؔ
اگرچہ خود کسی پچھلے زمانے والا تھا

اپنے ہی زور میں تھا روانہ لگا گیا
ہوتے ہُوئے نشاں کے نشانہ لگا گیا

دل پر کسی کی چوٹ سہاری نہ جا سکی
پتھر کے ساتھ آئنہ خانہ لگا گیا

ہم دیکھتے ہی رہ گئے رفتارِ صبح و شام
آیا نہ تھا ابھی کہ زمانہ لگا گیا

ہم نوحہ خوانیوں میں کچھ ایسے لگے رہے
وہ طرز کھو گئی، وہ ترانہ لگا گیا

دشمن کی داستاں سبھی تسلیم کر گئے
اپنا ہی جھوٹ مُوٹ فسانہ لگا گیا

اک خواب تھا کہ دل سے جدا ہو گیا کہیں
بے گانہ رہ گیا ہے، یگانہ لگا گیا

حیران تھے سبھی کہ یہ کس طرح ایک دَم
گاتے بجاتے گانا بجانا لگا گیا

اب جس کو ڈھونڈتے ہیں بُرون و دَروں یہاں
تسبیحِ روز و شب کا وہ دانہ لگا گیا

کیسی ہوا چلی، ظفرؔ اُس بزمِ خواب میں
آنا لگا گیا کبھی جانا لگا گیا

رُکی رُکی سی ایک روانی لگ سکتا ہے
دریا ہے باہر بھی پانی لگ سکتا ہے

چھوڑی ہُوئی محبت یاد بھی رہ سکتی ہے
مِٹا ہُوا بھی نقشِ ثانی لگ سکتا ہے

ایک اشارہ بھی کر جاتا ہے کام اپنا
ایک لفظ بھی یاد دہانی لگ سکتا ہے

جس کا ثانی آپ کبھی نہیں بَن سکتے ہوں
آپ کو وہ کیسے لاثانی لگ سکتا ہے

بار بار وہی ایک کہانی کہنے والا
آخر خود بھی ایک کہانی لگ سکتا ہے

آسانی میں بھی پیدا ہوتی ہے مشکل
مشکل کام بھی ایک آسانی لگ سکتا ہے

دیرینہ گھر کی بنیاد اُکھاڑنے والا
کسی نئے گھر ہی کا بانی لگ سکتا ہے

اندر سے جتنا بھی وطن دشمن ہو کوئی
اُوپر سے وہ پاکستانی لگ سکتا ہے

جس کی مکان سے تھوڑی سی بھی، ظفرؔ نسبت ہو
باہر رہ کر بھی وہ مکانی لگ سکتا ہے

چُپ رہنا بھی حال دُہائی لگ سکتا ہے
لگ سکتا ہے، میرے بھائی، لگ سکتا ہے

جو مضمون پڑھائے جاتے ہیں اب اُن میں
گُم راہی بھی راہ نمائی لگ سکتا ہے

غور سے دیکھو رنگ ملاقاتوں کے سارے
اِن میں بھی اک رنگِ جدائی لگ سکتا ہے

دل میں رفتہ رفتہ پکنے والا پودا
اچھائی بھی ایک بُرائی لگ سکتا ہے

اتنے زور شور سے صلح کرانے والا
شاید خود بھی اک بلوائی لگ سکتا ہے

جیب میں جب پیسے ہی کم ہوں تو بازار میں
یہ سستا پن بھی مہنگائی لگ سکتا ہے

ڈوب کے مرنے کی بس ہمت ہونی چاہیے
اُتھلا پانی بھی گہرائی لگ سکتا ہے

جو اُن سب پر کرتا ہو انگشت نمائی
داناؤں کو وہ سودائی لگ سکتا ہے

جرم اقبال کی کرتے ہو جو، ظفر چالاکی
یہ بھی ایک بیانِ صفائی لگ سکتا ہے

٥

بھرا ہُوا بھی خالی برتن لگ سکتا ہے
میرے جیسا دوست بھی دشمن لگ سکتا ہے

پیاس کی ساری بات ہے، پیاس لگی ہو تو پھر
ہاتھوں کا پیالہ بھی برتن لگ سکتا ہے

آنکھیں بند رکھیں تو یہی ہے اک ویرانہ
کھولیں تو گلشن بھی گلشن لگ سکتا ہے

شہر اندھیرا بھی ہے لیکن اس کا حصّہ
جو روشن نہیں وہ بھی روشن لگ سکتا ہے

جس ناطاقتی کے عالم میں پڑے ہُوئے ہیں
ایسے میں تو موم بھی آہن لگ سکتا ہے

جو خوش ہیں، اُن کے چہرے ہی بتا دیتے ہیں
جو ناراض ہے وہ بدظن بھی لگ سکتا ہے

لوگ نہ مانیں تو یہ بات الگ ہے، ورنہ
پیار محبت پر بھی قدغن لگ سکتا ہے

اپنی اصلی شکل نظر آتی ہے جس میں
دیکھ سکو تو دل بھی درپن لگ سکتا ہے

کانوں کا پردہ ہی، ظفرؔ جب رُکا ہُوا ہو
پھر تو ہمیں نغمہ بھی شیون لگ سکتا ہے

اور کسی کے ساتھ وہ جیسے لگ سکتا ہے
بس ویسے ہی ساتھ ہمارے لگ سکتا ہے

اب تو یہ حالت ہُوئی آہستہ آہستہ
کوئی بھی نزدیک تمھارے لگ سکتا ہے

خود پیچھے لگواتے ہیں کچھ لوگ، وگرنہ
ایسے کون کسی کے پیچھے لگ سکتا ہے

موسم میں آنے والی ہے وہ تبدیلی
اُوپر والا بھی اب نیچے لگ سکتا ہے

طوفانوں کا جتنا بھی رسیا ہو کوئی
ایک وقت میں وہ بھی کنارے لگ سکتا ہے

کوئی رکاوٹ نہیں ہے پیچھے آنے والو!
جس میں ہمّت ہو وہ آگے لگ سکتا ہے

کسی اُور کی طرح نہ لگنا چاہتا ہو جو
لگنا ہو تو جیسے تیسے لگ سکتا ہے

جیسے لگتا رہا ہے اتنی بار یہاں پر
ایک بار پھر اور بھی ایسے لگ سکتا ہے

کسی اُور کا کیا کرایا ہو جو سارا
کام ظفر کے ذمے کیسے لگ سکتا ہے

جلوہ کوئی بھی ہو جانانہ لگ سکتا ہے
اب سب کے پیچھے دیوانہ لگ سکتا ہے

اُس کے رنگ ہزاروں ہیں، دیکھے کوئی جا کر
اپنا ہو کر وہ بے گانہ لگ سکتا ہے

اِس محفل پر نہیں کسی کی اجارہ داری
اپنا بھی وہاں آنا جانا لگ سکتا ہے

سچی لگ سکتی ہے اُس کی رام کہانی
میرا حال احوال افسانہ لگ سکتا ہے

کسی دوست کی فاتحہ خوانی کے لیے اکثر
جاتے ہُوئے گاڑی میں گانا لگ سکتا ہے

میری وفاداری کی جانچ کے لیے وہاں پر
ناپ تول کا اک پیمانہ لگ سکتا ہے

اُسے بُھلانے کی جتنی بھی کوشش کر لو
پھر بھی اِس میں ایک زمانہ لگ سکتا ہے

بُلبُل دھوکا کھا سکتی ہے گُل کے ہاتھوں
شمع کی باتوں میں پروانہ لگ سکتا ہے

کوشش کر کے دیکھو، ظفرؔ، مشکل نہیں اِتنا
نئی نیند میں خواب پرانا لگ سکتا ہے

عام سا ایک گمان مثالی لگ سکتا ہے
بھرا ہُوا برتن بھی خالی لگ سکتا ہے

مجھے بھی کچھ معلوم نہ ہو، اور دل دیوانہ
اندر اندر ترا سوالی لگ سکتا ہے

دیکھنے والی ایک نظر درکار ہے، ورنہ
فرش نشیں کا رُتبہ عالی لگ سکتا ہے

نارسائی کا یہ سارا احساس ہے، ورنہ
مِل جائے تو چاند بھی تھالی لگ سکتا ہے

آرپار بھی دیکھنے والی آنکھ چاہیے
جس کے ذریعے جسم بھی جالی لگ سکتا ہے

اندر خوئے قناعت موسم میں نہ ہُوئی تو
پُورا سُورا پیڑ بھی ڈالی لگ سکتا ہے

نیند کا تھوڑا موڑ کاٹنے سے بھی یک دم
خواب میں کوئی چیز نرالی لگ سکتا ہے

چڑھتے چاند کا رنگ ہی سارا ایک بار تو
ڈوب چلے سورج کی لالی لگ سکتا ہے

یہ بھی ممکن ہے کہ ظفرؔ اس بے کاری میں
اک دن تیرے باغ کا مالی لگ سکتا ہے

بھرا ہُوا دریا ایک آنسو لگ سکتا ہے
کبھی کبھی سورج بھی جگنو لگ سکتا ہے

وہ جو طلسمی شہر ہے، اس کی بات نہ پوچھو
ایک طرف ہو کر بھی ہر سُو لگ سکتا ہے

اُسے مٹانے کی نیّت ہو جائے تو پھر
اتنا سارا فرق سرِ مُو لگ سکتا ہے

کسی اَور کا دوست بہ ظاہر لگتا ہے جو
اپنا بھی وہ دست و بازو لگ سکتا ہے

اس کے اپنے دھوکے ہیں، اپنی تعزیریں
اس جنگل میں شیر بھی آہُو لگ سکتا ہے

دن راہوں میں صبح و شام، کسی بھی لمحے
گولی چل سکتی ہے، چاقو لگ سکتا ہے

دل کو سمجھا لینے کی ہے بات، وگرنہ
اینٹ کا یہ تکیہ بھی زانو لگ سکتا ہے

ہو سکتی ہے یہاں صفائی ستھرائی بھی
دل کی سڑکوں پر بھی جھاڑو لگ سکتا ہے

میں ہوں، ظفرؔ وہ بُجھتا ہُوا چراغ کہ جس پر
آتے جاتے اُس کا پلّو لگ سکتا ہے

کھول کے دیکھنا، کافی آساں لگ سکتا ہے
اپنا حال کچھ اور پریشاں لگ سکتا ہے

آ سکتا بھی ہے کوئی خیرات کا ٹکڑا
کبھی کبھی یہ دل بھی داماں لگ سکتا ہے

اپنی نیّت ہی کی ساری بات ہے، گویا
وہ سَو کپڑوں میں بھی عُریاں لگ سکتا ہے

کیسا کیسا ہو سکتا ہے وہ، مَت پوچھو
حیراں کر کے اور بھی حیراں لگ سکتا ہے

لگ سکنے کی بات ہی اَور ہے، اِس حالت میں
ایک وقت میں درد بھی درماں لگ سکتا ہے

شہر کا کیا ہے، رنگ بدل سکتا ہے کچھ بھی
تیرے ہوتے ہُوئے بھی ویراں لگ سکتا ہے

اپنے پار اُترنے سے کچھ دیر ہی پہلے
خواب کنارہ بھی اک طوفاں لگ سکتا ہے

چلتی رہیں اگر ایسی ہی تُند ہوائیں
یہ گلشن بھی کبھی بیاباں لگ سکتا ہے

گھر کی صورت اب تو ظفرؔ، ہوتی ہے ایسی
ساماں ہوتا نہیں ہے، ساماں لگ سکتا ہے

کوئی خلا ہو کر بھی منظر لگ سکتا ہے
دیکھو تو باہر بھی اندر لگ سکتا ہے

دل بے کار پِھرا کرتا ہے گلیوں گلیوں
شاید تیرے پاس یہ نوکر لگ سکتا ہے

ساری بات سلوکِ محبت کی ہے خالی
اُس کا گھر بھی تو اپنا گھر لگ سکتا ہے

ایک ستارہ بھی دل میں چمکا لینے سے
یہ سارا ماحول منوّر لگ سکتا ہے

جو لگتا ہی نہیں قریب و دُور کہیں پر
چاہیں تو ہر سمت برابر لگ سکتا ہے

تھوڑی سی کوشش ہی کر لینے سے شاید
شہر یہ پہلے سے کچھ بہتر لگ سکتا ہے

اتنا اَکڑ اَکڑ کر آنے جانے سے بھی
دروازے کے اُوپر سے سر لگ سکتا ہے

اب تو میں خود کو بھی نظر آتا نہیں اکثر
کیا کوئی اتنا بھی لاغر لگ سکتا ہے

حال حسد کا ایسا ہے کہ، ظفؔر ہر لمحے
کسی طرف سے بھی یہ پتھر لگ سکتا ہے

چاہے تو کچھ اَور بھی پیارا لگ سکتا ہے
یعنی جیسا نہیں ہے، ویسا لگ سکتا ہے

بات آغاز بھی ٹھیک سے ہُوئی نہ ہو تو پھر بھی
دل کے اندر ایک تماشا لگ سکتا ہے

پہلی بار کسی سے مِل بیٹھے ہوں کہیں پر
پھر بھی کوئی اپنا اپنا لگ سکتا ہے

تازہ تغافل پر تیرے حیراں نہیں، تجھ کو
مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی اچھا لگ سکتا ہے

ایک ایسا بھی شخص ہے، اے دریائے محبت
جو پانی پی کر بھی پیاسا لگ سکتا ہے

میں بادل کے ساتھ اُڑ بھی سکتا ہوں کسی دن
دیکھنے والے ہوں تو ایسا لگ سکتا ہے

شہر کے اندر کوئی ہے بھی یا کہ نہیں ہے
باہر سے بھی یہ اندازہ لگ سکتا ہے

وہی قَرابت، وہی گُریز، وہی حیرانی
نیا کھیل بھی بہت پُرانا لگ سکتا ہے

اس ہنگامۂ ہستی میں دیکھو جو ظفؔر کو
تنہا نہیں بھی ہے، اور تنہا لگ سکتا ہے

عجیب ہی کوئی رنگ اب کے آشنائی میں تھا
وفا سے بڑھ کے مزہ اُس کی بے وفائی میں تھا

رہا نہ مجھ پہ کبھی کوئی ایک سا موسم
کبھی فراق میں تھا اور کبھی جدائی میں تھا

سب اپنی اپنی جگہ سانس روکے بیٹھے تھے
ذرا سا وقت ابھی اُس کی رونمائی میں تھا

قصور تھا کہ نہ تھا، دَھر لیا گیا میں ہی
بیان اُس کا بھی ورنہ مری صفائی میں تھا

کچھ اُس پہ میں ہی قناعت نہ کر سکا، ورنہ
خیال وخواب میں کیا کچھ مری رسائی میں تھا

میں اُس سے دُور، بہت دُور جا چکا تھا، مگر
پتا چلا کہ ابھی اُس کی پیشوائی میں تھا

کسی کے ہو گئے ہم بھی، مگر رہا باقی
وہ ایک فرق جو بستر میں اور چٹائی میں تھا

مری نظر میں نہیں آئے ساز ورخت اُس کے
کہ میں ہی مست بہت اپنی بے نوائی میں تھا

کبھی کبھی مجھے شک سا گزرتا ہے کہ ظفرؔ
مرے سِوا بھی کوئی اَور اِس خدائی میں تھا

اُمید کی کرن دلِ تنہا میں ڈال دے
نیکی کر اور پھر اسے دریا میں ڈال دے

اور اس زمین کو مجھے اب دیکھنا نہیں
یہ مُشتِ خاک چشمِ تماشا میں ڈال دے

کافی نہیں ہے خواہشِ دیدار ہی فقط
خواب ایک اور خوابِ زلیخا میں ڈال دے

جو میں گزار ہی نہ سکا ہوں کسی طرح
میری وہ عمر، عمرِ بقایا میں ڈال دے

تحریرِ خواب کو بھی سہولت ملے گی کچھ
یہ روشنائی بھی شبِ وعدہ میں ڈال دے

یہ بھی نہ ہو کہ شوقِ ملاقات کی جگہ
دل کو وہ اَور ہی کسی دُبدھا میں ڈال دے

مطلب کو ایک سمت میں رہنے نہ دے کہیں
جو اصل بات ہے وہ علاوہ میں ڈال دے

شاید اُلٹ پلٹ سے کوئی راستہ بنے
ثانی کی بات مصرعِ اُولیٰ میں ڈال دے

یہ خواب آسماں کی طرف لے نہ جا، ظفر
دُنیا کی چیز ہے، اسے دنیا میں ڈال دے

کرگل سے دھوئے ہاتھ کہ ڈھاکا لگا گیا
جو فالتو تھا، سارا علاقہ لگا گیا

دل میں پھٹا تھا کوئی پٹاخہ سا ایک رات
پھر دُور دُور تک وہ دھماکا لگا گیا

چڑھنا تھا رنگِ جوشِ جوانی کچھ اُس پہ بھی
پھر باپ کی جگہ وہاں کاکا لگا گیا

پہلے تو دل میں شور رہا خوب، اور پھر
بُھولی وہ شکل اور وہ خاکہ لگا گیا

تھوڑی بہت حیا کی رمق تھی اُس آنکھ میں
سو بھی بچا کھچا سا وہ جھاکا لگا گیا

کیوں کر لیا تھا اُس کی مسیحائی پر یقیں
جاری رہا علاج، افاقہ لگا گیا

اپنا ہی خوں نکال کے پینے سے ایک دم
صدیوں کی بھوک اور وہ فاقہ لگا گیا

اہلِ شکست سوگ منانے کو رہ گئے
اور ہر طرح کا ڈھول ڈھماکا لگا گیا

پتّا بھی اب تو آپ سے ہِلتا نہیں، ظفرؔ
پھر کیا ہُوا جو زور ہَوا کا لگا گیا

گوروں کے ساتھ ساتھ ہی کالے لگے گئے
تیرے وہ پاؤں چُومنے والے لگے گئے

ملبوسِ خاک رہ گیا جسموں پہ آخرش
وہ پیرہن، وہ شال دوشالے لگے گئے

ہم ہی نہیں ہیں شہر بدر، آ کے دیکھ لو
اب شہر کے گھروں کو بھی تالے لگے گئے

آئے تو تھے غنیم ہمیں مارنے، مگر
ہم تو وہیں ہیں، آپ ہی سالے لگے گئے

جو مستقیم تھے وہی باقی رہے یہاں
دیوار تو کھڑی رہی، جالے لگے گئے

ہم رُک گئے تھے اُن کے سبب سے جو راہ میں
جب چل پڑے تو پاؤں کے چھالے لگے گئے

بادل کی طرح خوابِ تلافی بھی اُڑ گیا
اَور اِس کے ساتھ ساتھ ازالے لگے گئے

اب داستانِ شوق زبانی ہے بیش تر
مضموں نہیں رہے، وہ مقالے لگے گئے

نام و نشان بھی نہ رہا اپنا، اے ظفرؔ
ہم چل دیئے تو اپنے حوالے لگے گئے

گانے لگے گئے کہ ترانے لگے گئے
جو کچھ بھی تھے بہانے، بہانے لگے گئے

کردار جن میں کوئی ہمارا بھی تھا کبھی
ہم سے بھی پیش تر وہ فسانے لگے گئے

اب وہ اُداس پھرنے کی ہمت نہیں رہی
یعنی فراغتوں کے زمانے لگے گئے

ملتی نہیں پناہ ہمیں اَور اب کہیں
ایسے مسافروں کے ٹھکانے لگے گئے

پانی ہے، اَور ڈوبنے والا نہیں کوئی
پتھر ہیں، اور آئنہ خانے لگے گئے

آخر کو اپنے ہاتھ میں دھاگا ہی رہ گیا
تسبیحِ خواب کے سبھی دانے لگے گئے

اظہارِ شوق اُس کا بھی سب جھوٹ مُوٹ تھا
ہم بھی فسانہ اپنے سنانے لگے گئے

اک خواب سا بُجھی ہُوئی آنکھوں میں رہ گیا
وہ محفلیں، وہ پینے، وہ کھانے لگے گئے

اب نسلِ نو کے ساتھ گزارہ ہے، اے ظفرؔ
ہم کیا کریں کہ لوگ پُرانے لگے گئے

طوفاں کے زور میں سبھی دھارے لگے گئے
اور، اُس کے ساتھ ساتھ کنارے لگے گئے

آندھی نے امتیاز نہ رکھا کوئی یہاں
ارمان سب ہمارے تمھارے لگے گئے

قائم تھے اپنی اپنی جگہ لوگ، اور لفظ
جانے لگے تو سارے کے سارے لگے گئے

ہم جیسے جو کھڑے نہیں تھے اپنے پاؤں پر
دیوار گر گئی تو سہارے لگے گئے

آخر پہ آ کے پھر گئے اپنے بیاں سے ہم
جو تھے ثبوت سب ترے بارے، لگے گئے

باقی تھی آدھی رات کہ یہ ماجرا ہُوا
بس آسمان رہ گیا، تارے لگے گئے

اہلِ فراق تو نہ رہے اپنے آپ میں
کیوں ہے کہ تیرے وصل کے مارے لگے گئے

ارمان دل میں آئے تھے اپنے قیام کو
ایسی ہَوا چلی کہ بچارے لگے گئے

بہتر، ظفؔر یہی ہے کہ اب تم بھی لگ چلو
ساتھی جو تھے تمام تمھارے، لگے گئے

کسی چیز میں ٹھونسے تم
رہنا پاسے اوسے تم

ہم وہی کمّی اور کمین
نُون، ٹوانے، کھوسے تم

لیتے ہو آ یہاں ڈکار
کھا کر چنگے چوسے تم

ہم روزہ ہی رکھ لیں گے
کھاتے پھرو سموسے تم

کام تو سارا اپنا تھا
مارے گئے بے دوسے تم

کہیں پہنچ ہی جاؤ گے
چل دو رام بھروسے تم

کُوچ بھی ہم کر جائیں تو
رہنا بے افسوسے تم

باہر ٹھنڈ بہت ہے آج
اور، ہو کوسے کوسے تم

ہم کو بھی ارداس کرو
کبھی ایک دو بوسے تم

کوئی بڑے گنجینے ہو
کیا مستور دفینے ہو

شکل دِکھاتے ہو کیسی
تم کیسے آئینے ہو

اندر سے کھدّر کھدّر
باہر سے پشمینے ہو

ہم کو پہچانا ہی نہیں
شاید کچھ نابینے ہو

آ جاتے ہو روز کے روز
ایسے بے تسکینے ہو

آنے والا سال ہو تم
گزرے ہُوئے مہینے ہو

اندر کچھ ہو، باہر کچھ
گندم ہو یا چینے ہو

چٹنی کر کے کھا جائیں
تم ایسے پُودینے ہو

گھٹیا ہے کچھ وہ بھی، ظفرؔ
تم بھی بہت کمینے ہو

پھر وہی ہونے نہ ہونے کا اشارہ ہونا
اُسی بے سُود محبت کا دوبارہ ہونا

چل پڑے خود ہی اک آسان گزرگاہ پہ ہم
ہمیں مشکل بھی نہ تھا کوئی سہارا ہونا

بھول جانا وہ سمندر کی سیاہی، اور پھر
یاد آنا وہ سفینے کا ستارہ ہونا

رفتہ رفتہ ہی محبت بھی اثر کرتی ہے
پہلی منزل ہے جہاں صرف گوارا ہونا

پاؤں پر اپنے کھڑے ہیں تو غنیمت ہے بہت
یہاں دیوار نہ ہونا ہے سہارا ہونا

سچ جو پوچھیں تو کسی طرح سے ممکن ہی نہ تھا
تیرے اِس باغ و بیاباں میں ہمارا ہونا

یہ خسِ خواب و خیالات ہی ایسا ہے کہ اب
چاہتے ہیں کسی لمحے بھی شرارہ ہونا

جوڑ دینا بھی تو ہے کام ہمارا بے شک
اپنا مقدور ہے مٹی کبھی گارا ہونا

عافیت کوش ہوں دریا کی روانی میں، ظفر
موج ہونے کا ہی مطلب ہے کنارہ ہونا

۵

ڈُم چھوٹی ہے، لنڈے ہو
رَنڈوے ہو یا رنڈے ہو

کسی کام کے نہیں رہے
ایسے گندے انڈے ہو

نیچے نیچے سے ہو گرم
اوپر اوپر ٹھنڈے ہو

کبھی بپا کرتے ہو فساد
کبھی صلح کے جھنڈے ہو

کس سے سیکھا ہے یہ کام
کس اُستاد کے چنڈے ہو

چُبھتے ہی رہتے ہو سدا
کس کیکر کے کنڈے ہو

سو سو کر کے کھائیں گے
جُوتے ہو یا گنڈھے ہو

قد ہی چھوٹا ہے اتنا
ڈانگ نہیں ہو، ڈنڈے ہو

نرم ہو اندر سے جو، ظفرؔ
یہ کیسے مُسٹنڈے ہو

راہ گیر ہی گندے ہو
دیکھ کر چلو، اندھے ہو؟

بس کا بھرا پیالہ تم
یا پھانسی کے پھندے ہو

اُس کا بھی ہے کوئی حق
جس مولا کے بندے ہو

مانگنے آ جاتے ہیں سب
کیا مسجد کے چندے ہو

کن زلفوں میں پھرا کیے
کس کنگھی کے دندے ہو

چھیل چھال کر نرم کیا
سب کو، ایسے رندے ہو

ایک ہے مطلب دونوں کا
شانے ہو یا کندھے ہو

کھول کے دیکھیں گے اک دن
ایسے کوئی پلندے ہو

ہم کو ہو منظور، ظفرؔ
جیسے گندے مندے ہو

ہر گاڑی میں جَوتے ہو
بندے ہو یا کھوتے ہو؟

ہنس کر کیا کرو کچھ بات
کیسے روتے دھوتے ہو

پڑے ہو کیسے کاموں میں
کسی دادا کے پوتے ہو

دل ہی نہیں رہا، بھائی
تم دُنیا کو روتے ہو

بِھیڑ ہے بھائیوں بہنوں کی
میں سمجھا اکلوتے ہو

آنکھیں پِھیر رکھی ہیں کیوں
دل بَر ہو یا طوطے ہو؟

جس پر ہُوا نہ کبھی عمل
ایک ایسے سمجھوتے ہو

گھوڑیاں رکھ لی ہیں ساری
گھوڑے بیچ کے سوتے ہو

پتھریلی مٹّی ہے، ظفرؔ
بیج کہاں پہ بوتے ہو

اپنا آپ بکھرتے دیکھتا رہتا ہوں
کیا کچھ ڈرتے ڈرتے دیکھتا رہتا ہوں

گھوڑوں گھوڑیوں کو کھیتوں کھلیانوں میں
شب بھر چُگتے چرتے دیکھتا رہتا ہوں

صلح صفائی کے بھی علَم برداروں کو
ہر دَم لڑتے مرتے دیکھتا رہتا ہوں

شام اُترتے ہی لفظوں اور لمحوں کو
بیچوں بیچ گزرتے دیکھتا رہتا ہوں

محنت مجھے پسند ہے، میں مزدوروں کو
دن بھر محنت کرتے دیکھتا رہتا ہوں

لہریں لیتا اک دریا ہے کہیں خود کو
جس کے پار اُترتے دیکھتا رہتا ہوں

کون مسافر ہیں، دُھندلاہٹ میں جن کو
پاؤں ہوا پر دَھرتے دیکھتا رہتا ہوں

سورج کوئی ہے میرے اندر، جس کو
ڈوبتے اور اُبھرتے دیکھتا رہتا ہوں

اب تو اپنے بِگڑے سارے کام، ظفرؔ
اپنے آپ سنورتے دیکھتا رہتا ہوں

باہر آیا ہوں بس اتنے ہی خسارے کے لیے
خس کوئی چاہیے سورج کے شرارے کے لیے

کوئی منظر مرے اندر ہی رواں رہتا ہے
میں کہ آنکھیں نہیں رکھتا ہوں نظارے کے لیے

آ کہ میں کرسکوں اک روز کہیں اس کے سپرد
اپنی تصویر بناتا ہوں ستارے کے لیے

سانس لینے کے لیے تازہ ہوا چاہتا ہوں
بے گھری چاہیے ہے ایک گزارے کے لیے

اب جہاں شور ہے، کہرام ہے، آوازے ہیں
منتظر ہوں میں وہاں ایک اشارے کے لیے

خود تو میں اپنے لیے کچھ نہیں کر پایا ہوں
کرتا رہتا ہوں دعائیں سی تمھارے کے لیے

مجھے موجیں ہی علیحدہ نہیں ہونے دیتیں
زور کرتا ہوں بہت میں تو کنارے کے لیے

ڈرتا رہتا ہوں کہ گر جاؤں نہ خود ساتھ اُس کے
رُک تو جاتا ہوں ترا بوجھ اُتارے کے لیے

عشق ٹکڑوں کا سزاوار نہیں ہے، سو ظفرؔ
بات اُس شوخ سے کرنا کبھی سارے کے لیے

شورِ دریا کو مہیّا تھا روانی کے لیے
ڈوبنے والے ترستے رہے پانی کے لیے

میں زمانے کو سُنانے کے تو قابل ہی نہیں
کوئی عنوان ہی مِل جائے کہانی کے لیے

چل دیے آپ ہی دروازہ کُھلا چھوڑ کے ہم
کوئی سامان نہ تھا نقل مکانی کے لیے

تاکہ مِل جائے کہیں کوئی تمھیں میرا سُراغ
خود کھڑا ہوں ترے رستے پہ نشانی کے لیے

روتا رہتا ہوں کہ یہ کھیتیاں شاداب رہیں
میری آنکھیں ہیں فقط آب رسانی کے لیے

دل جو رہتا ہے پریشان پریشان مرا
ہے یہ کافی مری آشفتہ بیانی کے لیے

اِس قدر اُس کے اشارات ہیں واضح، کہ نہیں
اب تو الفاظ بھی درکار معانی کے لیے

لکھ دیا کھول کے سب، کوئی پڑھے یا نہ پڑھے
کچھ بچا ہی نہیں پیغامِ زبانی کے لیے

سخن آرائی کا یہ حال ہے اپنا، کہ ظفرؔ
پہلا مصرع ہی نہیں مصرعِ ثانی کے لیے

آتی ہُوئی رُتوں کا پتا دینا چاہیے
گزری ہے جو بھی، اُس کو بُھلا دینا چاہیے

برکت اگر نہیں حرکت کے بغیر کچھ
پیچھے کوئی کسی کے لگا دینا چاہیے

جب دشمنی ہو پاؤں جمانے کے آس پاس
تب ہاتھ دوستی کا بڑھا دینا چاہیے

لے جائیں نامہ ہائے محبت جہاں تہاں
سارے کبوتروں کو اُڑا دینا چاہیے

تحریر کوئی اور ہی درکار ہے یہاں
دیوار کے لکھے کو مٹا دینا چاہیے

شرم و حیا بھی خوب ہے، لیکن کبھی کبھی
پردہ یہ درمیاں سے ہٹا دینا چاہیے

سارے تماش بین ہیں یہ لوگ، اِنھیں کوئی
کرتب کبھی کبھار دِکھا دینا چاہیے

اچھے نہیں ہیں شہر کے حالات کچھ ابھی
جاگے ہُوؤں کو پھر سے سُلا دینا چاہیے

یہ خواب ہے تو پھر کہیں پہنچے بھی، اے ظفرؔ
یہ خون ہے تو اس کو بہا دینا چاہیے

وہم سا اعتبار میں دیکھا
کیا ہے جو آر پار میں دیکھا

نظر آتا وہ کیا کہ میں نے اُسے
دُھند میں اور غبار میں دیکھا

وہ ملاقات میں بھی تھا نہ کہیں
جو مزہ انتظار میں دیکھا

سبھی شکلیں تھیں ایک ہی جیسی
میں نے اُس کو ہزار میں دیکھا

اِس سے پہلے کہیں نہ تھا موجود
رنگ جو رنگ دار میں دیکھا

خامشی آبشار سے نکلی
شور سا کوہسار میں دیکھا

جو دِکھائی دیا شروع میں ہی
وہی پایانِ کار میں دیکھا

تھا خزاں میں بھی زور شور وہی
جو کرشمہ بہار میں دیکھا

کسی گنتی ہی میں نہ تھا جو ظفرؔ
وہ شمار و قطار میں دیکھا

یہ بھی سچ ہے اُس کے انداز بھول جاتا ہوں
اپنی بھی تو اکثر آواز بھول جاتا ہوں

مجھ میں ہے بھی اُس سے اظہارِ عشق کی جرأت
پاس جا کے لیکن الفاظ بھول جاتا ہوں

ساحری بھی سیکھی ہے اُس کا توڑ بھی، لیکن
وقت پر ہی سارا اعجاز بھول جاتا ہوں

دل جلاتی رہتی ہے صبح و شام رُسوائی
جو ملے ہیں اب تک اعزاز بھول جاتا ہوں

دشمنوں کو رکھتا ہوں سر پہ میں سوار اکثر
جس قدر ہیں میرے دم ساز بھول جاتا ہوں

عقل کی بہت باتیں سیکھتا ہوں روزانہ
بعض یاد رہتی ہیں، بعض بھول جاتا ہوں

کس سے کیا چھپانا ہے، کس کو کیا بتانا ہے
رازداں بناتا ہوں، راز بھول جاتا ہوں

کچھ دماغ کا میرے ضعف بھی ہے اور میں کچھ
اپنی بے نیازی میں ناز بھول جاتا ہوں

ہے ظفرؔ کچھ ایسی ہی دل میں حُسن کی ہیبت
اُس کے سامنے سب انداز بھول جاتا ہوں

حال بھول جاتا ہوں، قال بھول جاتا ہوں
زندگی کے سارے جنجال بھول جاتا ہوں

جب رُکا ہُوا منظر یاد کوئی آتا ہے
چلتے چلتے میں اپنی چال بھول جاتا ہوں

واپسی پہ اکثر میں شام کے اندھیرے میں
اپنے آشیانے کی ڈال بھول جاتا ہوں

صرف و نحو کے چکّر سے نکل نہیں سکتا
اسم یاد کر کے افعال بھول جاتا ہوں

دُھواں پھیل جاتا ہے ذہن کے کناروں پر
جانے بوجھے چہرے، اشکال بھول جاتا ہوں

دل کو تازہ رکھتا ہوں دوسروں کے طعنوں سے
اور اپنے سارے اعمال بھول جاتا ہوں

تاکہ پھر بھی آنے کا ٹھیک سا بہانہ ہو
اُس کے پاس اپنا رُومال بھول جاتا ہوں

کیا لکھا گیا اس میں، کیا جواب آئے گا
اُس کو نامہ کر کے ارسال بھول جاتا ہوں

کام تو ظفرؔ سارے ملتوی ہی رہتے ہیں
فال نکلوا کر میں فال بھول جاتا ہوں

کام کچھ نہیں ہے بے کار بھول جاتا ہوں
چلتے چلتے جو یہ رفتار بھول جاتا ہوں

جب کبھی جاتا ہوں اُس کی مزاج پُرسی کو
وہاں اپنا میں سب آزار بھول جاتا ہوں

اُس کے صاف انکار پر چپ سی لگ جاتی ہے کیوں
اور کس لیے میں اِصرار بھول جاتا ہوں

اُس کے، پاس جاتا ہوں کر کے خوب تیاری
اور وہاں پہنچ کر گفتار بھول جاتا ہوں

یاد وہ دِلاتا ہے بار بار جو باتیں
میں تمام باتیں ہر بار بھول جاتا ہوں

حکم سے نہیں کرتا آپ کے میں سرتابی
بھول جاتا ہوں میں سرکار بھول جاتا ہوں

جن کی چھاؤں سارا دن دُھوپ سے بچاتی ہے
شام پڑتے ہی وہ اشجار بھول جاتا ہوں

دوسروں پہ کرتا ہوں جھوٹ سچ بہت تنقید
جانے کیوں میں اپنا کردار بھول جاتا ہوں

چھوڑیئے، ظفرؔ، اپنی طبع ہی کچھ ایسی ہے
اپنے ساتھ اُس کے اقرار بھول جاتا ہوں

عمر ہی کا تحفہ ہے، عام بھول جاتا ہوں
شکل یاد رہتی ہے، نام بھول جاتا ہوں

وقت نے ہر اک شے میں دُوریاں بڑھا دی ہیں
دن گزر نہیں سکتا، شام بھول جاتا ہوں

چاند وہ چمکتا ہے کون سے اندھیرے میں
یاد رکھتے رکھتے میں بام بھول جاتا ہوں

کیا کروں کہ اب بھی تعریف یاد رہتی ہے
اور، اِس خوشی میں دُشنام بھول جاتا ہوں

پھر جواب میں مجھ سے جو سلوک ہوتا ہے
خلق پر لگا کر الزام بھول جاتا ہوں

ناپسند کرتا ہوں دوسروں کا شور و شر
دل میں مچنے والا کُہرام بھول جاتا ہوں

لفظ کو جو کرتا ہوں دو سے ایک دَم تقسیم
اور کر کے یہ سارا کام بھول جاتا ہوں

غور کرتا رہتا ہوں کُفر کی کرامت پر
اور اِسی ہوا میں اسلام بھول جاتا ہوں

ٹھیک اور غلط کیا ہے، کچھ پتا نہیں چلتا
پختگی کے لمحوں میں خام بھول جاتا ہوں

ہر روز چڑھنیاں کہ فلک سے اُترنیاں
دیکھے جو کوئی آ کے تری کام کرنیاں

کچھ یاد بھی دِلا کے نہیں اپنی سرخ روئی
تجھ سے بھی تیز تر یہ تری کہہ مکرنیاں

منہ زور چلنیوں سے زیادہ ٹھہرنیاں
خوابِ دَروں سے جاگنیاں اور ڈرنیاں

ساکت ہیں آسمان و زمیں اور دَم بہ خود
اس دل کی خاک پر یہ تری پاؤں دھرنیاں

آنکھوں کو انتظار ہی رہتا ہے، اور پھر
اِس رہ گزار سے تری اکثر گزرنیاں

منزل تو سر بہ سر کہیں پیچھے ہی رہ گئی
اب کے کچھ اِس طرح کی تھیں اپنی سفرنیاں

پانی بھی پینیاں ہیں کسی اور طرح کی
اپنی ہی طرز کی ہیں مری گھاس چرنیاں

جاری ہیں، کچھ مُراد بھی ملتی ہے یا نہیں
اپنے ہی آستانے پہ اپنی پسرنیاں

کرتے ہیں کام سوچ سمجھ کر ہی اب، ظفرؔ
معلوم کرنیوں سے جو آگے ہیں بھرنیاں

جدائی میں اتنی قرار انتظاری
خزاں میں ہے کیسی بہار انتظاری

کہیں قافلہ کھو چکا تھا ہمارا
کئی روز سے تھی غبار انتظاری

دما دم خسِ خواب کا وہ لرزنا
بہت اَوج پر تھی شرار انتظاری

کنارے پہ رُکتے ہیں ناچار سارے
پہنچتی ہے دریاؤں پار انتظاری

ہجومِ تماشا ہی کرتے ہیں اکثر
نہیں ہم میں کوئی قطار انتظاری

ابھی نااُمیدی ہے اور نارسائی
کیے جایئے اختیار انتظاری

کسی کے بھی آنے کا امکان کیا ہو
یہ ہے اصل میں انتظار انتظاری

کبھی اپنی ناکام پرواز کا غم
کبھی ہم کو اُس کی اُتار انتظار

ظفرؔ آج ممکن نہیں ہو گا آنا
کیے جاؤ بیٹھے ہزار انتظاری

ہر گھڑی رُخ بدلنیاں میری
گرنیاں اور سنبھلنیاں میری

اور اُس کی جُدائی میں یک سر
سڑنیاں اور گلنیاں میری

اُس کو ناراض کرنیاں اک دن
اور پھر ہاتھ ملنیاں میری

اُس کی محفل کی سمت جاتے ہُوئے
رُکنیاں اور چلنیاں میری

جلوہ گاہِ خیال و خواب میں وہ
شمع کی طرح جلنیاں میری

ایک سانچے سے باہر آ کر وہ
نئے سانچے میں ڈھلنیاں میری

کسی تازہ ہَوا کی حسرت میں
گھر سے، باہر نکلنیاں میری

چھوڑنے پاؤں میرے مٹّی نے
اور، چھت تک اُچھلنیاں میری

اَور، کسی کام کے بغیر، ظفؔر
اُس گلی میں ٹہلنیاں میری

چوری چوری وہ تکنیاں تیری
اور، آنکھیں جھپکنیاں تیری

کچھ مرے گھر کی سمت آتے ہُوئے
راستے میں اٹکنیاں تیری

اور، اک دن نظر بچاتے ہُوئے
دل کی گٹھڑ اُچکنیاں تیری

شام کے انتظار لمحوں میں
بام و در سے جھلکنیاں تیری

آج بھی ہیں اُسی طرح موجود
پہلی پہلی جھجکنیاں تیری

چاہنا بھی کہ ہو سکے کچھ تو
اور کچھ کر نہ سکنیاں تیری

کس جگہ جا کے اب کِھلا ہے تو
اور کدھر ہیں مہکنیاں تیری

آج دل میں بہت اندھیرا ہے
چاہیے ہیں چمکنیاں تیری

اور، یہ ساری ساری رات، ظفؔر
اُس گلی میں بھٹکنیاں تیری

چاروں اور اندھیرا ہے
آدم خور اندھیرا ہے

ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے
کیا گھنگھور اندھیرا ہے

کہیں چُرا لے گیا روشنی
ایسا چور اندھیرا ہے

جان بھی کرتا جائے اندھیری
وہ منہ زور اندھیرا ہے

کسی طرف نہیں جا سکتے
ہر سُو گور اندھیرا ہے

ناچ رہا ہے رگ رگ میں
کیسا مور اندھیرا ہے

رات گئی تو لے کر ساتھ
لائی بھور اندھیرا ہے

مستقل ہی جی کے اندر
کرتا ٹھور اندھیرا ہے

چنا جور تھا پہلے گرم
اور اب جور اندھیرا ہے

تجویز

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے نام

محبت سر بہ سر نقصان تھا میرا ظفؔر، اب کے
میں اس سے بچ بھی سکتا تھا، مگر ہونے دیا میں نے

Zafar Iqbal:
A Semi-Personal Tribute

Aftab Hussain

Zafar Iqbal is not a popular ghazal poet; neither has he ever ventured to be one. Notwithstanding some of his couplets have already become part of popular imagination and still some others have the capacity to reach and impress the general readership, he is perhaps the most talked about, even controversial, ghazal-poet among the whole lot that appeared in the post-1947 era. Credit for being in the centre-stage of discussions goes, besides his powerful interventions into modern Urdu ghazal, partially to his linguistic experimentations in the genre and in part to his prose-pieces that primarily take the art, craft and form of ghazal as their subject-matter.

Zafar Saheb and myself are a generation apart: I was still in my infancy when his maiden collection of poetry"AAB e RAWAAN" appeared, personally, I owe a three-fold relationship with him, that is, (1) as a common reader and admirer of his poetry, (2) in the privileged position of knowing him

personally and (3) in the capacity of a younger poet who has been writing in the same genre since last three decades or so. Of all these three forms of affiliation the second one is perhaps the most fragile, you may call it even insignificant, as contrary to many of my contemporary fellow-poets, I have had, unluckily, very rare occasions to see and interact with him, though his empirical being has always been of great meaning and value for me and I, even while my long-time stay abroad, managed to either be somehow in contact with him or to be posted of his well-being.

In view of critical reception, Zafar Iqbal has been extensively written on and even more talked about. But looking at the bulk of this criticism and the nature of oral appreciation of his poetry one feels that to date all - almost all - has been centred on his linguistic experimentatins either by rejecting or justifying them. No critic has ever touched on his amazingly remarkable thematic range. With his enviable mastery of words, Zafar Iqbal has incorporatied a lot of subjects hitherto alien into the repertoire of new Urdu ghazal. He himself views language at the heart of his creative process. Resultantly and quite interestingly, every thing under the Sun could be a subject-matter of ghazal. He, with his amazing craft and marvellous skill can and could include the very banal things in his ghazal and

has very successfully elevated such matter to the point of sublimity. It is said about Max Horkheimer, the chief proponent of Frankfurt School, that he could make metaphysics out of chewing gum. Zafar Iqbal is the rare example of this magical mastery in the modern Urdu ghazal.

Like any of his junior contemporary, I had certain reservations about the liberties that he has taken with language, especially in his second collection of poetry - GULAAFTAAB. The urge on the part of an individual to alter the entire course of language was to me a radically romantic move. Quite understandably, he has made amendments in the latest edition of that book, though, he tried to justify the subsequent changes by remarking that the book had already served its purpose. These bold steps went, no doubt, a long way in emboldening his following generations of ghazal writers, but on the whole, that deliberate distortions in language could gender hardly any serious, consistent and concerted followings..

A restless soul, Zafar Iqbal sets out again and again for his adventurous peregrinations but quite cunningly he always leaves his way-back open. Whereas most of his spineless followers are lost in the labyrinthine paths they eventually take for their destination. Zafar Iqbal is a craftman par excellence. Hardly any of his contemporaries has explored the

astonishingly variegated ways to express in this closed genre of ghazal. The sharp and chiselled lines of his couplets are mostly in prose-order and even at the occasion when the first line relies on the one that follows it, it is not without some strong tactics.

Zafar Iqbal is perhaps the only major poet who has always maintained a very alive, lively and meaningful rapport with different generations of poets that came after him. As a young poet he himself would lock horns with his senior contemporaries. Especially, he was at odds with his illustrious predecessor Nasir Kazmi as the soft and soulful strain of Kazmi's ghazal that sometimes verges on self-pity - was a thing apart to his own vibrant, vigorous and full-blooded poetry.

He can't resist appreciating a budding poet with a slightest spark, promise or potential. He discusses younger poets, challenges them and at times even provokes them. That generates controversy and sometimes even sharp reactions. A few years back a whole book of ghazals was anonymously authored in the form of parody to his ghazals.

Interestingly, he was first to welcome this move and worte an appreciative column on the book. Ghazal is his passion and he loves to indulge in any discussion that centres on this genre. if he stumbles on a piece of ghazal writtten by an obscure novice

published in an insignificant smalltown periodical, he would write a whole write-up on it. In doing so he expatiates on the art and craft of ghazal and as a student of this genre these points are of utmost interest for me.

The relationship between two generations is a matter of quite a ticklish nature that could not be defined solely in terms of any dialectical process. You have a certain fascination towards your precursors who have had already made a mark but, at the same time, you wish to detach yourself from thier system - a feeling that Harald Bloom has very aptly temred as the Anxiety of Influence.

It is generally expounded by some of my fellow writers that I am amongst the few later poets who came under the influence of his ghazal. Zafar Iqbal himself has echoed these views on some occasions. Well, Jaun Elia had located me in the classical vein of Urdu ghazal - in the tradition of the great Mir and Mushafi while Ahmed Nadeem Qasmi had put my humble efforts in the line of modern poet like Firaq, Nasir Kazmi, Athar Nafees and Shakeb Jalali, it is not me to determine the genealogy of my ghazal.

To get enamoured by a stalwart like Zafar Iqbal should surely be a matter of pride and, by the way, there is hardly to find a ghazal poet of younger generation who is free from the influences of Zafar

Iqbal. More important is to look at whether and where have I and/or my fellow-poets managed to exploit and improve upon the possibilities left by him. Zafar Saheb had very kindly sent me a set of his total works and after having gone through his oeuvre for the first time in to to I cannot deny my strong fascination for his ghazal. But, please let me add that I approach his poetry very cautiously and even sometimes deliberately misprison it. For Zafar Iqbal, if on the hand, paves way for new poets, on the other hand, he closes many doors as well. He almost exhausts the possibilities of what he lays his hand upon.

Zafar Iqbal's contirbutions cannot be overstated. He has left indelible imprints in modern Urdu ghazal. He is there and he is there to stay. We can't bypass him; we have to navigate through him.

◆◆◆

ظفر اقبال کو پڑھتے ہوئے

عابد سیال (کوانگ ژو، چائنا)

۲۴ را پریل ۲۰۱۶ء

یہ سطریں لکھنے کا محرک ظفر اقبال کی غزل کے بارے میں لکھی، کہی اور دہرائی جانے والی بعض ایسی باتیں ہیں جو غزل کے طالبِ علم کی حیثیت سے میرے لیے اُلجھن کا باعث ہیں۔ اپنے طور پر اور اپنے لیے اس اُلجھن کو سلجھانے کے لیے ایک عرصے سے کچھ لکھنے کا ارادہ تھا۔ اب جب کہ جناب ظفر اقبال کی کلیات کی نئی جلد چھپنے کو جارہی ہے، اور اُن کے حکم کے مطابق امکان ہے کہ یہ تحریر اُس کا حصہ بنے گی تو اس سے بہتر موقع اس کے لکھنے کا اور اِس سے بہتر جگہ اِس کے چھپنے کی اور کیا ہو سکتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ظفر اقبال کی غزل کے چند پہلوؤں کو اپنے طور پر سمجھنے کی ایک کوشش ہے، اگر اس سے کسی اور پڑھنے والے کا بھی کوئی مغالطہ دور ہو سکے تو اضافی خوشی کی بات ہے۔

مذکورہ اُلجھن کا آغاز اِس وقت ہوتا ہے جب ظفر صاحب کی غزل میں لسانی تشکیلات پر بات کرتے ہوئے اِس طرح کے شعر مثال کے طور پر درج کیے جاتے ہیں:

بلبل تھا یا بوم تھا
یہی دلِ مرحوم تھا

☆

اور شکر گڑھ سے بہت
دور کہیں شنگھائی تھا

☆

سبز شلوار پر قمیص
لگ رہی تھی بھلی سفید

نقش اچھے تو تھے مگر
تھی بہت منجھلی سفید

کم از کم مجھے ان اشعار میں کوئی نئی لسانی تشکیل نظر نہیں آتی۔ یہ غزل کے روایتی ذخیرۂ الفاظ اور مضامین سے بغاوت و انحراف ضرور ہے لیکن زبان کے مروج سانچے میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اس لیے ان دونوں معاملات کو الگ الگ ذرا توجہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

شعری موضوعات اور شعری زبان میں تبدیلی کی ضرورت ہر دور میں رہی اور یہ عمل ایسا نہیں کہ کسی ایک زمانے سے مخصوص ہو۔ بیس ویں صدی کے وسط میں اس ضمن میں چند حوالے خاص طور پر معروف ہوئے۔ شاعری اور خاص کر غزل کے موضوعات کے حوالے سے سلیم احمد اور شعری زبان کے حوالے سے افتخار جالب اور جیلانی کامران کے مؤقف اس حوالے سے نمایاں ہیں۔ ظفر اقبال کی شاعری میں موضوعاتی اجتہاد اور لسانی تشکیلات کو سمجھنے کے لیے ایک نظر پھر سے ان حوالوں کو دیکھنا بے محل نہ ہوگا۔ سلیم احمد لکھتے ہیں:

> "چاند، بادل اور دریا کے الفاظ کا استعمال شاعری نہیں۔ بعض لوگ جنھیں صرف اس قسم کے الفاظ پر وجد آتا ہے، شاعرانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ اور مضامین کی قیدو تخصیص کے قائل ہوتے ہیں۔ اُن کا نظریہ صحیح ہو یا غلط، میں اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا۔ خودرحمی اور رقت کے جذبات بھی مجھے زیادہ پسند نہیں ہیں۔ یہ عناصر کسی حد تک مجھے اپنے پیش رووں سے وراثت کے طور پر ملے ہیں مگر میں نے اُن سے شعوری جنگ کی ہے۔"

اس مؤقف سے واضح ہے کہ اس بغاوت یا جھنجھلاہٹ کا تعلق شاعری کے موضوعات سے ہے۔ اس اقتباس میں 'غیر شاعرانہ الفاظ' سے مراد بھی نئے الفاظ یا مرکبات کی تشکیل نہیں بلکہ ایسے الفاظ اور اُن کے وسیلے سے ایسے موضوعات ہیں جو اس وقت تک کی شاعری میں عمومی طور پر ممنوع یا کم از کم غیر مستحسن سمجھے جاتے تھے۔ اسی تسلسل میں سلیم احمد کی ایک طویل اور مسلسل غزل کے اشعار بھی معروف ہیں جس میں اُنھوں نے اُردو غزل کے روایتی پیرایوں سے بے زاری کا اظہار کیا ہے۔ میر کی عشق میں خواری سے فراق کی منزلِ غم تک کے اُردو غزل کے روایتی موضوعات سلیم احمد کو خوش نہیں آتے اور اگر وہ ربط کا اظہار کرتے بھی ہیں تو یگانہ سے جو بغاوت اور انحراف کی ایک مثال ہیں۔ اس بحث میں یہ یاد رہنا چاہیے کہ یگانہ کی بلند بانگ بغاوت اور بعض دیگر شعرا کے

ہاں تخلیقی سطح پر روایتی شعری موضوعات سے گریز کی مثالوں کے علاوہ اقبالؔ کی غزل ایک ایسی ناقابلِ فراموش مثال کے طور پر موجود ہے جس میں ان سب عناصر سے نمایاں اور اعلیٰ ترین تخلیقی سطح کا انحراف موجود ہے جس کی بات سلیم احمد نے کی ہے۔ تاہم عمومی طور پر غزل کے شعرا کا بڑا طبقہ جس سے غزل کی روایت تشکیل پاتی ہے، انھی 'وراثتی' موضوعاتی دائروں کا اسیر رہا۔ سلیم احمد کے اس طرح کے اشعار میں اس 'شعوری جنگ' کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے:

تیرا پڑتا نہیں کھاتا تو نہ لے جنسِ وفا
گھوم پھر کر اسی اک مال پہ کیوں پڑتا ہے

☆

تجھ کو چاہا تو شاعری بھی کی
آم کے آم گٹھلیوں کے دام

اور یہ شعر بھی جو مذکورہ بالا مسلسل غزل کا مقطع ہے:

گانٹھتے ہیں پھٹے ہوئے جذبات
ہو کے سید بنے سلیم چمار

اس نوع کی جو غزل سلیم احمد اور بعض دیگر شاعروں کی طرف سے پیش کی گئی اُسے 'اینٹی غزل' کہا گیا اور ابھی یہ ردوقبول (رد زیادہ، قبول کم) کے مراحل ہی میں تھی کہ سلیم احمد کی توجہات اور طرف ہو گئیں۔ دیگر شاعروں کے ہاں بھی اسے مسلکے کے طور پر نہیں لیا گیا، اس لیے بعض مثالوں کی دستیابی کے باوجود کسی اہم شاعر کے ہاں یہ عمل بنیادی شعری رویے کے طور پر نظر نہیں آتا۔

ظفر اقبال کے ہاں موضوعاتی دائرے کو توڑنے کا یہ عمل اپنے تسلسل، تواتر اور توانائی کی بدولت بھی نمایاں تر ہے اور اس آغاز سے کئی قدم آگے تک بھی جاتا ہے۔ ایک دل چسپ مثال سلیم احمد کے اس شعر کے حوالے سے دی جا سکتی ہے:

شام ہی سے سنور کے بیٹھی ہیں
حسرتیں ہیں زنانِ بازاری

غزل کی روایت میں موضوع کے ساتھ منسلک ایک اور چیز ایک خاص تہذیبی تصور بھی ہے۔ سلیم احمد کی جھنجلاہٹ موضوعاتی حدود کو تو پھلانگنے کی کوشش کرتی ہے لیکن بیان کے مخصوص تہذیبی پیرائے سے چھٹکارا پانا اُن کی کلاسیکی وضع کے لیے آسان نہیں تھا، اس لیے اُنھوں نے غیر متوقع

تشبیہ سے مضمون کا ایک رخ تو پلٹ دیا لیکن تہذیب کے مخصوص دائرے سے باہر کا لفظ لانے کی تاب اُن میں نہیں تھی۔ شاید اسی وجہ سے بہت جلد وہ اس کام سے الگ بھی ہو گئے۔ ظفر اقبال نے اس حد بندی کو بھی توڑا۔ اسی مضمون کا شعر اُن کے ہاں مختلف لفظیات میں ملتا ہے:

یوں بجی ہے پھٹی پرانی اُمید
شام کے وقت جس طرح رنڈی

لیکن وہ یہیں تک نہیں رہے، ایک اور شعر میں اس مضمون کو آگے بھی بڑھایا ہے:

مدت سے حسرتوں کی کمائی پہ ہے پڑا
یہ دل کہ مانتا نہیں کنجر کسی طرح

جو اس پورے مضمون ہی کا مضحکہ اُڑاتا ہے کہ سلیم احمد کے لیے اگر چاند، بادل، دریا کا ذکر شاعری نہیں تو اسی تسلسل میں حسرتوں کا ماتم بھی کوئی ایسی بات نہیں جسے شاعری کہا جا سکے اور اگر بدلنا ہی ہے تو غزل کے ساتھ منسلک مخصوص تہذیبی تصورات کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔

ظفر اقبال کے ہاں بھی آغاز میں یہ عمل شعوری ہی تھا لیکن جس طرح بعض عمل عادتِ ثانیہ بن کر شخصیت کا جزو ہو جاتے ہیں، اسی طرح اُن کے ہاں یہ عمل رفتہ رفتہ شعوری کی بجائے بے ساختہ اور نتیجتاً بہ تدریج ہموار ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ "آبِ رواں" ہی سے اس طرح کے شعر ملنے لگتے ہیں:

سخن سرائی تماشا ہے، شعر بندر ہے
شکم کی مار ہے، شاعر نہیں مچھندر ہے

لیکن اصل میں یہ کام "گلافتاب" سے شروع ہوا۔ اشاعت سے لے کر اب تک اُردو ادب کے نمایاں ترین نقادوں کی طرف سے اس کتاب کی تحسین و تردید میں جتنی گفتگو ہو چکی ہے، وہ بجائے خود اس کی اہمیت اور اس میں روا رکھے گئے تجربات کے قابلِ توجہ ہونے کی دلیل ہے۔ یہ کتاب اُردو غزل کو نئے مضمون کی اختراع کے ساتھ ساتھ روایتی مضامین کی تخریب و انہدام کی راہ بھی سجھاتی ہے۔ اس میں بڑی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ صدیوں سے ایک ہی حالت میں لکھے چلے جا رہے، موضوعات کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ یہ کام اس کے بعد کی کتاب "رطب و یابس" میں بھی جاری رہتا ہے۔ "آبِ رواں" جیسی مستحکم کتاب کے بعد "گلافتاب" اور "رطب و یابس" جست کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ دورانِ جست ٹھہراؤ کا تقاضا بے معنی ہے لیکن پھر بھی حیرت ہے کہ لوگ "گلافتاب" کی غزلوں میں بنیان اور شلوار والے شعر کو تو یاد رکھتے ہیں لیکن اس کے

میں اوپر موجود باقی شعروں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے جن کی تازگی اور وفور بے مثال ہے۔ ''غبار آلود سمتوں کا سراغ'' نسبتاً ایک مستحکم پڑاؤ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں بہت حد تک گزشتہ دو کتابوں کے تجربات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد ''سرِ عام'' کی حیثیت پھر زیادہ تر تجرباتی حصے پر مشتمل ہے اور ''عیب و ہنر'' میں ایک بار پھر انہدام کی بجائے اُستواری اور اختراع نمایاں ہے۔ یہ اُن کے کلیات ''اب تک'' کی پہلی جلد میں شامل مجموعے ہیں جن میں اُن کی شاعری کے ارتقائی سفر کو کسی حد تک درجہ بہ درجہ پہچانا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد تجربات کی یہ صورتیں تخلیقی یکتائی میں ڈھل گئی ہیں اور اُن کے شاعری کے سارے رنگ یوں یکے بعد دیگرے کبھی ترتیب اور کبھی تنوع کے ساتھ سامنے آتے ہیں جیسے جدید دور میں جگمگاتی روشنیوں کا تماشا ہے جس میں مختلف رنگوں کی روشنیوں کی لکیریں، دائرے، قوسیں، نقطے ڈوبتے اُبھرتے، ایک دوسرے کو کاٹتے، ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اور نئی سے نئی فضا اور ماحول کی تشکیل کرتے ہیں۔

ظفر اقبال کے ہاں روایتی موضوعاتی مداروں اور شاعرانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ کی تقسیم و تحدید سے نکلنے کی یہ کوشش اس بنا پر بھی اپنے پیش روؤں اور اپنے معاصرین سے ممتاز ہے کہ انھوں نے یہ عمل بہ یک وقت کئی جہات میں کیا۔ اُن کے ہاں مضمون کا مضحکہ اُڑانے کی وہ شکل بھی نظر آتی ہے، جو سلیم احمد کے ہاں ہے اور دیگر شاعروں کے ہاں دیکھی جاسکتی ہے:

میں جب سے بجا رہا ہوں ظفر
میرے چاروں طرف ہے کیا کیا بھینس

☆

یہی صورت ہے اب، کتاب اُس کے
سر پہ دے مار اور کہہ اقراء

☆

خیر جعلی ہے کہ فرضی ہے میاں
رکھ تو لو وصل کی عرضی ہے میاں

ظفر صاحب کے بعض شعروں پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ وہ غیر سنجیدہ ہیں۔ میرے خیال میں اسے ظرافت کہنا چاہیے جو غیر سنجیدہ نہیں ہوتی۔ شاعری میں ظرافت کی ارفع صورتیں پہلے فارسی اور بعد ازاں اُردو غزل کے بڑے شاعروں کے ہاں ملتی ہیں۔ یہ رنگ ایک طرف سماجی

زندگی کی ایک معروف قدر کو شعری عمل کا حصہ بناتا ہے اور دوسری طرف شاعر کی خوداعتمادی کا اظہار ہے جسے یقین ہے کہ کسی بھی طرح کا مضمون بیان کرنے سے شاعری کا کچھ نہیں بگڑتا۔ میر کے ہاں ''یہ آواز، اسی خانہ خراب کی سی ہے'' یا غالب کے ہاں ''مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں'' یا ''ڈھول دھپا'' جیسے شعروں میں ظرافت کا جو رنگ ہے وہ انھیں غیر سنجیدہ نہیں بناتا۔ ظفر صاحب کے اس نوع کے اشعار پڑھتے ہوئے یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ظرافت کا تعلق زبان کے زمانی اور مکانی محاورے اور روزمرہ کے ساتھ بھی گہرا ہے اور شاعر کے مزاج کے ساتھ بھی۔ اٹھارویں صدی میں دلی میں رہتے ہوئے میر کے ہاں محض ''خانہ خراب'' کہہ دینا بھی کافی ہو جاتا ہے جب کہ انیس ویں صدی میں غالب ''ڈھول دھپا'' تک آجاتے ہیں۔ بیس ویں اور اکیس ویں صدی کے سنگم پر پنجابی محاورے سے لیس اُردو لکھنے والے شاعر کو کچھ اور گنجائش دینا پڑے گی:

کسر نکالتا ہے خوب گھر پہنچتے ہی
مجھے کہ رکھتا ہے وہ اتنے پیار سے باہر

☆

میں اتنا بد معاش نہیں یعنی کھل کے بیٹھ
چبھنے لگی ہے دھوپ سویٹر اُتار دے

☆

گھر والی کے واسطے بچی نہ پیالی چائے کی
کتے بلے آن کر کھا گئے کیک مٹھائیاں

یہ آخری شعر عائلی زندگی کے جس زاویے کو سامنے لاتا ہے اس موضوع پر ظفر صاحب کے ہاں متعدد بہت عمدہ اشعار موجود ہیں جن کے تجزیے کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ موضوعات کی اسیری سے نکلنے کی ایسی کوششیں جن میں کام یابی کا رنگ زیادہ نمایاں ہے، اُردو غزل کے نئے دیاروں کے ذائقوں کی سرشاری سے معمور ہیں۔ ان میں عام بول چال کے لفظوں کے تخلیقی استعمال کا سلیقہ، مقامی زبانوں کے الفاظ کو غزل کے مصرعے کی مخصوص فضا میں کھپانے کا ہنر، اور عوامی محاورے کا ادبی برتاؤ حیرت آمیز مسرت سے دوچار کرتا ہے:

سفرِ خواب کا صلہ مانگیں
سُوجتے پَیر، کانپتی ٹانگیں

☆

روک رکھنا تھا ابھی اور یہ آواز کا رس
بیچ لینا تھا یہ سودا ذرا مہنگا کر کے

☆

رکھتے نہ تھے قدم کہ سفر سا ہمسانہ ہو
پھیلا ہوا تھا خواب خبر دام ہر طرف

☆

کچھ اور بھی سنپولیے حق دار تھے ظفرؔ
میں اپنے آپ اُٹھ کے خزانے سے آگیا

☆

اب ایسے میں باہر کہاں جائیں ہم
سو، کمرے میں ہی کارخانہ ہے اب

☆

کچھ ہوا چاہیے آخر مجھ کو
سانس کا سنکھ بجانے کے لیے

☆

لڑکیاں سنتی نہیں، دیکھتی رہتی ہیں اُسے
روز بے کار چلے جاتے ہیں لیکچر کتنے

☆

وہ روٹھتا رہے اور ہم اُسے منایا کریں
کہا تھا کس نے یہ تقسیمِ کار کرنے کو

☆

چہرے سے جھاڑ پچھلے برس کی کدورتیں
دیوار سے پرانا کیلنڈر اُتار دے

☆

مجھے کبڑا نہ سمجھو، زندگی پر
میں ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا ہوں

چاہیے) کا کام ابھی زور و شور سے شروع نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میر کو یقین تھا کہ "پڑھتے پھریں گے گلیوں میں اِن ریختوں کو لوگ" اور نظیر تو خود گلی گلی پھر کر اپنا کلام پڑھتے تھے۔ زبان کو مصفا کرنے کے اِس چکر نے عربی اور فارسی محاورے کی درستی کے نام پر مقامی زبانوں کے اظہارات کے وہ دھارے جو اس نئی زبان کی رگوں میں تازہ خون لانے کے وسیلے تھے، خشک کر دیے۔ انیس کو بھی قاری یا سامع میسر رہا کیوں کہ اس ماحول کے سامع کی زبان بھی وہی تھی۔ لیکن جب بات اس سے آگے آئی تو زبان کا معیار فارسی دانی مقرر ہوا۔ جیسے جیسے قاری کی عمومی معیاری زبان اور ادبی زبان کا فاصلہ بڑھتا گیا اسی قدر اِس بات کی ضرورت بھی بڑھتی گئی کہ کوئی ہنرور ادبی قبولیت کی قربانی دے کر اس تفاوت کو دور کرے۔ نظیر کا تجربہ سامنے ہے کہ عوامی مقبولیت کے باوجود اُن کی زبان اور اظہار کے سانچوں کو ادب کے مرکزی دھارے میں فوری قبولیت نصیب نہ ہوئی۔ نظیر کے بعد سے یہ قربانی مسلسل ٹلتی رہی۔ غالب کے مسائل اور تھے۔ وہ فارسی اُساتذہ کے مقابلے پر اُترے ہوئے تھے اور ادبی اظہار میں اُنھوں نے یہ مقابلہ کر کے دکھایا اور اُردو میں اعلیٰ ترین شعری اور ادبی اظہارات کی مثالیں قائم کیں۔ اِس مقابلے میں وہ کسی طرح کا لسانی رسک نہیں لے سکتے تھے اور نہ اُنھوں نے لیا۔ سو زبان کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ بعض شعرا کی انفرادی کوششوں کے باوجود اب مثالیں ایسی قائم ہو چکی تھیں کہ شاعری کے مرکزی دھارے کی زبان بہت حد تک مقرر ہو چکی تھی۔ اقبال کا معاملہ بالکل ہی الگ ہے کہ زبان تو کیا، شاعری ہی اُن کا بنیادی مسئلہ نہ تھا۔ اُن کے سامنے اُن کا نظامِ فکر تھا اور شاعری اظہار کا وسیلہ۔ لیکن قدرت نے اُن کو شاعر پیدا کیا تھا، سو مشرقی اور مغربی زبانوں کے اعلیٰ ترین ادبی اظہارات سے تخلیقی استفادہ کر کے اُنھوں اُردو شاعری کو اُس کی معراج تک پہنچا دیا۔ اِس ضمن میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ اقبال کے ہاں شعری زبان جس کشادگی کا احساس دلاتی ہے، اُس کے پیچھے یہی امر کارفرما ہے کہ اقبال زبان کے معاملے میں 'حساس' نہ تھے۔ مروّج لسانی حرمتوں کو بالائے طاق رکھ کر اقبال نے زبان کے 'غلط استعمال' کی تہمت قبول کی لیکن جو کچھ بنایا اُس کی ادبی قدر اِس درجہ عالی ہے جہاں یہ 'لسانی اغلاط' سند قرار پا جاتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ بعد کے شاعروں نے (غالباً خوفِ ناکامی سے) عمومی طور پر پھر سے اقبال سے پہلے کی لسانی روش کو اختیار کیا۔ زمانہ مابعد اقبال میں جو چار اہم ترین شاعر سامنے آئے، اِن میں راشد اور فیض نے اِسی لسانی روش کو بڑھاوا دیا۔ میراجی اور مجید امجد نے لسانی سانچوں کو بدلنے کی کوششیں کیں، تاہم اُردو شاعری کی بالعموم اور اُردو غزل کی بالخصوص عمومی

لسانی روش وہی رہی۔ اِس مرحلے پر اُردو میں لسانی تشکیلات کی آواز بلند ہوتی ہے۔

لسانی تشکیلات دراصل کیا ہیں، عام اُردو قاری کے لیے یہ ایک اُلجھا ہوا سوال ہے۔ ناقدین نے اِس کی جڑیں منطقی اثباتیت کے فلسفے میں تلاش کی ہیں۔ اس کی وجہ اور صورت جو بھی ہو، موجودہ بحث کا تقاضا محض اتنا ہے کہ لسانی تشکیلات کا عام سا مفہوم کیا ہے۔ اِس رجحان کے پیش کاروں میں مرکزی آواز افتخار جالب کی تھی، سو اُنھی سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''لسانی حرمتیں ایک اُسلوبِ زیست سے جنم لیتی ہیں اور اُسلوبِ زیست سماجی مفاہمتوں، لسانی تصنیفات اور لسانی عادات کو ایک وحدت دیتا ہے چوں کہ یہ تمام عناصر ایک بحران کا شکار ہیں، اِس لیے اُن کے پسِ پردہ اُسلوبِ زیست اور اُس کے حوالے سے لسانی حرمتیں اُکھڑ چکی ہیں۔ اُنھیں چیلنج کرنے کی بجائے رد کرنا چاہیے کہ یہ حرمتیں نام نہاد ہیں، عملاً اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔''

ذرا اور وضاحت کے ساتھ اور نسبتاً زیادہ قابلِ فہم اور قابلِ عمل صورت میں یہ نکتہ جیلانی کامراؔن نے یوں بیان کیا ہے:

> ''ہم اپنی نظموں میں جو زبان استعمال کرتے ہیں اس کا ایک مخصوص طرزِ بیان ہے۔ یہ طرزِ بیان مختلف ترکیبوں، استعاروں، محاوروں، الفاظ کی بندشوں اور دوسری لسانی جزئیات سے پیدا ہوتا ہے، جسے ایک لمبے عرصے سے پڑھ پڑھ کر نہ صرف کان جھنجھلا چکے ہیں بلکہ اب تو آنکھیں بھی اور آنکھوں کے ساتھ ہاتھ بھی دیکھ دیکھ کر اور لکھ لکھ کر تھک چکے ہیں۔''

یعنی یہاں بنیادی بات نئے موضوع، نئے مضمون یا نئے لفظ کی نہیں۔ نہ مطمحِ نظر یہ ہے کہ کسی ایسے ذخیرۂ الفاظ کو شاعری میں داخل کیا جائے جو اِس سے قبل استعمال نہیں ہوا۔ ظاہر ہے نیا لفظ کسی حد تک نیا مضمون بھی لے کر آتا ہے۔ سو اگر تقاضا یہ نہیں ہے تو اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بات موضوعات کی نہیں بلکہ موجود لفظوں کی نئی ترتیب سے نئے یا مختلف لسانی سانچوں کی ہے۔ جیلانی کامراؔن نے جو لسانی جزئیات گنوائی ہیں، ان میں ترکیبوں، استعاروں، محاوروں اور الفاظ کی بندشوں کا ذکر ہے۔ گویا لسانی تشکیلات کا مفہوم نئے مضمون کا نہیں بلکہ زبان کی نئی تشکیل کا ہے۔ یہ بات یوں بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اہلِ جدیدیت کے نزدیک جدید تخلیق کار کے پاس زندگی

کی نئی تعبیروں، نئے انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور دیگر گوناگوں تصورات کی شکل میں تازہ افکار کا وسیع خزانہ موجود ہے۔ مسئلہ زبان کا ہے کہ روایتی شعری زبان میں اس پیچیدگی کی ترسیل ممکن نہیں۔ سو فکر کو نہیں، طرزِ بیان کو نیا کرنے کی ضرورت ہے اور یہاں طرزِ بیان بھی کلاسیکی معنی میں نہیں کہ محض علم بدیع و بیان تک محدود ہو، بلکہ اس کی بنیاد لسانی تجربات پر اُستوار ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں 'اینٹی غزل' کا علاقہ 'نئی لسانی تشکیلات' سے جدا ہوتا ہے۔ اب ایک نظر افتخار جالب کے ہاں اُس خواب کو تعبیر کرنے کی کوشش بھی دیکھتے ہیں۔ اُن کی نظم ''چومتا پانی، پانی پانی'' اِن سطروں پر ختم ہوتی ہے:

اعصاب تشنج پھیلتی بے رخ باتوں کی تردید قیامت کر بھی چکو
یہ حادثہ دائرہ سایہ سمٹتا سرپٹ بھاگتے قدموں کی لَو پر جل بھن راکھ ہو
شعلہ تھر کتا ریڑھ کی ہڈی سے مغز کے حکم سلاسل چاٹتا
دن پانے کی لغزش کرلے کرہی لے مجبوری آلیتی ہے
چوگردی گردش راکھ قرینے کی یکجائی تمثیل بظاہر کی تائید میں رکھتی ہے
انگلیاں انگلیاں، باتیں باتیں، پسینہ پسینہ، باقی باقی
اور بے چارگی
تاہم تو یہ تیقن ترک تغافل ٹھہرے
قول قیامت آنے کے جتن کرے تقریب تماشا ڈھونڈے
چھپی رہے، تڑپائے، تڑپے

اس اقتباس میں کئی مقامات گہرے مطالعے کے متقاضی ہو جاتے ہیں جب اسے یہ سمجھ کر پڑھا جائے کہ اس میں لفظوں کو مختلف فکری پہلوؤں کے انعکاس کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش اس ترسیل میں کامیاب ہے یا نہیں، کم از کم شاعر کا لسانی مؤقف ضرور واضح کرتی ہے۔

جہاں تک میں سمجھا ہوں شاعر کے ذہن میں واضح ہے کہ فکر یا موضوع کا نمایاں حصہ تاثر پر مبنی ہوتا ہے اور تاثر عموماً لفظ کے معنی سے نہیں، اس کے استعمال سے واضح ہوتا ہے۔ یوں عمومی معنی اور تاثر کا حاصل جمع تخصیصی معنی ہوتا ہے جو اس متن میں شاعر کا منشا ہوتا ہے۔ لہٰذا لفظوں کی ترتیب، نشست، اصوات وغیرہ تاثر کی ترسیل میں معاون ہوتی ہیں اور اگر یہ سب کچھ روایتی لسانی سانچوں کو استعمال کرتے ہوئے کیا جائے تو کسی نئے تاثر کی ترسیل ممکن نہیں۔ سو ان ٹکڑوں کو دیکھیے جن میں اصوات کی تکرار ہے۔ لفظ کی ابتدائی صوت کی تکرار میں ''بے رخ باتوں''، ''قول

قیامت''، ''تقریب تماشا''، اور یہ طویل ٹکڑا ''تاہم تو یہ تیقن ترکِ تغافل''؛ درمیانی صوت کی تکرار میں ''چوگردی کی گردش'' اور اختتامی صوت کی تکرار میں ''حادثہ دائرہ سایہ سمٹتا'' اور ''چھپی رہے، تڑپائے، تڑپے'' دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی لفظ کی تکرار کے ضمن میں یہ لائن ''انگلیاں انگلیاں، باتیں باتیں، پسینہ پسینہ، باقی باقی'' قابلِ توجہ ہے۔ ایک لفظ کے مختلف اشتقاقات دہرانے کے حوالے سے ''تڑپائے، تڑپے'' والا ٹکڑا دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد یہ پوری لائن ملاحظہ ہو جس میں رموزِ اوقاف کو یکسر اڑا دیا گیا ہے: ''چوگردی کی گردش راکھ قرینے کی یک جائی تمثیل بہ ظاہر کی تائید میں رکھتی ہے''، جس میں یہ متعین کرنا بہت مشکل ہے کہ کون سا لفظ دراصل کس لفظ کے ساتھ ہے، کون سا بہ طور اسم استعمال ہوا، اور کون سا بہ طور صفت یا کسی دیگر لسانی جزو کے طور پر۔ لسانی تشکیلات کی یہ ناکام تجرباتی صورت کہیں پہنچاتی نہیں، تاہم کچھ سجھاتی ضرور ہے اور زمانہ مابعد میں لکھی جانے والی نظموں کا مطالعہ بہ خوبی احساس دلاتا ہے کہ جہاں جہاں اور جس جس شاعر کے ہاں یہ صورتیں کام یابی کے ساتھ استعمال ہوئیں، وہاں شعری تاثر کی ترسیل کا وسیلہ ثابت ہوئیں۔ یہاں ایک بات یہ بھی کی جاتی ہے کہ کیا اس طرح کے وسائل اس سے پہلے کے شعرا کے ہاں نہیں ملتے۔ جواب یہ ہے کہ ضرور ملتے ہیں لیکن اس طور نہیں ملتے۔ ایسے ہی جیسے علامت، تمثال وغیرہ کا استعمال ادب میں کوئی نئی چیز نہیں لیکن جس معنی میں، جس التزام کے ساتھ اور جس نئے تناظر میں ان وسائل کا استعمال جدید دور میں ہوا، پہلے سے بہت مختلف اور نیا ہے۔

ظفر اقبال کے ہاں مذکورہ بالا لسانی تجربات کی نوعیت کو دیکھا جائے تو یہ اس خام صورت میں بھی ملتے ہیں جیسے افتخار جالب کی نظم میں ہیں، اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر نیم پختہ صورت میں بھی ملتے ہیں اور بالآخر اپنے درجۂ کمال پر بھی۔ مثال کے طور پر ایک دو غزلوں میں تکرارِ صوت کی شعوری تجرباتی صورت ملاحظہ ہو:

پتھر پکار پائینچہ پیچاک سانولی
گھونگھٹ گھٹاؤں گھاس چندن چاک سانولی
موسم مہار سوگ ثمر نکس رقص راز
پت پردہ شاخ شرم جھلک جھاک سانولی
کھل کھیل نقش ناز گوم گن گرہ گداز
بت بند مرگ مند ستھن ساک سانولی

☆

پتھر پیرہن رُت رہا باردا
جنم جستجو جابجا باردا
مگن موت مستور خونخوار خواب
سفر سبز نم نارسا باردا

ان جیسے تجرباتی شعروں کے بارے میں یہ باتیں بھی ہوتی ہیں کہ سرے سے شعر بنا ہی نہیں یا یہ کہ غیر معیاری شاعری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تجرباتی حالت کے شعر ہیں۔ آرکسٹرا پر دھن بناتے ہوئے موسیقار بعض اوقات سارے سازوں کو خاموش کرا کے کسی ایک ساز پر سماعت کا ارتکاز کرتا ہے اور اندازہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مکمل دھن کی مجموعی فضا میں اس ساز کا عمل دخل کتنا اور کیسا ہوگا۔ ان شعروں میں بھی فوری معنی کو معطل یا مؤخر کر کے اصوات اور الفاظ کے دروبست کو سمجھنے سمجھانے اور دیکھنے دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔ اور اگر آپ لسانی ساخت کے ضمن میں کچھ نیا کرنا چاہتے ہیں تو یہ ناگزیر ہے۔ باقی رہی بات 'شعر بنا ہے کہ نہیں بنا' تو یہ معاملہ ایسا پیچیدہ نہیں۔ جہاں تجربہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ہوگا وہاں لسانی ساخت مستحکم رہتی ہے، توجہ مضمون پر ہے جو اگر اعلیٰ یا بہت اعلیٰ نہ نکلے اور خام رہ جائے تو زیادہ سے زیادہ مضمون ہی پھیکا ہوگا، شعر کا روایتی ڈھانچا بہر حال مکمل ہو ہی جائے گا۔ لیکن تجربہ اگر لسانی ہے تو خام یا نیم پختہ رہ جانے کی صورت میں اس میں روایتی شعر جیسی تکملیت کی توقع رکھنا تجربے کی نوعیت کو نہ سمجھنے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے ان تجرباتی شعروں کو پڑھتے ہوئے یہ توقع ہی نہیں رکھنی چاہیے یہ روایتی نحوی ساخت کے اعتبار سے 'معیاری' ہوں گے۔ یہ ایک طرح کا ریاض ہے جس میں صوت اور نشست کے ایک ایک نقطے پر الگ الگ توجہ کر کے اسے دہرایا گیا ہے اور یہ عمل ہر شاعر کرتا ہے، ایک مصرعے کو کئی کئی طرح سے کہہ کے دیکھتا ہے۔ مضمون پر توجہ کرنے والا شاعر لفظوں کی نشست کے مختلف امکانات کھنگالتے ہوئے جب ان کی جگہیں بدلتا ہے تو ہر نشست میں نحوی ساخت مروجہ زبان کے عمومی اصولوں کے مطابق ہونے کے باعث ہر متوقع مصرع کے ساتھ شعر 'بن' جاتا ہے، لسانی تجربے میں ایسا ممکن نہیں جب تک وہ اپنی تکمیلی صورت تک نہ پہنچ جائے۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اعتراض یہی کیا جا سکتا ہے کہ اس 'نیٹ پریکٹس' کو چھاپنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو شاعر کی مرضی اور پبلشر کے اختیار کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر

پھیکے، گھسے پٹے، اُتھلے، چبائے، اُگلے ہوئے ہزاروں مرتبہ ایک ہی طرح سے لکھے گئے موضوعات پر مبنی ناکام شعروں کی کتابوں سے گھروں، کتب فروشوں اور کتب خانوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں تو یہ تو ابھی ایک شاعر کا کام ہے۔

اوپر بیان کیے گئے اشعار کے مصرعوں کو اگر محض تجربہ سمجھ لیا جائے تو بھی درج ذیل نوعیت کے اشعار معاملے کو ذرا آگے بڑھاتے محسوس ہوتے ہیں:

زبر زیر مدھ موج خالی خمار
حمائل ہوس بڑھ ہوا یاردا
خبر خون خاکہ تنگ تبصرہ
سُرخ سرورق جوگیا یاردا

ان میں الفاظ کا دروبست اصرار کرتا ہے کہ ان میں سے پہلا شعر کسی جنسی تجربے کی کشمکش اور دوسرا اخبار کی کسی خون میں لتھڑی خبر سے متعلق کچھ معنی کی ترسیل کرتا ہے جو اس تجربے کی نیم پختہ حالت سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس سے اگلے مرحلے کے اشعار اس طرح کے ہو سکتے ہیں:

تند کی تہ میں طلب تھی تنگ میں تاخیر تھی
تلخیِ تسکیں تعاقب تیز کی تصویر تھی
کھینچ ہی لائی مجھے آخر ہرے رنگ کے ہرگ سے
پاؤں میں زرفام زندہ زرد کی زنجیر تھی

اور آخری مرحلے میں اب ان اصوات کی تکرار، لفظوں کی نشست، مرکبات کی صورت گری اور مصرعے کے بہاؤ کی چند تکمیلی صورتیں اور شعری تاثر کی ترسیل میں ان کی معاونت ملاحظہ ہو۔ یہ اشعار محض مثال کے لیے ایک سرسری نظر ڈال کر پیش کیے گئے ہیں، مزید کاوش سے ایسے اور اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں بناؤ کی یہ صورتیں زیادہ اُجاگر اور روشن ہوں:

وہی منظر برف برسنے کے، وہی گھڑیاں دھوپ نکلنے کی
سبھی سلسلہ وار سبیلیں ہیں ترے موسمِ راز میں ڈھلنے کی
کہیں ساعتِ سبز کا عکس اُڑے، کہیں گریۂ شام کی موج مڑے
کوئی سعیِ سعید حجاب میں ہے ترا لمس لباس بدلنے کی

یہ جو زخموں کی پھل جھڑیاں ہیں، یہی صورت صورت کڑیاں ہیں
اسی خار خمار خرابے میں مرے گرنے اور سنبھلنے کی
آرام حرام ہے میرے لیے، یہی شام انعام ہے میرے لیے
ترے ہجر کی آگ میں جلنے کی، اسی آگ میں پھولنے پھلنے کی

☆

دھاروں دھار برسنے والا بادل خشک ہوا
خوابوں خواب چمکنے والی صورت ماند پڑی

☆

کچھ بھر دیا ہے خواہشِ خالی میں رنگِ دل
کچھ پُر کیے ہیں بیٹھ کے نقشے نصاب کے

☆

ظلم ضروری تھا، لیکن
لطف الطاف بھی کرنا تھا

☆

لہو کی لہر تھی یا سوچ کی کوئی سلوٹ
لرز رہی تھی کوئی شے شراب کے پیچھے

☆

پھر پچھلے پہر آئینۂ اشک میں ظفر
لرزاں رہی وہ سانولی صورت سویر تک

☆

ہوا میں گھول کے میٹھی مراد کی خوشبو
اُداس کر گئی اُمید کی حسینہ بھی

☆

اُلجھ نہیں، روش و رنگ کا تماشا کر
جدھر سے آئے، سبھی راستے ہیں پانی کے

پھر آئی تھی وہی لفظوں کی تند و تیز ہوا
اُڑا کے لے گئی ذرّے زرِ معانی کے

☆

گزرنا پڑا سرسراتے ہوئے
نیا کوئی نقشہ جماتے ہوئے
ندامت کے ساحل پہ اُتریں گے ہم
محبت کے چھینٹے اُڑاتے ہوئے

☆

ٹوٹا ہے دوپہر کا کنارہ پھر ایک بار
پھر جمع ہیں خبر کے خریدار اُس طرف
موجِ بلا اَڑی ہوئی دریا کے درمیاں
فوجِ فنا کھڑی ہوئی تیار اُس طرف
سویا ہوں میں تو نم ہوئی انوارِ فصلِ خاک
کھویا ہوں میں تو کھل گئے بازار اُس طرف

☆

پھرتا ہے گردباد کی صورت کہاں کہاں
دل کی فضا میں خاکِ خبردار کا بدن
مخفی ہے اُس کی رمز بدن در بدن ظفرؔ
انکار کے بدن میں ہے اقرار کا بدن

☆

ایک ناموجودگی رہ جائے گی چاروں طرف
رفتہ رفتہ اِس قدر سنسان کر دے گا مجھے

☆

ہوا کے ہاتھ پہ رکھا ہوا معاملہ ہے
سو، یہ ہمارا تمھارا ابھی کیا معاملہ ہے

کبھی ملیں بھی تو موسم کی بات کرتے ہیں
ہمارا اُس کا تعلق ہی لامعاملہ ہے
کچھ اس کی بزم میں جانے سے تو نہیں انکار
بس اس کے ساتھ ہمارا ذرا معاملہ ہے
ابھی یہ راز کسی پر نہیں کھلا کہ یہ کھیل
بشر معاملہ ہے یا خدا معاملہ ہے

اِن آخری شعروں میں مجرد 'معاملہ' کے معنی کی تدریجات تو اپنی جگہ ہیں لیکن لامعاملہ، بشر معاملہ، خدامعاملہ جیسی تراکیب سے جو معنویت آشکارا ہوتی ہے وہ نہ صرف اس ایک لفظ کے امکانات بجھاتی ہے بلکہ زبان کے ہر لفظ کے ساتھ یہی معاملہ کر کے لسانی اظہار کی توسیع کی راہیں بھی روشن کرتی ہے۔

اِن تجربات پر ردِعمل کی بعض صورتیں بھی عجیب ہیں۔ ''گلافتاب'' چھپی تو فیصل آباد کے ہمارے محترم دوستوں نے سہ روزہ اعتکاف کا حاصل ایک پیروڈی نما کتاب ''سہ روزہ ہذیان'' کے نام سے اِس طور پیش کی کہ جو تجربہ ظفر اقبال نے تیس سال میں کیا ہے، وہ تین دن میں کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ جانے بغیر کہ تجربے کی نقل تجربہ نہیں ہوتا، اس کے لیے کچھ نیا سوچنا پڑتا ہے۔ میں اس کتاب کو پورا نہیں دیکھ سکا لیکن اُس کے جتنے بھی حوالے سامنے آئے ہیں اُن اشعار میں کوئی شعر کسی لسانی تشکیل پر مشتمل نہیں ملا بلکہ وہ اینٹی غزل ہے جس کے ڈھنگ پر شعر گھڑنا کوئی مشکل بات نہیں۔ حیرت زا ردِعمل کی ایک اور مثال ''ہدایت نامہ شاعر'' کے مصنف کی رائے ہے۔ بہت پہلے اُنھوں نے نظم میں لسانی تشکیلات کا تجربہ کرنے والوں کے بارے میں لکھا تھا:

> ''جدیدیت کے نام پر اظہار اور ترسیل کا المیہ ہے اور ہر چند کہ افتخار جالب اور انیس ناگی جیسے لوگ ناکام ہوئے مگر اُن کی عزت میرے دل میں ہے کہ اُنھوں نے تجربے سے چشم پوشی نہیں کی اور اپنے قد سے بڑھ کر دراز دستی کی کوشش کی۔ میں اُن کا نوحہ بھی پڑھوں گا اور اُنھیں سلام بھی کروں گا کہ شاعری کی نجات نہ کلاسیکی سمندر میں ڈبکیاں لگانے میں ہے نہ انیس اور دبیر کی جھیلوں میں ڈھیلا پھینکنے میں، بلکہ زبان و بیان کے نت نئے تجربات میں ہے۔ اس میں ناکامی بھی ہوگی اور کامیابی بھی، مگر شاعری شرمندہ نہیں ہوگی۔''

جناب ساقی فاروقی نے اظہار اور ترسیل کے المیے کا ذکر کیا ہے لیکن یہیں ایک المیہ رائے قائم کرنے کے دوہرے معیار کا بھی ہے۔ نظم کے مذکورہ شاعروں کی صریح ناکامی (حالاں کہ میں ان نظموں کو اتنا ناکام نہیں سمجھتا جس شدت کے ساتھ اُن کا رد کیا جاتا ہے، اُنھوں نے اُردو نظم کو بہت کچھ دیا ہے، اس پر بات پھر کبھی ہوگی) اور اُن کا نوحہ پڑھنے کے باوجود وہ اُنھیں سلام بھی کرتے ہیں اور اپنی توفیق سے بڑھ کر جست لگانے پر اُن کے دل میں اُن کی عزت بھی ہے اور اُن کے خیال میں تجربے کی ناکامی شاعری کی ناکامی نہیں۔ لیکن ظفر اقبال کی غزلیں پڑھتے ہوئے اُن کی کیفیت ہی اور ہو جاتی ہے۔ دنیازاد-۱۹ میں شائع ہونے والے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ابھی خوش ہی ہو رہا تھا کہ نگاہ ظفر اقبال کی ایک سے ایک
بڑھ کر بوگس غزلوں پر پڑی۔ جی چاہا کہ او کاڑے جاؤں اور اُسے قتل کر دوں۔
اب برداشت نہیں ہوتا۔ اے مالک اُسے اُٹھا لے یا مجھے اُٹھا لے۔"

اظہارِ رائے کی یہ شدت ہمارے ہاں بہ افراط دستیاب ہے۔ لسانی تشکیلات کا یہ عمل ظفر اقبال اور اس وسیلے سے جدید اُردو غزل کے حوالے سے دیکھنے پرکھنے کے مختلف یا نئے معیارات کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بات ظفر اقبال کی شاعری پر لکھنے والے تقریباً ہر نقاد نے کہی ہے اور افتخار جالب نے "گلافتاب" کے دیباچے میں اس کی کچھ راہیں بھی سجھائی تھیں۔ بعد ازاں ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے تھیوری کے جدید مباحث اور لسانیات کے تناظر میں اس دیباچے کو "شعریاتِ ظفر" کی کلید قرار دیا ہے۔ سو، ظفر اقبال کے ہاں لسانی تشکیلات کا عمل تقاضا کرتا ہے کہ اس کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی اہمیت کے اعتراف کے بعد اس کے علمی تجزیے کی روشنی میں کیا جائے:

یہی پیرایۂ اظہار ہے جو آخرِ کار
اپنے جادو سے پرانے کو نیا کرتا ہے

ظفر اقبال کی شاعری کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کتابیں آرٹ کے شوروم نہیں ہیں جیسا کہ اب ہمارے ہاں عام طور پر شاعری کی کتابوں کا رواج ہو گیا ہے۔ ظفر صاحب کی کتابیں آرٹ سٹوڈیو ہیں۔ شوروم اور آرٹ سٹوڈیو میں فرق ہوتا ہے۔ شوروم پر صرف تیار مال (finished products) رکھا جاتا ہے۔ سٹوڈیو، شوروم اور ورکشاپ کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں تیار مال کے ساتھ ساتھ اس میں استعمال ہونے والے مختلف میٹریل کہیں خام، کہیں نیم تکمیل، کہیں مکمل مگر غیر مربوط میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی بھی

حالت میں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کام کی چیز نہیں۔ یہ میٹریل بہرطور کام کی اشیاء ہوتے ہیں، اگر فن کار کے اپنے کام میں نہ بھی آسکیں تو سٹوڈیو میں آنے والوں میں سے کسی کے کام کے ضرور ہو سکتے ہیں۔ لازم نہیں کہ آرٹ سٹوڈیو میں آنے والا ہر شخص گاہک ہی ہو یعنی تیار مال کا خریدار جس کا مقصد ہر طرح سے مکمل، اعلیٰ اور نک سک سے درست مال سے فائدہ (حظ) اٹھانا ہو۔ ان میں آرٹ کے نقاد بھی ہوتے ہیں جو فن پارے کی تکمیل کے مراحل دیکھنے کے تمنائی ہوتے ہیں؛ ان میں اکثر خود فن کار بھی ہوتے ہیں جو آرٹ میٹریل بنانے کا طریقہ سیکھ سمجھ کر خود بھی اس کی طرز پر اپنی نئی چیزیں بنا سکتے ہیں؛ ان میں کم درجہ، نئے یا شوقیہ فن کار بھی ہو سکتے ہیں جو، ان نیم پختہ چیزوں کو مانگ کر بھی لے جا سکتے ہیں اور چوری بھی اٹھا سکتے ہیں۔ یوں بڑے فن کار کا فیض اس کے اپنے بنائے ہوئے شہ پاروں ہی میں نہیں بلکہ اپنے زمانے کے دیگر فن کاروں کی ہنر آزمائی میں بھی جاری نظر آتا ہے اور یہ بھی صاحبِ عہد کی نشانیوں میں سے ایک ہے اور اگر بات شاعری کی ہے تو بڑا شاعر تو معاصرین کی ایک بڑی تعداد کو "مستعار از" اور "مستفاد از" جیسی وضاحتوں سے بھی سبک دوش کر دیتا ہے کہ بتائے بغیر بھی پتا چلتا رہتا ہے کہ یہ مٹی کہاں کی ہے۔

آخر میں ایک بات ظفر صاحب کے مسلسل لکھتے چلے جانے کے بارے میں بھی۔ اُردو ادب کے ایک وسیع حلقے کو اس بات پر شکایت، اعتراض یا کم از کم جھنجھلاہٹ ضرور ہے کہ یوں دھڑا دھڑ لکھتے چلے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب شاعر خود کو دہرانے لگے، ادھر اُدھر کی مارنے لگے، شعر برائے شعر گھڑنے لگے، قافیے کو اُس کے گھر تک اور ردیف کو اس کی حد تک پہنچانے کی کوششیں کرنے لگے تو اُسے خود پر رحم کرتے ہوئے اور پڑھنے والوں پر ترس کھاتے ہوئے بس کر دینا چاہیے۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہی ہے کہ بہت حد تک یہ شاعر کی مرضی پر منحصر ہے اور اگر بات صرف ظفر صاحب ہی کی ہے تو ممانعت کی یہ تجویز تو انھیں اُن کی دوسری کتاب "گلافتاب" کے بعد ہی ملنا شروع ہو گئی تھی۔ سو جب اُس وقت باز نہیں آئے تو آخری وقت میں کیا...... اور اگر بات شکایت کی ہے تو رسائل کے مدیران اور پبلشر حضرات سے کرنی چاہیے کہ انھیں شائع کرنے سے گریز کریں اور اتنا ہی کاغذ اور روشنائی ان سے 'بہتر' لکھنے والوں پر صرف کریں جن کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے اور جو انیس ویں صدی کی زبان میں اٹھارویں صدی کے مضامین بھرپور تغزل کے ساتھ پیش کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ادبی روایت میں محض وفور و افراط کوئی خامی نہیں۔ کسی کام کے سلسلے میں ایک بار منٹو کی پوری

کلیات اوّل تا آخر پڑھنے کا موقع ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ منٹو کے متعدد افسانے ایسے ہیں جنھیں محض 'فارمولا افسانے' کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے پاس افسانہ لکھنے کے دو چار ایسے ڈھنگ تھے جس سے فوری افسانہ تیار کیا جا سکتا ہے اور یہ بات سب کو پتا ہے کہ بعض اوقات ضرورتاً، بعض اوقات شرارتاً اور بعض اوقات تجربتاً اُنھوں نے ایسے افسانے لکھے۔ غلام عباس نے اُن کی ایسی ہی 'حرکتوں' کی وجہ سے کہا تھا کہ منٹو 'سٹنٹ' کرتا ہے۔ لیکن اُن افسانوں کو منٹو نے اپنی کتابوں سے نکال باہر کیا اور نہ منٹو کے کلیات مرتب کرتے ہوئے اب ہم اُنھیں زائد از ضرورت سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بڑے لکھنے والے کی تحریریں ہیں جن سے استفادے کا کوئی نہ کوئی پہلو ہر زمانے میں دستیاب رہے گا۔ کچھ عرصہ پہلے کسی کا ایک تحقیقی مقالہ بھی نظر سے گزرا جس میں دو تین چھوٹی چھوٹی 'پرچیوں' کا تعارف پیش کیا گیا تھا جو منٹو نے کسی مدیر کو بھیجی تھیں اور اپنے سوانح سے متعلق کچھ لکھا تھا جو کوئی زیادہ اہم نوعیت کا بھی نہ تھا۔ اگر کسی اہم لکھنے والے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرچیاں بھی اتنی قیمتی ہو سکتی ہیں تو تخلیق تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ پریم چند کا تحریری اثاثہ دیکھیں تو رشک آتا ہے، آدھی الماری بھر جاتی ہے۔ کرشن چندر کی تخلیقات کے محض نام گننا شروع کریں تو رک کر سانس لینا پڑتا ہے۔ پتا نہیں ہم شاعری سے اتنے نالاں کیوں ہیں؟ اور اگر کسی کچے پکے اور مکھی پر مکھی مارنے والے شاعر سے نالاں ہوں بھی تو بات سمجھ میں آتی ہے، مستند اور پختہ کار شاعر کی تخلیق تو اثاثہ ہے کہ اعلیٰ ادب کی مجموعی مقدار میں اضافے کا باعث ہے۔ بہت پرانی بات نہیں کہ شاعر نئے مضامین کا 'انبار' لگاتا ہے اور اپنے خوشہ چینانِ خرمن کو برسرِ منبر فخریہ دعوتِ عام دیتا ہے۔ ظفر صاحب کے ہاں بات محض مضامینِ نو تک نہیں، اُسلوب اور زبان کے نئے ذائقے بھی اُن کا اختصاص ہیں۔ نیا مضمون بار بار دہرایا جائے تو اُس کی کشش کم ہوتی ہے، کھردرا لفظ اور کم مانوس لسانی ساخت جتنی بار اور جتنے زاویوں سے دہرائی جائے اُس میں ملائمت اور مانوسیت پیدا ہوتی ہے۔ کم از کم مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ شاعری آنے والے زمانے میں لفظ کے استعمال کی اسناد فراہم کرے گی، سو یہ جس قدر زیادہ ہوں اِسی قدر قیمتی ہیں اور اگر بات ادبی قدر و قیمت ہی کی ہے تو اُن کی ایسی تازہ غزلیں جنھیں وہ 'خانہ پُری' کہہ کر پیش کرتے ہیں گاہ گاہ اب بھی عجب تازہ ذائقہ رکھتی ہیں۔ گزشتہ کچھ کالموں میں چھپنے والی بالکل تازہ غزلوں سے یہ چند شعر مثال کے طور پر دیکھے جا سکتے ہیں:

تنازعہ ہے کوئی۔ رنگ رنگ میووں کا
تمھارے باغ کے اس پار جنگ جاری ہے

☆

جو بہہ رہا ہے وہ پانی نہیں ہمارا ظفر
مگر یہ دونوں طرف کے کنارے اپنے ہیں

☆

ابھی خاموش رہنا تھا مگر اظہار کر ڈالا
جو تھا دشوار اس کو اور بھی دشوار کر ڈالا
یہ کیسی نیند کی نیلم پری تھی جس نے کچھ کہہ کر
ابھی سویا ہی تھا میں اور مجھے بیدار کر ڈالا
جو دیکھا تو نہیں تھا کچھ بھی اس کی دوسری جانب
وہ دریا میں نے جانے کس خوشی میں پار کر ڈالا
جہاں پر چھاؤں تھی پھیلی ہوئی اشجار کی ہر سُو
وہیں میں نے بھی اپنا سایۂ دیوار کر ڈالا
تمھارے گل کدے میں چار دن کی سیر تھی ایسی
میں کیا بتلاؤں، اس نے تو مجھے بیمار کر ڈالا
گزرتے بھی ہیں سب اس پر سے، باتیں بھی بناتے ہیں
مگر میں خوش ہوں کچھ تو راستا ہموار کر ڈالا

معاصر اُردو میں کتنے شاعر ہیں جو اپنی جولانی کی عمر میں بھی ایسا رچا ہوا لکھنے کی توفیق رکھتے ہوں۔ شاعری میں کھلارا ڈالنا بھی کچھ آسان نہیں کہ ہر کہ و مہ اس کی صلاحیت رکھتا ہے نہ تاب، تاہم اپنے کھلارے کو سمیٹنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ظفر اقبال نے جتنا کچھ کھلارا ہے اُس کا معتدبہ حصہ سمیٹ کر بھی دکھایا ہے۔ ان دونوں اقدامات کی اہمیت الگ الگ ہے۔ اُن کی شاعری کا وہ حصہ جس میں یہ کھلارا ڈالا گیا ہے کم از کم تین زاویوں سے اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ یہ حصہ اُن کے شعری ارتقا اور تشکیل کو سمجھنے میں معاون ہے، دوسرے یہ کہ غزل کے نئے شاعر کے لیے اختراع کے محرک کا کام دے سکتا ہے، تیسرے یہ کہ شاعری اور خاص کر غزل کے موضوعاتی اور لسانی حدود کے لامتناہی ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ لیکن بجائے مجتہد بہ طور شاعر ظفر اقبال کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں نظر اس حصے پر بھی رکھنی ہوگی جہاں یہ کھلارا سمیٹا

گیا ہے۔ جہاں غیر شاعرانہ ذخیرۂ الفاظ، شاعرانہ ہو گیا ہے، جہاں روزمرہ زندگی سے متعلق وہ موضوعات جو عام انسانی اور شخصی تجربے سے نزدیک تر اور غزل کی شعری واردات سے دُور تر تھے، غزل کے موضوعاتی دائرے میں رچ بس گئے ہیں؛ جہاں نئی لسانی تشکیلات ایسی سبک اور ملائم ہو گئی ہیں کہ اپنی تازگی کی سرشاری کو قائم رکھنے کے باوجود مغائرت کے احساس سے مبرّا ہیں؛ جہاں نامانوس یا کم مانوس لفظ یا مرکب کی غیر متوقع آمد عجب، اچنبھا، کھردراہٹ یا چونکاہٹ پیدا کرنے کی بجائے بہجت اور روانی کی فراوانی کو ساتھ لاتی ہے اور اس کے نتیجے میں غزل کا جو شعر پیدا ہوتا ہے وہ روایتی فکری دائروں سے بغاوت اور متعین لسانی سانچوں سے انحراف ضرور کر سکتا ہے لیکن غزل کے ترجیحی اُسلوبیاتی اختصاص یعنی ترفع، گداز اور لسانی ملائمت پر سمجھوتا نہیں کرتا۔ اس ضمن میں ظفر اقبال کے اس نوع کے اشعار اُردو غزل کے اعلیٰ اور لطیف منطقوں کی خبر لاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے اُردو شاعری کا سرمایہ ہیں:

ترے لباس پہ ہو اس کی واپسی کی چمک
جو ایک عمر ترے خون کے سفر میں رہا

☆

سب میں شامل بھی ہوں، بیزار بھی سب سے ہوں بہت
وہ کڑی ہوں کہ چھنکتی نہیں زنجیر کے ساتھ

☆

بیٹھ سے جاتے ہیں دھول اور دھواں شام کے بعد
رات کے وقت زیادہ نظر آتا ہے مجھے

☆

کہیں تحلیل سا ہوتا ہوا اک خیمۂ خواب
کسی گہرائی میں گرتے ہوئے ذرات اس کے

☆

تیرہ درخت پر پڑی آبِ رواں کی روشنی
صبح لپٹ گئی مجھے بارِ یاب سے

☆

بنی ہے رات کہ آرام کر سکے دنیا
نہ یہ کہ اس کے لیے دل میں سوءِ ظن ہونا

☆

پیرتے پھرتے ہیں دل میں کبھی دالان میں ہاتھ
کس پری چہرہ کے رہتے ہیں مرے دھیان میں ہاتھ

☆

ہجومِ رنگ وہ چہرہ، بڑے گلاب کا پھول
ملا نہ پھر کبھی شاخوں میں منہ چھپا کے مجھے

☆

الجھی ہوئی ہیں سر میں صداؤں کی گچھیاں
یا پانو میں کھبے ہوئے ٹکڑے ہیں خواب کے

☆

وہاں اچھال کے پھینکا تھا موجِ دل نے مجھے
جہاں سے خلق بھی غائب تھی اور خدا بھی نہ تھا

☆

سر میں جھکڑ جو چلا کرتا ہے دن رات، ظفر
یہ گرائے گا ابھی برگِ نوا اور بہت

☆

لینا دینا اگر نہ ہو کچھ
بازار بھی ایک راستہ ہے

☆

اُس ذائقے کی تاب تو لاتا کوئی ظفر
کہنے کو اک جہان کے منہ میں زبان ہے

◆◆◆

چُھپا ہُوا جو نمودار سے نکل آیا
یہ فرق بھی ترے انکار سے نکل آیا

پلٹ پڑا جو میں سر پھوڑ کر محبت میں
تو راستہ اُسی دیوار سے نکل آیا

مجھے خریدنا کچھ بھی نہ تھا، اِسی خاطر
میں خود کو بیچ کے بازار سے نکل آیا

ابھی تو اپنے کھنڈر ہی کی سیر تھی باقی
یہ تُو کہاں مرے آثار سے نکل آیا

بہت سے اَور طلسمات منتظر ہیں مرے
اگر کبھی ترے اسرار سے نکل آیا

مجھے بھی دے رہے تھے خلعتِ وفا، لیکن
نظر بچا کے میں دربار سے نکل آیا

مرا نصیب نہیں تھا کُچل کے مرنا بھی
یہی بہت ہے کہ وہ کار سے نکل آیا

نئی ہَوا، نئے آفاق ہیں اُسی کے لیے
جو آج اُڑتی ہُوئی ڈار سے نکل آیا

اِسی کو ایک غنیمت قرار دُوں گا، ظفرؔ
جو ایک شعر بھی طومار سے نکل آیا

ہجومِ حسرت و آلام سے نکل آیا
نکل پڑا تو میں آرام سے نکل آیا

مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ اِتنی جلد
پھنسا ہُوا میں ترے دام سے نکل آیا

شمار کر رہے تھے وہ جسے مری نیکی
میں اپنے آپ اُس الزام سے نکل آیا

جہاں پہ آ گیا تھا حُسنِ اِتفاق سے وہ
وہیں پہ میں بھی کسی کام سے نکل آیا

غروب ہو گیا جب ایک چاند اندھیرے میں
تو ایک اور لبِ بام سے نکل آیا

کیا جو غور تو جیسے اک اور مطلب بھی
ڈھکے چُھپے ترے پیغام سے نکل آیا

اک اور دن تھا مرا منتظر اُسی لمحے
اگر میں اپنی کسی شام سے نکل آیا

مجھے کفن کی طرح لگ رہا تھا سر تا سر
میں خود ہی جامۂ احرام سے نکل آیا

پڑی مجھے روشِ خاص بھی بہت مہنگی
جو میں ظفرؔ روشِ عام سے نکل آیا

نکل پڑا جو میں سودائے خام سے باہر
رہا ہوں کام کے اندر نہ کام سے باہر

ہزار رنگ شب و روز تھے مرے پس و پیش
نکل سکا نہیں میں اپنی شام سے باہر

پیام بھیجنا مقصود تھا مجھے اُس کو
سو، آج سارے کبوتر تھے بام سے باہر

کچھ اَور کام سے اندر وہ جا ہُوا مصروف
بِٹھا کے مجھ کو بڑے احترام سے، باہر

اسیر ہونے کی خواہش نہ تھی مجھے، لیکن
بہت پھرا ہوں کبھی تیرے دام سے باہر

زیادہ فاصلہ مجھ سے کبھی رہا نہ ترا
کہ میں یہیں تھا، اِسی اژدہام سے باہر

تلاش میں مری، آغازِ کار پر مت جا
کہ میں پڑا ہوں کہیں اختتام سے باہر

نکل سکوں جو کبھی، یہ بھی عین ممکن ہے
ابھی نہیں ہوں ترے انتظام سے باہر

ظفرؔ، نہ تھا مجھے سُود و زیاں کا اندازہ
نکل گیا ہوں جو اپنے مقام سے باہر

رکھا نہ کر مجھے خواب و خیال سے باہر
کہ میں نہیں ہوں کسی احتمال سے باہر

مجھے پَرکھنے کا معیار کوئی اَور ہی رکھ
کہ میں پڑا ہوں کمال و زوال سے باہر

میں ترے وصل کی راحت میں گھِر چکا ہوں بہت
مجھے نکال کبھی اِس وبال سے باہر

میں جانتا ہوں کہ پانی ہی پھینک سکتا ہے
کسی طرح سے مجھے تیرے جال سے باہر

کرے نہ کوئی مری پُرسشِ مزاج کہ میں
ہوں اپنے حال کے اندر بھی حال سے باہر

میں عرضِ حال پہ پھرتا ہوں مطمئن کہ کبھی
جواب ہو نہیں سکتا سوال سے باہر

اگر میں اپنے ہی جیسوں میں رہ رہا ہوں تو پھر
شمار کر نہیں مجھ کو مثال سے باہر

کسی کی اب کوئی پہچان ہی نہیں باقی
کہ ہو چکے ہیں سبھی خدّ و خال سے باہر

زمانہ میری نظر میں کچھ اَور ہے، کہ ظفرؔ
کٹی ہے عمر مری ماہ و سال سے باہر

دیکھی نہ ہو گی آپ نے ایسی بلا کی جنگ
آغاز ہو رہی ہے جو ارض و سما کی جنگ

طوفاں تو اپنے آپ ہی تھمتا چلا گیا
سارے مسافروں سے رہی ناخدا کی جنگ

وہ لے رہے تھے نام ہمارا بھی جا بہ جا
جو لڑ رہے تھے اصل میں اپنی بقا کی جنگ

بدلا ہے جب سے آپ نے دستورِ گلستاں
پھولوں سے ہوتی رہتی ہے بادِ صبا کی جنگ

جاری رہے گی، کوئی چھڑانے نہ آئے گا
وہ اِس لیے کہ ہے یہ ہما و ثنا کی جنگ

ڈرتے رہے فضول ہی اب تک ہم آپ سے
ورنہ تو اصل جنگ ہے شاہ و گدا کی جنگ

باہر سلوک و صُلح کے احوال تھے، مگر
اندر لگی ہُوئی تھی کوئی اِنتہا کی جنگ

پہنچے گی اپنے منطقی انجام تک کبھی
یہ جنگ ہے ہماری تمھاری سدا کی جنگ

کوئی چراغ بزم سے باہر نہیں، ظفرؔ
اب دیکھیے گا روز ہَوا سے ہَوا کی جنگ

کیوں اِن آباد زمینوں میں اُجڑ کر مر جائیں
بُھوکوں مرنے سے تو بہتر ہے کہ لڑ کر مر جائیں

کسی مانگے ہُوئے سورج کی تپش کے بدلے
ہمیں منظور ہے سردی میں اکڑ کر مر جائیں

اُس سے اُمیدِ مروّت کا صلہ یہ ہو گا
کہ لگاتار اِسی سوچ میں سڑ کر مر جائیں

وہ عدو ہے ابدی، اُس کے گلوگیر تو ہوں
فتح پانا نہیں ممکن تو پچھڑ کر مر جائیں

ذہن میں اُس کے مچلتی ہے کوئی قطع و بُرید
اُس کی خواہش ہے کہ ہم لوگ سُکڑ کر مر جائیں

زیبِ تن ہیں سو الگ ہو نہیں سکتے خود سے
زندہ پوشاک ہیں، کس طرح اُدھڑ کر مر جائیں

شاخ سے رکھتے ہیں رشتہ کوئی مضبوط، سو ہم
کوئی سُوکھے ہُوئے پتے ہیں کہ جھڑ کر مر جائیں

گردنِ ناز پہ لپکیں گے کسی روز یہ ہاتھ
کس لیے آپ کی دہلیز پکڑ کر مر جائیں

اِتنی پسپائی بھی اک موت کی صورت ہے، ظفؔر
اب تو لازم ہے کہ آگے کہیں بڑھ کر مر جائیں

بھرے دریاؤں کی یک سر روانی روکنے والے
مرے ہمسائے، ماں جائے یہ پانی روکنے والے

مرا عزم و ارادہ موجزن ہے دُور تک، دیکھو
کہاں سے لاؤ گے یہ بے کرانی روکنے والے

چلے ہیں داستاں اپنی کوئی آغاز کرنے کو
ہماری بیچ میں ساری کہانی روکنے والے

تمھاری اپنی نیّت ہی نے سارا گُل کِھلایا تھا
نہیں تھے ہم تمھاری خوش بیانی روکنے والے

طریقہ اور ہی کوئی نکالیں گے تو کچھ ہو گا
تمھیں ہم لوگ تھے اب تک زبانی روکنے والے

وہ موقع آ رہا ہے جب اِنھی اطراف سے شاید
نکل آئیں تمھاری لَن ترانی روکنے والے

کوئی دن اور دیکھو گے ابھی رسّی دراز اپنی
بہت ہوں گے زمینی آسمانی روکنے والے

جنھیں تم لُقمۂ تر ہی سمجھتے آئے ہو اب تک
یہیں پر ہیں تمھاری خوش گمانی روکنے والے

ظفرؔ، وہ خود خس و خاشاک سے بڑھ کر نہیں کچھ بھی
بڑے آئے مری آتش بیانی روکنے والے

پانی اگر نہیں ہے، کنارہ تو ہے مجھے
اِن راستوں سے اُس نے گزارا تو ہے مجھے

میں عقل مند ہی نہیں، کیسے سمجھ سکوں
ورنہ کسی طرف سے اشارہ تو ہے مجھے

مجھ پر ہی گر پڑے نہ یہ دیوار ایک دن
جب تک کھڑی ہُوئی ہے، سہارا تو ہے مجھے

میں کُوچ کر چکا ہی سہی شہر سے، مگر
مُدت کے بعد اُس نے پکارا تو ہے مجھے

دن اور رات پر تو نہیں میری دسترس
خوش ہوں کہ شام کا یہ شرارہ تو ہے مجھے

ہاتھوں کی اُنگلیوں سے جو اَب دیکھتا ہوں میں
آنکھیں ہی بُجھ چکی ہیں، نظارا تو ہے مجھے

حصہ نکالنا ہے مجھے دوسروں کا بھی
وہ اِس لیے کہ سارے کا سارا تو ہے مجھے

پھر بھی یہ میرا جی نہیں بھرتا ہے کس لیے
جو ایک بار تھا وہ دوبارہ تو ہے مجھے

گُم ہو گیا ہوں رات کی راہوں میں، اے ظفؔر
لیکن یہی بہت ہے، ستارہ تو ہے مجھے

سر میں رُکا ہُوا کوئی پانی تو ہے مجھے
پانی سے دُور ایک روانی تو ہے مجھے

لکھی ہُوئی ہی پیش کروں گا کسی طرح
فی الحال ایک بات زبانی تو ہے مجھے

بازار جا رہا ہوں خرید و فروخت کو
حالاں کہ ساتھ ساتھ گرانی تو ہے مجھے

بُھولا ہُوا ہوں اُس کی محبت کا راستہ
یہ اک طرح کی یاد دہانی تو ہے مجھے

چڑھتا نہیں ہے مجھ پہ نئی دوستی کا رنگ
پہلو میں کوئی یاد پُرانی تو ہے مجھے

دُنیا اسے سُنے نہ سُنے کوئی غم نہیں
کب سے سُنا رہا ہوں، کہانی تو ہے مجھے

بوڑھا ہوں اور بے سر و سامان ہوں تو کیا
اُمید و انتظارِ جوانی تو ہے مجھے

آگے چلے گئے ہیں جو الفاظ رُوٹھ کر
پیچھے ہی پیچھے موجِ معانی تو ہے مجھے

کھویا ہُوا ہوں کب سے نئے شہر میں، ظفرؔ
حالاں کہ ایک گھر کی نشانی تو ہے مجھے

پاس اپنے جو بُلا کر بھی نہیں مِلتا ہے
اب کبھی شہر میں آ کر بھی نہیں مِلتا ہے

بھیجتا رہتا ہے ہر چیز وہ خود ہی، لیکن
کچھ تو ہے جو وہاں جا کر بھی نہیں مِلتا ہے

دُور و نزدیک سے مِلتے ہیں بہت لوگ آ کر
اور وہ دل میں سما کر بھی نہیں مِلتا ہے

وہ بھی دن تھے کہ جو مِلتا تھا جُھکا کر نظریں
اب کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں مِلتا ہے

اُس سے پہلے جو گلے لگ کے مِلا کرتا تھا
اب تو وہ ہاتھ مِلا کر بھی نہیں مِلتا ہے

اہلِ دُنیا کو دِکھا کر جو مِلا کرتا تھا
اب وہ لوگوں سے چُھپا کر بھی نہیں مِلتا ہے

خود ہی بتلائیے کہاں ڈھونڈنے جائیں آخر
وہ سکوں جو اُسے پا کر بھی نہیں مِلتا ہے

ایک لمحہ کہیں موجود ہے ایسا بھی کہ جو
زندگی ساری گنوا کر بھی نہیں مِلتا ہے

جو نہ مِلنا ہو وہاں سے وہ کسی طور، ظفؔر
ناچ کر بھی نہیں، گا کر بھی نہیں مِلتا ہے

زمیں بھی کوئی مرے آسماں میں شامل ہے
کہاں کی چیز تھی، آ کر کہاں میں شامل ہے

میں جب بھی چاہوں اُسے راکھ میں بدل ڈالوں
شرارِ برق مرے آشیاں میں شامل ہے

اِسی پہ فیصلہ ہو گا عدالتِ دل میں
خلافِ واقعہ جو کچھ بیاں میں شامل ہے

جسے نکال دیا تھا کسی نے سر تا سر
وہ بات اب بھی مری داستاں میں شامل ہے

اگر مکیں ہی نہیں کوئی تو یہ بتلاؤ
کہ اَور کون یہاں اِس مکاں میں شامل ہے

اک اَور شے بھی دمکتی ہے دُھند میں ہر سُو
اک اور چیز بھی خوابِ رواں میں شامل ہے

یقین ہے کہ مرا اپنا آپ بھی اب تو
کسی طرح مرے وہم و گماں میں شامل ہے

جو یہ جہاں کہیں موجود ہی نہیں ہے تو پھر
بتائے کیا کوئی کیا کیا جہاں میں شامل ہے

جیے مرے گی تو اپنے ہی زور پر، کہ ظفرؔ
زباں کا زہر بھی اب تو زباں میں شامل ہے

جو سلسلہ سا تری آرزو میں شامل ہے
وہ پیچ و تاب اِسی رنگ و بو میں شامل ہے

خبر نہیں ہے وہ انکار تھا کہ تھا اقرار
جو لفظ ابھی تک لہو میں شامل ہے

سُراغ اور کسی کا نہ ہو دراصل کہیں
جو صبح و شام تری جستجو میں شامل ہے

ہے ایک ٹوٹا ہُوا ربط ایک مدّت کا
جو غائبانہ ہے اور رُوبہ رُو میں شامل ہے

تمھارا بھیجا ہُوا تازہ اور خنک جھونکا
کچھ ایسے لگتا ہے جس طرح لُو میں شامل ہے

گزر کے آتی ہُوئی جھونپڑوں سے شام و سحر
ہَوا وہی ہے جو اِس کاخ وکُو میں شامل ہے

جو بے کنار ہے اپنے وجود میں اتنا
وہ بحر شاید اِسی آب جُو میں شامل ہے

وہ رنگ اَور ہے جو ہے بیان سے باہر
وہ بات اَور ہے جو گفتگو میں شامل ہے

کہاں سے اتنا بڑا فرق آ گیا ہے، ظفرؔ
مرا وجود اگر ہُو بہ ہُو میں شامل ہے

جھٹک کے پھینک بھی سکتا ہے ناگہاں دن رات
اُٹھائے پھرتا ہے کب سے یہ آسماں دن رات

تھکے ہُوئے ہیں، کسی وقت رُک بھی سکتے ہیں
کوئی پتا نہیں کب تک رہیں رواں دن رات

پناہ لی ہُوئی ہے میں نے چار تنکوں میں
مرے لیے ہیں یہی میرا آشیاں دن رات

نہ روشنی نہ اندھیرا ہے اِس جگہ تو کہیں
چلے گئے ہیں ذرا دیکھنا کہاں دن رات

جو عمر کا کوئی مصرف نہ تھا ہمارے لیے
یہاں گزار دیئے ہم نے رائگاں دن رات

کبھی تو ختم بھی ہو گا سمندروں کا سفر
لیے جو پھرتے ہیں مجھ کو یہ بادباں دن رات

وہاں پہ چلتا ہے کس طرح کام دنیا کا
کوئی بتائے کہ ہوتے نہیں جہاں دن رات

سوال تھا ہی نہیں کوئی اَور پیشِ نظر
ہم ایک بات جو کرتے رہے بیاں دن رات

ظفرؔ یہاں پہ کسی کو پسند ہو کہ نہ ہو
ہمارے نام کی چلتی ہے داستاں دن رات

اسی طرح کہ بہ طرزِ دگر بنایا گیا ہے
مجھے کہیں پہ دوبارہ اگر بنایا گیا ہے

جسے میں سہہ نہیں سکتا لگا گئے ہیں وہ گھاؤ
جہاں میں رہ نہیں سکتا وہ گھر بنایا گیا ہے

جو دن چڑھے کوئی چڑیوں کا شور ہوتا ہے مجھ میں
میں آدمی ہوں کہ مجھ کو شجر بنایا گیا ہے

کہ ٹھیک طرح پذیرائی بھی مِلے کوئی اُس کو
خدا بنانے سے پہلے بشر بنایا گیا ہے

وہ دن نکلتے ہی کیوں لخت لخت کردیا ہم نے
جو مشکلوں سے یہاں رات بھر بنایا گیا ہے

کسی کو اِس کی سمجھ ہی نہ آرہی تھی وہاں پر
وہ خواب تھا کوئی جس کو خبر بنایا گیا ہے

کسی سے طے ہی نہیں ہو رہا ہے موت کی جانب
یہ راستہ جو بہت مختصر بنایا گیا ہے

ہُوا نہ قافلے والوں میں آپ ہی کہیں شامل
اسی لیے مجھے گردِ سفر بنایا گیا ہے

ٹھہر سکے گا ظفرؔ ایک ہی جگہ پہ کہاں تک
ہوا کی طرح جسے دَر بہ دَر بنایا گیا ہے

ابھی تو اِس کو ذرا سرسری بنایا گیا ہے
اندھیری رات جسے روشنی بنایا گیا ہے

ہمارا کام ہی ایسا مِلا جُلا تھا کہ اس کو
کبھی بگاڑ دیا ہے کبھی بنایا گیا ہے

کسی کے چہرے پہ ہوتی ہے تازگی ہی کچھ اتنی
کہ ایسے لگتا ہے جیسے ابھی بنایا گیا ہے

بنائے جانے کے اُمّیدوار تھے ہی کچھ اتنے
کسی کو چھوڑ دیا ہے، کوئی بنایا گیا ہے

ہم اِس کو کام میں خود ہی نہ لا سکے تھے سراسر
یہ اختیار جسے بے بسی بنایا گیا ہے

نتیجہ اُس کا بہت جلد ہونے والا ہے ظاہر
وہ دشمنی کہ جسے دوستی بنایا گیا ہے

ہمارے سر سے گزر جائے تو عجب نہیں، ورنہ
ہزار سعی سے غم کو خوشی بنایا گیا ہے

اگر نہیں ہے وہ ساروں کی دسترس میں تو پھر کیا
جو چاہیے تھا یہاں پر سبھی بنایا گیا ہے

بھم کیا گیا ہے پہلے پُرزہ پُرزہ ظفرؔ کو
کہ جس کا وعدہ کیا تھا وہی بنایا گیا ہے

لبوں پہ موجِ مسرّت مچلنے والی ہے
زمین اپنے خزانے اُگلنے والی ہے

نئے سرے سے نکھرنے کو ہے یہ رنگِ چمن
یہ کوئی اور ہوا ہے جو چلنے والی ہے

چمکنے والی ہے رنگوں میں تازگی کوئی
فضا لباس پُرانا بدلنے والی ہے

دبی ہوئی تھی تہِ خاک جو توانائی
وہ ایک چشمے کی صورت اُبلنے والی ہے

بھرے پُرے مرے دریائے خواب میں اب کے
ہے ایک لہر جو باہر اُچھلنے والی ہے

مجھے نوید مِلی ہے کہ شہر کے سر پر
بلا جو آئی ہوئی تھی وہ ٹلنے والی ہے

وہی ہے دشت کی پہنائی اور شام کا وقت
یہیں سے اب کوئی صورت نکلنے والی ہے

دعاؤں کا ہے اثر یا کسی دوا کا ہے کام
یہاں مریض کی حالت سنبھلنے والی ہے

سپیدۂ سحری دُور ہے اگرچہ، ظفرؔ
یہی بہت ہے کہ یہ رات ڈھلنے والی ہے

نوحے کو یہ جو ہم نے ترانہ بنایا ہے
سب سے جدا ہی اپنا زمانہ بنایا ہے

چھوڑا نہیں ہے تیر ہوا میں ہی سر بہ سر
یہ ہم نے آسماں کو نشانہ بنایا ہے

اوروں کی داستاں بھی سُنیں اپنے شوق سے
ہم نے بھی اپنا ایک فسانہ بنایا ہے

اک دام سا بچھا لیا ہے رہ گزر پہ، اور
دل کو کسی کے واسطے دانہ بنایا ہے

پھرتے ہیں اصل میں جو تعاقب میں تیرے ہم
جینے کا یہ بھی ایک بہانہ بنایا ہے

پھرتا ہے تُو ہی سنگ بدست اِس کے آس پاس
تیرے لیے تو آئنہ خانہ بنایا ہے

بے دخل کر نہ دیں ترے دل سے بھی اہلِ شہر
مدّت کے بعد ایک ٹھکانہ بنایا ہے

بازار میں وہ مفت بھی لیتا نہیں کوئی
اپنے تئیں ہنر جو یگانہ بنایا ہے

چھوٹا سا اک سوال کیا تھا کبھی، ظفرؔ
جس کو ستم ظریف نے طعنہ بنایا ہے

ایسا بنایا ہے، کبھی ویسا بنایا ہے
جو شے ملی ہے اُس کو تماشہ بنایا ہے

دُنیا تو دیکھنے کے بھی قابل نہیں رہی
اچھا کیا ہے جو مجھے اندھا بنایا ہے

اب اور کچھ بنانے کی حاجت نہیں رہی
کافی سے بھی زیادہ ہے، جتنا بنایا ہے

جو کچھ کہ بن چکا ہے اُسے کیا بنایئے
جو بن نہیں سکا ہے وہ اچھا بنایا ہے

اک عمر سے لگے ہُوئے ہیں صبح و شام آپ
ہم کو بھی کچھ بتایئے کتنا بنایا ہے

جو کچھ بنا ہے اُس کو غنیمت ہی جانیے
یعنی قبول کیجیے جیسا بنایا ہے

مِل جُل کے سب نے کام کیا ہوگا رات دن
لیکن یہ لگ رہا ہے کہ تنہا بنایا ہے

جو بنتے بنتے رہ گیا ہے درمیان میں
کس منہ سے ذکر کیجیے کیسا بنایا ہے

میرا ہے یا کہ دیکھنے والوں کا ہے قصور
اُلٹا ہی لگ رہا ہے جو سیدھا بنایا ہے

کچھ اَور بھی خراب کیا ہے ظفرؔ نے کام
کہنے کو آپ نے یہ دوبارہ بنایا ہے

کیا دُم ہِلانے لگتا ہے افسر کے سامنے
اللہ نے آدمی کو بھی کُتا بنایا ہے

پڑھنا مشاعرے میں ترنّم سے یہ غزل
آخر تمھیں خدا نے گویّا بنایا ہے

آخر بنا ہے کام کسی اَور کا یہاں
میرا بنایا ہے نہ تمھارا بنایا ہے

اتنے پہ بھی ابھی سے بہت مُشتعِل ہیں آپ
میں نے تو یہ سخن ابھی آدھا بنایا ہے

شاید کہیں پہ رہ گئی ہو گی کوئی کسر
اپنی طرف سے میں نے تو پورا بنایا ہے

کیسے جتن سے اُس نے یہ دُنیا بنائی تھی
پھر بعد ازاں ہمیں سگِ دُنیا بنایا ہے

کچھ کچھ بگاڑ بھی دیا ہے اِس کے ساتھ ساتھ
ویسے تو مطمئن ہیں کہ سارا بنایا ہے

گڑبڑ تو کوئی ہونی ہی تھی اِس میں بیش و کم
جب دوسرے کے بعد یہ پہلا بنایا ہے

آنسو ہی اپنی آنکھ میں رکھا ہے مستقل
صحرا کے درمیان میں دریا بنایا ہے

سب کو ہی خودکشی کی سہولت رہے بہم
مینار ہم نے آپ ہی اُونچا بنایا ہے

دیوار کے ہے پار بھی دیوار ہی کوئی
یعنی فضول ہی یہ دریچہ بنایا ہے

اُفتادِ طبع ہی تھی کچھ ایسی کہ کیا بتائیں
تھا اصل میں بڑا جسے چھوٹا بنایا ہے

وہ ہو گیا ہے اَور کا ہی اَور کچھ، ظفرؔ
کچھ اِس طرح کا اُس کا سراپا بنایا ہے

دُنیا تو مانتی نہیں یہ شعبدہ، مگر
ناپید تھا وہی جسے پیدا بنایا ہے

میں نے تو خیر کوئی بھی دعویٰ نہیں کیا
کیا آپ نے بھی کام کسی کا بنایا ہے

جو مارتا ہے اُس کو مسلّح کیا ہے خوب
اَور، مار کھانے والا نہتّا بنایا ہے

اک روح اِس میں پھونکنا باقی ہے اَور بس
میں نے بھی ایک خاک کا پُتلا بنایا ہے

کیا دوسروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے یہ سلوک
یا میرے ساتھ ہی یہ رویہ بنایا ہے

اِس جیسا اَور مجھ سے بھی شاید نہ بَن سکے
یہ حُسنِ اتفاق سے ایسا بنایا ہے

دل میں ہے کُلّیات بنانے کا عزم بھی
آغاز تو کیا ہے جو مصرع بنایا ہے

اتنا بہت نبھانے کے لائق تھا اِس جگہ
اَور، اپنے اختیار میں جو تھا، بنایا ہے

پھر چاند پر بھی جائیں گے موقع اگر مِلا
ہم نے ابھی تو چاند کا ہالہ بنایا ہے

بَننا ہے کچھ تو بَن رہے گا زُود یا بہ دیر
کیا کم ہے یہ کہ اِس کا اِرادہ بنایا ہے

اُس کے ہی چند لفظوں کو توڑ اور مَروڑ کر
ناچار اُس کے وصل کا وعدہ بنایا ہے

ہونٹوں کا رنگ چُوس لیا ہے کھڑے کھڑے
رنگین تھا بہت، اُسے سادہ بنایا ہے

چھوڑے تکلُّفات بھی درمیان میں
مضمون تھا طویل، خلاصہ بنایا ہے

کچھ تو کیا ہے کاہلی کے باوجود بھی
اب چھوڑیے، بگاڑ دیا یا بنایا ہے

اپنا یہ بال بال بندھا ہے جو قرض سے
اِتنا ہی عمر بھر میں اثاثہ بنایا ہے

خود کو بھی جھونک ڈالا ہے اُس کے وجود میں
اَور اُس کو اپنی ذات کا حصّہ بنایا ہے

پھیلا دیا ہے میز پہ دل کو نکال کر
تھوڑا سا اِس سے کاٹ کے صحرا بنایا ہے

کچھ خاک اَور نور کو آپس میں گوندھ کر
اپنی طرف سے بندہ و مولا بنایا ہے

ہے اِنحصار دُودھ پہ سارا، کہ چائے کو
پتلا بنایا ہے کبھی گاڑھا بنایا ہے

کاتا ہے میں نے چبھتی ہُوئی چاندنی کا سُوت
اِس کے لیے ہی چاند کو چرخہ بنایا ہے

گُم ہو گیا ہوں کار گہِ کائنات میں
یہ اُس کو ڈھونڈنے کا ذریعہ بنایا ہے

آٹے سے پانچ دن ہُوئے روٹی بنائی تھی
روٹی کو آج پیس کے آٹا بنایا ہے

مہنگی ہوئی شراب تو ناچار اے ظفرؔ
پانی ہی پی کے شور شرابہ بنایا ہے

اتنے دن انتظار کیا اور آخرش
کاغذ پہ آج پان کا پتّا بنایا ہے

رشتوں کا ہو رہا ہے تعین پھر ایک بار
دادا کو بھائی، باپ کو بیٹا بنایا ہے

نکلا ہے سب سے دوڑ میں آگے وہی یہاں
اللہ پاک نے جسے لنگڑا بنایا ہے

حکمت کچھ اُس کی اِس میں بھی ہوگی ہی لازماً
شادی شدہ کو جس نے کنوارہ بنایا ہے

پہلے بنا دیا اُسے آساں جو لگا
مرغی بنائی ہو گی کہ انڈہ بنایا ہے

کچھ بن نہیں رہا تھا مکمل تو مجھ سے کام
جو بھی بنا تھا، آج بقایا بنایا ہے

عزّت مِلی تو آخر اُسی سے مِلی، ظفرؔ
بے غیرتی کے ساتھ جو پیسہ بنایا ہے

آغاز کر کے سارے کا سارا بنایا ہے
سورج کو توڑ کر جو شرارہ بنایا ہے

یوں اپنے اضطراب سے بھی کچھ لیا ہے کام
پانی تھا جس سے میں نے یہ پارہ بنایا ہے

کاری گری کا شوق ہی پورا کیا ہے کچھ
اور چاند کی جگہ یہ ستارہ بنایا ہے

جب گفتگو سے تنگ پڑا ہوں تو ایک دن
اس کے بجائے ایک اشارہ بنایا ہے

اس میں بھی منفعت کی کوئی شکل ہے ضرور
اس کاروبار میں جو خسارہ بنایا ہے

پانی تھا اور زور تھا پانی کا ہر طرف
روکا ہے اِس کو اور کنارہ بنایا ہے

ایثار کر سکے ہیں یہی اُس کے واسطے
پتلون اُدھیڑ دی ہے، غرارہ بنایا ہے

نیت ہی جس نے کی ہو بنانے کی کچھ اگر
اُس نے بھی کچھ نہ کچھ تو ہمارا بنایا ہے

سب اُنگلیاں ہی چاٹتے رہ جائیں گے، ظفرؔ
پکوان ہی کچھ ایسا کرارہ بنایا ہے

میں نے کچھ آج عقل کے اندھوں کے واسطے
ناچار شاعری کا یہ جلوہ بنایا ہے

کُرتا کدھر کو جا رہا ہے اور میں کدھر
درزی نے آپ ہی اِسے آڑا بنایا ہے

پردہ سا ڈال رکھا ہے اشیائے دہر پر
اُسی نے اِسی خیال سے کُہرا بنایا ہے

تُو آ کے اِس کو دیکھ تو لیتا، ترے لیے
دل کے نواح میں جو یہ کمرہ بنایا ہے

لے جاؤں گا اُٹھا کے کہیں اِس زمین کو
محنت سے ایک ایسا ہی آلہ بنایا ہے

میں تا کہ اِس سے بھاگ نہ نکلوں کبھی کہیں
اپنے لیے گڑھا کوئی گہرا بنایا ہے

رنگوں میں کوئی ڈال دیا ہے فتور سا
پیلے کو سُرخ، سبز کو نیلا بنایا ہے

پہلے تو کوئی رنگ نہ تھا صبح کا یہاں
ہم نے ہی اِس کو اتنا سنہرا بنایا ہے

میں تا کہ ساتھیوں کے سخن سے بچا رہوں
شاید اِسی لیے مجھے بہرا بنایا ہے

اُلٹا سکیں اِسے سرِ بازار بار بار
شاید اسی لیے مرا چھابہ بنایا ہے

اس سے کبھی نکل نہیں سکتا کہ اُس نے بھی
میرے ہی ناپ کا ترا پنجہ بنایا ہے

جس طرح کا دیا تھا یہاں میں نے امتحان
ویسا ہی اُس نے میرا نتیجہ بنایا ہے

ہے لطف یہ کہ چند ہی برسوں میں وقت نے
اَنکل مجھے تو آپ کو آپا بنایا ہے

حالاں کہ کام اپنا اَکٹھا ہی تھا، مگر
تُم کو معزز اور مجھے رُسوا بنایا ہے

اتنے زیادہ خرچ کے قابل نہیں تھا کام
بَن تو گیا، مگر ذرا مہنگا بنایا ہے

لوگوں کو لایا جاتا ہے کچھ اَور کام سے
ہم نے یہ شاخِ دار کو جھولا بنایا ہے

چھوٹی سی بات کر کے غلط وقت پر، ظفرؔ
ہم نے خود اُس کو آگ بگولہ بنایا ہے

آخر دِکھا ہی دی ہے کرامات ہم نے بھی
خالی دُھواں ہی تھا جسے شعلہ بنایا ہے

اِس میں بھی کوئی مصلحتِ خاص ہو تو ہو
شہباز کو جو ہم نے ممولا بنایا ہے

سیدھی سپاٹ شاعری کس طرح سے کروں
اُس نے مرا دماغ ہی اُلٹا بنایا ہے

مجھ کو بھی کچھ پسند نہ تھی راہِ مستقیم
اُس نے بھی راستہ مرا ترچھا بنایا ہے

جانا ہے مجھ کو اور کہاں، کچھ خبر نہیں
یہ وصل ہے کہ ایک وسیلہ بنایا ہے

اِس پر بھی لوگ، دیکھیے ایمان لائے ہیں
یہ جو بناوٹی سا کرشمہ بنایا ہے

میں ننگ اپنا دیکھ نہ سکتا تھا، اِس لیے
اپنی ہی کھال اُتار کے جامہ بنایا ہے

بنتا کسی طرح بھی نہ تھا اہلِ شہر سے
ہم نے کچھ اتنی دُور سے بھی آ بنایا ہے

چوپال میں تھا پیشِ محبت معاملہ
جھوٹے ہُوئے ہیں خود، اُسے سچّا بنایا ہے

شامل تھے ہم سبھی میں بہ ظاہر تو اس جگہ
پر، کام دوسروں سے علیحدہ بنایا ہے

مطلب کچھ اس کا ہو کہ نہ ہو، ہم نے لازماً
ہر لفظ کے اخیر پہ شوشہ بنایا ہے

مصروفِ کار ہی رہے دُنیا میں جا بہ جا
یوں ہم نے دل لگی کو بھی پیشہ بنایا ہے

یہ دوسرے بھی میرے ہی جیسے ہیں، کیا ہُوا
مجھ کو اگر کچھ اور کمینہ بنایا ہے

میں تو بندھا بندھایا ہوں پہلے ہی، جانِ من
میرے لیے فضول یہ رسّہ بنایا ہے

کیسی یہ مصلحت ہے کہ اُس نے جگہ جگہ
پتھر کے ہی پڑوس میں شیشہ بنایا ہے

میں تاکہ اِس میں بیٹھ کے آرام کر سکوں
کس نے یہ دُھوپ میں مرا سایہ بنایا ہے

خود کو اُڑائے رکھا ہے چلتی ہوا کے ساتھ
اپنا غبار میں نے ہمیشہ بنایا ہے

پڑھتا ہوں اور پھونکتا رہتا ہوں خلق پر
اپنے ہی نام کا جو وظیفہ بنایا ہے

دیکھو جو غور سے تو بنایا ہے ٹھیک ٹھاک
ظاہر میں لگ رہا ہے کہ بے جا بنایا ہے

بس آسماں بنا دیا ہے ایک عکس ہی
اَور، اپنی اِس زمین کو ذرّہ بنایا ہے

شامل اِسے جو تھوڑا بہت کر لیا ہے اب
انکار کے پہاڑ میں ذرّہ بنایا ہے

اُس کو بھلا لگے گا، یہی سوچ کر ظفرؔ
آنکھوں کو اپنی پِیس کے سُرمہ بنایا ہے

اگرچہ ساری خرابی ترے سبب سے ہے
گلہ جو ہے بھی تو اپنے ہی روز و شب سے ہے

میں کیا چھپاؤں کہ ہے کس گمان پر یہ اُمید
میں کیا بتاؤں کہ یہ انتظار کب سے ہے

مجھے بھی یاد نہیں نالہ کب ہُوا آغاز
کہ صبح و شام کا یہ شور کوئی اب سے ہے

گزر گیا ہے زمانہ، مگر ترے رُخ پر
اُسی طرح کی تر و تازگی ہے جب سے ہے

نیاز مند ہیں کچھ خاص ہی تمھارے ہم
دُعا سلام ہماری اگرچہ سب سے ہے

مطالبہ ہے کچھ اُن شاخ شاخ بانہوں سے
طلب کوئی کسی رخسار و چشم و لب سے ہے

ہماری عرضِ تمنّا بھی تھی الگ سب سے
ہماری یاد دہانی بھی اور ڈھب سے ہے

دِلا رہا ہے تری مہربانیوں کی بھی یاد
پڑا ہُوا جو یہ پالا ترے غضب سے ہے

ابھی جب اُس سے شناسائی بھی نہیں تھی، ظفرؔ
خیال و خواب کا یہ کاروبار تب سے ہے

گزر گیا ہے جہاں سے غبار کا موسم
چھپا ہُوا تھا وہیں آشکار کا موسم

سدا بہار ہے اُلجھی ہُوئی اُمید کی رُت
بدل سکا نہ کبھی انتظار کا موسم

خبر کسی کو نہ ہو گی کہاں سے اُترا ہے
یہ خار و خس پہ کسی لالہ زار کا موسم

بُھلا سکا نہیں میں، خوب یاد ہے مجھ کو
وہ آسمان سے اپنے اُتار کا موسم

پتا مجھے بھی نہیں کب ہوا اُڑا لے جائے
یہ دل پہ چھایا ہُوا اعتبار کا موسم

کہانیاں ہی سُنایا نہ کر مجھے اُس کی
کبھی دِکھا بھی مجھے اپنے پیار کا موسم

کچھ اہلِ قافلہ بھی درمیاں میں چھوڑ گئے
مجھے بھی راس نہ تھا رہ گزار کا موسم

رُکا رہا تھا بہت دیر سامنے اُس کے
جو رہ گزار پہ تھا کوہسار کا موسم

میں ایک شاخِ برہنہ کی طرح سے ہوں، ظفرؔ
نصیب تھا نہ جسے برگ و بار کا موسم

ہوا میں دُھند کی صورت بکھرنے لگتے ہیں
ہم اپنے آپ سے اِس طرح ڈرنے لگتے ہیں

اُڑان ہوتی ہے اپنی فلک سے بھی آگے
کبھی زمیں سے بھی نیچے اُترنے لگتے ہیں

ہمیشہ کے لیے پانی کو بھی قبول نہیں
کبھی جو ڈوب گئے تھے، اُبھرنے لگتے ہیں

کبھی اُٹھائی تھی شرمندگی بہت جس پر
پھر ایک بار وہی کام کرنے لگتے ہیں

یہ آپڑا ہے سفر کس سے دُور ہونے کا
ابھی چلے بھی نہیں اور ٹھہرنے لگتے ہیں

کچھ اب تو صبر بھی اس عمر میں نہیں پڑتا
وہ پاس جب کبھی ہوتا ہے، مرنے لگتے ہیں

جو دیکھتا ہوں کبھی اُس کو بند آنکھوں سے
تو رات کے یہ اندھیرے نکھرنے لگتے ہیں

بھٹک گئے تھے کہیں دشتِ خواب میں جو کبھی
وہ قافلے مرے دل سے گزرنے لگتے ہیں

جب اہلِ شہر کو پڑ جائے شک ہمارا، ظفؔر
تو پھر نیا ہی کوئی سوانگ بھرنے لگتے ہیں

دیکھا جو اپنے خوابِ طلب سے پکار کے
ہم بھی شمار میں تھے کسی بے شمار کے

کیوں کر سفر تمام نہیں ہو گا اِس دفعہ
چلتے ہیں آج بوجھ بدن کا اُتار کے

جب سے ہَوا نے پھینک دیا ہے خلاؤں میں
چکّر لگا رہا ہوں تمھارے مدار کے

دیکھا تو کارواں نکل آیا تھا کوئی اَور
ہم انتظار میں تھے جب اپنے غبار کے

پہچان ہی سکا نہ ہمیں کوئی آج تک
بِچھڑے ہُوئے تھے ہم جو یہاں اپنی ڈار کے

آندھی میں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا دُور تک
واقف نہیں تھے ہم بھی بہت رہ گزار کے

کب سے کسی شرارۂ لب کا تھا انتظار
کچھ ڈھیر تھے جہاں خس و خاشاک و خار کے

چاہوں تو جس طرف سے نکل جاؤں بے دھڑک
خوش ہوں کہ فائدے ہیں بہت بے کنار کے

رہتے تھے قیدیوں کی طرح ہر طرف، ظفرؔ
اندر حصار کے، کبھی باہر حصار کے

گزرنے والی تھی اَور بے شمار گزری ہے
جو سرخوشی مرے سر پر سوار گزری ہے

خود آپ اپنا اُڑا کر غبار گزری ہے
یہاں سے میں نہیں، پوری قطار گزری ہے

پَروں کا کام بھی دیتی تھیں سُرخ پنکھڑیاں
نظر کے سامنے پھولوں کی ڈار گزری ہے

وہ لہر جس کا گماں تک نہ تھا کبھی مجھ کو
تمھارے اَور مرے آرپار گزری ہے

گزر گئی ہو وہ جیسی بھی اَور جتنی بھی
یہی کہیں گے بہت شان دار گزری ہے

یہ شام وہ ہے کہ موجِ ہوائے خاک بہ سر
بدن دریدہ ہے اور تار تار گزری ہے

ہمارے ہونٹ ترستے ہیں بُوند بھر کے لیے
ہمارے سر سے کوئی آبشار گزری ہے

اب آنے والا ہے کچھ اُس کی واپسی کا بھی وقت
یہ زندگی جو سراسر اُدھار گزری ہے

ہرا بھرا ابھی تاراج ہے، یہاں سے، ظفرؔ
سپاہ اپنی اگر ایک بار گزری ہے

رواں رہے یونہی پانی سو، بار بار چلے
کبھی چڑھاؤ چلے اور کبھی اُتار چلے

اسی لیے کہیں کتنا نہیں سفر میرا
کہ چل پڑوں تو مرے ساتھ رہ گزار چلے

خبر وہی کوئی رکھتا ہے دونوں جانب کی
ہَوا کی طرح جو دریا کے آرپار چلے

ہم اُس کو ڈھونڈ کے لائیں گے وہ جہاں بھی مِلا
پتا کہیں تو کوئی اُس کا زینہار چلے

بتا سکیں اُسے بے اختیاریاں اپنی
کبھی تو اُس پہ ہمارا بھی اختیار چلے

زمیں سے باندھے ہُوئے ہے یہ سامنے کی ہَوا
کسی طرح یہ رُکے تو مرا غبار چلے

پھر ایک دن وہی نظّارہ دیکھنا ہے ابھی
ہَوا رُکی ہُوئی ہو، اَور کوہسار چلے

ہے اُس کا شور اِسی زور پر ابھی، ورنہ
زمانہ ہو گیا اندر کا آبشار چلے

یہ سانس مانگے ہُوئے ہیں مرے کسی سے، ظفؔر
مجھے خبر نہیں کب تک مرا اُدھار چلے

یاد تو ہو گا تمہیں بھی ایک دیوانے کا نام
بزم میں آ کر جو لیتا ہی نہ تھا جانے کا نام

یہ گھٹا ہی اصل میں ہے تیرے آنے کی خبر
اور، بارش آسماں سے پھول برسانے کا نام

کر رہے ہیں آپ سے دستِ تعاون کی طلب
پڑ چکا ہے آج کل جو ہاتھ پھیلانے کا نام

فرق باقی ہی نہیں کوئی، پکارو تو سہی
اس ہجومِ خواب میں اپنا ہے بے گانے کا نام

اب نہیں، لیکن جب اِس کو چھوڑ کر جاؤں گا میں
پھر کہیں رکھوں گا شاید اپنے کاشانے کا نام

موسمِ گل میں بھی پتّے ہی اُڑاتی ہے ہوا
اور، پھولوں کے لیے کِھلنا ہے مرجھانے کا نام

واعظوں کا شہر ہے یہ اور خدا کے فضل سے
کوئی بھی لے گا نہ آئندہ سے یارانے کا نام

دیکھ لو، اب کوئی کچھ کہتا نہیں سیدھے سبھاؤ
اصل میں تو بات ہے بس بات اُلجھانے کا نام

اے ظفرؔ جس کو غزل کہتے ہیں، اب تو رہ گیا
بارہا لکھی ہوئی باتوں کو دُہرانے کا نام

نار تھی کبھی، ناری ہو گئی
ایسی راج کماری ہو گئی

رُکی ہُوئی تھی جو مدّت سے
دیکھ کے مجھ کو جاری ہو گئی

تھوڑی تھوڑی تھی وہ پہلے
پھر ساری کی ساری ہو گئی

لال گلابی رنگ تھا جس کا
کھڑے کھڑے نسواری ہو گئی

لے بیٹھے آسان جو اُس کو
یہی ذرا دُشواری ہو گئی

پیدا ہونے سے پہلے ہی
مرنے کی تیّاری ہو گئی

مہنگائی نے زور جمایا
اُوپر سے بے کاری ہو گئی

اُس کے دروازے پر کیسی
اپنی پاؤں پساری ہو گئی

شامت گھیر کے لائی اُس کو
خود قسمت کی ماری ہو گئی

کپڑے اور کہیں جا ٹانگیں
تنگ بہت الماری ہو گئی

اَن ہونی سی ہے جو محبت
میری اور تمھاری ہو گئی

دُنیا سے باہر تھے، لیکن
پھر بھی دُنیا داری ہو گئی

کچھ لوگوں سے مانگ کے لائے
کوئی چیز اُدھاری ہو گئی

جُوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں
مہنگی بہت سواری ہو گئی

ایک ہی چیز تھی آپ کی اپنی
وہ بھی اب سرکاری ہو گئی

پیک پان کی تھوکی اُس نے
کپڑوں پر گل کاری ہو گئی

خواب میں آیا ہی تھا ابھی وہ
اتنے میں بیداری ہو گئی

زور لگا بیٹھے کچھ اتنا
کم زوری، لاچاری ہو گئی

آئینے جیسی کو دیکھا
حیرانی سی طاری ہو گئی

پَل میں کہاں کہاں جا پہنچے
بیٹھے رہے، اُڈاری ہو گئی

کُھل کر بات کریں اب ہم سے
کافی شرم شماری ہو گئی

اُس کے خون کی پیاسی تھی وہ
جس کے صدقے واری ہو گئی

سب نے ناشاعر گردانا
پوری بات ہماری ہو گئی

حرف شفا پاتے ہیں مجھ سے
یہی مجھے بیماری ہو گئی

مان گئی تھی وہاں تو سب کچھ
آ کے یہاں انکاری ہو گئی

بھاؤ تاؤ کرتے ہی کرتے
بات ذرا بازاری ہو گئی

پہلے پیار جتایا مجھ سے
پھر اللہ کو پیاری ہو گئی

ایسی ترُشی سے وہ بولا
ساری بزم اچاری ہو گئی

اپنے ہی لوگوں پر کیسے
ٹینک چڑھے، بم باری ہو گئی

جہاں جہاں بھی تھی کچھ عزت
وہیں وہیں پر خواری ہو گئی

ناک بھی کاٹ نہ سکتی تھی جو
پڑے پڑے دو دھاری ہو گئی

جتنی بے چینی تھی پہلے
اُتنی ہی بے زاری ہو گئی

بٹوے سے سورج کو نکالا
رات اگر اندھیاری ہو گئی

خود تو ہلکی پھلکی تھی وہ
پاؤں سے ذرا بھاری ہو گئی

طبع ظفرؔ کی رفتہ رفتہ
سوچ سمجھ سے عاری ہو گئی

جس کی کوئی تعبیر نہ ہو وہ خواب دِکھانے آ جاتے ہیں
آنا چاہیں تو اکثر وہ کسی بہانے آ جاتے ہیں

آتے ہیں تو اَور زیادہ پریشان کر جاتے ہیں وہ
لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا جی بہلانے آ جاتے ہیں

جلدی ہی حالات ہمارے سازگار ہوتے جائیں گے
کبھی جو آتے ہیں تو ایک ہی بات بتانے آ جاتے ہیں

رستہ کچھ ہموار تو کچھ دشوار بھی کرتے جاتے ہیں وہ
اک دیوار گرانے تو اک نئی اُٹھانے آ جاتے ہیں

بہت سنواری سُلجھی ہُوئی زلفوں والے، دراصل ہماری
اُلجھی ہُوئی طبیعت کو کچھ اَور اُلجھانے آ جاتے ہیں

کوئی ہَوا چلتی ہے اور بدل جاتا ہے دل کا موسم
آنکھوں کے آگے سب گزرے گئے زمانے آ جاتے ہیں

کچھ حالات بھی لگتے ہیں قابو سے باہر جاتے ہُوئے سے
اَور، کچھ لوگ بھی یہاں ہمارے ہوش اُڑانے آ جاتے ہیں

اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کرتے رہتے ہیں کوشش بھی
سوچتے سوچتے دل میں خوف بھی نئے پرانے آ جاتے ہیں

یوں ہے ظفرؔ احباب کی محفل میں اپنا یہ آنا جانا
جو موزوں ہی نہیں ہُوئے وہ شعر سُنانے آ جاتے ہیں

کچھ امکاں تو تھے ہی ملاقات کے
مگر، اَور تیور تھے حالات کے

اُٹھے گا ابھی آسماں کا نقاب
ابھی رنگ بکھریں گے برسات کے

کُھلیں گے پرانی زمینوں کے راز
کٹے گا سفر ساتھ ہی ساتھ کے

رُکا بیچ میں خواب کا سلسلہ
چلے تُند جھونکے خیالات کے

وہی ہر طرف سبز ہے یہ زمیں
وہی ہیں کرشمے نباتات کے

کمی کوئی پھیلی ہے چاروں طرف
یہ سب شاخسانے ہیں بُہتات کے

بتا، اصل میں تیرا مطلب ہے کیا
معانی کئی ہیں تری بات کے

ان آبادیوں سے نکل جایئے
یہاں پر ٹھکانے ہیں آفات کے

ظفر، سخت کیشی بھی ہے ایک وضع
کہ ہوتے ہیں کچھ لوگ ہی دھات کے

ڈور سے کیا آ کے میرے دل میں گھر اُس نے کیا
مسکرایا تھا، بس اتنا ہی سفر اُس نے کیا

آسمانی تھا، زمیں پر یونہی اُترا تھا کہیں
پھر بھی یہ سارا تماشا خاک پر اُس نے کیا

کیا وہ گھر ہوں گے جہاں وہ آ کے ٹھہرا تھا کبھی
راستے کیا ہوں گے جن پر سے گزر اُس نے کیا

کام جو کرنا تھا اُس کو ٹالتا رہتا تھا وہ
جو نہیں کرنا تھا آخر سر بہ سر اُس نے کیا

کیا بتاؤں، میری کایا ہی پلٹ دی ایک دم
میں فرشتہ تھا، مجھے بندہ بشر اُس نے کیا

گرچہ مجھ سے بے وفائی کام تھا مشکل بہت
اور کوئی کر نہ پایا تھا، مگر اُس نے کیا

دُھول جھونکی تھی مری آنکھوں میں اُس نے شہر میں
باخبر تھا میں ہی، مجھ کو بے خبر اُس نے کیا

پہلے اپنی قید میں رکھا زمانے سے الگ
پھر ہوا کی طرح مجھ کو دَر بہ دَر اُس نے کیا

مشترک ہونا ہے کاروبارِ اُلفت، اے ظفرؔ
کام تھا میرا، غلط کیا ہے اگر اُس نے کیا

اپنی مرضی سے ہی تھوڑے کو زیادہ کر لیا
اور، کبھی حسبِ ضرورت خود کو آدھا کر لیا

اُس کو جلدی تھی پہنچنے کی، مگر کیا کیجیے
اپنے ساتھ اُس کو بھی ہم نے پاپیادہ کر لیا

کچھ تو کرنا چاہیے، سوچا کیے دن رات ہم
اور، پھر کچھ بھی نہ کرنے کا اِرادہ کر لیا

مُفت مِلتی تھی محبت اُس گلی میں اِس برس
ایک دن ہم نے بھی تھوڑا اِستفادہ کر لیا

پہلے بیوی قتل کی، بچے کو مارا اور پھر
خودکشی کی اور چھوٹا خانوادہ کر لیا

کوئی کھڑکی کھول دی تازہ ہوا کی، اور پھر
اِس طرح سے تنگیٔ دل کو کُشادہ کر لیا

ستر پوشی کے لیے اتنا ہی ممکن تھا کہ ہم
آئے جب لوگوں میں، لفظوں کو لبادہ کر لیا

آج کل شعر و سخن کا بس یہی احوال ہے
دوسروں نے جو کہا، اُس کا اعادہ کر لیا

آج کل اُس کی گزر اوقات اِسی پر ہے، ظفرؔ
جھوٹ سچ بولا، کسی سے کوئی وعدہ کر لیا

وہم سا اعتبار میں دیکھا
کیا ہے جو آر پار میں دیکھا

نظر آتا وہ کیا کہ میں نے اُسے
دُھند میں اور غبار میں دیکھا

وہ ملاقات میں بھی تھا نہ کہیں
جو مزہ انتظار میں دیکھا

سبھی شکلیں تھیں ایک ہی جیسی
ہم نے اُس کو ہزار میں دیکھا

اِس سے پہلے کہیں نہ تھا موجود
رنگ جو رنگ دار میں دیکھا

خامشی آبشار سے نکلی
شور سا کوہسار میں دیکھا

جو دِکھائی دیا شروع میں ہی
وہی پایانِ کار میں دیکھا

تھا خزاں میں بھی زور شور وہی
جو کرشمہ بہار میں دیکھا

کسی گنتی ہی میں نہ تھا جو ظفرؔ
وہ شمار و قطار میں دیکھا

آتی ہوئی رُتوں کا پتا دینا چاہیے
گزری ہے جو بھی اُس کو بُھلا دینا چاہیے

برکت نہیں اگر حرکت کے بغیر کچھ
پیچھے کوئی کسی کے لگا دینا چاہیے

جب دشمنی ہو پاؤں جمانے کے آس پاس
تب دوستی کا ہاتھ بڑھا دینا چاہیے

لے جائیں نامہ ہائے محبت جہاں تہاں
سارے کبوتروں کو اُڑا دینا چاہیے

تحریر کوئی اور ہی درکار ہے یہاں
دیوار کے لکھے کو مٹا دینا چاہیے

شرم و حیا بھی خوب ہے، لیکن کبھی کبھی
پردہ یہ درمیاں سے ہٹا دینا چاہیے

سارے تماش بین ہیں یہ لوگ اِنھیں کوئی
کرتب کبھی کبھار دِکھا دینا چاہیے

اچھے نہیں ہیں شہر کے حالات کچھ ابھی
جاگے ہوؤں کو پھر سے سُلا دینا چاہیے

گر خواب ہے تو یہ کہیں پہنچے بھی، اے ظفر
یہ خون ہے تو اِس کو بہا دینا چاہیے

رات کا رنگ ہے پانی جیسا
اور، پانی ہے روانی جیسا

روز میں اُس کو سُنا دیتا ہوں
واقعہ کوئی کہانی جیسا

چشمِ پُر آب میں لکھا ہُوا ہے
موسمِ خواب زبانی جیسا

دوستی کوئی نہیں اُس جیسی
اور، ہے دشمنِ جانی جیسا

آج بازار میں بیٹھا ہُوا تھا
پھر کوئی بھوت گرانی جیسا

ہے رہائش میں بھی پورا اب تو
ذائقہ نقل مکانی جیسا

کبھی آ جاتا ہے بھولے بھٹکے
ایک جھونکا سا جوانی جیسا

کچھ مرے حالِ پریشاں کی طرح
کچھ مری ہستیٔ فانی جیسا

مل سکا نہ کوئی نمونہ نہ، ظفرؔ
تیری آشفتہ بیانی جیسا

ہے وفا اور کمینہ جیسا
اہلِ دُنیا میں ہوں دُنیا جیسا

کُھلتے جاتے ہیں ہُنر پانی کے
ڈوبتا جاتا ہوں جیسا جیسا

جو ہویدا نہیں ہر جانب سے
لگ رہا ہے وہ ہویدا جیسا

ہر طرف ہے وہی پانی کی چمک
میرا صحرا بھی ہے دریا جیسا

ڈوب مرنے کی نہیں گنجائش
ورنہ پانی تو ہے گہرا جیسا

ریت کا بوجھ اُٹھانے کے لیے
حوصلہ چاہیے صحرا جیسا

لوگ ہیں، لفظ ہیں اور لمحے ہیں
نظر آتا ہے تماشا جیسا

عرصۂ خواب گزرتا نہیں جو
ہے مری عمرِ بقایا جیسا

کھیتی باڑی بھی عجب شے تھی، ظفرؔ
کچھ نہیں پیشۂ آبا جیسا

نیا نکور نرالے جیسا
چاند کان کے بالے جیسا

بھرے پُرے دریا کا پانی
باہر وار اُچھالے جیسا

ٹھوکر ایک اچانک جیسی
گرتے سار سنبھالے جیسا

ملاقات بھر منہ نہیں کھولا
بند ہی رہا تالے جیسا

پھول پھول بکھرا بیٹھا ہوں
ہار گلے میں ڈالے جیسا

جگہ سے اپنی ہلا نہیں وہ
پڑا رہا پرنالے جیسا

پیاس بڑھا دیتا ہے اکثر
پانی ایک پیالے جیسا

ایسا نامانوس اجنبی
تھا کوئی دیکھے بھالے جیسا

یہاں ظفرؔ سڑکوں گلیوں میں
وہی ہے دیس نکالے جیسا

تھا کوئی خواب پُرانے جیسا
کسی تاریک زمانے جیسا

اعتبار اِس پہ اگر کر سکتے
واقعہ ہے جو فسانے جیسا

جانے اِس بار لگا کیوں مجھ کو
تیرا آنا، ترے جانے جیسا

یہاں پانا بھی ہے کھونا اکثر
اَور، کھونا کسی پانے جیسا

دُور سے ہاتھ ہلانے میں بھی ہے
ذائقہ ہاتھ مِلانے جیسا

اَور، کبھی بات چُھپانے میں بھی
اک مزہ بات بنانے جیسا

ایک بستر سا بِچھانے کے بعد
کوئی پردہ سا گرانے جیسا

کچھ بھروسہ اگر اُس ذات پہ ہے
خرچ کرنا ہے بچانے جیسا

پھیرتا رہتا ہوں دن رات، ظفرؔ
دل ہے تسبیح کے دانے جیسا

جھلملاتے ہُوئے تارے جیسا
تھوڑا تھوڑا نہیں سارے جیسا

یہ بھنور اَور طرح کا ہے کوئی
یہاں پانی ہے کنارے جیسا

ذائقہ ہے کوئی اندر باہر
ایک ہی بار دوبارے جیسا

نیند پتھر کی طرح سخت رہی
خواب تھا نرم نظارے جیسا

حُسن بھی کوئی حجاب آگیں ہے
میں بھی ہوں شرم کے مارے جیسا

ہم نے آخر کو بڑھائی ہے دُکاں
نفع تھا بھی تو خسارے جیسا

بہت اُونچا نہیں معیار اب کے
چاہیے کوئی گزارے جیسا

انتظار اَور ابھی کر دیکھو
شعر چمکے گا شرارے جیسا

ہم نے سمجھا نہیں پہلے تو، ظفرؔ
کام تھا کوئی اشارے جیسا

ہم تو ہو کر بہم رُکے ہُوئے ہیں
وہ اگر بیش و کم رُکے ہُوئے ہیں

خلق ساری رواں دواں ہے، مگر
دہر میں ایک ہم رُکے ہُوئے ہیں

کارواں ہیں قیام پر اپنے
راستے خم بہ خم رُکے ہُوئے ہیں

یہ سفر یوں ہی طے نہیں ہوتا
خود رواں ہیں، قدم رُکے ہُوئے ہیں

پہلے رُکتے تھے دیر دیر کے بعد
اَور، اب ایک دم رُکے ہُوئے ہیں

کچھ نہیں سُوجھتا ہے لکھنے کو
طبع جاری، قلم رُکے ہُوئے ہیں

ابھی کچھ اَور دیکھ بھال کریں
ابھی اُس کے ستم رُکے ہُوئے ہیں

سارے وعدے وعید ہیں موقوف
اَور، قول و قسم رُکے ہُوئے ہیں

ہے فقیروں کو انتظار، ظفرؔ
کہیں اہلِ کرم رُکے ہُوئے ہیں

دَم بہ دَم جا بہ جا رُکی ہُوئی ہے
اُس کی آوازِ پا رُکی ہُوئی ہے

میں روانہ ہوں اک زمانے سے
اور، میری صدا رُکی ہُوئی ہے

طبع کی کچھ نہیں خبر ہم کو
یہ روانہ ہے یا رُکی ہُوئی ہے

خوں الگ سے قیام پر ہے یہاں
نبضِ ہستی جدا رُکی ہُوئی ہے

اب مجھے صبر آ گیا شاید
میری آہ و بُکا رُکی ہُوئی ہے

یہ ٹلی تو نہیں ابھی شاید
اپنے سر پر بلا رُکی ہُوئی ہے

پیڑ ہیں تر بہ تر پسینے میں
جانے کب سے ہَوا رُکی ہُوئی ہے

کون جانے کہ اتنی اشیا میں
کیا رواں اور کیا رُکی ہُوئی ہے

پھول کھِلنے کے منتظر ہیں، ظفرؔ
جانے کب سے صبا رُکی ہُوئی ہے

راستہ اور گھر رُکا ہُوا ہے
یعنی سارا سفر رُکا ہُوا ہے

دل دھڑکتا تھا پہلے بھی کم کم
آج تو سر بہ سر رُکا ہُوا ہے

آپ دریا چلا ہُوا ہے کدھر
اور، نہ جانے کدھر رُکا ہُوا ہے

شبہ سا کیوں ہے چلتے رہنے کا
اصل میں کام اگر رُکا ہُوا ہے

دستکِ خواب اب نہیں ہوتی
سلسلہ دَر بہ دَر رُکا ہُوا ہے

انتظار اُس کا ہے زمانوں سے
جو کہیں راہ پر رُکا ہُوا ہے

ہے رواں یہ ہَوا یہاں کب سے
اور، کب سے شجر رُکا ہُوا ہے

بہت آگے ہے شاعری، لیکن
کہیں پیچھے اثر رُکا ہُوا ہے

قافلہ کتنی مدّتوں سے، ظفرؔ
چل رہا ہے، مگر رُکا ہُوا ہے

بُلبُل تھا یا بُوم تھا
یہی دلِ مرحوم تھا

باقی سب تھے مستفید
اک میں ہی محروم تھا

وہی تھی سونے کی جگہ
وہی ڈرائنگ روم تھا

بندہ تھا وہ ٹھیک ٹھاک
نام، مگر کلثوم تھا

نام کا حاتم طائی وہ
سب سے بڑھ کر شُوم تھا

چومنے میں چالاک، اور
دیکھنے میں معصوم تھا

ابھی ابھی تو تھا کوئی
اور، ابھی معدوم تھا

ہوتے فریادی کہاں
ظالم خود مظلوم تھا

کُلّیات اپنا، ظفرؔ
کیسا نامنظوم تھا

ہنگامہ تو گرم تھا
کام اپنا ہی نرم تھا

ہم خود ہی بھگوان تھے
یہی ہمارا دھرم تھا

جھٹ میں ہُوئی دیوالیہ
دل ایک ایسی فرم تھا

جمع نہ ہوتے لوگ کیوں
میرا گریا کرم تھا

لے گیا کھال اُتار کر
کیا سوداگر چرم تھا

جس میں جم کر بیٹھتے
من ہی وہ آشرم تھا

تھا خود بھی بے باک وہ
کچھ میں بھی بے شرم تھا

آیا نہیں وہ، اگرچہ
آنا تو کنفرم تھا

سر پھڑوا آئے ظفرؔ
اُور منہ پر بھی ورم تھا

تنہا وہ مہمان تھا
بھرا بھرا یہ مکان تھا

مشکل لگتا تھا، مگر
کام بہت آسان تھا

گاڑی تھی وہ نئی سی
اور، میں گاڑی بان تھا

جتنا تھا میں باخبر
اُتنا ہی اَن جان تھا

گلتی دال اپنی کہاں
وہاں وہی پردھان تھا

پریشان تھا وہ بہت
کچھ میں بھی حیران تھا

لگتا کم ہی تھا، مگر
بہت عظیم الشان تھا

مایوسی بھی تھی، مگر
تھوڑا سا امکان تھا

فیصلہ جو بھی ہو، ظفرؔ
میرا وہی بیان تھا

بچا کھچا جو خواب تھا
وہ بھی اب نایاب تھا

تھا خود بھی تیار وہ
اور، میں بھی بے تاب تھا

ڈوبنے کی حسرت رہی
دریا ہی پایاب تھا

زہریلی تھی شراب وہ
باسی کوئی کباب تھا

نیت اب کے ٹھیک تھی
لیکن حال خراب تھا

ٹر ٹر اندر ہی رہی
مینڈک ہی تالاب تھا

کہاں وضاحت مانگتے
اُس کا صاف جواب تھا

کافی تھا اپنے لیے
خط کا جو اَلقاب تھا

عزت یہ تھی ظفرؔ کی
خود ہی آپ جناب تھا

تو ہی عرش نژاد تھا
میں تو دُنیا زاد تھا

پہلے ہی تعمیر سے
گھر کوئی برباد تھا

اس ملبے کی جگہ پر
شہر کوئی آباد تھا

وہ تھا مجھ سے پیش تر
میں ہی اُس کے بعد تھا

رُت بدلی تھی اس طرح
شاد بھی اب ناشاد تھا

کچھ تصدیق نہ ہو سکی
وہ کس کی اَولاد تھا

عشق اپنا اس بار کچھ
زائد از میعاد تھا

ٹکرایا ہوں جس کے ساتھ
میرا بھی اُستاد تھا

بہت مصائب تھے، ظفرؔ
میں اُن پر ایزاد تھا

موقع تو محدود تھا
رستہ ہی مسدود تھا

سیب تھا رَسا ہُوا کوئی
کڑھا ہُوا کوئی دُودھ تھا

خوشبو کے طوفان میں
پکا ہُوا اَمرود تھا

سمجھا شیخ سعید ہے
جو طارق محمود تھا

مُشک میں لتھڑا ہُوا جو
تھا میرا ہی وجود تھا

بدلا ہُوا تھا وہ اُس روز
مِلنا ہی بے سُود تھا

پیدا نہیں ہُوا تھا میں
وہ بھی نامولود تھا

باہر سے تو تھا وہی
اندر سے مفقود تھا

وہ بھی غائب تھا، ظفرؔ
میں بھی ناموجود تھا

مرنا ایک وبال تھا
جینا بھی جنجال تھا

تم نے جو کر دیا ہے
وہی ہمارا حال تھا

دیواروں پر گرد سی
اُور شیشے میں بال تھا

باسی کڑھی تھی عشق بھی
جس میں بہت اُبال تھا

سچی بات ہے یہ کہ وہ
اپنی ایک مثال تھا

بچ نکلا اُس کے لیے
یہ اچھا ہی سال تھا

جن اشیا کی تھی طلب
شہر میں اُن کا کال تھا

جس کو ترسے جی بہت
وہی پرایا مال تھا

ملے تھے ہم بھی ظفرؔ سے
وہی گُرو گھنٹال تھا

وہی خیالِ خام تھا
اَور، برائے نام تھا

مِلا نہیں وہ، اور مجھے
بہت ضروری کام تھا

کچھ نیچے تھا بام کے
کچھ بالائے بام تھا

چُوس کے پھینکا ہی نہیں
ایسا میٹھا آم تھا

تھا آغاز بھی ہُو بہ ہُو
اَور وہی انجام تھا

دانے سمٹے ہُوئے سے
بِچھا ہُوا سا دام تھا

دروازے سے لوٹ آئے
اپنا یہی قیام تھا

مِلنا تھا ہم نے جہاں
کوئی اَور مقام تھا

آگے تھا خود تو ظفرؔ
اَور، پیچھے پیغام تھا

تھوڑا سا اقرار تھا
اُور باقی انکار تھا

ہر کوئی بیمار تھا
اُور، وہی آزار تھا

کچھ دریا کے اِس طرف
کچھ دریا کے پار تھا

گرمی تھی جب مال میں
سرد بہت بازار تھا

بھاگنے والا آخرش
ہر اک سے دوچار تھا

تارکِ دُنیا تھا، مگر
کتنا دُنیا دار تھا

پیچھے گہری کھائی تھی
اُور، آگے کہسار تھا

کام آتا کیا شہر کے
بندہ ہی بے کار تھا

میں بھی پیدل تھا، ظفرؔ
وہ بھی سڑک سوار تھا

کعبہ تھا یا دَیر تھا
ایک ہی سب کا اَیر تھا

جھگڑے سے کیا نکلتے
بیچ میں اُس کا پیر تھا

ہوتا اپنا کس طرح
جو غیروں کا غیر تھا

میرے اُس کے درمیاں
بہت پُرانا بیر تھا

کام تمام جو کر گیا
ایک فرینڈلی فَیر تھا

میں بھی تھا تجھ سے الگ
تو بھی مرے بغیر تھا

ہم سمجھے تھے اور کچھ
باغ برائے سیر تھا

تُلسی کھڑا بجار میں
مانگے سب کی کھیر تھا

مقطع لکھا تو، ظفرؔ
پھر تمت بالخیر تھا

دل کے اندر چور تھا
چور کے پیچھے مور تھا

تازہ دَم تھا عشق بھی
وہ بھی نیا نکور تھا

کھا گیا سارا ہی مجھے
ایسا آدم خور تھا

دل کا رُتبہ ایک دَم
سارا سیم اَور تھور تھا

کشتی بھی ٹوٹی ہُوئی
پانی بھی منہ زَور تھا

کوئی نہ تھا اَطراف میں
میں اَور میرا شور تھا

مرنا میں نے بھی نہیں
گور میں کوئی ہور تھا

کبھی مزے کا تھا سخن
کبھی بہت ہی بور تھا

اچھا تھا پھر بھی ظفرؔ
جیسا ڈنگر ڈھور تھا

رنگ تھا یا وہ ڈھنگ تھا
میں سر تا پا دنگ تھا

اندر سے تھا نرم خُو
لہجہ ذرا دبنگ تھا

رُکا رہا چنیوٹ میں
جانا جس کو جھنگ تھا

بھیڑ تو تھی معمول کی
رستہ ہی کچھ تنگ تھا

میں بچّوں کے ہاتھ میں
ٹوٹی ہُوئی پتنگ تھا

ویسا وہ تھا ہی نہیں
جیسا روپ اَور رنگ تھا

مشکل شاید وہی ہے
آئینے پر زنگ تھا

مارا آخر اُسی نے
یہ جو نام و ننگ تھا

دل میں آہٹ تھی، ظفرؔ
یا کوئی آہنگ تھا

جنگ و جدل سے دُور تھا
اَور، زخموں سے چُور تھا

محنت سے مغرور تھا
میں کیسا مزدور تھا

لہو میں تھی دیوانگی
سر میں کوئی فتور تھا

کچھ بے بس تھا آپ بھی
کچھ میں بھی مجبور تھا

کبھی تھا ساہیوال وہ
کبھی بہاول پُور تھا

خوش تھے لوگ اِسی لیے
میرا دل رنجور تھا

وہ تو پاس ہی تھا مرے
میں ہی اُس سے دُور تھا

میں بھی تھا بے دید، اَور
کچھ وہ بھی مغرور تھا

طور طریق اپنا، ظفرؔ
اُس کو نامنظور تھا

ایک طرف حلوائی تھا
دوسری جانب نائی تھا

چھائے ہُوئے تم تھے کہیں
کہیں تمھارا بھائی تھا

کنجوسوں کا بادشاہ
کیسا حاتم طائی تھا

اور، شکر گڑھ سے بہت
دُور کہیں شنگھائی تھا

دل کے ترکے میں مرا
حصّہ ایک تہائی تھا

صحرا ہے اب جس جگہ
یہ خطّہ دریائی تھا

وہی ہُوا ہے پیش رفت
جو پہلے پسپائی تھا

ہم بھی تھے دل پھینک سے
وہ بھی اک ہرجائی تھا

چھوڑ کے رُسوا ہوں، ظفرؔ
پیشہ جو آبائی تھا

یہ جو روئے زمیں تھا
کہیں نہیں تھا، کہیں تھا

آیا ہے وہ یہاں پر
جو پہلے ہی نہیں تھا

کِھسک گئی تھی جگہ ہی
ورنہ میں تو وہیں تھا

شہر وہی اُجڑا ہے جو
اُس کے زیرِ نگیں تھا

آدھا تو تھا مکاں میں
آدھا باہر مکیں تھا

اندر آنا تھا جسے
باہر ہی جاگزیں تھا

خواب تھا میرے اِرد گرد
خوف عِلاوہ ازیں تھا

شور اتنے کے باوجود
میں دُنیا میں نہیں تھا

جتنا کچھ بھی تھا ظفرؔ
سو بھی اپنے تئیں تھا

جس میں اپنا سفر تھا
مٹّی ہی کا بھنور تھا

وہ بھی اب نہیں رہا جو
جھوٹا سچا ہُنر تھا

کبھی ہمارا شہر میں
ہونا ہی اک خبر تھا

مانا نہیں وہ، بات میں
بس اتنا ہی اثر تھا

اَندھوں کے اِس شہر میں
میں ہی صاحب نظر تھا

زُہد شکن تھا خود بھی وہ
میں بھی بندہ بشر تھا

کون تھا جس کے ساتھ وہ
اتنا شیر و شکر تھا

باہر آیا کیوں نہیں
غصّہ مجھ میں اگر تھا

کیا کر ڈالا ظفؔر نے
بندہ تو بے ضرر تھا

وہ اُتنا ہی ورے تھا
جتنا مجھ سے پَرے تھا

پنڈی پہنچا کس طرح
ابھی تو وہ سنگھرے تھا

اپنے مرنے کا قلق
اُس سے بڑھ کر مجھے تھا

شہر چھوڑنے کا خیال
میرے علاوہ اُسے تھا

دل چسپی اتنی ہی تھی
فائدہ جتنا جسے تھا

خطرے میں تھا وہ بہت
مسجد یا مدرسے تھا

جا پہنچا ہوں شاہکوٹ
جانا تو شاہدرے تھا

سچ پوچھیں تو شہر سے
سروکار ہی کسے تھا

گھر والوں کا ڈر، ظفرؔ
مجھے ہی تھا یا تجھے تھا

وہ جو دل میں لہو تھا
اُسی سے اپنا وضو تھا

ہنستا بستا شہر بھی
کبھو نہیں تھا، کبھو تھا

جسے منایا دُھوم سے
عید نہیں تھی ٹرو تھا

بھاگے تھے جب بالکے
سب سے آگے گرو تھا

باتیں ہی کرتا رہا
بہت بڑا جو کرُو تھا

ہم نے جوڑا گوند سے
کرنا جس کو رَفو تھا

شاطر تھا دراصل وہ
دیکھنے میں ہی گئو تھا

لگتا تھا لاہور ہی
دیکھا تو لکھنؤ تھا

سمجھے تو خود ظفرؔ ہی
اپنا اصلی عدو تھا

ایک ہَوا کا دِیا تھا
جو اندر جل رہا تھا

اُس نے سُنا نہیں، مگر
میں نے بھی کچھ کہا تھا

اُس کے میں بھی چار دن
آگے پیچھے ہُوا تھا

میرا ہی تھا اصل میں
شور جو میرے سِوا تھا

پیچھے پیچھے تھی خزاں
آگے آگے ہَرا تھا

جس کی تھی مجھ کو طلب
رستے ہی میں پڑا تھا

اک میں ہی تھا بے خبر
سب کو میرا پتا تھا

گزرا ہی نہیں وہ کہ میں
آگے سے تو ہٹا تھا

شہر بدر تھے، جو، ظفرؔ
میں اَور میرا خدا تھا

جان گیا ہوں، وہی تھا
ابھی نہیں جو ابھی تھا

سب سے اتنا مختلف
ہم ہی میں سے کوئی تھا

سچا تھا ہر طرح سے
لیکن، جھوٹا وہی تھا

پھانسی چڑھ گئے بے گناہ
اصلی مجرم بَری تھا

مجھ سے آگے تھا وہی
جو مجھ سے بھی غبی تھا

بدقسمت تھا اصل میں
جو قسمت کا دھنی تھا

بہت بخیل تھا کام میں
باتوں کا ہی غنی تھا

پہلے تنہا تھا، مگر
دیکھتے دیکھتے کئی تھا

ایک چھلاوہ سا ظفؔر
کبھی نہیں تھا، کبھی تھا

وہ جو اپنا جہاں تھا
وہم تھا، کوئی گماں تھا

نیلی ہو گئی تھی زمیں
نیلا ہی آسماں تھا

نیچے نیچے دُھند سی
اُوپر اُوپر دُھواں تھا

نئے محلے میں کبھی
ایک پُرانا مکاں تھا

برفیلی تہہ کے تلے
پانی سا اک رواں تھا

جو ہونا تھا یہاں پر
پہلے ہی سے عیاں تھا

منع کیا تھا جہاں سے
میں بھی شاید وہاں تھا

جس سے ہوئے تھے منحرف
وہی تو اپنا بیاں تھا

کہاں کھو گیا ہے ظفرؔ
ابھی ابھی تو یہاں تھا

یہ جو بندر نہیں لگ رہا
کیا مچھندر نہیں لگ رہا

یہ جو باہر ہے میلہ کوئی
میرے اندر نہیں لگ رہا

رام چندر ہے اصلی، مگر
رام چندر نہیں لگ رہا

کوئی مسجد نہیں لگ رہی
کوئی مندر نہیں لگ رہا

اُس کو میک اَپ ذرا کرنے دو
جو چقندر نہیں لگ رہا

جل رہا ہے اُسی آگ میں
اَور، سمندر نہیں لگ رہا

فتح کرتا گیا ہند، سندھ
جو سکندر نہیں لگ رہا

اچھا خاصا بھگندر ہے جو
کچھ بھگندر نہیں لگ رہا

ہے قلندر تو پوچھو ظفرؔ
کیوں قلندر نہیں لگ رہا

کام اعلیٰ نہیں لگ رہا
کچھ نرالا نہیں لگ رہا

جمع پونجی یہی ہے، مگر
مجھ سے تالا نہیں لگ رہا

اندر اندر تو لگتا ہے سب
بالا بالا نہیں لگ رہا

مکڑیاں تو بہت ہیں، مگر
گھر میں جالا نہیں لگ رہا

سب تلافی تو ہو بھی چکی
کیوں ازالہ نہیں لگ رہا

حق تعالیٰ بھی کچھ روز سے
حق تعالیٰ نہیں لگ رہا

سر بہ سر ہی وہی ہے، مگر
پہلے والا نہیں لگ رہا

ہم نے سمجھا جسے اِس قدر
تر نوالہ نہیں لگ رہا

چاند بے شک وہی ہے، ظفرؔ
یہ وہ ہالہ نہیں لگ رہا

کچھ اور طرح سے بھی بنایا نہیں میں نے
جو کام بگڑنے سے بچایا نہیں میں نے

وہ راز کہ تھا وجہِ فساد، اِس لیے مجھ کو
معلوم بھی تھا اور بتایا نہیں میں نے

پوشیدہ رکھی ایک طرف خلق سے دن رات
پردہ یہ برابر سے ہٹایا نہیں میں نے

گرمی تھی اگر کوئی تو اُس کی ہی بدولت
دشمن کو جو محفل سے اُٹھایا نہیں میں نے

میں دُھوپ میں اُس روز جُھلستا رہا بے سُود
اشجار بھی نزدیک تھے، سایا نہیں میں نے

اندر کے تو احوال ہی مخدوش تھے، تاہم
چہرے سے کبھی رنگ اُڑایا نہیں میں نے

مطلب کے لیے پاؤں بھی اُس شوخ کے پکڑے
اِس بار فقط سر ہی جھکایا نہیں میں نے

تحقیق بھی کی، اُس کے کوائف بھی کیے جمع
خالی کوئی اندازہ لگایا نہیں میں نے

خالص ہے ظفرؔ، سلسلۂ خواب اُسی طرح
اِس جنس میں کچھ اور مِلایا نہیں میں نے

ترچھا نہیں کچھ بھی، ابھی آڑا نہیں میں نے
وہ خواب کہیں ڈھنگ سے کاڑھا نہیں میں نے

کچھ بھیڑ زیادہ بھی تھی اُس بزم میں اِس بار
موجود تھا، لیکن اُسے تاڑا نہیں میں نے

یہ شہر کھنڈر ہونے کو تیار تھا، لیکن
سب جانتے ہیں، اِس کو اُجاڑا نہیں میں نے

اپنے ہی مسائل میں گرفتار رہا ہوں
اِس خاک پہ جھنڈا کوئی گاڑا نہیں میں نے

کچھ کھیلنے والے ہی غلط کار تھے یک سر
یہ کھیل کسی طور بِگاڑا نہیں میں نے

یہ گرد مری خاک سے اُٹھتی ہے شب و روز
اِس کو در و دیوار سے جھاڑا نہیں میں نے

اِس باغ پہ یہ بھی مرا احسان بہت ہے
جڑ سے جو کوئی پیڑ اُکھاڑا نہیں میں نے

لاہور کو بھی آن کے آباد کیا ہے
اور، ساتھ ہی چھوڑا بھی اوکاڑہ نہیں میں نے

سُن لی ہے، ظفرؔ خلق نے آخر مری آواز
اک عمر گلا یونہی تو پھاڑا نہیں میں نے

کچھ اُس کو مصیبت میں جو ڈالا نہیں میں نے
ارماں ہے اک ایسا کہ نکالا نہیں میں نے

گرنے سے بچایا اُسے چھوٹے سے گڑھے میں
دشمن کو کنوئیں سے تو سنبھالا نہیں میں نے

رکھے ہُوئے ہوں عشق سے اک فاصلہ ہر وقت
اچھا تھا، مگر روگ یہ پالا نہیں میں نے

ایک ایسی مصیبت ہے کہ ڈرتا رہا جس سے
آتی ہے تو سر سے اُسے ٹالا نہیں میں نے

تکلیف بھی اَور چارہ نہیں اِس کا کیا ہے
نقصان ہے اَور اِس کا ازالہ نہیں میں نے

میں اجنبیوں سا ہی مِلا کرتا ہوں اُس سے
ہرگز بھی اُسے اپنا حوالہ نہیں میں نے

دُنیا میں دُھندلکا سا ہی رہنے دیا ہر سُو
اتنا بھی اندھیروں میں اُجالا نہیں میں نے

ہو گا تو ذرا دوسروں سے اَور طرح کا
یہ کام کچھ ایسا بھی نرالا نہیں میں نے

بہتا ہوں، ظفرؔ اپنے کناروں میں سمٹ کر
اپنا ہی تھا پانی جو اُچھالا نہیں میں نے

پانی کبھی یوں سر سے گزارا نہیں میں نے
اُس کو کسی حالت میں پکارا نہیں میں نے

سر پر ہی رہی اُس کے تغافل کی یہ گٹھڑی
چاہا بھی تو یہ بوجھ اُتارا نہیں میں نے

کافی بھی نہ تھی ایک ہی بار اُس سے ملاقات
تھا یہ بھی مناسب جو دوبارہ نہیں میں نے

آنا تھا یہاں اپنی روانی میں ہی اُس کو
گزرا بھی اِدھر سے تو اشارہ نہیں میں نے

اپنی بھی معیت میں گزرتی نہیں اچھی
کیا جانے کیوں پھر بھی تمھارا نہیں میں نے

اپنی ہی تپش سے جل اُٹھے ہیں یہ خس و خاک
پوچھا ہے جو مجھ سے تو شرارہ نہیں میں نے

بگڑا ہُوا ہے ذائقہ ہی اب تو کچھ اِس طور
اچھی بھی کوئی بات گوارا نہیں میں نے

ہیں اَور بھی شاعر یہاں ایک ایک سے بڑھ کر
کچھ ہوں بھی اگر میں تو اجارہ نہیں میں نے

اِس خوابِ قناعت میں ہی گُم ہوں، ظفرؔ اب تک
تھوڑا بھی ہے کافی کہ یہ سارا نہیں میں نے

یہ آب و تاب جو دشت و دمن کے پیچھے ہے
کہیں ہوائے خزاں بھی چمن کے پیچھے ہے

پہنچتی ہے خبر اُس کی بھی گاہ گاہ مجھے
اک انجمن جو تری انجمن کے پیچھے ہے

مجھے سُراغ لگانا ہے ایک دن اُس کا
جو ایک چیز ترے بانکپن کے پیچھے ہے

یہی ہے وجہِ پریشانی آج میرے لیے
یہ تکمہ سا جو قبائے بدن کے پیچھے ہے

میں بدگماں تو نہیں اِس قدر، مگر شاید
اک اور بات مرے سوئے ظن کے پیچھے ہے

وہ اِس لیے کہ اُسے دیکھ ہی نہ لے کوئی
جو مور ناچ رہا ہے وہ بَن کے پیچھے ہے

وہ لے کے جائے گا ایک اَور ہی طرف مجھ کو
جو شک و شبہ ترے غالباً کے پیچھے ہے

ذرا سا صبر تو کر، تھوڑا انتظار تو کھینچ
خوشی کی لہر بھی رنج و مِحَن کے پیچھے ہے

دوا بھی چاہیے ہے اِس کے باوجود، ظفرؔ
کوئی دعا بھی اگر اہلِ فن کے پیچھے ہے

نظر میں رہتے ہُوئے اِس جہاں کے پیچھے ہے
وہ آسماں جو مرے آسماں کے پیچھے ہے

بہت گزر گئی آگے، مگر کہیں نہ کہیں
حکایت اَور بھی اِس داستاں کے پیچھے ہے

وہ ذائقہ جو زباں پر نہیں رہا، باقی
میں سوچتا ہوں کہ شاید زباں کے پیچھے ہے

وہ کیا کمائے گا اِس کاروبار میں جو یہاں
اُسی طرح ابھی سُود و زیاں کے پیچھے ہے

اُسی سے بھید کُھلے گا کہ ہوں بھی یا کہ نہیں
وہ اک نشاں جو مرے ہر نشاں کے پیچھے ہے

فریب ہی اِسے سمجھو، مگر سنو تو سہی
وہ ایک نغمہ جو میری فغاں کے پیچھے ہے

لگے گا وقت ابھی آپ کی تلاشی میں
کہ ایک اور مکاں بھی مکاں کے پیچھے ہے

مجھے کوئی نظر انداز کیا کرے گا، اگر
یقیں بھی مرے وہم و گماں کے پیچھے ہے

ظفؔر اگرچہ زیادہ بھی شرپسند نہیں
کوئی تو شہر میں امن و اماں کے پیچھے ہے

ابھی یہ وحشت اگر دشت و زر کے پیچھے ہے
تو جیسے کوئی بلا ہے جو گھر کے پیچھے ہے

قریب و دُور کی اب کوئی اہمیّت ہی نہیں
ابھی تو خوابِ سفر بھی سفر کے پیچھے ہے

سُنی سُنائی پہ ہی اعتبار کیجیے گا
کہ ایک خوف بھی ہے جو خبر کے پیچھے ہے

یہ کارکردگی میری ہی سب نہیں کہ یہاں
ہَوا کا زور بھی کچھ بال و پر کے پیچھے ہے

مرے حساب میں اب کیا بتاؤں کس دن سے
وہ خشک وتر بھی ہے جو خشک وتر کے پیچھے ہے

وہ لے بھی سکتا ہے واپس، ذرا خیال رہے
کہ دینے والا ہے جو خود اثر کے پیچھے ہے

یہی نہیں ہے فقط، ہے کوئی سبب اِس کا
کچھ اَور بھی ہے جو، اِس شور وشر کے پیچھے ہے

اُسے بھی دھیان میں رکھنا کہ وہ بھی ہے کوئی چیز
جو کارساز کسی کارگر کے پیچھے ہے

بچائے پھرتا ہوں دستار کیا میں اُس سے، ظفرؔ
وہ ایک شخص کہ جو میرے سر کے پیچھے ہے

◆

یہ اور بات مرض خود شفا کے پیچھے ہے
یہاں اگرچہ دعا بھی دوا کے پیچھے ہے

عجیب صورتِ حالات ہوتی جاتی ہے
کہ اب روا بھی یہاں ناروا کے پیچھے ہے

نظر کسی کی نتیجے پہ کچھ نہیں، لیکن
ہر ایک شخص جزا و سزا کے پیچھے ہے

طلسمِ زارِ بدن کا ہو کیا بیاں، جیسے
قبا اک اَور بھی رنگِ قبا کے پیچھے ہے

میں اُس کے ہاتھ نہ آؤں گا اِس بیاباں میں
فضول ہی وہ مرے نقشِ پا کے پیچھے ہے

ہُوا نہ تھا کبھی پہلے تو مہرباں اتنا
سو، کوئی اَور بھی اُس کی رضا کے پیچھے ہے

کہیں تو لے کے اُنھیں بیٹھ جائے گی خود بھی
ہماری گرد جو اہلِ صفا کے پیچھے ہے

یہ دَوڑ ختم بھی ہو گی کہیں، نہیں معلوم
ہَوا اک اَور بھی جیسے ہَوا کے پیچھے ہے

ہو اور چارہ و تدبیر کیا کہ اُس کو ظفرؔ
پکارتا بھی ہے، خود بھی صدا کے پیچھے ہے

جو مل رہا نہیں، تیرے جہاں کے اندر
زمیں سے دُور ہے اور آسماں کے اندر ہے

میں کہہ سکوں نہ کبھی یہ ہے اَور چیز، مگر
ابھی وہ بات زبان و بیاں کے اندر ہے

یہ مشتِ خس ہے اسی روشنی سے تابندہ
جو ایک پارۂ برق آشیاں کے اندر ہے

ذرا سی اَور توجہ بھی ہے مجھے درکار
ابھی کچھ اَور مری داستاں کے اندر ہے

کرے گا یہ تو مجھے شاید اَور بھی گُم راہ
جو اک سُراغ سا اُس کے نشاں کے اندر ہے

عجیب صورتِ حالات میں گِھرا ہوں کہ وہ
مکین بھی نہیں، لیکن مکاں کے اندر ہے

میں سوچتا ہوں کہ دشمن میں بھی نہیں ہو گی
وہ ایک بات جو اُس مہرباں کے اندر ہے

نہ بات کوئی زبردست سُوجھتی ہے مجھے
نہ زور ہی کوئی طبعِ رواں کے اندر ہے

ظفؔر کا ربط ہی باقی نہیں کسی سے یہاں
اگرچہ کہنے کو وہ کارواں کے اندر ہے

مسافرت پہ ہے دل، رہ گزر کے اندر ہے
اگرچہ ایک زمانے سے گھر کے اندر ہے

جسے سمجھتا رہا ایک عمر تک مشکوک
جو دیکھتا ہوں تو وہ سر بہ سر کے اندر ہے

خیال وہ ہے کہ سر سے گزر گیا کئی بار
یہ خواب وہ ہے کہ اپنی خبر کے اندر ہے

تلاش کرتا ہوں گرد و نواح میں جس کو
بہت ہی دُور ہے اور دَر بہ دَر کے اندر ہے

میں اُس کو بھول چکا تھا اُڑان کرتے ہُوئے
وہ تازگی جو ابھی بال و پر کے اندر ہے

مری نگاہ میں ہے اور بھی کوئی دُنیا
یہی نہیں ہے کہ جو خشک و تر کے اندر ہے

ہَوا کے ساتھ جو پیغام بھیجتا ہے مجھے
چھُپا ہُوا کوئی بیٹھا شجر کے اندر ہے

کئی دفعہ مری آنکھوں میں رنگ سا بکھرا
چمک عجیب سی اُس مال و زر کے اندر ہے

مِلا جُلا سا ہے، یہ سارا کاروبار، ظفؔر
کہ ایک بے ہُنری بھی ہُنر کے اندر ہے

بھٹکتا پھرتا ہوں، اور ہُو بہ ہُو کے اندر ہے
یہ آرزو جو مری آرزو کے اندر ہے

تبادلہ تو خیالات کا کرو کسی دن
چمن کھلا ہُوا اِس گفتگو کے اندر ہے

لحاظ داریوں میں ہیں کرشمہ کاریاں بھی
مقامِ صلح بھی اِس دُوبہ دُو کے اندر ہے

میں رفتہ رفتہ ہی پہچان پاؤں گا اُس کو
مرا لہو جو ترے رنگ و بو کے اندر ہے

ہوائیں اور فضائیں ہیں اور بھی کیا کیا
یہی نہیں ہے جو اِس چار سُو کے اندر ہے

سمجھ رہا تھا جسے رُوبہ رُو سے باہر میں
تمام شعلۂ جاں رُوبہ رُو کے اندر ہے

اَٹک گیا ہے کوئی لفظ بات کرتے ہُوئے
یہ روشنی سی جو تیرے گلو کے اندر ہے

ملی ہے مجھ کو ترے ساتھ سو کے ہی اکثر
یہ جس طرح کی طہارت وضو کے اندر ہے

مُداخلت ہے ظفرؔ سے کلام کرنا بھی
کہ آج کل یہ کسی جستجو کے اندر ہے

تلاش کرتا ہوں اور جا بہ جا کے اندر ہے
ہوا کا سلسلہ سارا ہوا کے اندر ہے

زیادہ فرق نہیں رہ گیا ہے دونوں میں
کہ اِنتہا بھی اِسی اِبتدا کے اندر ہے

مری نظر کا یہ دھوکا ہے جو بھی ہے ہر سمت
وگرنہ ساری خدائی خدا کے اندر ہے

وہی طلسم ہے اُس کی ادا کے باہر بھی
جو اپنے زور میں اُس کی ادا کے اندر ہے

بِلا مُجلا سہی، باہر کے رنگ پر مت جا
کہ اصل سارا کرشمہ قبا کے اندر ہے

اگرچہ دونوں بہ ظاہر ہیں مختلف، ورنہ
سزا کی ساری خرابی جزا کے اندر ہے

کُھلے گا راز جو دیکھو جدا جدا کر کے
ہماری ساری خموشی صدا کے اندر ہے

برہنہ آنکھ سے کچھ بھی نظر نہ آئے گا
یہ اشتراک جو بیم و رجا کے اندر ہے

چلا ہُوا ہے اندھیرے میں کام سب کا، ظفرؔ
چراغ بھی اِسی ظلمت سرا کے اندر ہے

چلنے کے لیے ہے نہ اُچھلنے کے لیے ہے
یہ راہ فقط راہ بدلنے کے لیے ہے

کچھ آب و ہوا چاہیے ہے اُس کو گوارا
پودا یہ بہت پھولنے پھلنے کے لیے ہے

کچھ ہونے ہی والا ہے کسی پَل، کسی لمحے
یہ دل ہے کہ ناگاہ دہلنے کے لیے ہے

یہ خشک تنا بھی ہے پُر اُمّید کہ اک دن
کونپل کوئی اِس میں سے نکلنے کے لیے ہے

ہونے کو ہیں شاداب یہ ترسے ہُوئے ذرّے
چشمہ مرے صحرا سے اُبلنے کے لیے ہے

اچھا ہے کہ اِس کے لیے تیار ہوں میں بھی
یہ دوپہر اک آن میں ڈھلنے کے لیے ہے

یہ راستہ ہم کو ابھی یہ بھی نہیں معلوم
گرنے کے لیے ہے کہ سنبھلنے کے لیے ہے

معلوم نہیں ہے تجھے یہ باغِ تماشا
موجود یہاں تیرے ٹہلنے کے لیے ہے

دل ہے تو، ظفر چھوڑ اِسے حال پر اس کے
یہ اپنی ہی آتش میں پگھلنے کے لیے ہے

سونے کے لیے ہے نہ سُلانے کے لیے ہے
یہ سلسلہ اک خواب دِکھانے کے لیے ہے

یہ باغِ ثمردار سے ہوتا ہُوا رستہ
اِس شہر میں واپس ترے آنے کے لیے ہے

اب روکنے آئے ہو اِسے عزمِ سفر سے
تیار جو بیٹھا ہُوا جانے کے لیے ہے

ترتیب کوئی تیری کہانی کو ہے درکار
تفصیل کوئی میرے فسانے کے لیے ہے

رونق جو لگی ہے تو کسی اور کی خاطر
یہ میرے لیے ہے نہ زمانے کے لیے ہے

ہم بھول گئے تجھ کو تو بھولے نہیں یک سر
کچھ یہ بھی تجھے یاد دِلانے کے لیے ہے

جو مجھ کو ڈبونے کے لیے آئی تھی، دراصل
وہ لہر مجھے پار لگانے کے لیے ہے

ہم نے اُسے کچھ اور سمجھ رکھا ہے کیوں کر
یہ خاک اگر پھول اُگانے کے لیے ہے

ہے اصل، ظفرؔ، شاعری اتنی سی ہی، ورنہ
باقی تو بس اک دُھوم مچانے کے لیے ہے

اونوں کے لیے ہے کہیں پونوں کے لیے ہے
انعام ہے جو بھی یہاں بونوں کے لیے ہے

پوچھو، اگر اتنی بڑی دُنیا میں جگہ کوئی
تھوڑی سی محبت کے بچھونوں کے لیے ہے؟

مشغول جو رکھا ہے اُسے کھیل میں سب کو
گنجائش اگر ہے تو کھلونوں کے لیے ہے

اِس آبِ تماشا میں نہاتے بھی ہیں کچھ لوگ
اَور، پیاس فقط ہونٹ بھگونوں کے لیے ہے

میری نہ تمھاری ہے محبت کی مصیبت
یہ رَنج برابر کا ہے، دونوں کے لیے ہے

گھر والوں سے چُھپ کر کہیں رو لینا گھڑی بھر
اعزاز یہ کب سے کئی کونوں کے لیے ہے

سب کو نہیں دیتے ہیں کہ یہ درد کی دولت
اک دوسرے میں جا کے سمونے کے لیے ہے

محروم کسی کو نہیں رکھتے کہ یہ دُنیا
ہونوں کے لیے اَور نہ ہونوں کے لیے ہے

اس گلشنِ ہستی کی ''ظفرؔ'' کوئی بھی نعمت
شاخوں میں ستارے سے پرونوں کے لیے ہے

تھا یوں تو سبھی سلسلہ اقرار سے باہر
اک اَور بھی شے تھی ترے انکار سے باہر

اپنوں سے تو یک سر اِسے فارغ ہی سمجھیے
مِلتا نہیں جو حلقۂ اغیار سے باہر

پہچان کسی کی یہاں باقی ہی نہیں ہے
دیوار ہے خود سایۂ دیوار سے باہر

پھرتی تھی ہَوا شام کی شہنائی سی بَن کر
اشجار کے اندر کبھی اشجار سے باہر

وہ کُونج ہوں اِس عرصہ گہِ شامِ فلک میں
نکلی تھی کبھی آپ ہی جو ڈار سے باہر

میں اپنے نشانات کے اندر نہ ملوں گا
ڈھونڈو کبھی مجھ کو مرے آثار سے باہر

اک لفظ ہے ایسا کہ اَدا ہو نہیں سکتا
اک بات ہے پیرایۂ اظہار سے باہر

کچھ مانگ ہی باقی نہیں اِس بار، سو اپنا
سودا کبھی ہو گا بھی تو بازار سے باہر

اپنا بھی شمار اب تو ظفر، ہونے لگا ہے
دو چار کے اندر، کہیں دو چار سے باہر

پہنچا تھا وہاں میں بھی بہت شام سے باہر
نکلا ہُوا تھا وہ بھی کسی کام سے باہر

قائم رہا اُلجھے ہُوئے انکار پہ وہ بھی
نکلا، نہیں میں بھی طمعِ خام سے باہر

وہ دانۂ لب جس نے پھنسایا مجھے آخر
تھا دام کے اندر تو کبھی دام سے باہر

اندر بڑی تکلیف سے پہنچا ہے جہاں وہ
نکلے گا کسی دن بہت آرام سے باہر

تھا پہلی نظر میں ہی وہ پایانِ تماشا
آغاز نہیں ہے کوئی انجام سے باہر

ممکن ہے کہ وہ تیری اجازت سے چڑھا ہو
اک چاند نیا تھا جو ترے بام سے باہر

تُو نے تو بدل دی تھی کہیں بعد میں وہ بات
میں خود نہیں نکلا ترے الزام سے باہر

اک شور کو چھوڑا تو ہُوا دوسرا درپیش
کہرام تھا ایک اور بھی کہرام سے باہر

کر لیں گے، ظفرؔ لوگ بھی تسلیم کسی دن
کچھ ہو تو سہی آپ کے اس نام سے باہر

دیکھا ہے نکل کر جو کبھی ذات سے باہر
تھی بات کوئی اور مری بات سے باہر

ایسا ہی نتیجہ بھی نکلنا تھا کہ اب کے
تھے سارے جوابات، سوالات سے باہر

کچھ بھید سمجھ میں مری آئے ہیں کم و بیش
سوچا ہے نکل کر جو خیالات سے باہر

دُنیا کے عجائب ہیں مرے سامنے دن رات
باقی نہیں کچھ اُس کے طلسمات سے باہر

اندر کی خبر کچھ نہیں مجھ کو مگر اِس بار
کچھ اور ہوا تھی ترے باغات سے باہر

ایسا ہے کہ روشن تھے اندھیرے کسی جانب
دن سا کوئی نکلا ہوا تھا رات سے باہر

اُس نے بھی کبھی ڈھیل مجھے دی نہیں اِتنی
میں خود بھی نکلتا نہیں اوقات سے باہر

کچھ اَور حقائق بھی نظر آئیں گے مجھ کو
نکلوں جو کبھی اُس کے بیانات سے باہر

پابند کرو اُس کو، ظفرؔ ٹھیک طرح سے
ورنہ تو نکل جائے گا پھر ہاتھ سے باہر

خواہش سے نہ اِس خواب کے جنجال سے باہر
نکلوں گا میں کیا ایسے بُرے حال سے باہر

رکھ سکتا ہوں کیا اِس کا حساب اَور حوالہ
پرواز تھی میری یہ پر و بال سے باہر

اُس کے ہُنرِ نغمہ پہ کیا رائے ہو میری
میں آپ ہمیشہ سے ہوں سُر تال سے باہر

ہے جال کے اندر ہی ترا غیب تو کافی
اک طرفہ تماشا ہے کوئی جال سے باہر

پھیلے ہُوئے تھے کتنے طلسمات مرے گِرد
نکلا نہیں میں اُس کے خد و خال سے باہر

مارا گیا کچھ میں ہی قناعت میں، وگرنہ
دولت ہے تمام اُس کے زر و مال سے باہر

آگے نہیں چل سکتا ہوں دو چار قدم بھی
ہوتا ہوں جو میں اپنی کبھی چال سے باہر

بازار میں یہ لفظ لیے پھرتا ہوں کب سے
چلتا نہیں، سکّہ ہے یہ ٹکسال سے باہر

کیا تم سے توقع ہو ظفرؔ خود تو ابھی تک
نکلے نہیں پیرایۂ پامال سے باہر

رُسوائی ہی رُسوائی تھی اعزاز کے آگے
یہ شعبدہ میرا ترے اعجاز کے آگے

لڑ جائے تو بس معجزہ ہو گا کوئی یہ بھی
آیا ہے ممولہ کوئی شہباز کے آگے

کچھ بات وسائل کی بھی ہوتی ہے کم و بیش
ٹھہرے کوئی کیا تیری تگ و تاز کے آگے

نکلا ہے کوئی اتنے بڑے شہر میں اب تک
اُس ناز کے آگے کہ اِس انداز کے آگے

تجھ کو تو کوئی فکر نہیں چاہیے کرنی
میں آپ ہی دیوار ہوں اِس راز کے آگے

اُس دشمنِ جاں سے یہ توقع بھی نہیں تھی
یہ مسئلہ رکھتے کسی دم ساز کے آگے

پانی ہی بہا لے گیا بہبود کا ہر خواب
باندھا نہ کوئی بند جو اغراض کے آگے

پہلے تو میں ہم راہ رہوں گا کسی حد تک
پھر خود ہی نکل جاؤں گا آواز کے آگے

کیا شعر کہیں گے، ظفرؔ اِس حال میں، اب تو
مجبور کھڑے رہتے ہیں الفاظ کے آگے

نکلتے نہیں بے قراری سے ہم
ابھی مہربانی تمھاری سے ہم

یہ روٹی جو باسی ہے اور سخت بھی
اسے کاٹ ہی لیں گے آری سے ہم

خزاں زاد تھے اِس لیے ایک دم
پڑے تنگ بادِ بہاری سے ہم

کرو کام سارے ہمارے سپرد
کریں گے بہت رازداری سے ہم

اُڑائی ہے کیا جانے کس کس کی خاک
جو رہتے ہیں اب خاکساری میں ہم

جہاں ہم کو آدھی نہیں تھی قبول
گئے آخرِ کار ساری سے ہم

سرِعام پکڑے گئے ہیں جو پھر
تو اپنی ہی کچھ خام کاری سے ہم

بزرگوں کی شاید یہی تھی دُعا
کہ باز آئیں چوری نہ یاری سے ہم

ظفرؔ، کون جانے پھر آئے نہ آئے
اگر رہ گئے آج باری سے ہم

بڑے مطمئن ہیں گرانی سے ہم
جو بے زار ہیں دانہ پانی سے ہم

بہت بدسلوکی سے پالا پڑا
گئے تھے جہاں خوش گمانی سے ہم

نہیں کوئی پھل پھول اپنے لیے
تو باز آئے اِس باغبانی سے ہم

رکاوٹ بھی ایسی ہی تھی راہ میں
چلے تھے جو اتنی روانی سے ہم

ہمارا جو کردار ہی کچھ نہ تھا
نکل آئے خود ہی کہانی سے ہم

جو جیتے تھے دشمن سے کھا کر شکست
تو ہارے ہیں اب کامرانی سے ہم

جو موقع مِلا تو کبھی حالِ دل
کہیں گے اُسے بے زبانی سے ہم

گئے تھے جو خود محفلِ ناز میں
تو نکلے تری مہربانی سے ہم

ہُوئے کیسے خُلد آشیانی ظفرؔ
یہ پوچھیں گے جنت مکانی سے ہم

رہا کرو اب رُوٹھے
تم روٹھے، ہم چھُوٹے

کچّے، رہے سلامت
پکّے دھاگے ٹُوٹے

جانے لگے کراچی
پکڑے گئے کُھوٹے

چوک ہو یا چوبارہ
کہیں تو بھانڈا پھُوٹے

کنجی ہُوئے نایاب
اُلٹے پڑے ہیں ٹھُوٹھے

گھاس تھی کچھ پامال
کچھ روندے ہُوئے بُوٹے

معنی دیئے پچھاڑ
مزے لفظ کے لُوٹے

بیر بہوٹیاں تھیں کچھ
باقی بیر بہوٹے

سب کے ساتھ ظفرؔ بھی
اپنا پپیا کُوٹے

جو کچھ اپنے تئیں جوڑا میں نے
دوسری طرح سے توڑا میں نے

کس گھڑی جانیے کیا کر بیٹھوں
خود کو تنہا نہیں چھوڑا میں نے

اپنے ہی سامنے کیوں لا رکھا
آپ کی راہ کا روڑا میں نے

کر دیا اُس کو زیادہ واپس
رکھا اپنے لیے تھوڑا میں نے

میرا اپنا ہی بیاں تھا جس کو
بعد میں توڑا مروڑا میں نے

میں نے سوئے ہُوئے سے کچھ نہ کہا
جاگتے کو ہی جھنجھوڑا میں نے

کوئی اُلٹا ہی سفر تھا درپیش
کس دیا زین پہ گھوڑا میں نے

دیکھیے اپنا ہی بھانڈا کیسے
عین چوراہے میں پھوڑا میں نے

شعر پھیکا ہی رہا جس پہ ظفرؔ
دل کا لیموں بھی نچوڑا میں نے

آرزو آگے بڑھی، اقرار پیچھے رہ گیا
ایسی پسپائی ہوئی، اصرار پیچھے رہ گیا

عشق میں اِس بار باہر کی ہوا ایسی لگی
دیکھتے ہی دیکھتے گھر بار پیچھے رہ گیا

کچھ پتا چلتا نہیں واماندگی کی راہ میں
یار پیچھے رہ گیا یا پیار پیچھے رہ گیا

یہ تو ہونا ہی تھا رخشِ خواب پر ہو کر سوار
سو رہا منزل پہ ہے، بیدار پیچھے رہ گیا

ہر دفعہ اِس دوڑ میں آگے نکلنا تھا مجھے
اور میں وہ ہوں کہ جو ہر بار پیچھے رہ گیا

تیز رفتاری کے صدقے اب مرے چاروں طرف
دُھوپ ہے اور سایۂ اشجار پیچھے رہ گیا

آ دبوچا سر بہ سر گھیرے اندھیروں نے ہمیں
اور کہیں وہ مطلعِ انوار پیچھے رہ گیا

گھومتے رہتے تھے ہم جو ایک ہی نقطے کے گرد
گردشِ گفتار میں کردار پیچھے رہ گیا

بِک گیا ہوں مفت میں، وہ بھی سرِ راہے، ظفرؔ
مول کیا لگتا مرا، بازار پیچھے رہ گیا

سال بھر چھابڑی لگاتا ہوں
بے خطر چھابڑی لگاتا ہوں

تاکہ ہو جاؤں شام تک فارغ
وقت پر چھابڑی لگاتا ہوں

پھر بھی سودا تو بچ ہی رہتا ہے
جس قدر چھابڑی لگاتا ہوں

کوئی آکر اُٹھا بھی سکتا ہے
بے خبر چھابڑی لگاتا ہوں

غیر خوانچہ وہیں جماتا ہے
میں جدھر چھابڑی لگاتا ہوں

نہیں کرتا ہوں ایسا ویسا کام
ہاں، مگر چھابڑی لگاتا ہوں

آنا جانا کہیں نہیں پڑتا
بیٹھ کر چھابڑی لگاتا ہوں

اَور کچھ بھی نہیں کیا کرتا
سر بہ سر چھابڑی لگاتا ہوں

آپ کو اعتراض کیا ہے، ظفرؔ
میں اگر چھابڑی لگاتا ہوں

کس کس کو شکایت کیجیے
کس کس سے رعایت کیجیے

پیسہ نہیں، موبائل ہی سہی
اب کچھ تو عنایت کیجیے

ہوں کافی ہدایت یافتہ
مجھ کو نہ ہدایت کیجیے

سختی جو بہت فرمائی ہے
نرمی بھی عنایت کیجیے

بھرپور ہے اتنا جسم اگر
اتنی نہ کفایت کیجیے

دشمن بھی یہاں پھرتے ہیں مرے
اُن کی بھی حمایت کیجیے

دل کا رستہ ہے کُھلا ہُوا
چپکے سے سرایت کیجیے

باہر بھی علاقہ آپ کا ہے
اندر بھی وِلایت کیجیے

افسانۂ دل اچھا تھا، ظفرؔ
کچھ اَور حکایت کیجیے

دوبارہ بھتہ خور ہوں
بے چارہ بھتہ خور ہوں

چل پھر کے بیچتا ہوں پرچی
بنجارہ بھتہ خور ہوں

پہلو ہیں میرے اَور بھی کچھ
کیا سارا بھتہ خور ہوں

آتا نہیں نظر، ایسا
نظّارہ بھتہ خور ہوں

اکثر نہیں لگتی دیہاڑی
ناکارہ بھتہ خور ہوں

تشدید سے پھُول گیا ہوں بس
غبّارہ بھتہ خور ہوں

کیا پوچھ رہے ہو میں نفسِ
امّارہ بھتہ خور ہوں

ٹک کر کیا بیٹھوں گا، آخر
آوارہ بھتہ خور ہوں

تم جیتے ہو آخر، ظفرؔ
میں ہارا بھتہ خور ہوں

بسیار جھاڑو پھیرتا ہوں
بے کار جھاڑو پھیرتا ہوں

ہر بار رہ جاتے ہیں تنکے
ہر بار جھاڑو پھیرتا ہوں

کام اور تو آتا نہیں کچھ
ناچار جھاڑو پھیرتا ہوں

انکار جھاڑو پھیرتا تھا
اقرار جھاڑو پھیرتا ہوں

جس پار ہے ساری ضرورت
اُس پار جھاڑو پھیرتا ہوں

کردار جھاڑو کھو گیا ہے
گفتار جھاڑو پھیرتا ہوں

جی ہی نہیں لگتا ہے اِس میں
بے زار جھاڑو پھیرتا ہوں

فارغ سمجھتا ہے مجھے کیا
اے یار، جھاڑو پھیرتا ہوں

دیتے دلاتے کچھ نہیں ہیں
بیگار جھاڑو پھیرتا ہوں

جُڑی ہُوئی بیماری ہے
اوپر سے بے کاری ہے

جب سے افسر بنے ہو تم
بوسہ بھی سرکاری ہے

ہلکا پُھلکا ہوں جب سے
پاؤں تمھارا بھاری ہے

سانپ نکل کر بھاگ گیا
خالی پڑی پٹاری ہے

زخم لگا ہی نہیں جہاں
خون ابھی تک کاری ہے

دُنیا کی ہے ترک اگر
یہ بھی دُنیا داری ہے

چکھ کر دیکھا ہے اُس کو
پھیکی ہے نہ کراری ہے

لے جاتی ہے کہیں نہ کہیں
ایسی سڑک سواری ہے

شاعری اُس نے کی ہے، ظفرؔ
میں نے نقل اُتاری ہے

کھا کر بس میں دھکے
رہ گئے ہکّے بکّے

کچّے ہیں کانوں کے
بے غیرت ہیں پکّے

جج تھا یہی ہمارا
آ بیٹھے ہیں ٹکّے

بال گرا کر ڈھیلے
کھائے ہیں چوکے چھکّے

آپ لگائی عدالت
خود ہی چور اُچکّے

کھینچیں ناک لکیریں
چھوڑے آنکھ مٹکّے

مُڑے نہ شام ڈھلے تک
اُڑے کبوتر لکّے

جائیں گے ساتھ ہمارے
سارے بھیڑ بھڑکّے

سچ نہیں ہے کڑوا
میٹھے نہیں مُنقّے

ٹوٹی پھوٹی آس تھی
ہمیں تو وہ بھی راس تھی

گندا پانی جمع تھا
کیا ملنے کی پیاس تھی

اچھی خاصی دل پذیر
ابھی تو اُس کی ساس تھی

سہما ہُوا سریر تھا
پھُولی ہُوئی کپاس تھی

ٹھہرا ہُوا وجود تھا
نکلی ہُوئی بھڑاس تھی

میں تھا اپنے داؤ پر
وہ بھی نبض شناس تھی

اُونچی نیچی سطح پر
کیا چمکیلی گھاس تھی

برسوں کی پاکیزگی
پَل میں ستیاناس تھی

شاعری تو یہ ہے، ظفرؔ
باقی سب بکواس تھی

کالی بند اور گوری بند
جیسی تیسی چھوری بند

بہت کُھلے میں جی لیے
لاش ہے اپنی بوری بند

پھیکا ہے اپنا پکوان
آٹا ہُوئی چٹوری بند

سبھی دُکانیں اور بازار
کریں گے زورا زوری بند

پانی اندر جمع ہُوا
جب سے ہُوئی ہے موری بند

بم چلا دیا کسی نے
ہو گئی شورا شوری بند

نیند بھلا کیسے آئے
کرتے نہیں وہ لوری بند

اچھا کھولا دل کا حال
اُس نے کری کچوری بند

بلغم اتنی بڑھ گئی ہے
کریں گے بھنڈی توری بند

یا اَگاڑی چلے گی
یا پچھاڑی چلے گی

گدھا تو مر کھپ گیا
ہاتھ گاڑی چلے گی

مہنگے ہو گئے ریزر
اب تو داڑھی چلے گی

چولی کو کپڑا نہیں
پھر بھی ساڑھی چلے گی

اپنے انجن فیل ہیں
اُن کی گاڑی چلے گی

شہرو ہیں رُک جائے گا
اَور پہاڑی چلے گی

چلنا ہی جب پڑ گیا
ترچھی آڑی چلے گی

پوچھنے والے مر گئے
مارا دَھاڑی چلے گی

لکڑی ہو گئی زندگی
چیری پھاڑی چلے گی

وہی بُرائی کیجیے
یہی بھلائی کیجیے

لانڈریاں کُھل گئی ہیں
کہاں دُھلائی کیجیے

اور تو کام نہیں کوئی
مار کُٹائی کیجیے

شاید نکل ہی آئے کچھ
کہیں کُھدائی کیجیے

بیٹھے ہُوئے سلام کیا
اُٹھ کر، بھائی کیجیے

شادی ہو گئی آپ کی
تُرت جدائی کیجیے

بوسے کا جو قرض تھا
آج ادائی کیجیے

گڑھے پڑ گئے جان میں
ذرا بھرائی کیجیے

ہم تو بڑے نہیں، ظفرؔ
آپ خدائی کیجیے

بار بردار ہے گدھا گاڑی
اپنی تو یار ہے گدھا گاڑی

میرے بچّوں کو پالتی ہے
پرورش گار ہے گدھا گاڑی

آتا جاتا ہوں کہ میرے لیے
شور لے کار ہے گدھا گاڑی

سُست لگتی ہے دُور سے، ورنہ
برق رفتار ہے گدھا گاڑی

رات کو الوداع کہتی ہُوئی
صبح آثار ہے گدھا گاڑی

اُونٹ گھوڑے کی نہیں پروا
مجھ سے دوچار ہے گدھا گاڑی

صاف گونگا ہوں میں تو اُس کے بغیر
میرا اظہار ہے گدھا گاڑی

کسی گاہک کے انتظار میں ہے
یعنی تیار ہے گدھا گاڑی

جب سے یار ہے گدھا تو، ظفرؔ
تب سے بے کار ہے گدھا گاڑی

گلّے بانی بھی کی ہے
کوچوانی بھی کی ہے

ہے مکاں بھی میسّر
لامکانی بھی کی ہے

یہ بُڑھاپا نہ دیکھو
نوجوانی بھی کی ہے

نینوں والی سے ہٹ کر
اَندھی کانی بھی کی ہے

عجز بَن کر رہا ہوں
پاٹے خانی بھی کی ہے

کالی پیلی کے ہم راہ
ارغوانی بھی کی ہے

ضد پہ بھی اَڑ گیا ہوں
لَن ترانی بھی کی ہے

جب فلاں ہو گیا ہوں
تو فلانی بھی کیا ہے

شاعری ہے، سَو اکثر
بے معانی بھی کی ہے

آن چڑھائی کرے گا
پھر پسپائی کرے گا

گند بھی ڈالے گا بہت
وہی صفائی کرے گا

ملتا رہا تو ایک دن
دو سے ڈھائی کرے گا

عزّت دیتا ہے بہت
یہ رُسوائی کرے گا

یہ بھی دوسروں کی طرح
کبھی جُدائی کرے گا

اچھا کرو سلوک تو
کیوں نہ بُرائی کرے گا

سر پر عشق سوار ہے
خاک پڑھائی کرے گا

انتظار تو کرو کچھ
کرے گا بھائی، کرے گا

اب تو اِسی طرح ظفر
حال دُہائی کرے گا

آنی جانی کرے گا
اور من مانی کرے گا

گُم صُم بیٹھا ہے ابھی
کارستانی کرے گا

اچھی بھلی بہار کو
ریگستانی کرے گا

دانائی کی آڑ میں
پھر نادانی کرے گا

مہنگائی کے درمیاں
کچھ ارزانی کرے گا

لکھ دے گا جو ایک بار
وہی زبانی کرے گا

جس نے روکا ہُوا ہے
وہی روانی کرے گا

مُشکل میں ڈالے گا، اور
یوں آسانی کرے گا

میں نہیں کرتا ابھی، ظفر
دل بر جانی کرے گا

لالو لال ٹماٹر ہیں
اُس کے گال ٹماٹر ہیں

ادرک بھی ہے پڑی ہُوئی
اُس کے نال ٹماٹر ہیں

مہنگے ہیں یا ہیں غائب
بڑے کمال ٹماٹر ہیں

ممکن نہیں نصیب میں، کیا
وصل مثال ٹماٹر ہیں

سستے بازاروں کے بیچ
کیا بدحال ٹماٹر ہیں

اَگلے سال بھی ہوں شاید
اب کے سال ٹماٹر ہیں

ابھی جواب نہیں ممکن
ایک سوال ٹماٹر ہیں

یاروں کی خاطر اب بھی
خواب خیالِ ٹماٹر ہیں

نہیں پہنچتے اپنے پاس
کیا بے چال ٹماٹر ہیں

بڑھی ہوئی بے کاری تھی
لڑی ہوئی بے کاری تھی

کیا بستر میں میرے ساتھ
پڑی ہوئی بے کاری تھی

پتّا پتّا پیڑوں سے
جھڑی ہوئی بے کاری تھی

جیسے ہر اک ماتھے میں
جڑی ہوئی بے کاری تھی

نشے کی صورت سب کو
چڑھی ہوئی بے کاری تھی

نیزہ سا ہر سینے میں
گڑی ہوئی بے کاری تھی

کیا کہیے، اپنی ضد پر
اَڑی ہوئی بے کاری تھی

پکّے پیروں سے اندر
وڑی ہوئی بے کاری تھی

جاتے تھے جس سمت، ظفؔر
کھڑی ہوئی بے کاری تھی

ہائے گرانی، وائے گرانی
وائے گرانی، ہائے گرانی

وہی مرے اندر اور باہر
وہی مرے ہمسائے گرانی

جو کچھ بھی ہے، سب اُس کا ہے
کھوئے گرانی، پائے گرانی

بڑے مستقل موسم اِس کے
آ کر کبھی نہ جائے گرانی

آئے دال کا بھاؤ آپ ہی
گھر گھر جائے، بتائے گرانی

گلیوں، بازاروں، سڑکوں پر
کیا کیا دُھوم مچائے گرانی

دُور دُور ہی کرتی جائے
اپنے اور پرائے گرانی

میرے ترے معاملات میں
اپنی ٹانگ اَڑائے گرانی

مِل بیٹھیں اَور اس کو کھائیں
اَور ہمیں یہ کھائے گرانی

یورش بھی کرتا ہوں
کوشش بھی کرتا ہوں

گانٹھتا بھی ہوں جُوتے
پالش بھی کرتا ہوں

کھڑا بھی رہتا ہوں، اَور
لرزش بھی کرتا ہوں

بندہ بشر بھی ہوں میں
خواہش بھی کرتا ہوں

دُھوپ کے گرم دنوں میں
بارش بھی کرتا ہوں

کام نکالنے کو میں
سازش بھی کرتا ہوں

مِلتا بھی ہوں جا کر
پُرسش بھی کرتا ہوں

کان میلیا بھی ہوں
مالش بھی کرتا ہوں

خود بھی ہو جاتا ہے
کاوش بھی کرتا ہوں

چارپائی پہ یوں نہ بیٹھا کھانس
اُٹھ کے بوڑھی سی کوئی مرغی پھانس

عشق من مرضیوں کا سودا ہے
اِس میں چلتی ہے کوئی دھونس نہ دھانس

کام سیدھا نہیں کیا کوئی
ہیں بریلی کو اپنے اُلٹے بانس

خاک ہم نے بھُلا دیا اُس کو
دل کے اندر جو رہ گئی ہے پھانس

مہربانی جو دوسروں پر ہے
کیا ہمارے لیے بھی ہے کوئی چانس

جانیے بھینس کھائے گی کہ نہیں
گھاس کو آج باندھتے ہیں گھانس

مان کر ہی نہیں دیا اُس نے
کر کے ہم نے بہت دِکھایا ڈانس

پاؤں بھی اُٹھ نہیں رہے اب تو
دُور ہے کتنی اور ملکہ بانس

جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں، ظفرؔ
درمیاں میں اَٹک گئی ہے سانس

ڈھول کا پول ہوں، کھلا ہُوا ہوں
کارواں سے بھی آ مِلا ہُوا ہوں

اصل ظاہر ہُوا ہوں اندر سے
جب سے اُس شوخ کا چِھلا ہُوا ہوں

پہلے تو ایک دم کسا ہُوا تھا
پڑا رہنے سے پلپلا ہُوا ہوں

اب الگ ہو سکوں گا مشکل سے
ساتھ اُس کے کہیں سِلا ہُوا ہوں

جو بہت ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے
کوئی ایسا ہی سلسلہ ہُوا ہوں

اپنے اَور اُس کے درمیان میں کچھ
گھٹتا بڑھتا سا فاصلہ ہُوا ہوں

لوگ سیڑھی لگا کے ملتے ہیں
آج کل چار منزلہ ہُوا ہوں

شاعری کر رہا ہوں اِس لیے میں
لازمی طور پر ہِلا ہُوا ہوں

راستے سے بھٹک گیا ہوں، ظفرؔ
کوئی بے سمت قافلہ ہُوا ہوں

خشکی ہے یا تَری ہے
ساری جادو گری ہے

ظاہر پر مَت جایئے
جن کے اندر پری ہے

ہے جو شے موجود وہ
ناموجود پہ دَھری ہے

خالی ہوں میں ہی فقط
شام خلا سے بھری ہے

آپ نہیں، سر بھی نہیں
کیسی یہ خود سری ہے

غائب ہونے کی یہاں
کچھ کوشش تو کری ہے

باہر زندہ ہے اُمید
اندر اندر مَری ہے

کم زوری ہی آج کل
اپنی زور آوری ہے

رہتا ہوں گھر میں، ظفؔر
اَور، وہی بے گھری ہے

فغاں بھی چھوڑ دی، فریاد بھی نہیں کریں گے
جو وہ کہے تو اُسے یاد بھی نہیں کریں گے

خیال و خواب پہ قدغن لگائیں گے یک سر
ہم اپنی بزم کو آباد بھی نہیں کریں گے

کِھلیں گے آپ کی آواز کے گلاب کبھی
اگرچہ آپ کچھ ارشاد بھی نہیں کریں گے

جو تیرے ہوتے ہُوئے کر سکے نہ ڈھنگ سے ہم
وہ کاروبار ترے بعد بھی نہیں کریں گے

خوشی جو دے نہ سکے کوئی سرپھرے دل کو
تو بے سبب اُسے ناشاد بھی نہیں کریں گے

اُمید و بیم کے نخرے اُٹھائیں گے کچھ دن
اگرچہ ختم یہ میعاد بھی نہیں کریں گے

کمی بھی کچھ نہ کریں گے ترے فسانے میں
کچھ اپنی سمت سے ایزاد بھی نہیں کریں گے

جئیں گے دیکھنے کو تیری خامشی کی حدیں
ہم اپنے آپ کو برباد بھی نہیں کریں گے

ظفرؔ کہ بُلبلِ گستاخ بھی ہے گلشن کا
اِسے حوالۂ صیاد بھی نہیں کریں گے

محبت کو گلے کا ہار کر لے
کسی بے مہر سے بیوپار کر لے

اُسی نے کام آنا ہے کسی دن
علاجِ خاطرِ بیمار کر لے

اُتر سکتا ہے ساحل پر سفینہ
اگر اِس موج کو منجدھار کر لے

یہی ہے ترکِ دُنیا کا طریقہ
کہ ساتھ اُس کو بھی دنیا دار کر لے

یہاں پر دوسری باری نہیں ہے
جو کرنا ہے وہ پہلی بار کر لے

ہمارا رابطہ باقی رہے گا
تُو بے شک بیچ میں دیوار کر لے

نہیں یہ کام اکیلے آدمی کا
کسی کو اب شریکِ کار کر لے

گزرنا ہے نظر کے قافلوں نے
زمینِ حسن کو ہموار کر لے

ظفرؔ جیسا بھی ہے اور جس قدر بھی
اِسی مجبور کو مختار کر لے

چائے کے ساتھ سموسہ
اُس نے آن پَروسا

دے کر ہُوا وہ فارغ
ایک ہوائی بوسہ

لگتا رہا لغاری
بعد میں نکلا کھوسہ

بات نہ اُس کی مانی
جس نے پالا پوسا

سیب تھا ٹھنڈا، شیریں
دُودھ تھا کوسا کوسا

بدلے نہیں اِرادے
ٹوٹا نہیں بھروسہ

گُتھم گتھا ہو گئے
کھا کر چنگا چوسا

لقمہ چھین کے اُس نے
اپنے منہ میں ٹھونسا

آخر کار ظفؔر بھی
مرے گا بے افسوسا

بھورے ہو یا کَکّے تم
رنگ باز ہو پکّے تم

ابھی ابھی ملتان میں تھے
ابھی ابھی ہو مَکّے تم

پھیلے ہُوئے زمینوں پر
آسمان میں رکّھے تم

پکڑو سادھوں کو دن رات
چھوڑو چور اُچکّے تم

آؤٹ نہیں ہونے والے
مارو چوکے چھکّے تم

میٹھے بھی ہو، کڑوے بھی
پھر بھی ہو اَن چکّھے تم

پیار دُلار تمھی سے ہے
دل بر ہو بے شکّے تم

گرے پڑے ہیں پہلے ہی
دینا ہمیں نہ دھکّے تم

پکڑے ہی جاؤ گے، ظفر
کرتے آنکھ مٹکّے تم

آتی جاتی رہ جاتی ہیں
سانسیں اٹکی رہ جاتی ہیں

آدمی کہیں چلے جاتے ہیں
باتیں باقی رہ جاتی ہیں

کام آغاز نہیں ہوتا ہے
عمریں آدھی رہ جاتی ہیں

جی بھر کے رو لینے سے بھی
آنکھیں پیاسی رہ جاتی ہیں

چشم دید کچھ بھی نہیں رہتا
سُنی سُنائی رہ جاتی ہیں

دیکھی ہُوئی جگہیں بھی جیسے
کچھ ان دیکھی رہ جاتی ہیں

بھول بھی جاؤ، پھر بھی یادیں
اچھی خاصی رہ جاتی ہیں

کچھ بھی نہیں خریدا جاتا
جیبیں خالی رہ جاتی ہیں

باتیں ساری کہہ جاتا ہوں
پھر بھی کتنی رہ جاتی ہیں

پھر رہا ہرن کُھلا
لگ رہا تھا اَن کُھلا

راستے تو ہیں بند
مجھ پہ یہ معاً کُھلا

چل پڑی ہوا بھی
دیر سے چمن کُھلا

روشنی سی اُڈی
شرٹ کا بٹن کُھلا

تنگ ہے بہت جی
چھوڑیئے بدن کُھلا

کہاں جا رہی ہو
ساتھ لے کے دھن کُھلا

رُوم سے وہ نکلی
گیٹ دفعتاً کُھلا

بھوک تھی بلا کی
جس گھڑی ٹفن کُھلا

مُڑ گئے فرشتے
رہ گیا کفن کُھلا

رات سے ہے گھر کُھلا
اَور، بے خطر کُھلا

باہر آئیں گے تب
اَبر یہ اگر کُھلا

راستہ گُما کر
مقصدِ سفر کُھلا

پھر رہا تھا سیلاب
کیسا دَر بہ دَر کُھلا

کُھلا تھا وہ منظر
اَور کس قدر کُھلا

تُو بھی اندر اندر
کوئی کام کر کُھلا

بند عیب تھا وہ
جو لگا ہُنر کُھلا

چور ہیں سب اندر
یہاں سے گُزر کُھلا

کر دیا مقفل
پھر کہیں ظفر کُھلا

دل سے دُشنام کیا نکلتی ہے
اک طرح سے دُعا نکلتی ہے

دیکھنا ہے بغیر برسے ہی
کس طرف کو گھٹا نکلتی ہے

بھرتا رہتا ہے ناؤ میں پانی
بادباں سے ہَوا نکلتی ہے

کہیں رکھتا ہوں اَور یاد اُس کی
یہ کہیں اَور جا نکلتی ہے

چُپ رہوں بھی تو کیا اگر میری
خامشی سے صدا نکلتی ہے

دیا بُجھتا ہے اور دُھوئیں کی لکیر
میرے سر سے جُدا نکلتی ہے

خواب میں فصلِ شوق بوئی ہُوئی
خاک سے جا بہ جا نکلتی ہے

جاں نکلتی ہے جسم سے ایسے
جیسے گھر سے بَلا نکلتی ہے

روشنی سی کبھی کبھار، ظفؔر
اِس طرف بھی تو آ نکلتی ہے

پتا نہیں چلنے دیتا اور شامل ہو جاتا ہے
جب کوئی چپکے سے دل میں داخل ہو جاتا ہے

خود سے مِلنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اکثر
کوئی تو ہے جو درمیان میں حائل ہو جاتا ہے

لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں، یہ کھیل ہے ایسا
یک دَم اچھا بھلا سخی بھی سائل ہو جاتا ہے

ہر شے کھو دیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں بچتا باقی
پھر بھی لگتا ہے سارا کچھ حاصل ہو جاتا ہے

آنکھیں اَور طرف کو کھینچتی ہوتی ہیں اُس لمحے
لیکن دل ایک اَور طرف ہی مائل ہو جاتا ہے

کوئی کنارہ ہے جو کبھی ڈبو دیتا ہے کشتی
ایک بھنور ہے جہاں سفینہ ساحل ہو جاتا ہے

اُسے بھی یاد نہیں آتا ہے ایک چاہنے والا
دل بھی محبت کرتے کرتے غافل ہو جاتا ہے

ایسے لگتا ہے کہ ہَوا بھی روک رکھی ہو اُس نے
بیٹھے بیٹھے سانس بھی لینا مشکل ہو جاتا ہے

پیش رفت کی کوشش میں تو لگے رہتے ہیں ظفرؔ ہم
اَور، اثر پہلے والا بھی زائل ہو جاتا ہے

ویسا بھی بہت لگتا ہے
ایسا بھی بہت لگتا ہے

ہوتا بھی رواں ہے، لیکن
ٹھہرا بھی بہت لگتا ہے

دل بھی ہے مجسم، لیکن
دُنیا بھی بہت لگتا ہے

یہ عشق بھی نہیں، اَور وہ
اچھا بھی بہت لگتا ہے

دریا لگنے والا بھی
صحرا بھی بہت لگتا ہے

سیراب ہو جتنا بھی وہ
پیاسا بھی بہت لگتا ہے

غیروں کا غیر بھی ہے وہ
اپنا بھی بہت لگتا ہے

اُتنا ہی غنیمت سمجھو
جتنا بھی بہت لگتا ہے

پُرکار ہے خوب، ظفرؔ وہ
سادہ بھی بہت لگتا ہے

♦

شمار ہونا ہے یا بے شمار ہونا ہے
یہی ہمارا نہ ہونا ہزار ہونا ہے

لگی ہوئی ہے جو آنکھوں میں تری آمد و رفت
ابھی تو دل نے ترا راہ گزار ہونا ہے

جہاں جہاں نہیں امکان تیرے آنے کا
وہاں وہاں بھی ترا انتظار ہونا ہے

رُکیں گے کیا ترے دریا کے درمیان میں اب
کہ آر ہونا ہے یا ہم نے پار ہونا ہے

ابھی تو ہم نے اُٹھانا ہے اور بھی نقصان
ابھی تو اور بہت کاروبار ہونا ہے

ابھی تو اور بھی کرنا ہے خواہشوں نے ہجوم
ابھی تو اور بھی بے اختیار ہونا ہے

ہمارے خواب نے چلنا ہے کارواں بن کر
ہماری خاک نے آخر غبار ہونا ہے

کبھی تو آپ کریں گے ہمارے ساتھ انصاف
کبھی تو آپ نے ایمان دار ہونا ہے

ظفر کے ہاتھ بھی خالی ہیں اور دل بھی، مگر
اسی نے آپ کا اُمیدوار ہونا ہے

تعارف

اصل نام	:	میاں ظفر اقبال
قلمی نام	:	ظفر اقبال
والد کا نام	:	میاں محمد شریف
جائے پیدائش	:	بہاول نگر
تعلیم	:	بی اے، ایل ایل بی
ملازمت	:	ڈائریکٹر اُردو سائنس بورڈ، لاہور (97-1995ء)
مطبوعات	:	''اب تک'' کلیاتِ غزل، 5 جلدیں
		پنڈ وکڑی (پنجابی کلیات)
		لاتنقید
		دال دلیا، خشتِ زعفران (کالموں کا انتخاب)
اعزازات	:	تمغۂ حسنِ کارکردگی (1998ء - 1997ء)
		ہلالِ امتیاز (15-2014ء)
		کمالِ فن ایوارڈ (حکومتِ پنجاب)
پتا	:	ظفر اقبال، B - 68،
		GOR - III،
		شادمان، لاہور
موبائل	:	0333-4374597
ای میل	:	Zafariqbal@dunya.com.pk

◆◆◆

ذہن رکھنے والوں نے انھیں سراہا تو کچھ نقادوں نے مقلد بھی بنایا مگر وہ اپنی ڈگر سے نہیں ہٹے اور زبان کے تجربے کرتے رہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

اک عمر ہو گئی جس میں خسارے سے لگا ہوں
بگڑا ہے وہی کام، دوبارے سے لگا ہوں
آواز تو آتی ہے دکھائی نہیں دیتا
وہ کون ہے میں جس کے پکارے سے لگا ہوں

لسانی تجربہ اور زود گوئی ظفر اقبال کے شعری رویے کی عام پہچان ہے لیکن ان کا یہ انداز ان کے کلام کے معیار پر اثرانداز نہیں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین اور قارئین ہمیشہ ان کی غزلوں کی طرف متوجہ رہے۔ سادہ زبان میں بہت سنجیدگی سے شوخ گوئی ایسا وصف ہے کہ وہ جدید عہد کے صاحب اسلوب شاعر قرار پائے:

اللہ کا گھر گرچہ ذرا دور تھا لیکن
آئے ہیں تو اس بت کی زیارت ہی کیے جائیں
جاتے ہیں ظفر پر تو ظفر دل سے کسی طور
اک عمر کے مہمان کو رخصت ہی کیے جائیں

بلا شبہ اردو زبان و ادب کو عصر حاضر میں اپنی شاعری سے ممتاز بنانے میں ظفر اقبال کا بڑا حصہ ہے۔

ڈاکٹر فاطمہ حسن

◆◆◆
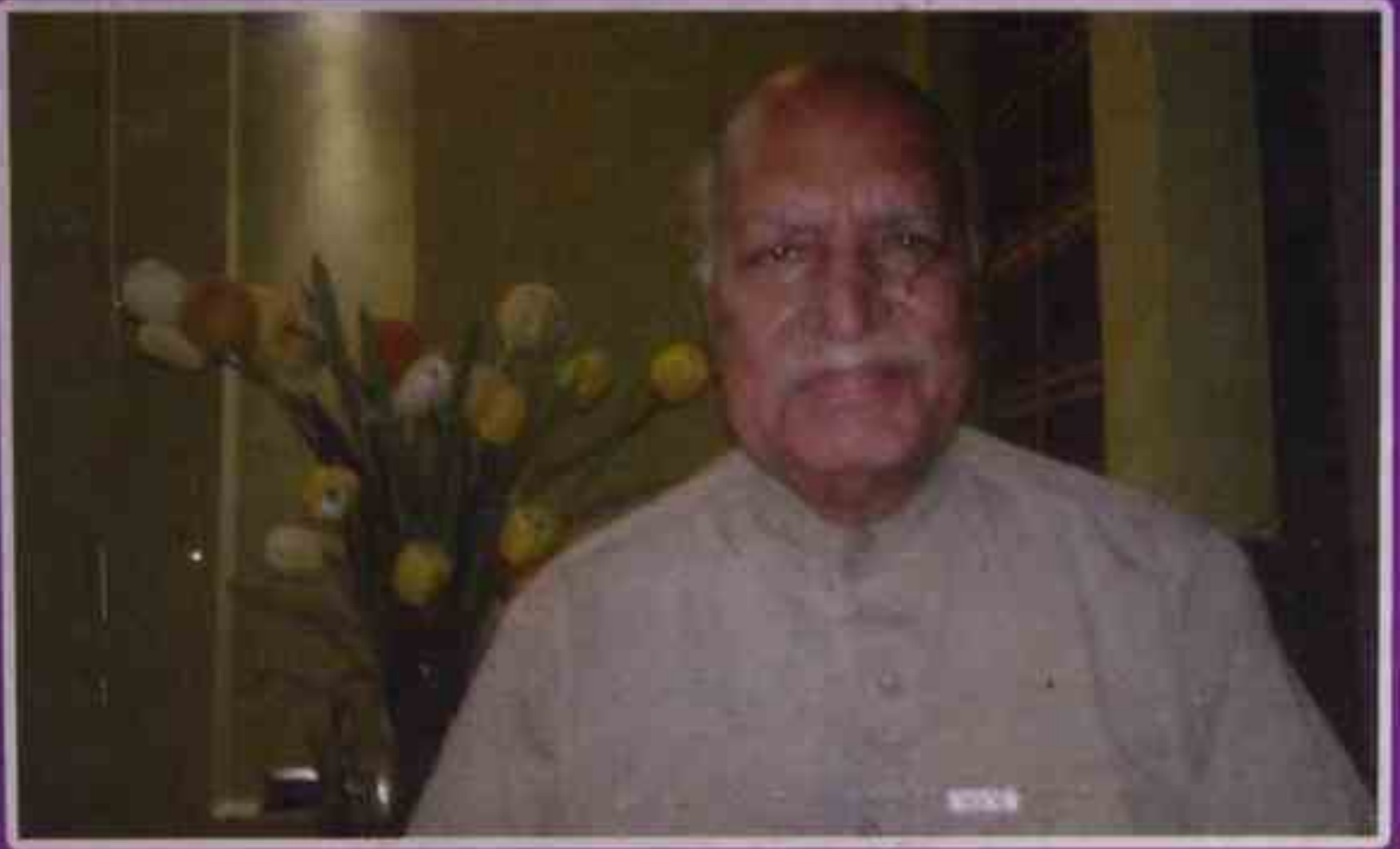
محترم ظفر اقبال صاحب از راہِ کرم مجھے یہ دعویٰ کرنے دیں کہ اردو زبان میں انفرادیت اور تخلیقی کے جتنے امکانات ہو سکتے ہیں وہ آپ کی شاعری میں بروئے کار آ گئے ہیں۔ ہاں اپنی تمام تر تخلیقی سکت اور خلاقی دولت کے ساتھ ایسا اور مکمل شاعر شاید یہ ابھی تخلیق نہیں کر سکتی۔ آپ نے اظہار کے معنوی، احوالی اور تشکیلی نظام کی جیسی تفصیل کر دکھائی ہے ایک تو وہ ہماری پوری روایت میں کہیں اور نظر نہیں آتی اور دوسرے یہ کہ آپ کی شاعری میں برپا تخلیقی انقلاب لسانیاتی شعور اور طرزِ احساس کے رسمی حدود کو بھی توڑ دیتا ہے اور تصورات و احساسات میں نئی نئی نسبتوں کو بہت قوت کے ساتھ فعال کر دیتا ہے۔

احمد جاوید

Rang-e-Adab Publications

Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.

021-32761100 0300-2054154

0345-2610434 0336-2085325

rangeadab@yahoo.com /rangeadab